15 — سرگزشت — **پیرِ صاحب** — ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادرروزگار کا تعارفِ خاص

16 — گفت و شنید — **شہرِ خیال** — مدیراعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

24 — شخصیت — **چراغِ ادب** — ڈاکٹر ساجد امجد
اردو ادب کے ایک معمار کی داستانِ حیات

49 — معلومات — **وہ کون تھے** — مختار آزاد
زمانہ قبل از تاریخ میں بھی ہوائی جہاز اڑا کرتے تھے

63 — روداد — **تتلیاں** — ابن کبیر
ان تین بہنوں نے ملک کی آزادی کی خاطر جان دے دی

80 — سفر کہانی — **ترکی نمی دانم** — علی سفیان آفاقی
اچھے سفرنامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ سفر کہانی

94 — جنگِ عظیم — **جرم وفا** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ہٹلر کے ایک جاں نثار کا مقدمہ پیش ہوا تو اس نے موت کی سزا سنادی

107 — فلم و صحافت — **فلمی الف لیلہ** — علی سفیان آفاقی
فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، معروف قلمکار کے حقیقی شب و روز

127 — تحریر خاص — **جون** — منظر امام
عیسوی مہینوں کے ایک اہم مہینے کا تذکرہ خاص

133 — جہاز بیتی — **الوداع** — حسن رزاقی
پی آئی اے کے ایک ریٹائرڈ افسر کی خودنوشت

151 — تحفہ خاص — **بھوک** — محمد ایاز راہی
بھوک انسان کو کس نہج پر پہنچا دیتی ہے

156 — معاشرت — **سراب** — کاشف زبیر
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

197 — شعر و ادب — **بیت بازی** — قارئین
شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

200 — انعامی مقابلہ — **علمی آزمائش** — ادارہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

202 — پہلی سچ بیانی — **موت و حیات** — شمائلہ شمی
زندگی کی کشمکش سے ابھری ایک دلچسپ کتھا

221 — دوسری سچ بیانی — **استادی** — صفدر
شہر میں کیسے کیسے استاد استادی دکھا رہے ہیں

227 — تیسری سچ بیانی — **اندھی سوچ** — صدف آصف
انسان کی سرشت میں دغابازی ہے

236 — چوتھی سچ بیانی — **اندیکھا سودا** — اشرف
کاش وہ والدین کی رضا پر راضی ہو جاتا

243 — پانچویں سچ بیانی — **ناقابلِ تلافی** — امیمہ سلیم
عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہ جا سکے ایک ایسا قصہ

255 — چھٹی سچ بیانی — **ہم مجرم** — عزیز صفی پوری
ایک یادرہ جانے والی دلچسپ سچ بیانی

261 — ساتویں سچ بیانی — **نہ خدا ملا** — افضل و یکٹر منٹے
اس نے ایک لڑکی کے لیے قربانی دی بدلے میں کیا ملا

269 — آٹھویں سچ بیانی — **انجامِ ہوس** — محمد حنیف قادری
انسان کو اپنے کیے کی سزا عمر بھر بھگتنا پڑتی ہے

279 — نویں سچ بیانی — **اعترافِ گناہ** — محمد ظفر حسین
کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے

000 — سوغات — **پارچے** — قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات افشا فائی پارچے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 24 ❖ شمارہ 07 ❖ جون 2014ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

راجا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فراز علی ہاشمی 0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

یہ کیسا وقت آگیا ہے کہ حب الوطنی، وطن پرستی قابلِ تعزیر ٹھہرائی جانے کی سازش ہورہی ہے۔ اس بات سے کون احمق انکار کرے گا کہ وطن کی حفاظت کے لیے ہر دور میں، ہر ملک میں ایک ایسی افرادی قوت تشکیل دی جاتی تھی اور آج بھی دی جاتی ہے جسے عسکری قوت کا نام دیا گیا ہے۔ اس قوت کا کام صرف اور صرف وطن کی حفاظت ہے۔ ملک کو بیرونی خطرات لاحق ہوں یا اندرونی۔ ان سے نمٹنے کی ذمّے داری عسکری قوت کے کندھوں پر ہوتی ہے۔ اس ذمّے داری کو ہماری عسکری قوت نے احسن طریقے سے انجام دیا ہے لیکن ہر دور میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس قوت سے خائف رہے ہیں اور الزام تراشی سے باز نہیں آتے۔ وہ لوگ جو ہماری آزادی کے محافظ ہیں ان کی طرف اٹھنے والی انگلیاں کیا محبِ وطن افراد کی ہوں گی، اس پر غور ضرور کریں کہ یہ وطن کی سلامتی کا سوال ہے۔ ہر محبِ وطن کے دل کی آواز ہے۔

میں جھکا ہوں نہ کبھی اور نہ جھکوں گا تادم
یہ الگ بات ہے کہ لگتی رہے تہمت مجھ پر

معراج رسول

پیر صاحب

سرگزشت

2 محرم 1296ھ ہجری بروز جمعرات بوقت صبح صادق بستی خواجہ نظام الدین میں اس نے آنکھ کھولی۔ والدین نے نام رکھا قاسم مگر ماموں بہادر علی اسے علی حسن کہتے اور وہ اسی نام سے پکارا جانے لگا۔ تعلق صوفی گھرانے سے تھا اس لیے ہوش سنبھالتے ہی تصوف کی طرف رغبت ہونے لگی۔ مگر تعلیم بھی تو ضروری امر ہے۔ اسے بھی ابجد کی جانب راغب کیا گیا گوکہ تعلیم کی ابتدا گھر سے ہوئی۔ لیکن ابجد شناسی میں سختی سے کام لیا گیا۔ یوں بھی وہ گھرانا علم تصوف میں درجۂ کمال پر تھا۔ اس لیے پڑھائی کی ابتدا قرآنی تعلیمات سے ہوئی پھر فارسی کی جانب توجہ دلائی گئی۔ احادیث کا درس دیا جانے لگا۔ عربی صرف ونحو کی تعلیم دی جانے لگی۔ استادِ اول کے طور پر مولانا محمد اسماعیل کا انتخاب ہوا۔ مولانا کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے اور لال قلعہ میں مقیم شاہی خاندان کے بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے مگر رہائش ان کی بستی نظام الدین میں تھی۔ اس لیے انہیں منتخب کرلیا گیا۔ مولانا کے لیے بھی یہ ایک خوش قسمتی کی بات تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے خاندان کے کسی فرد کو تعلیم دینا ہے۔ ناظرہ مکمل تھا۔ فارسی کی ابتدائی کتب بھی ختم کرچکا تھا۔ استاد نے شرح تہذیب اور کنز الدقائق شروع کرادیا۔ ابھی وہ بارہویں سال میں پہنچا تھا کہ ایک کے بعد ایک ماں باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا اب اس کی پرورش بڑے بھائی سید حسن علی شاہ کے ذمّے تھی۔ بڑے بھائی نے اس کے لیے شفقت کے در کھول دیے۔ اس کی تعلیم جاری وساری رہی۔ جلالین اور مشکوٰۃ شریف ختم کرنے اور سنن ابوداؤد، ترمذی شروع کرنے کے بعد اس نے شہر منتقل ہونے کی ٹھان لی۔ ان دنوں بستی نظام الدین دہلی شہر کا ایک مضافاتی قصبہ تھا۔ اس کے مقابلے میں دہلی زیادہ مواقع کا شہر تھا۔ وہاں مدارس بھی زیادہ تھے۔ شہر آکر اس نے مولوی وصیت علی کے مدرسے میں داخلہ لیا پھر اس نے مولوی عبدالعلی محدث، مولوی حکیم الہ دین پنجابی اور مولوی حکیم رضی الحسن ساکن کاندھلہ سے بھی مختلف کتب کی تعلیم حاصل کی۔ جب جناب مولانا محمد اسماعیل کی وفات ہوگئی تو ان کے بڑے صاحبزادے مولانا میاں محمد سے بھی سبق حاصل کیا۔ اس کے بعد مولانا محمد یحییٰ خلف مولانا اسماعیل جو مولانا رشید احمد محدث گنگوہی کے شاگرد تھے اسے اپنے ساتھ گنگوہ لے گئے۔ وہاں اس نے ڈیڑھ سال قیام کیا۔ گنگوہ سے واپس آتے ہی اسے چچا سید معشوق علی کی بیٹی حبیب بانو سے نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ شادی کے بعد حالات بہت زیادہ خستہ ہوگئے۔ گزر بسر تک مشکل ہوگئی تھی۔ فاقے کی نوبت آگئی تھی کہ 1908ء میں سید محمد ارتضیٰ عرف محمد الواحدی نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ فقہ و حدیث پر عبور حاصل کرلینے کی وجہ سے وہ ممتاز سمجھا جانے لگا تھا اور نظام الدین اولیا کے خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے اسے ایک الگ مقام حاصل تھا پھر حضرت مولانا پیر سید مہر علی شاہ نے بھی اسے بیعت لینے کی اجازت دے دی تھی۔ اسی لیے محمد الواحدی نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ محمد الواحدی کے علاوہ ریاست الور میں مولوی عمر دراز نظامی کی معیت میں ایک بڑی جماعت نے بھی بیعت کرلی تھی۔ محمد الواحدی نے حلقہ نظام المشائخ کی بنیاد میں بھی اہم کردار ادا کیا اور رسالہ نظام المشائخ جاری کرنے کے لیے اسے ایک بڑی رقم دی۔ حلقہ نظام المشائخ کی وجہ سے خاندان بھر میں تلاطم پیدا ہوگیا کیونکہ تمام لوگوں کی روزی نذر و نیاز کی رقم پر تھی۔ ان لوگوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ اب یہ آمدنی ان کے ہاتھ سے نکلنے والی ہے تو انہوں نے اس کے خلاف محاذ بنالیا مگر جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ اسے کتب و رسائل کی تجارت کے علاوہ کسی اور امر سے مطلب نہیں تو وہ خاموش ہوتے چلے گئے۔ حلقہ تصوف کی تعلیمات عام کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا اس لیے اس نے جلد ہی پورے برصغیر میں اپنا خاص مقام بنالیا۔ رسالہ ہر نگر ہر قصبے تک پہنچنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رسالے نے ایک تحریک کا مقام حاصل کرلیا۔ اس کے ساتھ حلقہ نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا۔ یہ کتب خانہ درگاہ کے ماتحت تھا جس میں بے شمار قلمی و نایاب کتب جمع ہوگئی تھیں۔ 1908 سے 1919 تک اس کی مضمون نویسی تصنیف و تالیف اور خدمتِ مریدین عروج پر رہی۔ مریدوں کی تعداد 80 ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ تالیفات چالیس سے اوپر پہنچ رہی تھیں۔ پہلی بیوی حبیب بانو کا انتقال ہوچکا تھا۔ اب ذرا حالات میں ٹھہراؤ آیا تو اس نے عقد ثانی کرلیا۔ 1913 میں اس نے نظام المشائخ واحدی صاحب کے سپرد کردی اور خود میرٹھ سے ایک اخبار توحید جاری کرالیا۔ گوکہ یہ اخبار صرف پانچ مہینے زندہ رہا مگر اس کی شہرت برصغیر کے طول و ارض میں پھیل گئی تھی۔ پھر وہ امرتسر آگیا۔ یہاں اخبار "وکیل" کے دفتر میں قیام رہا۔ یہیں مولانا ابوالنصر آہ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات رہی پھر وہ مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی کے ہمراہ نواب آف بہاولپور کی مسند نشینی کے سلسلے میں بہاولپور آیا۔ یہیں شیخ عبدالقادر جو اس وقت آفتابِ صحافت تھے ان سے صحبت رہی۔ مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑانے کے لیے اس نے ان کی اقتدا میں بہت کام کیا۔ اس بے لوث پیرِ طریقت کا نام حسن نظامی ہے۔

شہرِ خیال

☆ شاہد جہانگیر شاہد کی خوشنوائی پشاور سے ''عقل نشین، ڈاکٹر ساجد امجد نے بہت خوبصورت انداز سے ڈارون کی تھیوری کو واضح کیا ہے لیکن اگر رابرٹ ڈارون کھلے دل ودماغ سے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ پڑھ لیتا تو بہت ممکن تھا کہ ایک غلط نظریے کا بانی بننے سے بچ جاتا کیونکہ قرآن پاک میں واضح طور پر لکھا ہے (ترجمہ سورۃ البقرۃ آیت نمبر 65) ''اور تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو جو تم میں سے ہفتے کے دن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کر گئے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔'' جبکہ ڈارون کی الٹی کھوپڑی میں یہ واقعہ کچھ یوں سمایا کہ ''انسان تھا پہلے بندر'' اسی طرح ڈارون کا نظریۂ ارتقا بھی غلط مفروضے پر مبنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (ترجمہ سورۃ التین) ''انجیر کی قسم اور زیتون کی قسم اور طور سینین اور اس امن والے شہر کی قسم کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔'' مئی، منظر امام صاحب کا معلومات لٹاتا کارواں خیر سے عیسوی کیلنڈر کے پانچویں مہینے میں داخل ہو گیا ہے۔ دماغی توازن، اولاد پر ضرورت سے زیادہ حقِ ملکیت جتانے اور اس کے غلط نتائج پر مبنی ایک چشم کشا اور عبرت اثر سچ بیانی۔ تاریخ عکس، اس ماہ کی سب سے معلوماتی کہانی۔ تصور سے تصویر تک اور تصویر کے متحرک اور پھر گویا ہونے تک کے صبر آزما مراحل طے کرتی ہوئی ایک بے حد دلچسپ اور خوبصورت معلوماتی تحریر جس کے لیے مریم کے خان مبارک باد کی مستحق ہیں۔ شہر گزشت، صدر الدین، امین بھایانی نے ماضی کے کراچی کی سرکلر لوکل ٹرین کے ذریعے سیر کرادی اور میرے دل و ذہن میں بھی ماضی کے دریچے وا کر دیے جب والد صاحب مرحوم نے میرے پڑھنے کی طرف توجہ نہ دینے، فلم بینی اور دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی عادت سے تنگ آکر پڑھنے کے لیے کراچی بھیج دیا اور خبردار کر دیا کہ وہاں صرف پڑھنے کے لیے جا رہے ہو فلموں اور دوستوں سے دور ہی رہنا۔ پوری توجہ پڑھائی کی طرف دینا، مجھے کوئی شکایت نہ ملے۔ کراچی آکر ڈرگ کالونی (موجودہ شاہ فیصل کالونی) کے ایک فلیٹ میں رہائش اختیار کی۔ والد صاحب کی نصف نصیحت پر تو عمل کیا یعنی پڑھائی کی طرف تو متوجہ ہوا لیکن فلم بینی کی عادت ترک نہ کر سکا اور ایک لمبے عرصہ تک اس علت میں مبتلا رہا۔ امین بھایانی کی طرح ہر ماہ لوکل ٹرین سے ڈرگ کالونی کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن سے ٹاور جی پی او جاتا اور وہاں سے ماہانہ خرچ کی رقم نکلوا کر کبھی پیدل اور کبھی کبھی ٹما گھوڑا گاڑی یا ٹرام میں بیٹھ کر کراچی شہر کی سیر کرتا۔ اور جب خوب تھک جاتا تو شام کو پھر اسی لوکل ٹرین سے گھر واپس آجاتا۔ ڈرگ کالونی میں اس وقت تک کوئی سینما نہ تھا لہٰذا ناتھا خان گوٹھ کی کچی آبادی کے بیچ سے شارٹ کٹ کر کے ڈرگ روڈ اسٹیشن کے قریب واقع ایمپریل سینما میں فلمیں دیکھنے جایا کرتا۔ ڈرگ کالونی اسٹیشن کے قریب ایک بہت بڑا میدان ہوتا تھا جہاں ایک طرف چھوٹو پہلوان کا اکھاڑا تھا جہاں ہر اتوار کو عصر کے وقت سے شام تک باقاعدہ کشتی کے چیلنج مقابلے ہوا کرتے تھے۔ میدان کے باقی حصے میں ہم جیسے غریب غربا کبھی ہاکی اور کبھی فٹ بال کھیلا کرتے لیکن یہ طے تھا کہ کشتی والے دن اپنی دیگر مصروفیات چھوڑ کر ہم سب چھوٹو پہلوان کے اکھاڑے کے ارد گرد بیٹھ کر پہلوانی کے داؤ پیچ دیکھا کرتے۔ یہ غالباً 65-1964 کا زمانہ تھا جب اسی میدان میں پہلا سینما گھر شمع تعمیر ہوا اور پھر شبنم بنا اور اس طرح بچوں کے کھیلنے کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ مجھے یہ خوشی تھی کہ اب فلم دیکھنے دور نہیں جانا پڑے گا۔ میں 1966 تک کراچی میں زیرِ تعلیم رہا اور مڈل کے بعد پشاور لوٹ آیا لیکن اپنے لڑکپن میں جو روشنیوں کا شہر کراچی دیکھا تھا، اب بھی میرے خوابوں میں بستا ہے، وہ روشنیوں کا شہر جسے دہشت گردی نے ڈس لیا ہے۔ اس موقع پر مجھے خواجہ خورشید انور کی مشہور فلم ''چنگاری'' کا یہ مشہور گیت بہت یاد آرہا ہے جو مہدی حسن نے گایا تھا۔ یاد رہے کہ اس خوبصورت گیت کو ریڈیو پاکستان پر بجانے پر اسی زمانے میں پابندی لگ گئی تھی اور ہم اسے سننے کے لیے آزاد کشمیر ریڈیو لگا کر سنا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے وقت سے پہلے یہ گیت بنایا تھا شاید آج کے کراچی کے لیے۔ اے روشنیوں کے شہر بتا، اجیاروں میں اندھیاروں کا۔ یہ کس نے بھرا ہے زہر بتا، اے روشنیوں کے شہر بتا۔ شوبز مین، شکیل صدیقی کا اداکار و صداکار، فلم، ٹی وی اور اسٹیج کے مشہور فنکار ضیا محی الدین کے بارے میں تحریر کردہ یہ مضمون خاصے کی چیز ہے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ یہ 1970ء کی دہائی کی بات ہے جب ضیا محی الدین اپنے عجیب وغریب حلیے اور کھردرے چہرے کے ساتھ پی ٹی وی کی اسکرین پر نمودار ہوئے تو بڑے عجیب سے لگے۔ نہ چہرے مہرے سے اس دور کے فلم اور ٹی وی اداکاروں کی طرح خوش شکل وخوش لباس تھے نہ بظاہر کوئی اور خوبی نظر آئی کہ پی ٹی وی والوں کو اپنے ٹاک شو کی میزبانی کے لیے کوئی خوبصورت اور خوش لباس شخص میسر نہیں آیا جو بیٹلز گروپ سے ملتے جلتے حلیے کے اس شخص کو پکڑ لائے۔ ہم پاکستانی ناظرین ہمیشہ خوش شکل فنکاروں کو ہی اسکرین پر دیکھنے کے عادی تھے، چاہے فن کے نام پر وہ کتنا ہی غیر فنکار ہو۔ سب چلتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ضیا محی الدین کے پہلے شو کو ہم مذاق کے طور پر دیکھنے ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے لیکن جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ جسے ہم مذاق سمجھ رہے تھے، اس عجیب حلیے کے پیچھے ایک بہت بڑا فنکار چھپا بیٹھا ہے جسے استادوں کے ہاتھوں اور اس کی اپنی جد وجہد نے تراش خراش کر خام مال سے خاص ہیرا بنا دیا ہے۔ بیٹلز کے حلیے میں پوشیدہ یہ شخص اردو ادب پر مکمل دسترس رکھتا تھا۔ تلفظ اتنا اعلیٰ، شاندار اور شین قاف سے اتنا درست، الفاظ کی نشست وبرخاست اتنی خوبصورت کہ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' یہ شخص تو اپنے آپ میں فن اور آرٹ کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ اور پھر آنے والے ہر ہفتے وار شو میں اس کے فن کی خوبصورتیاں اور باریکیاں سامنے آنے لگیں۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جس دن ''ضیا محی الدین شو'' ہوتا، لوگ سارے کام جلدی جلدی نمٹا کر وقت سے پہلے ہی اپنے اپنے ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھ جاتے۔ بڑے شعرا وادبا اپنی نظم ونثر کی مقبولیت کے لیے اس کی آواز کے خواہشمند نظر آنے لگے۔ بہر حال کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔ ضیاء محی الدین اپنے آپ میں ایک مکمل ''ون مین شو ہے''۔ فلمی الف لیلہٰ اور ترکی نمی دانم، آفاقی صاحب کے یہ دونوں سلسلے کامیابی سے جاری وساری ہیں۔ شوکت رحمان خٹک صاحب کا اداکار رحمان (انڈین) کے بارے میں تحریر کردہ مضمون نما خط بے حد معلوماتی ہے۔ خٹک صاحب کے حوصلے کی داد دینا پڑے گی کہ اس قدر بیماری میں بھی لکھنے کا جذبہ وجنون برقرار ہے۔ اب آتے ہیں شہر خیال کی طرف ''پھر جاتا ہوں قصۂ دلدار چھیڑنا'' اپریل اور مئی کا مہینا اور سرگزشت میرے لیے بے پناہ خوشیاں لے کر آئے۔ اپریل 2014 میں میرا تحقیقی مضمون شاعر اعظم، شائع ہوا اور مئی میں مجھے قارئین سرگزشت اور شہر خیال کے دوستوں کی جانب سے پسندیدگی اور محبتوں کی مزدوری ملی (یوم مئی کی مناسبت سے) عبدالخالق بھٹی آپ کی دعاؤں کے لیے بے حد شکریہ۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ میرے لیے سب سے بڑی خوشی تو یہ ہے کہ اس دور میں جب لوگ کتاب سے دور ہوتے جا رہے ہیں آپ نے بیدل کی تلاش میں لائبریری کا رخ کیا اور اس سے استفادہ بھی کیا۔ یہی میری کاوش کا مقصد تھا۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ وسدرہ بانو ناگوری صاحبہ آپ دونوں خواتین کا بھی بے حد شکریہ کہ آپ نے اس ناچیز کی تحریر کو پسند کیا۔ محمد عمران جونانی، یہ آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ میں کس قابل، خوش قسمتی تو میری ہے کہ شہر خیال میں آپ جیسے دوستوں کی صحبت میسر ہے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، کیفی اعظمی کا شعر آپ نے شاعر اعظم کے لیے خوب منتخب کیا۔ مضمون کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ منشی محمد عزیز مئے، صدر الدین امین شاعر اعظم کی پسندیدگی کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ آپ کی خصوصی مبارکباد مجھ تک پہنچ گئی میری جانب سے بھی کوچوان جیسی خوبصورت تحریر کے لیے مبارکباد قبول کیجیے۔ انور عباس شاہ انشاء اللہ آیندہ بھی اپنے پیارے سرگزشت کے لیے لکھتا رہوں گا۔ پسندیدگی کا شکریہ ناصر حسین بہاولپور۔ شاعر اعظم کی پسندیدگی کے لیے بے حد شکریہ، شاعر اعظم نام انتہائی مناسب ہے جو کہ ادارہ سرگزشت نے تجویز کیا تھا۔ شاعرِ دلی نام رکھنا بیدل جیسی ہمہ گیر شخصیت کو محدود کرنے کے مترادف ہوتا' غالب جیسے بڑے شاعر نے ''محیطِ بے ساحل'' کہا ہے۔ شمالی ہندوستان افغانستان اور وسط ایشیا کے ممالک میں ان کا بڑا نام ہے۔ فارسی کے شعرا میں جو ان کا مقام ہے وہ کسی اور کا نہیں۔ میں نے تو ایک حقیری کوشش کی ہے ان کی شاعری کو قارئینِ سرگزشت سے متعارف کروانے کی جو کہ ان محدود صفحات میں کسی طور ممکن نہ تھی ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو۔'' آخر میں میں برادرم وحید ریاست بھٹی کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے پرچہ پشاور پہنچنے سے پہلے ہی فون پر مبارکباد دی اور اپنے زریں خیالات کا اظہار کر کے مجھے انتظار میں مبتلا کر دیا کہ کب سرگزشت پشاور پہنچے اور میں اسے دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا سکوں۔ کیا کریں پاکستان کا آخری شہر ہونے کے باعث پرچہ بھی سب سے آخر میں یہاں پہنچتا ہے اور اتنے کم وقت میں اسے پڑھنا اور پھر تبصرہ لکھنا آسان نہیں ہوتا اور رہی سہی کسر پوسٹ آفس والے پوری کر دیتے ہیں۔''

☆ سعید احمد چانگ، کراچی سے لکھتے ہیں ''معراج رسول کا اداریہ پڑھا۔ کاش یہ پڑھ کر اہلِ اقتدار کے کانوں پر جوں رینگ جائے۔ ادب کا سپاہی میں قاضی عبدالودود کے نام کو پڑھا، افسوس یہ نام ہماری نظر سے پہلے کبھی نہ گزرا۔ کئی مہینوں کے بعد شہر خیال میں قدم رکھا۔ ہم نے کوشش بہت کی مگر جب ہمیں شہر خیال میں جگہ نہ ملی تو ہمارا دل ٹوٹ گیا اور ہم نے شہر خیال میں لکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن رسالہ پڑھنا نہ چھوڑا۔ ہر دفعہ سوچتے اس دفعہ لکھیں گے مگر پھر دل گوارا نہ کرتا۔ اس دفعہ ہمت کر کے قلم سنبھال لیا کہ دیکھیں اس دفعہ بھی رسالے میں جگہ ملتی ہے یا نہیں۔ مسندِ صدارت پر عبدالخالق بھٹی کو دراز پایا۔ تبصرہ خوب تھا۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ رانا محمد شاہد بورے والا، سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر قرۃ العین، ناصر حسین بہاولپور، محمد اشفاق سرائے عالمگیر، قیصر عباس بھکر، بشرہ افضل بہاولپور، محمد عمران جونانی کراچی، ملک رحمت میانوالی، محمد عارف قریشی بھکر، آفتاب احمد نصیر اشرفی لاہور، منشی محمد عزیز لڈن وہاڑی، عزیز اللہ، انور عباس شاہ بھکر، فہیم خان

گنڈہ پور ڈیرہ اسماعیل خان، تہمی فردوس احمد گوجرانوالہ، ان سب کے تبصرے بھرپور اور جاندار تھے۔ آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ اچھی جارہی ہے۔ شہرِ گزشت امین بھایانی بھی اچھا ہے۔ تاریخ عکس مریم کے خان اچھا تھا۔ صائمہ اقبال کا ”وہ کون تھا“ سمجھ سے بالاتر تھا۔ علی سفیان آفاقی کا ”ترکی کی دانم“ بھی کچھ پھیکا پھیکا رہا ”سراب“ کاشف زبیر کی اچھی جارہی ہے۔ باقی زیرِ مطالعہ ہیں۔ لگتا تو نہیں کہ اس دفعہ رسالے میں جگہ ملے گی مگر امید پہ دنیا قائم ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نے کبھی بھول کر بھی ہمیں یاد نہیں کیا۔ سدرہ بانو ناگوری کا شکر گزار ہوں انہوں نے کم از کم یاد تو کیا۔“

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے لکھتے ہیں ”واہ بھئی واہ، کمال ہوگیا، ہمارا پیارا سرگزشت بروقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ شہرِ خیال کی محفل عروج پر ہے کئی نئے دوست محفل میں شامل ہورہے ہیں۔ دلچسپی بڑھنے کے ساتھ نئے انکشافات ہورہے ہیں۔ بشریٰ افضل نے عمرہ کی سعادت حاصل ہونے پر مبارک باد دی ہے۔ ”خطانمبر“ کا اعلان پڑھ کر اندازے لگارہے ہیں کہ اس بند پٹاری سے ہمارے ذوق کی تسکین کے لیے کیا کچھ نکلتا ہے، ابھی چند مہینے انتظار کرنا ہوگا۔ معذور مسیحا، غیر معمولی شخصیت ہیں، انہوں نے معذوری کو اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا اور خدمتِ خلق کو مشن بنالیا۔ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں بھی ہمت اور بیماری سے لڑنے کا جذبہ عطا کرے۔ فلمی الف لیلہ نے سارے گلے شکوے دور کردیے ہیں۔ مختلف کرداروں اور قصے کہانیوں نے معلومات میں اضافہ کیا۔ سچ بیانیوں میں ”دماغی توازن“ زیادہ دھوم دھڑکے والی کہانی نہیں ہے۔ جب کسی کام کا وقت ہوتا ہے تب لوگ اپنی ہٹ دھرمی سے معاملہ بگاڑ دیتے ہیں اور ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں جن سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی ہے۔ اپنے مزاج کی ضد اور انفرادی فیصلوں سے دوسرے کی اذیت کا سامان کرتے ہیں۔ جب ہاتھ سے پنچھی اڑ جاتا ہے تب افسوس سے سر پیٹنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا لیکن حالات میں تبدیلی نہیں آتی۔ ”فطرت“ کی رقیہ وفا اور ایثار میں بے مثال ہیں۔ وہ سب کچھ کھودینے کے باوجود بھی پُرعزم اور مطمئن ہیں لیکن میرا یقین ہے نذیر کو کبھی چین نصیب نہ ہوگا۔ ”محبت جرم ہے“ میں جلال اپنے وزن سے زیادہ اپنے دکھوں کا بار اٹھائے پھرتا ہے جب جذبوں کو دولت کے ترازو پر تولا جائے تو محبت جرم بن جاتی ہے۔ ”گاڑی والی“ اپنے لالچی مزاج سے مجبور تھی لیکن جب وہ اپنی خواہشوں کی قبر تلے دب گئی ہے تو عالیہ کو یہ قصہ بھلا کر اپنے اعلیٰ ظرف ہونے کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ یرغمال، میں گو منہاج مجرم ہے لیکن کسی کے گھریلو معاملات کی ٹوہ لینا بھی اخلاقی جرم ٹھہرا۔ اگر بھی کوئی کمزوری ہاتھ آئے تو فائدہ اٹھانے میں ممانعت نہیں رہتی اور بات بن جائے تو بلیک میلنگ کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ سب کچھ وقت، حالات اور دوسرے فریق کی مجبوری پر انحصار کرتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ تعلق پاکیزگی پر قائم رہا اور انجام بھی خوشگوار رہا۔ کامیاب، کا موضوع موجودہ حالات کے مطابق ہے ہم جھوٹے، مکار اور دغا باز کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، شریف اور ایماندار سے کنی کتراتے ہیں۔ زمانے کا چلن بدل گیا ہے اور یہ ہمارے اخلاقی دیوالیہ پن کا نتیجہ ہے۔ اپنی آگ، کے حلیم نے جو پودا لگایا اس کا سایہ نصیب ہوا نہ پھل کھاسکے الٹا پابندیوں اور روک ٹوک کا شکار ہیں۔ اگر ایسے واقعات پڑھ سن کر والدین نے قربانیوں سے ہاتھ کھینچ لیا تو اولاد کا مستقبل کیا ہوگا، یہی فکر انگیز بات ہے۔ آہٹ، پڑھ کر حیران بیٹھا ہوں۔ شیطانی طاقتیں اتنی زور آور ہوتی ہیں کہ انسانوں کو ادھیڑنا شروع کردیں اور بے بسی میں کوئی مداوا نہ کیا جاسکے۔ اس شیطانی کردار کو کچل دیا گیا لیکن ایک خاندان کس قدر ظلم اور تباہی کا شکار رہا۔“

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے ”سب سے پہلے انکل کے اداریے کو بغور پڑھا۔ چند دن پہلے ایک نیوز چینل پر ایک خبر دیکھی کہ راولپنڈی کے ایک اسکول میں طالبعلموں کے ہاتھوں میں جھاڑو دے کر ان سے اسکول کی صفائی کروائی جارہی تھی، اس خبر کو بار بار بریکنگ نیوز کے طور پر نشر کیا جاتا رہا۔ یقین جانیے قلم کے بجائے ہاتھوں میں جھاڑو تھامے ان بچوں کو دیکھ کر سر ندامت سے جھک گیا۔ پہلے بچوں کو ہوش سنبھالتے ہی اس حدیث سے روشناس کروایا جاتا تھا کہ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ لیکن اب تو قدم قدم پر پھیلے اسکولوں کے نام نہاد استادوں نے اس رول کو اپنالیا ہے کہ ”پیسا حاصل کرو چاہے کسی بھی حد تک جانا پڑے۔ شہرِ خیال کی محفل میں عبدالخالق بھٹی کا سندیسہ پہلے نمبر پر رہا، رانا محمد شاہد نے بھی عمدہ تبصرہ کیا۔ عزیز اللہ بھائی آپ کا یہ شکوہ کہ شہرِ خیال کے ساتھی گھما پھرا کر مہنگائی کا رونا رونے لگتے ہیں لیکن آپ پلیز اپنے اس خط کو دوبارہ ضرور پڑھیے کیونکہ آپ کا تبصرہ مہنگائی کے عفریت سے ہی شروع ہوا ہے۔ تہمی فردوس آپ کا نام بڑا خوبصورت ہے آپ کو ہماری طرف سے ویلکم۔ محفل میں شامل ہوتی رہیے گا۔ منشی عزیز بھائی اچھا لگا یہ جان کر کہ آپ سرگزشت کو اتنا مزے لے لے کر پڑھتے ہیں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ اتنا ہانپتے کانپتے شہرِ خیال کی محفل میں کیوں پہنچے؟ باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی پسند آئے۔ ابن کبیر، کی دغا باز بھی خوب رہی۔ ابھی ہم دغا باز کی دغا بازیوں کو پوری طرح جان بھی نہ پائے تھے کہ وہ دغا باز اپنی تمام تر دغا بازیوں سمیت پکڑا گیا اور اپنے انجام کو جا پہنچا۔ معذور مسیحا میں صبا شفیق نے انسانیت کے ایک نئے اور مہربان روپ سے روشناس کرایا۔ فلمی الف لیلہ میں ماضی کے معروف اداکاروں کی یادگار تصاویر اور آفاقی انکل کی یادداشتیں بے حد معلوماتی رہیں۔ سرگزشت کے صفحات پر اپنے پیارے شہر کی شہر گزشت، بہت مزیدار تھی۔ صدرالدین امین بھایانی کی زبانی پرانے کراچی کا تذکرہ اور ریل گاڑی کا یادگار سفر، ہائے کیا خوبصورت دور تھا۔ ہم تو عرصہ ہوا اس پریشانی میں مبتلا ہیں کہ شہر کراچی کو کس بدبخت کی نظر کھاگئی کہ روشنیوں سے جگمگاتے شہر نے نفرتوں۔ اور

تاریکی کا سیاہ لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ دشمنوں نے اپنوں کے بھیس میں امن کی فاختہ کے پر ہی کاٹ ڈالے کہ اب نہ وہ ریل گاڑی کا شاندار سفر رہا اور نہ ہی راتوں کو جاگنے والے شہر کراچی کی رونقیں رہیں۔ بیت بازی، میں سعید احمد چاند کا شعر بہت پسند آیا۔ پہلی سچ بیانی ذہنی توازن بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ بھلا جولڑکا اپنی ماں سے بات کرتے ہوئے گھبراتا ہو وہ دولڑکیوں سے محبت کا کھیل کیسے کھیل سکتا ہے۔ اگلی سچ بیانی کامیاب کے رائٹر نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ بے نام صاحب ہم خود بھی آپ کو پہچان نہیں پائے کیونکہ ہمارے ملک کے تمام ہی سیاستدان اس شعر کی عملی تصویر ہیں ”اوروں جیسا ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں، کچھ لوگوں کا جھوٹا پن ہے اور کچھ اپنی عیاری ہے“ آصف اقبال کی آہٹ، نے رونگٹے ہی کھڑے کردیے۔ خوف میں جکڑی اس تحریر کا انجام اچھا رہا اور انکل جی آخر میں یہ عرض کردیں کہ خطا نمبر کے خصوصی شمارے کے لیے کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔ (بہت جلد تاریخ کا اعلان کردیا جائے گا)“

☆ ڈاکٹر قرۃ العین اسلام آباد سے لکھتی ہیں ”مئی کا شمارہ 28 تاریخ کو ہی مل گیا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ Ghost Schools تو پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں خصوصاً دیہات میں، کے پی اور فاٹا میں اسکولوں کو بموں سے اڑانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آئندہ نسل کیسی ہوگی۔ اس صورتِ حال میں دہشت گردی مزید پھلے پھولے گی۔ پرائیویٹ اسکول وہ کاروبار ہے جس میں کوئی نقصان نہیں اور آمدن کروڑوں میں ہے۔ اسلام آباد کے کچھ اسکولوں میں ماہانہ فیس 20 ہزار تک ہے اور ایڈمشن فیس لاکھوں میں۔ اور آخر یہ ایڈمشن فیس ہے کیا چیز۔ یہ لے کر اسکول والے اس سے بچے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں قانون سازی ہونی چاہیے۔ تاکہ ان کے حدود کا تعین ہوسکے۔ شہرِ خیال پر نظر ڈالی تو ڈاکٹر روبینہ صاحبہ نظر نہیں آئیں۔ ہمیں ان کا خط پڑھنے کی عادت ہوگئی ہے اس لیے ان کی غیر حاضری محسوس ہوئی۔ سدرہ بانو اور بشریٰ صاحبہ باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ تہمی فردوس صاحبہ نے سرگزشت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ہو بہو میرے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ عقل نشین، میں ڈارون صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہت معلومات حاصل ہوئیں۔ سائنسدانوں کے حالاتِ زندگی پڑھنا مجھے بہت پسند ہے۔ لیکن اس سے مجھے ایک زبردست قسم کی احساس کمتری کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں کسی مسلمان کا نام نظر نہیں آتا۔ لگتا ہے مسلمانوں میں عقل کا ارتقا بند ہوگیا ہے کیونکہ ہم نے عقل کا استعمال چھوڑ رکھا ہے (فہرست مکمل کرنے کی کوشش کریں گی تو اور بھی زیادہ کوفت ہوگی۔ ویسے بہت جلد ہم خاص مضامین جس میں نئے مسلمان سائنسدانوں، نامور لوگوں کے حالات زندگی ہوں۔ دورِ حاضر میں بہت سے مسلمان نمایاں کام کررہے ہیں لیکن وہ یورپی ممالک میں رہ کر ہی اس منزل تک پہنچے ہیں۔ ابھی فہرست مکمل کررہا ہوں) وہ کون تھا، میں لگتا ہے کہ کاسپر کوئی ذہنی بیمار لڑکا تھا۔ خوامخواہ ہی سارا یورپ اس کے پیچھے پڑ گیا۔ بہرحال تحریر کے سسپنس نے آخر دم تک باندھے رکھا۔ سچ بیانیوں میں آہٹ، سب سے اچھی لگی۔ لگتا ہے ادارے، کو ہماری فریاد پر ترس آگیا ہے اور ہر ماہ انہوں نے ایک پراسرار کہانی شائع کرنا شروع کردی ہے۔ ویسے کسی زمانے میں مجھے مافوق الفطرت مخلوقات اور واقعات پر بالکل یقین نہیں آتا تھا۔ ہر چیز پر ہم سائنسی اصول لاگو کرتے تھے۔ مگر اب رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ جس چیز کو ہماری عقل تسلیم نہیں کرتی ہو ضروری نہیں کہ اس کا وجود ہی نہ ہو۔ کیونکہ Divine wisdom لامحدود ہے۔ اور انسان اور اس کی عقل محدود۔ لہٰذا محدود لامحدود کے ہر کام کو نہیں سمجھ سکتا۔ فطرت میں ہمیں رقیہ بیگم پر بہت غصہ آیا۔ آخر کیا ضرورت تھی شوہر کو گردہ دینے کی۔ جب کہ ان کا ایک گردہ بالکل صحیح تھا۔ آپریشن کے بعد ان کے پاس دو گردے ہوگئے اور آپ کے پاس ایک۔ اس کو ایثار نہیں کہتے، حماقت کہتے ہیں کیونکہ بچوں کی پرورش اور غمِ روزگار بھی ان کے ذمے تھا۔ اور آخر میں شوہر صاحب نے جو کیا میرا خیال ہے مکافاتِ عمل سے بچ نہیں سکیں گے۔ دماغی توازن بہت اچھی کہانی ہے۔ بیگم سجاد نے اپنے نفسیاتی عوارض سے پہلے اپنے بیٹے کی زندگی برباد کی۔ اس کو تعلیم سے محروم رکھا۔ پھر اپنے بیٹے کے قتل کی مرتکب ہوئیں۔“

☆ انور عباس شاہ کی آمد دریا خان بھکر سے ”سب سے پہلے شہرِ خیال میں نظر دوڑائی تو اپنا خط شامل پاکر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ تمام بھائی بہنوں کے خطوط دلچسپ تھے خاص طور پر رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر قرۃ العین اور قیصر عباس کے خطوط کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ بھکر کے طاہر قریشی کا بے حد شکریہ جنہوں نے یہ اطلاع دی کہ گلوکار مجیب عالم کے بارے میں معلومات سرگزشت میں چھپ چکی ہیں۔ واقعی یہ شمارہ میری نظروں سے نہیں گزرا۔ علاوہ ازیں اب ہمیں ان کی کتاب مشاہیر میانوالی بھکر کا شدت سے انتظار ہے۔ فلمی الف لیلہ، کے سلسلے میں ماضی کے چند فنکاروں کی تصویریں نظر آئیں جنہوں نے اس کو چار چاند لگادیے۔ اس قسم کی تصویریں شائع کرتے رہا کریں۔ اسی سلسلے میں صفحہ نمبر 127 پر آفاقی صاحب نے گلوکارہ مالا کے شوہر طاش بٹ بتایا ہے جبکہ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو اب سے چند برس قبل آفاقی صاحب نے گلوکارہ مالا کا شوہر عاشق بٹ بتایا تھا کیا ان کی دو شادی تھیں اپنی آگ بھی خاصی دردناک اور سبق آموز تحریر تھی لیکن اس کہانی کا انجام کچھ ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ آہٹ ایک بے مثال اور پُراسرار تحریر تھی ہمیں ایسی ہی تحریروں کی تلاش رہتی ہے۔ لیکن بات پھر بھی وہی آجاتی ہے کہ ایسی کہانیاں سو فیصد حقیقت پر مبنی ہونی چاہئیں جیسا کہ یہ کہانی تھی۔ محبت جرم ہے ایک عمدہ تحریر تھی۔ جلال واقعی ایک عظیم انسان ہے ان کی عظمت کو سلام۔ کامیاب ایک دلچسپ تحریر تھی۔ لیکن موصوف کو اپنے ایمانداری والے اصول سے ہٹنا نہیں چاہیے تھا کبھی تو خداوند کریم کو

ترس آجاتا۔ ویسے جھوٹ اور فریب کے لیے انہوں نے شعبہ صحیح منتخب کیا ہے۔ خداوند کریم ان کے حال پر رحم فرمائے۔ شوبز میں پڑھ کر بہت کچھ معلوم ہوا۔ خاص طور پر ضیا محی الدین کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ ایک بہترین کاوش تھی۔ مئی کے بارے میں معلومات پڑھنے کو ملیں جس سے ہم لطف اندوز ہوئے۔ یہ ایک اچھا سلسلہ ہے۔ سلسلے وار کہانی سراب حسب معمول اپنی ترقی کے زینے طے کرتی جارہی ہے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی سینما ہال میں کوئی دلچسپ اور سنسنی خیز فلم دیکھ رہے ہوں۔ آخر میں آپ سے سوال کہ قارئین کے خطوط آپ کے پاس زیادہ تر کس صورت میں پہنچتے ہیں (عام ڈاک سے)"

☆ رانا سجاد کا مظفر گڑھ سے شکوہ "ناصر حسین صاحب نے پوچھا کہ کہاں کھو گئے تو واقعہ یہ ہے کہ ہمارا تیسرا تبصرہ بھی محکمہ ڈاک کی کارکردگی کی نذر ہو گیا۔ بڑے ارمان کے ساتھ سرگزشت دیکھا تھا کہ لازماً ہوگا لیکن افسوس۔ یہ تبصرہ بھی امید اور ناامیدی میں لکھ رہے ہیں کہ شائع ہوجائے۔ عبدالخالق بھٹی، رانا محمد شاہد صاحب سے شروع میں ہی ملاقات ہوگئی تبصرہ پسند آیا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحب کیا حال ہے آپ کا اور آپ کے بلکہ ہمارے شہر قائد کے کچھ تبدیلی کے آثار نظر آئے یا نہیں؟ اعجاز حسین سنجار بہت مبارکباد۔ اللہ آپ کی حاضری کو شرفِ قبولیت بخشے، آمین۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ عمر شریف کے بارے میں تو کئی بار ذکر ہوا ہے اس لیے انکشاف تو مت کہیے۔ ناصر حسین کا مکتوب بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہوا۔ بشریٰ افضل سرگزشت کی دیرینہ قاری ہیں، آپ نے پہلا خط کس سال اور کس مہینے میں لکھا تھا؟ کچھ یاد ہے۔ باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ فہیم خان صاحب شوبی نہیں بلکہ لڑکیاں شوبی سے ٹکراتی ہیں، اب اس میں شوبی کا کیا قصور؟ فلمی الف لیلہ کے بارے میں جو بات میں سب سے پہلے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ رجنی کانت کے بارے میں آفاقی صاحب کو پتا نہیں ایسا کیا نظر آیا؟ اور جاہل عوام اس کے سحر میں کھوئی ہوئی ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک یہ بیہودہ فنکار اس قابل بھی نہیں کہ اسے تھرڈ کلاس فنکاروں میں گنا جائے۔ اور آفاقی صاحب نے جس فلم کی بات کی انیل کپور کے ساتھ نام تو مجھے بھی یاد نہیں آرہا لیکن اس فلم میں اتنی اوورایکٹنگ کی کہ خدا کی پناہ۔ مقبول تو سلطان راہی بھی تھے؟ ایک اور فلم بھی دیکھی تھی اس کی وہ بھی انتہائی بکواس تھی۔ باقی اس کے علاوہ فلمی الف لیلہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت رہی۔ سراب میں شوبی کی بیوقوفی پر ماتم کرنا چاہیے اور کچھ نہیں۔ عرصہ دراز کے بعد اتنے خوبصورت موضوعات کے ساتھ سرگزشت حاضر ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر خطا نمبر شائع کرنے کا اعلان کردیا۔ یہ تو ہمارے لیے واقعی حیران کن بات تھی۔ بہرحال شدت سے اس گھڑی کا انتظار رہے گا۔ برائے مہربانی زیادہ انتظار مت کروائیے گا۔ چارلس ڈارون کے بارے میں کچھ خاص مضمون نہیں تھا۔ بس درست تھا۔ افسوس ہورہا تھا کہ جب اقوامِ غیر کیا کیا تجربات کررہے تھے اور ہم؟ شہر گزشت میں کراچی کے اس دور کے خوبصورت پہلو دکھائے گئے۔ یقیناً یہ تحریر کراچی کے باسیوں کے لیے ایک نادر تحفہ ہوگا۔ وہ کون تھا؟ یہی کہیں گے کہ فضول تحریر تھی۔ ترکی نمی دانم، ایک دلچسپ تحریر ہے۔ شکر ہے ابھی سلسلہ جاری ہے۔ دغاباز پڑھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے دغابازی سے نیکلس کے والدین کو کتنا بڑا دکھ دیا۔ معذور مسیحا، رچرڈ نے آخر اپنی کمزوری پر غلبہ حاصل کرلیا اور معذوری میں بھی دوسروں میں مسیحائی بانٹنے لگا۔ اب آتے ہیں فلمی الف لیلہٰ کی طرف۔ بھارت کی موجودہ فلمی ہیروئنوں کے بارے میں ایس ایم یوسف کے بارے میں بتایا گیا "سہیلی" ان کی یادگار فلم تھی۔ مینا کماری کے بارے میں نئی معلومات دی گئی ہیں۔ مئی والی تحریر ابھی تک نہیں پڑھی۔ الوداع، ابھی نہیں پڑھی اس لیے تبصرہ کے لیے معذرت۔ سرگزشت کی جان تحریر "شوبز میں" شکیل صدیقی کی ایک بہت خوبصورت تحریر تھی۔ دماغی توازن میں ممتا نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی اولاد کا خاتمہ کردیا۔ اسے خوش نہ دیکھ سکی۔ فطرت میں نذیر جیسا گھٹیا انسان اپنی اوقات دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ تف ہے ایسے انسان پر جس نے اپنی وفادار بیوی کو چھوڑ کر اپنی مرضی کی۔ محبت جرم ہے کوئی خاص نہیں تھی۔ گاڑی والی ایک عجیب نفسیاتی عورت کی کتھا تھی۔ اس عورت کو ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ وہ خود ایک عورت ہے اور کیسی گھٹیا ذہنیت پر اتر آئی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے شوہر پر حیرت ہوئی جو چپ چاپ یہ سارا معاملہ دیکھتا رہا۔ اور کچھ نہیں کیا۔ ادھوری میں عورت کی دکھ بھری کہانی اور جاہلانہ معاشرے کی ایک لعنت اور خبیث اور گندے ذہنوں کی نقاب کشائی تھی۔ اس احسان فراموش کو یہ الفاظ کہنے سے پہلے غرق ہوجانا چاہیے تھا۔ آہٹ کافی خوفناک کہانی رہی۔"

☆ محمد عمران جونانی کی کراچی سے آمد "عبدالخالق بھٹی اپنے بےلاگ تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر فائز تھے۔ رانا محمد شاہد خوش نصیب ٹھہرے کہ ان کی ساتھیوں سے کی گئی علیک سلیک ہم تک پہنچی۔ سدرہ بانو اور قرۃ العین کے تبصرے بہت پسند آئے جبکہ اعجاز حسین نے سچ بیانیوں کو اچھی طرح پرکھا محمد اشفاق ضرورت سے زیادہ غصے میں ہیں۔ ناصر حسین کا خط دوسروں کی نسبت زیادہ تفصیلی ہے (تفصیلی لکھنے کی بجائے جامع لکھنا فن ہے۔ کم سطر میں اہم بات کرنا بہتر ہے) فہیم عباس آپ ہمیشہ یاد کرتے ہیں نوازش ہے۔ روبینہ نفیس اور طاہرہ گلزار غیر حاضر ہیں۔ ملک رحمت کا یہ پہلا خط ہے، ہمارے فیس بک کے ساتھی ہیں۔ یہ سفرنامے نہیں پڑھتے اس ضمن میں مشورہ ہے کہ کبھی قمر علی عباسی اور انشا جی کو پڑھ کر دیکھیں۔ آفتاب قریشی کا اشعار سے مزین خط دل چھو گیا۔ عزیز اللہ کے خط کی زبان کافی تیز ہے۔ انور عباس مجھے حیرت ہے کہ آپ کو شاعری سے دلچسپی نہیں۔ فہیم خان آپ کی آفاقی صاحب پر بے جا تنقید اچھی نہیں لگی۔ یوٹیوب گھٹیا یا بڑھیا نہیں، استعمال پر منحصر ہے۔ فہمی فردوس خوش آمدید آپ کا پر مسرت خط سب پر بازی لے گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمت نہیں ہارتے۔ مریم کے خان نے لمبے وقفے کے بعد شاندار تحقیقی مضمون کا تحفہ دیا۔ دس صفحات کے اس مضمون نے طویل کیمرا کہانی کا خوبی سے احاطہ کیا کہ کس طرح قدیم دیو مالائی داستانوں نے حقیقت کا روپ دھارا۔ وہ کون تھا، کے ساتھ صائمہ اقبال

نے بھی سکوت توڑا، مضمون غالباً ضرورت سے زیادہ لمبا تھا لیکن پُراسرار تحاریر کے شیدائیوں کے لیے اچھا تحفہ ہے۔ صدرالدین امین بھایانی کی پچھلی تحریر جناح وے دل کو نہیں لگی تھی لیکن اب کی بار صاحب نے کمال کردیا۔ باتوں ہی باتوں میں تیس چالیس سال پیچھے لے گئے اور سارا کراچی سامنے لا کھڑا کیا۔ آج جب بائیک پر روزانہ پچاس کلومیٹر کا سفر طے کرتا ہوں تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ کاش کراچی میں ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل ہوجائے۔ روشنیاں واپس آجائیں۔ ویسے بھایانی ہمارے اولڈ سٹی ایریا رنچھوڑ لائن وغیرہ میں آج بھی کچھ دکانیں ساری رات کھلی رہتی ہیں۔ یہ مضمون امی کو بھی بہت پسند آیا۔ انہوں نے مجھ سے بھی پہلے پڑھ لیا تھا۔ ڈارون تھیوری کو کوئی بھی صحیح العقل شخص تسلیم نہیں کرسکتا۔ شکیل صدیقی نے مخصوص انداز میں ضیا محی الدین کے فن کا حق ادا کیا۔ ضیاء محی الدین کی شخصیت پرت در پرت پیاز کی مانند ہے پرتیں کھلتی گئیں لیکن گری برآمد نہ ہوئی۔ کہہ نہیں سکتے ضیا محی الدین اصل میں ہیں کیا۔ ابن کبیر کی تحریر سب پر بازی نہ لے جائے یہ ہو نہیں سکتا۔ دغاباز، کے موضوع پر بننے والی فلم نہیں دیکھی لیکن اعلیٰ منظر نگاری سے بھرپور یہ داستان پڑھنے کے بعد طلب بھی نہیں رہی۔ صبا شفیق کی معذور مسیحا مختصر اور جامع تحریر ہے۔ بلاوجہ کی تفصیلات سے گریز اں صفحات کو نہایت پُراثر بنادیا۔ فلمی الف لیلہ میں مینا کماری کا تفصیلی تذکرہ پسند آیا۔ کچھ اداکار ایسے ہیں جن کی کثرت سے تکرار ہورہی ہے اس مرتبہ بھی کپور فیملی نرگس کے عشق اور کرینہ کے جلووں کا تذکرہ کیا گیا۔ (پرچے سے فارغ ہوجاؤں تو تمہاری کہانی پر فیصلہ ہوجائے گا)"

☆ رانا محمد شاہد کی سحر آفرینی بورے والا سے "گرمی خوب زوروں پر ہے اوپر سے طویل ہوتی لوڈشیڈنگ نے عوام کا جینا محال کر رکھا ہے اور بےحس حکمرانوں کی بےحسی ہے کہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ معراج رسول صاحب نے تعلیم کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کو بڑے اچھے پیرائے میں اجاگر کیا۔ حد تو یہ ہے کہ اب تعلیم، تعلیم نہیں رہی، کاروبار بن چکی ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو گلی گلی محلے محلے کھلی اکیڈمیوں سے بخوبی ہوجاتا ہوگا۔ کسی نے بڑی خوبصورت بات کہی تھی کہ ہم ایک ایسے معاشرے و ملک میں رہتے ہیں کہ "جہاں جس بندے کو زیر تعلیم ہونا چاہیے، وہ وزیر تعلیم ہوتا ہے۔" اس سے بڑا تعلیمی المیہ کیا ہوگا۔ ادبی دنیا کے سپاہی قاضی عبدالودود کی بیتی سرگزشت میں ان کی ادبی جدوجہد کا خوب احاطہ کیا گیا۔ سدرہ بانو ناگوری مبارکباد کا شکریہ۔ سعادت حسن منٹو اردو کے مضمون میں تین بار فیل ہوئے تھے۔ لیکن آج اردو کی تاریخ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اصل کامیابی ہمت، کوشش و جذبے میں ہے یعنی کامیابی کبھی نہ گرنے میں نہیں بلکہ گر کر سنبھلنے میں ہے۔ بشریٰ افضل دکھ یہ نہیں ہے کہ گٹر کے ڈھکن چوری کیوں ہوتے ہیں۔ دکھ تو یہ ہے کہ ایک کروڑ بنگلے والا بھی یہی چاہتا ہے کہ میرے بنگلے کے سامنے کا ڈھکن گورنمنٹ ہی لگوائے۔ خواہ اس انتظار میں کسی معصوم کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ محمد عمران جونانی! یہ سچ ہے کہ ایک پیدائشی مسلمان اور اسلام کو سمجھ کر قبول کرنے والے میں بہت فرق ہے۔ ایک واقعہ کہیں پڑھا تھا۔ وہ آپ سے شیئر کرلیتے ہیں۔" کچھ عرصہ پہلے ایک غیر مسلم ملک کی سیر کو گئے۔ سخت سردی کے دن تھے۔ درجہ حرارت منفی صفر سے کہیں کم تھا۔ شہر میں مسجدیں کم کم تھیں اور ان کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ جس جگہ ہم رہائش پذیر تھے، اس کے ساتھ ہی ایک مسجد تھی۔ ایک سخت سرد صبح فجر کی نماز کے لیے مسجد گیا تو دیکھا کہ انگریز مسلمان تیز تیز قدم اٹھاتا مسجد کی طرف آرہا ہے۔ آیا تو شاید گاڑی میں تھا۔ مگر اب وقت کی کمی کے باعث جلدی میں تھا۔ نماز ہوچکی تو تعارف ہوا۔ باتوں میں پتا چلا کہ اس شخص کا گھر یہاں سے 30 میل دور ہے اور وہ روزانہ وہیں سے نماز پڑھنے آتا ہے۔ میں نے حیرانی سے کہا کہ "آپ اتنی سخت سردی میں اتنی دور سے آتے ہیں۔ گھر پر ہی نماز ادا کیا کریں۔" اس نو مسلم انگریز نے تعجب سے میری طرف دیکھا چند لمحے توقف کیا اور پھر بولا۔ "My dear! You are muslim by birth but I am Muslim by Choice" اور میرے پاس سوائے شرمندگی کے کچھ نہ تھا۔ ملک رحمت نے لکھا کہ مجھے پتا ہے کہ محی الدین نواب کی سرگزشت شائع ہوچکی ہے، کیا واقعی؟ اور آپ سرگزشت کا شمارہ بتاسکتے ہیں کون سا تھا؟ (جنوری 1991ء کا شمارہ) آج کل آپ بیتیاں پڑھنے کا چسکا پڑھا ہے۔ فہمی فردوس احمد! محکمہ ڈاک کی کارکردگی کی کیا بات کریں۔ جب محکمہ والے خط کو ادارے تک پہنچانے میں دنوں نہیں بلکہ مہینوں اور سالوں لگادیں تو پھر ایسے سرپرائز تو ملیں گے۔ امین بھایانی کا پرانے کراچی کے بارے میں ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون تھا۔ پرانے کراچی کی ایک دو چیزوں کو تو لوگ بہت یاد کرتے ہوں گے۔ جی ہاں امن، بھائی چارہ، وضع داری، جدید دنیا ہمیں بہت کچھ دیتی ہے تو ہماری قیمتی ترین متاع ہم سے چھین بھی لیتی ہے۔ بقول اقبال، احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات۔"

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی خیال آفرینی لاہور سے "ماہ مئی کی بلبلا دینے والی گرمی میں سرورق کی دوشیزہ کا دماغی توازن تو خراب ہونا ہی تھا۔ متوازن تو ہمارا دماغ بھی نہیں رہا۔ معراج رسول صاحب کا سندیسہ کہ سرکاری اسکولوں کی زبوں حالی کس سطح پر پہنچ چکی ہے۔ ذمے داروں کی غیر ذمے داری، دراصل ہماری اپنی غیر ذمہ داری ہے کہ ان لوگوں کو ووٹ دے کر اپنی تقدیر کا مالک بنادیتے ہیں جو صرف ہمارے لیے بدتر ہی کرسکتے ہیں اور ہماری غیرت بھی بس اتنی ہی رہ گئی ہے کہ ہم اپنا انفرادی فائدہ کس طرح حاصل کرسکتے ہیں۔ ادب کے سپاہی کو مودبانہ سلام پیش کرکے شہر خیال میں داخل ہوئے۔ عبدالخالق بھٹی کو مسندِ صدارت پر دیکھ کر بالکل اس طرح خوشی ہوئی جس طرح

پنجاب میں لاہور کے علاوہ ان کے اور بشریٰ افضل صاحبہ کے شہر بہاولپور میں خادم اعلیٰ صاحب کو ترقیاتی کاموں کا جال بچھاتے دیکھ کر ہو رہی ہے۔ محفل میں روبینہ نفیس انصاری کو نہ پا کر ان کی خیریت کی طرف سے فکر لاحق ہوگئی ہے، خدا کرے وہ بخیریت ہوں۔ عقل نشیں نے اپنی عقل کے بل بوتے پر اپنے جیسے بے عقلوں پر انسان کو بندر کی اولاد ثابت کردیا ہے۔ جدید سائنس جب بھی ہمارے آفاقی مذہب اسلام سے ہم آہنگ ہوئی وہاں اس نے اس قسم کی خرافات کو کالعدم قرار دے دیا ہے۔ وضو کو ہمارے اعصابی نظام کے لیے ضروری' نماز کو دنیا کی بہترین ورزش ' روزہ کو ہمارے اندرونی نظام کے لیے مفید' زکوٰۃ کو انسانیت کے اجتماعی فائدے کی عملی کوشش اور حج کو نظم وضبط کی اعلیٰ اقدار کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ عقل نشیں ڈارون جیسے لوگوں کے لادینی نظریات چونکہ فطرت سے ٹکراتے ہیں اس لیے چند سالوں بعد یا چند صدیوں بعد پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ نصف صدی قبل چاند پر امریکی جھنڈا گاڑنے کی کوشش اب تک دوبارہ کیوں کامیاب نہیں ہوئی جبکہ اس وقت جدیدیت کے پر اور بھی زیادہ مضبوط ہیں۔ سائنس فطرت کھوجنے میں مصروف ہے اور بغیر مذہبی ہم آہنگی کے فطرت کا کوئی راز آشکار نہیں کرسکتی۔ تاریخ تمکس انتہائی معلوماتی، وہ کون تھا انتہائی تشنہ، شہر گزشت متاثر کن، حوصلہ بڑھاتی ہوئی معذور مسیحا نے دل کو چھو لیا جبکہ دغا باز مناسب تھی۔ الوداع جہاز بینی کا تسلسل تھی اور شاندار بھی۔ ماہ مئی نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں گے لیکن سرگزشت نے شوبز مین کی شکل میں جست لگا کر بہت سی حدیں پار کرلیں۔ ضیا محی الدین جیسی شخصیت کا قرض جس طرح احسان مندی کے ساتھ سرگزشت نے اتارا ہے اس نے ہمیں احسان مندی نہیں اس کا مقروض بھی کردیا ہے۔ ایک شاندار شخصیت کو شاندار خراجِ تحسین شاندار کارنامہ ہے۔ آفاقی صاحب ترکی یاترا سے نکلیں تو ہم ان کو بتائیں کہ ان کی فلمی الف لیلہٰ خیر سے اپنے انیس برس مکمل کرنے والی ہے اور عمر کی وجہ سے اپنے جوبن پر بھی ہے ہر چند کہ مجازیت کا رنگ غالب آتا جا رہا ہے کیونکہ وہ اپنے ذاتی مشاہدے کے محور سے نکل کر ہندوستان کی فضاؤں کی سیر کروا رہے ہیں اور خوب کروا رہے ہیں۔ آخر میں سراب کے پیچھے بھاگے تو معلوم ہوا کہ سراب تو سراب ہوتا ہے ہمیشہ کی طرح پُرفریب اور دلکش، سچ بیانیوں میں کوئی بری نہیں تھی پارچے بھی انتہائی معیاری تھے۔"

☆ عبدالغفور خان ساغری خٹک نے اٹک سے لکھا ہے "3 ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضرِ محفل ہوں۔ امید ہے کہ اس دفعہ خط شائع ہوگا۔ ٹائٹل گرل خوبصورت تھی۔ کہانیوں میں اپنی پسندیدہ کہانی سراب کاشف زبیر کی پڑھی، آپ شہباز کو ہر دفعہ آخر میں دشمنوں کے ہاتھوں دے آتے ہیں۔ کچھ تو سویرا کا خیال کریں۔ شہباز کا دستِ راست بیتو بھی کبھی وسیم وغیرہ سے ٹوک جھونک کرتا ہے اچھا لگتا ہے۔ ویسے بیتو اگلے ماہ کچھ کرکے دکھائے گا۔ شہباز جی اس دفعہ رامن اور نائیک کا کام تمام کردیں اس کے بعد دماغی توازن کہانی اچھی نہیں لگی۔ فطرت کہانی اچھی تھی خاص کر رقیہ بیگم کا کردار اچھا تھا لیکن نذیر نے اپنا کمینہ پن نہیں چھوڑا۔ رقم لے کر چلا گیا۔ یرغمال اچھی کاوش تھی دل کو چھو لینے والی۔ کہانی اپنی آگ بھی اچھی لگی باقی سب بھی ٹھیک تھیں۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ شہر خیال میں عبدالخالق بھٹی صدارت فرما رہے تھے۔ مبارک قبول۔ بھائی اعجاز حسین عمرہ مبارک ہو۔ فلمی الف لیلہ میں رجنی کانت کا پڑھا اچھا تھا لیکن یہ مختصر اتھا کچھ اور شائع کریں۔"

☆ احمد خان توحید کراچی سے رقمطراز ہیں" برادر معراج رسول صاحب آپ کا تعلیمی تجارت پر رونا۔ سابق ماڈرن وزیرِ خارجہ کا ساری دنیا سے ہاتھ ملانا اور اپنے حلقہ غریب عوام سے پردہ۔ اسکول بھینسوں کے باڑے' کہیں گندم کے گودام بنا رکھے ہیں۔ میرے گاؤں کا 8 کمروں پر مشتمل پرائمری اسکول 10 سال سے لوگوں نے قبضہ کرکے باڑے بنا رکھے ہیں۔ جبکہ پاکستان کے ہی 9 سال کے بچے نے اولیول یونیورسٹی میں ٹاپ کرکے 800 سالہ ریکارڈ توڑ دیا۔ ہم کیا کام نہیں کرسکتے؟ علم جتنا خرچ کرو گے اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ یہ چوری سے بھی محفوظ ہے۔ ادب کا سپاہی، جس انسان سے سر سید احمد خان، حسرت موہانی، محمد علی جوہر کی تحریر پڑھی ہو وہ کبھی تعارف کا محتاج نہیں ہوتا، قاضی عبدالودود ہو یا دوسرا۔ شہر خیال میں عبدالخالق بھٹی کو کرسی صدارت مبارک۔ خود کو مسلسل چار ماہ سے غائب پایا۔ گھر کی محفل گھر کی بات اللہ صبر والوں کے ساتھ ہیں۔ رانا شاہد بورے والا، اسلامی ایثار کی جگہ رمضان شریف ودیگر تہوار پر لوٹ مار معمول بن چکی ہے۔ شامت غریب عوام کی آئی ہے۔ مسز سدرہ ناگوری' کالا باغ ڈیم بنا کر سرزمین پاک میں زراعت کا سیلاب لایا جاسکتا ہے مگر کرتا دھرتا لوٹ مار وبد بختی چھوڑ دیں تب۔ اعجاز سٹھار نور پور تھل، روضۂ رسول کی زیارت بڑے نصیب کی بات ہے ۔ میرے خطوط چار ماہ سے شاملِ اشاعت نہ ہوئے (اندازِ تحریر قابلِ فہم بنائیں۔ یہ مشورہ مسلسل دیا جا رہا ہے) فہمی فردوس گجرانوالہ، واقعی سرگزشت ملنے کے بعد لازم ڈیوٹی سے بھی ہم جلد نجات چاہتے ہیں۔ گنڈاپور سے فہم صاحب، واقعی سراب سے اچھی فلم بن سکتی ہے، آفاقی صاحب سے رابطہ کریں۔ انور عباس بھکر، ناصر حسین، ڈاکٹر قرۃ العین اچھے تبصرے ہیں۔"

☆ شبانہ حنیف کراچی سے لکھتی ہیں "سرگزشت کی پرانی پرستار ہوں ماہنامے کی تعریف وتوصیف سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے کیونکہ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ اپریل کے شمارے میں منشی محمد عزیز کی اپیل پڑھی۔ پھر مئی کے شمارے میں شہر خیال کا مطالعہ کرنے کے بعد پتا چلا کہ کسی نے بھی کوئی جواب نہ دیا تو میں نے سوچا کہ میں عزیز صاحب کو بتادوں کہ میرے پاس 2001 سے مئی 2014 تک کے تمام شمارے موجود ہیں۔ یعنی کہ 2001 سے 2011 تک کے شمارے اگر انہیں خریدنا ہیں تو وہ اپنا رابطہ نمبر دے دیں۔ لیکن انہوں نے لکھا ہے کہ وہ 300 کلومیٹر کا سفر بخوشی طے کرلیں گے جبکہ کراچی تو اس سے کہیں زیادہ فاصلے پر ہے؟ اب وہ کیا

کریں گے؟ مئی کا شمارہ دو دن سے زیرِ مطالعہ ہے۔ سراب اور سچ بیانیاں پڑھ چکی ہوں۔ سچ بیانیاں قابلِ غور ہیں۔ اور سراب تو پڑھنے کے بعد اگلی قسط کے انتظار پر مجبور کردیتی ہے۔ میں آپ کے ادارے کے پانچوں شماروں کی قاری رہی ہوں۔ (اچھا، پانچواں دلکش تو کچھ عرصہ اپنی دلکشی دکھا کر غائب ہوگیا لیکن دعا ہے کہ باقی چاروں پرچے پوری آب وتاب سے ہمیشہ جاری رہیں آمین، خطا نمبر کا اعلان دیکھ کر ابھی سے انتظار شروع کردیا ہے۔ فلمی الف لیلہٰ اور سفرنامے تو صرف سرگزشت کا ہی کمال ہے اور باقی تمام مضامین اپنے موضوعات کے اعتبار سے صرف اور صرف سرگزشت میں مل سکتے ہیں۔"

☆ اسلم عالم کا ای میل "میں ممبئی میں مقیم ہوں گزشتہ دو تین سالوں سے سرگزشت کا قاری ہوں، رسالہ اس لیے بھی پسند ہے کہ اس میں نامور شخصیات پر جو مضامین شائع ہوتے ہیں وہ معلوماتی ہونے کے علاوہ بڑے دلچسپ اسلوب میں لکھے جاتے ہیں۔ پہلے یہ رسالہ میرا بیٹا ہانگ کانگ سے کسی نہ کسی کے بدست بھیج دیتا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی کوئی شمارہ نہیں ملتا تھا، اب ممبئی کے ایک ڈیلر نازبک ڈپو سے سالانہ معاملہ طے ہوجانے سے شمارے مل رہے ہیں۔ اپریل کے شمارے میں کچھ ایسی باتوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں صحیح نہیں۔ صفحہ 189 پر خواجہ نظامی کے خلیفہ کا نام حسن سنجری لکھا گیا ہے یہ سنجری نہیں بلکہ سجری۔ (سنجری صحیح ہے۔ دیکھیں اسلامی انسائیکلوپیڈیا مرتب: سید قاسم محمود) دیکھیے فوائد الفواد مطبوعہ اردو اکادمی دہلی۔ صفحہ نمبر 238 پر مولانا سلیمان پھلواری اور مولوی خدا بخش کے بارے میں 130 ہجری کا سن دیا گیا ہے جو شاید غلطی سے چھپ گیا ہے۔ (سن 1130 صحیح ہے)"

☆ منشی محمد عزیز میئے کا فرمان لڈن وہاڑی سے "اب چلیے تازہ شمارے کی جانب۔ پہلے تو یہ بتادیجیے کہ کیا ماہنامہ سرگزشت میں محمد عبداللہ عرف دُلہ بھٹی کی سرگزشت شائع ہوچکی ہے۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو سال اور ماہ بتایئے اور اگر جواب نفی میں ہے تو جلد از جلد ہمارے جدِ امجد کی سرگزشت شائع کی جائے۔ (دُلہ بھٹی کی سرگزشت ضمناً آئی ہے) ہم لوگ بھی اصل میں بھٹی ذات کے ہیں اور بڑے بزرگ بتاتے ہیں کہ جب اکبر بادشاہ کی فوجیں چن چن کر بھٹی ذات کے افراد کو ختم کررہی تھیں تو بہت سے بھٹی ذات بدل گئے، ایک مزے کی بات بتاؤں ہمارے بزرگوں کی بہادری کی کہ جب اکبر بادشاہ کی فوج کے سپاہی ہمارے جدِ امجد کے پاس آئے اور پوچھا تمہاری ذات کیا ہے؟" وہ گھبرا گئے اور انہیں کوئی جواب نہ سوجھا۔ پاس ایک بکری بندھی ہوئی کھڑی تھی وہ بولی میں میں۔ ہمارے جدِ امجد نے جھٹ سے جواب دیا "میں۔ یعنی میں" آج کل مئے، ہے اور ہماری بستی چاہ میاں والہ (مئے آں والہ) کے نام سے مشہور ہے۔ اور اب تازے شمارے پر تبصرہ 27 اپریل کو پرویز بلگرامی صاحب کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ رسالہ پوسٹ کردیا گیا ہے۔ 28 کو وہاڑی بکسٹال والے کو فون کیا تو اس کا جواب اثبات میں تھا۔ پوسٹ آفس سے پتا کیا تو رجسٹری نہیں آئی تھی۔ سو آن دی ڈیوٹی ہونے کے باوجود خاموشی سے بس پر سوار ہوا اور وہاڑی سے سرگزشت خرید لایا۔ سرورق والی محترمہ کا اداس چہرہ بھی دل کو بھا گیا۔ فہرست کا صفحہ اس مرتبہ آگے پیچھے تھا۔ اداریے کا کیا کہنا۔ ہمارے یہاں لڈن میں تین اسکولوں میں مویشیوں کے باڑے ہیں۔ میں خود اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ ادب کا سپاہی میں قاضی عبدالودود کا نام پہلی مرتبہ پڑھا۔ شہر خیال کی صدارت اس مرتبہ عبدالخالق بھٹی کے نام تھی۔ مبارکباد! جن دوستوں نے مبارکباد دی ان کا بیحد شکریہ خصوصاً سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر قرۃ العین، ناصر حسین، قیصر عباس، ملک رحمت۔ دوستو اپریل 2014 کا ماہ میرے لیے واقعی لکی تھا کیونکہ سرگزشت میں پہلی مرتبہ میری تحریر شائع ہوئی اس کے ساتھ ساتھ ایک اور ماہنامے میں بھی میری کہانی آئی۔ بہت شکریہ سدرہ بانو بہنا، انکل محترم کے ساتھ ساتھ بھی رائٹرز کا تعارف سرگزشت کے سلور جوبلی نمبر میں شائع ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر قرۃ العین جی الحمدللہ اس وقت میرے پاس سرگزشت کے ایک سو بیس شمارے موجود ہیں۔ فہمی فردوس احمد! بڑی خوش نصیب ہیں کہ چھ ماہ بعد ہی آپ کا خط شائع ہوگیا۔ رانا شاہد، سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر قرۃ العین اور ناصر حسین کے خطوط بھرپور تھے۔ عقل نشیں متنازعہ سائنسدان چارلس ڈارون کا احوالِ زیست بہت زبردست تھی۔ لیکن اس سے زیادہ مزہ مریم کے خان نے تاریخ عکس میں دیا۔ شہر گزشت میں امین بھایانی صاحب نے کراچی کے خوبصورت ماضی کی بہت زبردست عکاسی کی ہے۔ وہ کون تھا۔ ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین کہانی تھی۔ کاسپر کا معما ابھی تک لاینحل ہے۔ معذور مسیحا ایک باہمت ڈاکٹر کی داستان تھی جس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب گزرے ہوئے سہانے وقت کو یاد کرتے نظر آئے۔ مزید کپور خاندان، اقبال یوسف، رجنی کانت، کمال امروہی اور ادا کار رحمٰن کا تذکرہ تھا۔ اس قسط میں مئی، منظر امام صاحب نے بہت ہی معلوماتی اور زبردست قسم کا سلسلہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ یقیناً بہت ہی مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ شوبز مین میں ضیا محی الدین کے بارے میں پہلی مرتبہ کچھ تھا۔ حیرت ہوئی۔ اتنا بڑا فنکار بیت بازی میں توشین عارف، سعید احمد چاند گل فراز اور عنایت مسیح کا انتخاب پسند آیا۔ دماغی توازن ممتا سے مجبور ایک دکھی ماں کی داستاں جو کہ غلط فیصلے کے باعث اپنا اکلوتا بیٹا بھی گنوا بیٹھی۔ محبت جرم ہے، ایک عاشق مجبور کی داستانِ حیات تھی جسے پڑھ کر دل بہت اداس ہوگیا۔ گاڑی والی عجیب وغریب مزاج کی حامل عورت کی داستان تھی۔ ادھوری، ایک غلط رسم سے متعلق تھی جو کہ سندھ میں زیادہ تر ہے۔ یرغمال میں منہاج کی بے غیرتی بہت افسوسناک تھی۔"

دیر سے موصول ہونے والے خطوط:

بشریٰ افضل بہاولپور ۔ ملک رحمت، میانوالی۔ قیصر عباس خان، بھکر۔ فہیم خان گنڈہ پور، ڈیرہ اسماعیل خان۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ شگفتہ مشتاق، لاہور۔ محمد سلیم قیصر، سینٹرل جیل ملتان احسان سحر، میانوالی۔

ایک بڑے ادیب و نقاد کے شب و روز کا احوال

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ دنیائے ادب کا درخشندہ ستارہ کہلایا۔ اپنی ذمّے داری کو بھرپور انداز میں انجام دینے کی خاطر شب و روز عوامی جذبے کی ترجمانی میں مصروف رہا کیونکہ اسے ادراک تھا کہ جو قلم کار سچے جذبے کی ترجمانی نہ کرسکے اس کے الفاظ کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں، تحریر موثر نہیں ہوگی۔ اس نے قلم کا حق ہر طرح سے ادا کیا وہ مسلسل لکھتا رہا اپنی تحریر کو عمرِ جاوداں عطا کرتا رہا۔

دھوپ نے قدم نکالا اور پھر پاؤں پاؤں چلتی ہوئی دُہرے دالان سے اتری اور کشادہ صحن میں آگئی۔ کھیلنے کو جگہ ملی تو بڑی دیر تک شوخیاں دکھاتی رہی۔ کھیلتے کھیلتے صحن کے وسط میں پہنچ گئی۔ پھر جیسے قدم بڑھانا بھول گئی۔ حکیم مرزا فضل حسین خاں اس شان سے داخل ہوئے کہ شیروانی کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ململ کا کرتہ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے جو گوری رنگت پر موتیوں کا سماں پیش کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیا دوسرے ہاتھ میں کوئی رجسٹر تھا باقی سامان ملازم نے اٹھایا ہوا تھا۔ غالباً یہ روز کا معمول تھا۔ ملازم کو معلوم تھا کہ اسے کس راہ جانا ہے۔ مرزا صاحب نے دائیں جانب کی سیڑھیوں پر قدم رکھا تو ملازم خود بخود بائیں جانب مڑ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرزا صاحب کا رخ زنان خانے کی جانب تھا اور ملازم اس کمرے کی جانب جا رہا تھا جو زنان خانے سے ملحق تھا۔ اسے مردانہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ کمرا صرف مرزا صاحب کے لیے مخصوص تھا۔ وہ زنان خانے میں زیادہ وقت نہیں گزارتے تھے۔ سکون کے لیے اس کمرے میں آجاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا کام یہیں سرانجام دیتے تھے۔ ملنے والے آجاتے تو پھر مکان کا مردانہ آباد ہوجاتا تھا۔

انہوں نے دروازے میں قدم رکھا تھا کہ حویلی میں بھونچال سا آگیا تھا۔ ہر زبان پر ایک ہی جملہ تھا ”بڑے سرکار تشریف لے آئے ہیں، یہ صدا بیوی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ مرزا صاحب اولاً انہی کے کمرے میں حاضری دیں گے۔ جی چاہے گا یہیں استراحت فرمائیں گے ورنہ کچھ دیر باتیں کرکے اٹھ جائیں گے یا کسی بھاوج کے کمرے میں جھانک لیں گے۔ ویسے امکان کم ہی تھا کیونکہ وہ آج ناوقت آگئے تھے۔

مرزا صاحب نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر ہلکے سے کھنکھارا تاکہ اندر اطلاع ہوجائے۔ بیگم نے کمرے میں موجود دو ملازماؤں کی طرف مخصوص انداز میں دیکھا۔ وہ دونوں دوپٹے سنبھال کر کھڑی ہوگئیں۔ اِدھر مرزا صاحب نے چلمن کا کونا اٹھایا اُدھر وہ دونوں تسلیمات بجالاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

”واہ بیگم واہ! خوب پٹی پڑھائی ہے ان دونوں کو۔ مجال ہے جو دو گھڑی ہمارے پاس بیٹھ جائیں۔“

”اے کوئی پردہ تھوڑی کرتی ہیں۔ وہ تو آپ کے

چہرے پر خدا نہ رکھے وحشت ایسی ہے کہ بے چاریوں کا دم گھٹنے لگتا ہوگا۔"

"اس اعتبار سے تو آپ کے لیے "ڈھیٹ" کا لفظ نہایت موزوں ہوا۔ جس دن سے آئی ہیں اسی طرح جمی بیٹھی ہیں۔ قسم لے لو جو ذرا سرک بھی جائیں کہ ہم بیٹھ جائیں۔"

"اے ہے، ان چوچلوں کے لیے کیا کسی نے منع کیا ہے۔ یہیں بیٹھنا ہے تو یہ رہی گاڑی بھر جگہ۔"

"بیگم ہم نے تو یونہی مذاق کیا تھا۔ آپ کی حالت ایسی نہیں کہ زیادہ دیر بیٹھیں۔ آپ لیٹ جائیں ہم دوسرے پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"لیٹے لیٹے بھی تو آدمی تھک جاتا ہے۔ ذری دیر کے لیے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔"

"ہم تو کہتے ہیں ہمارے ساتھ مل کر کنکوے اُڑایا کرو مگر آپ کب کسی کی مانتی ہیں۔"

"چھوڑیے بھی۔ آپ تو ہر بات مذاق پر ٹال دیتے ہیں۔"

"چلیے نہیں کرتے مذاق۔ سنجیدگی سے بتایئے اب طبیعت کیسی ہے۔"

"آج صبح بسم اللہ دائی آئی تھی۔ دیکھ کر گئی ہے۔ کہہ رہی تھی بیس دن زیادہ سے زیادہ پچیس دن۔"

"کچھ ایسا اشارہ کیا جس سے معلوم ہو کہ لڑکا ہوگا۔"

"میں نے پوچھا تھا" انہوں نے پاندان اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ "کہنے لگی یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہوگا۔ ویسے آپ کمزور ہوتی جا رہی ہیں اس سے لگتا ہے لڑکا ہوگا۔"

"ہم نے جو سفوف آپ کو دیا تھا کہ گھول کر پی لیجیے گا، وہ پیا؟"

"رات ہی کو پی لیا تھا۔"

"اسے پینے کے بعد قے تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں تو۔"

"اس کا مطلب ہے دائی کا اندازہ درست ہے۔ اس مرتبہ آپ کے لڑکا ہوگا۔ اگر لڑکی ہونے والی ہوتی تو آپ کو فوراً قے ہوگئی ہوتی۔ ویسے ہمیں اللہ معاف کرے جو اللہ دے گا وہ سر آنکھوں پر۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ "ویسے بیگم اگر آپ نے ہماری مراد پوری کردی تو دنیا ایسی دھوم دھام کا جشن دیکھے گی کہ چشمِ فلک نے نہ دیکھا ہوگا۔"

"دو گھڑی تو بیٹھیے۔ ایسی بھی کیا جلدی۔"

"حضور بخش سے کہتا ہوا آیا تھا کہ حقہ تازہ کرے۔ بس ایک گلوری اپنے ہاتھوں سے بنا دیں۔ پھر ہم چلتے ہیں۔"

مرزا صاحب نے گلوری منہ میں دبائی اور کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

حکیم مرزا فضل حسین خاں کا خاندان ایرانی تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ حکیم مرزا محمد شفیع اصفہان سے آئے تھے اور اکبر آباد میں قیام کیا تھا۔ لکھنو اس وقت تک آباد بھی نہیں ہوا تھا۔ فیض آباد اپنی بہاریں دکھا رہا تھا۔ نواب شجاع الدولہ کروفر سے حکومت کر رہے تھے۔ دلی اپنے دورِ ابتلا سے گزر رہا تھا۔ اقتدار کی کھینچا تانی میں اہلِ علم کا نقصان ہو رہا تھا۔ کتنے ہی خاندان ایسے تھے جو دہلی کے کوچے چھوڑ کر فیض آباد کو آباد کر رہے تھے۔ مرزا محمد شفیع نے دہلی کو مسکن نہیں بنایا تھا۔ وہ اکبر آباد میں اپنی حکمت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ہندوستان کی کشش انہیں ایران سے کھینچ لائی تھی اور اب وہ کسی قدر دان کی تلاش میں تھے۔

ان کی حکمت و شرافت کے چرچے اکبر آباد میں گونجے تو یہ معلوم ہوا جیسے دریا کی خبر سمندر کو مل گئی ہو۔ شرفائے فیض آباد میں سے ایک شخص جس کی رسائی شجاع الدولہ تک تھی ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوا جس کا علاج کہیں نہیں تھا۔ دہلی کے حاذق حکما کی جانب سے بھی اسے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ کسی نے اسے مشورہ دیا کہ اکبر آباد (آگرہ) جائے اور حکیم مرزا محمد شفیع سے اپنا علاج کرائے۔ اگر انہوں نے توجہ کی اور علاج پر رضا مند ہوگئے تو یقیناً شفا ہوگی۔ وہ اپنے مرض سے ایسا تنگ تھا کہ اکبر آباد کیا دنیا کے کسی بھی گوشے میں جانے کو تیار تھا۔ اسے یقین تھا کہ علاج طویل ہوگا۔ اس نے خوب اچھی طرح زادِ سفر تیار کیا کہ نہ جانے کب تک آگرہ میں رہنا پڑے اور روانہ ہوگیا۔ آگرہ پہنچ کر حکیم شفیع کا پتا دریافت کرنا کون سا دشوار تھا۔ اس نے ایک سرائے میں سامان رکھا اور ان کے مطب پہنچ گیا۔ مطب کے سامنے ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اس نے بہت چاہا کہ نواب شجاع الدولہ سے اپنا تعلق ظاہر کرکے مطب میں داخل ہوجائے لیکن مطب کے دربان نے اس کی ایک نہ سنی۔

"یہاں غریب امیر سب برابر ہیں۔ تم بھی ان

لوگوں میں شامل ہوجاؤ۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ جب تمہاری باری آئے گی میں تمہیں بھیج دوں گا۔"

اس شخص نے چاہا کہ دربان کو کچھ رقم دے کر شیشے میں اتار لے لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ اگر یہ شخص بھڑک گیا اور شکایت حکیم صاحب تک پہنچ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وہ بھی اس بھیڑ میں، ایک طرف کھڑا ہوگیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہونے لگا تھا کہ جو مریض اندر جاتا ہے جلد ہی واپس آجاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حکیم صاحب مریضوں کو جلدی جلدی دیکھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی باری آگئی۔ وہ اندر گیا تو ایک ایرانی... خدوخال کے بزرگ کو بیٹھے دیکھا۔ کتابی چہرے پر داڑھی بہار دکھا رہی تھی۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں آدمی کو اکساتی تھیں کہ وہ ان سے بے تکلف ہوجائے۔ اس شخص نے یہ سوچ کر کہ علاج اچھا ہوجائے گا نواب شجاع الدولہ سے اپنا تعلق جتانا چاہا۔ ابھی اس نے تمہید باندھی تھی کہ حکیم صاحب نے اسے ٹوک دیا۔

"جناب یہ مطب ہے۔ یہاں ذاتی باتیں مناسب معلوم نہیں ہوتیں۔ مجھے تو صرف یہ بتایئے کہ آپ کو تکلیف کیا ہے۔ اگر جو باتیں آپ کر رہے ہیں اتنی ہی ضروری ہیں تو بے شک غریب خانے پر تشریف لے آیئے۔ آپ اس شہر میں مسافر ہیں۔ آپ کی پذیرائی مجھ پر فرض ہے۔ اب ایسا بھی بے مروت نہیں کہ جی لگا کر آپ کی باتیں نہ سنوں لیکن اس وقت صرف نبض دکھایئے۔"

حکیم صاحب نے نبض دیکھتے ہی چند باتیں ایسی بتائیں جو اس کے مرض سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسے کچھ کہنا ہی نہیں پڑا اور حکیم صاحب نے اس کا مرض پہچان لیا۔

"میں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ دروازے کے پاس بچہ بیٹھا ہے اس سے دوا بنوا لیجیے گا۔ دوا دو دن کی ہے۔ اس دوا کے استعمال کے بعد اگر آپ محسوس فرمائیں کہ آدھا مرض غائب ہوگیا ہے تو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ ایک ہفتے کی مزید دوا بنوا لیجیے گا اور فیض آباد واپس چلے جایئے گا۔ خوامخواہ گھر سے دور رہنے سے کیا حاصل۔ ہاں اگر یہ دوا کارگر نہیں ہوئی تو بے شک آپ مجھ سے مل سکتے ہیں۔"

"کیا نذرانہ پیش کروں؟"

"وہ بچہ جتنے پیسے مانگے اسے دے دیجیے گا۔"

وہ شخص کچھ یقین کچھ بے یقینی کی کیفیت میں اٹھا اور اس لڑکے کے پاس چلا گیا جو لوگوں کے نسخے دیکھ کر انہیں دوا دے رہا تھا۔ اس دوا کے اسے واجبی سے پیسے دینے پڑے۔ اس نے بے دلی سے دوا لی اور مطب سے باہر نکل آیا۔ وہ حکیم صاحب کی طرف سے مطمئن ہوگیا تھا لیکن دوا کی طرف سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا انہوں نے دو دن کی دوا دی ہے۔ پیسے بھی نہ ہونے کے برابر لیے ہیں۔ ایسی بیماری کا اتنے کم پیسوں میں کوئی علاج ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے بس ٹال دیا ہے۔ اس بیماری کا علاج ان کے پاس بھی نہیں۔

اس نے حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق دو دن کی دوا کھالی۔ وہ حیران رہ گیا۔ دوا تھی کہ جادو تھا۔ اتنا افاقہ ہوگیا کہ وہ کہہ سکتا تھا بیماری ختم ہوگئی۔ وہ تو مہینوں کا سوچ کر آیا تھا، دو دن میں فیصلہ ہوگیا۔

اس نے حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق ایک ہفتے کی دوا لی اور فیض آباد چلا گیا۔

ایک ہفتے کی دوا کھانے کے بعد وہ بھلا چنگا ہوگیا تھا۔ اس نے کئی نادر تحفے ساتھ لیے اور پھر اکبر آباد آگیا۔ اس مرتبہ محض ملاقات مقصود تھی اس لیے وہ مطب پر نہیں گیا، حکیم صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ حکیم مرزا شفیع اس تپاک سے ملے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔ اس شخص نے اپنی کیفیت سے انہیں آگاہ کیا اور ان کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ دیر تک فیض آباد کی رونق اور شجاع الدولہ کی قدر دانی کی باتیں ہوتی رہیں۔

وہ شخص فیض آباد چلا گیا۔

اکبر آباد سے فیض آباد کے سفر کے دوران وہ برابر یہ سوچتا... جا رہا تھا کہ مرزا شفیع جیسی نابغہ روزگار ہستی کو تو فیض آباد میں ہونا چاہیے تھا۔ خلقِ خدا کو کتنا فائدہ پہنچتا۔ لوگ دور دور سے فیض آباد آتے اور دنیا میں فیض آباد کا نام سربلند ہوتا۔ شہر پناہ تک پہنچتے پہنچتے وہ فیصلہ کرچکا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ شجاع الدولہ سے ذکر کرے گا اور کوشش کرے گا کہ نواب کی قدر دانی کے طفیل مرزا شفیع فیض آباد میں قیام کرلیں۔ یہ موقع اسے جلد ہی مل گیا۔ کچھ تو حقیقت تھی کچھ اس نے ایسا مبالغہ کیا کہ شجاع الدولہ کو رات کاٹنی مشکل ہوگئی، صبح ہوتے ہی حکم ہوا کہ شال دوشالے، موتیوں سے بھرا تھال جیسا کہ قاعدہ ہے اکبر آباد روانہ کرو اور جس طرح بھی بن پڑے حکیم مرزا شفیع کو فیض آباد آنے پر رضا مند کرو۔

مرزا شفیع تو دہلی کی طرف سے مایوس ہو کر فیض آباد پر

آنکھیں جمائے بیٹھے تھے۔ خودداری اجازت نہیں دیتی تھی کہ خود پہل کریں اب جو بلاوا آیا تو جی جان سے تیار ہوگئے۔ کہلا بھیجا کہ ضروری تیاری کے بعد حاضرِ خدمت ہوجائیں گے۔

تیاری کیا کرنی تھی۔ اتنا تو صرف اس لیے کہلوادیا تھا کہ بے قراری ظاہر نہ ہو۔ جب تک وہ روانہ ہوئے ایک بلاوا اور آگیا۔

انہوں نے اہلِ خانہ کو ساتھ لیا اور فیض آباد روانہ ہوگئے۔

شہر پناہ کے دروازے میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ شہر آگیا۔ بازار سامنے تھا۔ خرید و فروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے پکوان۔ مٹھائیاں سجی ہوئی۔ کہیں شربت کے کٹورے بج رہے تھے۔ کہیں نان خطائیاں بہار دکھلا رہی تھیں۔ کہیں قلفی اور فالودے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ خریدار اتنے کہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔

"بھائی کیا چوک بازار یہی ہے؟"

"ابھی کہاں ابھی تو آپ شہر کے دروازے میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ شہر پناہ کے مغربی دروازے سے داخل ہوجایئے چوک بازار پہنچ جایئے گا۔"

چوک بازار پہنچتے پہنچتے آنکھیں حیرت سے بھر گئیں۔ بازار کیا تھا پرستان تھا۔ چہروں کا گلستان تھا۔ ہر پھول اپنی جگہ لاجواب تھا۔ مفلسی کا کال تھا ہر آدمی خوش حال تھا۔ لگتا تھا کوئی بازار میں خزانہ رکھ کر بھول گیا ہے۔ جو آتا ہے مٹھیاں بھر بھر کے اچھالتا ہے۔

یہ تھا فیض آباد۔ انہوں نے اس شہر کے بارے میں جو سنا تھا اس سے بھی بڑھ کر پایا۔ اس وقت نظارے دل میں اتارنے کا وقت نہیں تھا ورنہ وہ یہیں مطلب جما کر بیٹھ جاتے۔ اتنی دکانوں میں ایک دکان اور سہی۔ انہیں محلہ گلاب باڑی تک پہنچنا تھا جہاں ان کا میزبان قیام رکھتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کا انہوں نے علاج کیا تھا اور جو انہیں یہاں تک لانے کا سبب بنا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ کچھ دن ان کی میزبانی کرے گا اور پھر موقع دیکھ کر شجاع الدولہ کے سامنے پیش کردے گا۔ محلہ گلاب باڑی کے اس مکان پر پہنچے تو میزبان فرشِ نگاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے میزبانی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دربار تک پہنچانے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ مرزا شفیع کی قسمت اچھی تھی کہ جلد ہی موقع مل گیا۔ انہیں شجاع الدولہ کے سامنے پیش کردیا گیا۔

ضروری گفت و شنید کے بعد شجاع الدولہ نے انہیں ملازم رکھ لیا۔

دن عید اور راتیں شب برات بن گئیں۔ جن چیزوں کے لوگ خواب دیکھتے ہیں وہ حقیقت میں انہیں میسر تھیں بات بات پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی تھی۔

بعد ایک مدت کے مرزا شفیع کے فرزند مرزا محمد سمیع کربلا معلیٰ عراق چلے گئے۔

شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ حکمران ہوئے۔ جی میں کیا سمائی کہ اقتدار کا مرکز فیض آباد سے منتقل کرکے لکھنؤ کو پری خانۂ عالم بنادیا۔ فیض آباد کا جوہر لکھنؤ میں سمٹ آیا۔

آصف الدولہ کے لیے مشہور تھا "جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ" ان کے فیض و احسان کے نتیجے میں لکھنؤ ہر طرح کے اربابِ صنعت اور دانشوروں کا ایسا مجمع ہوا کہ چشمِ فلک نے دنیا میں کہیں نہ دیکھا ہوگا۔

مرزا سمیع کو کربلا گئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ فرشتۂ اجل نے ان کی جوانی کو تاڑ لیا۔ دنیائے فانی سے عرصۂ عدم کو روانہ ہوئے۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند مرزا علی خان کربلا سے لکھنؤ چلے آئے۔ دیکھا تو لکھنؤ کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ شعرا پرے جمائے بیٹھے ہیں۔ ناچنے گانے والے طائفے ہیں جو خرد بیچتے ہوش خریدتے ہیں۔ نوبت نقاروں کے شور سے کان بہرے۔ ہر کوچہ باغِ جنت۔ کون تھا جو یہاں آکر چلا جائے۔ وہ بھی آئے تو یہیں کے ہو رہے۔ کچھ ہی دن میں آصف الدولہ کی نظروں میں آگئے۔ حکیم الملک کا خطاب ملا۔ دولت کی بارش ہوئی تو شرفائے لکھنؤ میں شمار ہونے لگا۔

مرزا علی خان کے چھ لڑکے تھے۔ فضل حسین خان انہی کے فرزند تھے۔ ان کا خاندان ایک معزز اور علم و ادب سے بہرہ ور خاندان سمجھا جاتا تھا۔ نوابی عہد میں بے شمار اعزازات اس خاندان کو حاصل تھے۔ یہ خاندان "ثقات کرہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس گھرانے کی زبان دانی اس قدر مانی ہوئی تھی کہ جب بھی زبان کا مسئلہ درپیش ہوتا تو اس گھرانے کے افراد حکم قرار دیے جاتے۔ یہ لوگ جاگیر والے کہلاتے تھے۔

مرزا فضل حسین خان کا زمانہ آتے آتے بھی جمع پونجی اتنی تھی کہ سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ زمینداری تھی، پولیٹیکل پنشن تھی، ذاتی مکانات تھے، خزانے میں روپیا تھا۔ غرض چین سے بسر ہوتی تھی۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ شرافت اور دولت ایک گھر میں قیام کرلیں مگر یہ اعزاز اس گھرانے کو حاصل تھا۔

☆☆☆

مرزا فضل حسین خاں مردانے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ انہوں نے زنانے میں خلافِ معمول چہل پہل دیکھی۔ اس سے پہلے کہ انہیں کوئی بتانے آتا وہ خود ہی دوستوں سے اجازت لے کر زنان خانے میں چلے گئے۔ یہاں ایک خبر ان کا انتظار کررہی تھی۔ ایک بیٹی کے بعد انہیں اولادِ نرینہ کی آرزو تھی۔ اب انہیں یہ سننے کو مل رہا تھا کہ خدا نے ان کی دعا سن لی ہے۔

"اتنی بڑی خوش خبری تھی اور مجھے کوئی بتانے تک نہیں آیا۔" وہ ملازموں پر برس پڑے۔

"ہمیں بیگم صاحبہ نے روک دیا تھا کہ دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہیں ان کی باتوں میں خلل پڑے گا۔"

"کیا میں اپنے بیٹے کو دیکھ سکتا ہوں۔"

"ابھی آپ کو کچھ دیر توقف کرنا ہوگا۔"

وہ پھر مردانے میں چلے گئے۔ خوش خبری دوستوں کو سنائی اور دیر تک مبارک بادیں وصول کرتے رہے۔ دوستوں نے اسی وقت وعدہ لے لیا کہ بیٹے کی ولادت کی خوشی میں وہ شاندار تقریب منعقد کریں گے۔ لکھنؤ میں کوئی تقریب ہو اور مجرا نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ حکیم صاحب خود تو ان باتوں سے دور تھے لیکن دوست تو ہر مزاج کے ہوتے ہیں۔ ان کی دلدہی بھی شرط تھی۔ اس کا بھی وعدہ ہوگیا بلکہ جن صاحب نے یہ فرمائش کی تھی انہی کے سپرد مجرے کے انتظامات بھی کردیے گئے۔ جب شام ڈھل گئی، دوست رخصت ہوگئے تو اندر سے بلاوا آیا کہ اب وہ فرزند دل پذیر کو دیکھنے کے لیے آسکتے ہیں۔

مرزا صاحب اندر گئے۔ نومولود کو گود میں لیا۔

"اس کے کان میں اذان دے دی گئی ہے؟"

"مولوی اسماعیل کو بلالیا تھا۔ انہوں نے اذان دے دی ہے۔ استانی جی آگئی تھیں۔ نہایت نیک خاتون ہیں، بجن ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کے ہاتھ سے گھٹی چٹادی جائے۔"

"سب کام تو آپ نے خود ہی کرلیے پھر ہمیں کیوں بلایا ہے۔ کیا اب بھی کوئی کام باقی ہے؟"

سوانحی خاکہ

نام......مرزا جعفر علی خاں
تخلص......اثر لکھنوی
والد......حکیم مرزا فضل حسین خاں
وطن......لکھنؤ
آبائی وطن......اصفہان، ایران
تعلیم......بی۔ اے۔ کننگ کالج لکھنؤ
تلمذ......عزیز لکھنوی
ملازمت......کلکٹر۔ ایڈیشنل کمشنر۔ وزیر ترقیات و داخلہ (کشمیر) قائم مقام وزیر اعظم (کشمیر)
اعزازات......خان بہادر، پدم بھوشن
پیدائش...... 12 جولائی 1885ء
وفات...... 1967ء (6 جون)
تدفین......تال کٹورہ، لکھنؤ

"ابھی تو بہت کام ہیں۔ اس کا نام تو آپ ہی کو رکھنا ہے۔"

"نام تو ہم نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ ہم آج کا کام کل پر ٹالنے کے قائل نہیں۔"

"اگر لڑکی ہوجاتی تو؟"

"ہم نے لڑکی کے نام کا انتخاب بھی کرلیا تھا۔"

"اچھا اب پہیلیاں نہ بوجھوایئے۔ اللہ قسم ہمیں بے قراری ہورہی ہے کہ ہم اپنے بچے کو نام لے کر پکاریں۔"

"بیگم، اس کا نام ہوگا مرزا جعفر علی خاں۔ بعد میں اگر شاعری شروع کردی تو تخلص خود رکھ لے گا۔"

"اب آپ اپنی طرح اسے بھی شاعر بنائیں گے؟"

"ہم کیا بنائیں گے یہ خود بن جائے گا۔ لکھنؤ میں کوئی بچہ پیدا ہو اور شاعری نہ کرے اور پھر یہ تو مرزا جعفر علی خاں ہیں۔ ہمارے خاندان میں کئی صاحب دیوان شاعر ہوگزرے ہیں۔ کچھ تو اثر آئے گا۔ ارے ہاں "اثر" تخلص بھی ٹھیک رہے گا۔ اس نے بڑے ہوکر شاعری شروع کی تو ہم اس سے کہیں گے "اثر" تخلص رکھ لے۔ مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی۔"

"توبہ! نام کیا ہوا عمر عیار کی زنبیل ہوگئی۔"

"ارے ہاں ابھی تو اس نام سے پہلے "نواب" لگنا باقی رہ گیا۔ ویسے گھبراؤ نہیں شاعروں میں تو صرف "اثر

لکھنوی'' سے کام چل جائے گا۔''

''آپ بھی کیا بے وقت کی راگنی بجانے بیٹھ گئے۔ جعفر بھی کہہ رہا ہوگا نہ باپ کو منڈن کی فکر ہے نہ چھٹی چھلے کی۔''

''بھئی یہ سب باتیں تم عورتوں سے متعلق ہیں۔ ہم تو ایک بڑی تقریب منعقد کریں گے جس میں پورا لکھنو مدعو ہوگا۔''

''میں تو کہتی ہوں یہ تقریب اسی دن پر اٹھار کھیے جس دن میرے میکے والے کرتہ ٹوپی لے کر آئیں گے اور ''چھٹی کی رسم ہوگی۔''

''کڑہ ابوتراب کے صدر دروازے پر شہنائیاں تو آج ہی سے بجنا شروع ہوجائیں گی۔ اب آپ کی مرضی چھٹی کب کرتی ہیں۔''

جعفر حقیقی معنوں میں سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی اور پھر پہلی اولاد نرینہ تھی۔ محلہ کڑہ ابوتراب دلہن کی طرح سج گیا۔ نوبت اور شہنائیاں بجنے لگیں۔ محتاجوں اور مسکینوں کی بن آئی ''چھٹی'' کی رسم ایسی دھوم دھام سے ہوئی کہ عرصے تک لکھنو میں اس کا چرچا رہا۔ سات دن برابر ''مجرے'' ہوتے رہے۔

جعفر کی پرورش نازونعم کے ماحول میں ہونے لگی۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ لکھنو کے محاورات اس وقت سے اس کے کانوں میں پڑنے لگے جب وہ ان کا مطلب بھی نہیں سمجھتا ہوگا۔ جولوریاں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں وہ بھی مستند اشعار کی صورت میں تھیں۔ اس کے ایک چچا نواب دلاور حسین غالب کے عاشق تھے۔ وہ آجاتے تو بہانے بہانے سے غالب کے اشعار سناتے اور پھر ان کے معنی بیان کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنو میں غالب کو مہمل گو سمجھا جاتا تھا لیکن دلاور حسین غالب کی عظمت کے معترف تھے اور لکھنو والوں سے جھگڑتے رہتے تھے۔ نہایت اچھا تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ غالب کے علاوہ دوسرے شعرا کے بھی سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ جعفر کی پرورش ان اشعار کی چھاؤں میں ہورہی تھی۔ کہتے ہیں بچے کی تربیت اسی وقت سے شروع ہوجاتی ہے جب وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ جعفر کی تربیت ادبی ماحول میں ہو رہی تھی۔ مرزا افضل حسین بھی شاعر تھے۔ جب جعفر گود میں آنے کے لائق ہوگیا تو وہ اسے مردانے میں لے جاتے۔ شعروشاعری شروع ہوجاتی اور جعفر کا معصوم ذہن ان شعروں سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ کئی مرتبہ یہ مشاہدہ کیا گیا کہ وہ کسی بات پر رو رہا ہے۔ کسی نے اس کے سامنے شعر پڑھا اور وہ خاموش ہوگیا۔ یہ بات خاندان میں ایک لطیفے کی طرح مشہور ہوگئی تھی۔ جب وہ گھٹنوں سے اٹھ کر چلنے کے لائق ہوا اور دوڑنے بھاگنے لگا تو ایک دن اچانک مرزا فضل حسین نے مٹھائی کے کئی ٹوکرے منگوائے اور نہایت اہتمام سے محلے میں تقسیم کرائے۔

''حکیم صاحب، یہ مٹھائی کیسی ہے۔'' جعفر کی ماں نے پوچھا۔

''محلے میں تقسیم کرانے کے لیے لایا ہوں۔''

''مگر کس خوشی میں۔''

''دیکھتی نہیں ہو ہمارا بیٹا دوڑنے بھاگنے لگا ہے۔ چھت پر بہ آسانی آجاسکتا ہے۔ اب ہم چھت پر تواب للن سے پتنگ لڑانے جائیں گے تو یہ ہمارے ساتھ جانے کے لائق ہوگیا ہے۔ چرخی پکڑ کر کھڑا ہوگا۔ یہ مٹھائی اسی خوشی میں ہے۔''

''لوگ مٹھائی تقسیم کرنے کا سبب پوچھیں گے تو کیا آپ انہیں یہی بتائیں گے۔''

''ہاں تو کیا ہوا۔''

''ہوا تو کچھ نہیں لیکن میں کہتی ہوں یہ تو اس کے لکھنے پڑھنے کی عمر ہے اور آپ اسے کنکوے بازی پر لگا رہے ہیں۔ ہمارے خاندان میں پتنگ بازی کے علاوہ تعلیم کا بھی تو دستور ہے۔''

''اس کا انتظام بھی ہوجائے گا فی الحال تو ہم جعفر میاں کو لے کر چھت پر جارہے ہیں۔''

جعفر کے لیے یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ وہ چھت پر کئی مرتبہ آچکا تھا لیکن اس وقت کی بات اور تھی اس وقت کا ماحول اور تھا۔ حکیم صاحب کو پتنگ اُڑاتے اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چرخی پکڑے کھڑا تھا اور حکیم صاحب اپنی پتنگ کو ہوا میں بلند کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ پتنگ اُڑانے اور پیچ لڑانے کے گُر بھی بتاتے جارہے تھے۔

حکیم صاحب کا یہ شغل کبھی کبھی کا تھا لیکن جب سے جعفر ان کا شریک شغل بنا تھا ان کی ہر شام چھت پر گزرنے لگی تھی۔ ان کی یہ محویت دیکھ کر ان کی بیگم نے انہیں پھر یاددہانی کرائی کہ جعفر کی تعلیم کا بندوبست کرنا ہے۔

''ابھی جعفر بہت چھوٹا ہے کہاں مکتب جاتا پھرے گا۔''

''مکتب نہ بھیجیں کم ازکم گھر پر تو بندوبست کرسکتے ہیں۔''

''ہاں یہ ہوسکتا ہے۔ میں کوئی نہ کوئی انتظام کل ہی کرتا ہوں۔''

دوسرے دن شام ہوئی اور وہ وقت آگیا جب وہ باپ کے ساتھ پتنگ اُڑانے چھت پر چڑھا کرتا تھا کہ آج چھت کی بجائے اسے مردانے کی راہ دکھائی گئی۔

''سید محمد جعفر آئے ہیں۔''

''یہ کون بزرگ ہیں۔''

''تمہیں آج سے عربی پڑھانے آیا کریں گے۔''

''اور کنکوا؟''

''ان کے جانے کے بعد۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ جب ہم چھت سے نیچے اتریں تو وہ پڑھانے آجائیں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔''

وہ اس وعدے پر ان سے پڑھنے چلا گیا کہ سبق کے بعد کنکوا اُڑایا جائے گا لیکن ہوا ایسا کہ جب وہ پڑھا کر رخصت ہوئے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اب پتنگ اڑانے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔

جعفر یہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ اس سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ اس سے تو یہ کہا گیا تھا کہ کسی کو دھوکا دینا یا جھوٹ بولنا سخت گناہ ہے اور اب اس کے باپ نے یہ دونوں عمل اس کے ساتھ دہرائے ہیں۔

''میں کل سے پڑھنے نہیں بیٹھوں گا۔''

''کیوں بھائی کیوں نہیں بیٹھو گے۔''

''اس لیے کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ پڑھنے کے بعد اتنا وقت ہی نہیں بچا کہ میں چھت پر جاکر پتنگ اُڑاتا۔''

''اچھا کل سے مولوی صاحب سے کہہ دیں گے کہ ذرا پہلے آئیں۔ پڑھنے کے بعد اتنا وقت مل جائے گا کہ تم چھت پر جاسکو۔'' یہ باتیں باپ بیٹے کے درمیان ہو رہی تھیں۔ اس موقع پر ماں نے بھی ضروری سمجھا کہ وہ دخل دیں۔

''اگر آپ اسی طرح اس کی ناز برداریاں کرتے رہے اور اس کی ضدیں پوری ہوتی رہیں تو اس کے بگڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جائے گی۔''

تصانیف:

نظم

اثرستان، زنگاری بیگم، بہاراں، نوبہاراں، ریگستان، لالہ وگل، نغمۂ جاوید، ہلاک فریب، عروسِ فطرت۔

نثر

مزامیر، اثر کے تنقیدی مضامین، چھان بین، انیس کی مرثیہ نگاری، مطالعہ غالب، فرہنگ اثر (لغت)

تاریخ وفات

لکھ دو کمال مصرع یہ تاریخ کا
آہ علامہ جعفر علی خاں اثر
1967ء
یاد کر کے ان کو کہتے ہیں خدا سے سب رفیق
بے اثر، بے لطف ہے بزمِ ادب ربِ کریم
1387ھ

''میں اس کی ضد پوری نہیں کر رہا ہوں۔ اس کا حق اسے دے رہا ہوں۔ بچے کا حق ہے کہ وہ کھیلے زیادہ، پڑھے کم۔''

''میں کب کہہ رہی ہوں کہ اس کے کھیلنے پر پابندی عائد کردی جائے لیکن کیا آپ یہ بھی اس کی مرضی پر چھوڑیں گے کہ وہ کس وقت پڑھے گا اور کس وقت کھیلے گا۔''

''ارے نیک بخت جب ہمیں بچے کو کھیلنے کا موقع دینا ہی ہے تو اس کی مرضی کا وقت منتخب کرلیں تاکہ کھیل میں بچے کا دل لگے۔''

''پڑھائی میں دل لگے نہ لگے کھیل میں لگے۔''

''جب بچے کا دل کھیل میں لگے گا تو پڑھائی میں بھی لگ جائے گا۔''

''معلوم نہیں کون سی منطق ہے یہ آپ کی۔''

''منطق یہ ہے کہ بچہ زبردستی سے نہیں پڑھتا۔ میں نے اس کی ضد پوری کردی وہ میری ضد پوری کرے گا یعنی پڑھے گا۔''

''مجھے ڈر ہے آپ کا یہ لاڈ پیار اسے بگاڑ نہ دے۔''

''بیگم یاد رکھنا لاڈ کا بگڑا سنبھل جاتا ہے، ڈانٹ کا بگڑا نہیں سنبھلتا۔''

''آپ کی اولاد ہے۔ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے آپ جانیں۔''

”دوسرے دن سے ایسا وقت مقرر کردیا گیا کہ جب وہ پتنگ بازی سے سیر ہو کر نیچے اترا تو سید محمد جعفر صاحب اسے سبق دینے کے لیے تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ خوش ہوگیا اور جی لگا کر پڑھنے لگا۔

جب وہ خوب بہل گیا تو ایک دن حکیم صاحب نے اسے سمجھایا۔

”ابھی تمہیں عربی کے علاوہ دوسرے مضامین بھی پڑھنے ہیں۔ رات کو جلدی سونا صحت کے لیے اچھا ہوگا ہے اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ روزانہ پتنگ نہیں اڑاتے اس کے لیے ایک دن مقرر کرلیتے ہیں۔ اس دن کوئی پڑھائی نہیں ہوگی صرف پتنگ اڑائی جائے گی اور باقی دنوں میں صرف پڑھائی۔“

ایک مرتبہ اس کی ضد مان لی گئی تھی لہٰذا اس مرتبہ اس نے باپ کی بات رکھ لی۔ سید محمد جعفر باقاعدگی سے بڑھانے کے لیے آنے لگے۔

ان دنوں خوش نویسی کی تعلیم بھی بچوں کو پابندی سے دلائی جاتی تھی تاکہ جب وہ پڑھنے کی منزل سے لکھنے کی منزل میں آئیں تو ان کا ”خط“ اعراب وغیرہ سے مزین ہو۔ مرزا علی حسین لکھنو کے بے مثل خوش نویس تھے۔ مرزا فضل حسین سے ان کے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ وہ اسے خوش خطی سکھانے کے لیے آنے لگے۔ اس طرح وہ اردو اور فارسی کی تعلیم بھی گھر پر ہی حاصل کرنے لگا۔

شہسواری سکھانے کے لیے ایک انگریز چارلی نام کا آنے لگا جو بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔

ان تمام نازنخروں نے اسے انتہائی شریر بنادیا۔ ان شرارتوں میں بڑوں کے ساتھ گستاخی کا عنصر شامل نہیں تھا لیکن وہ ایسی حرکتوں کا مرتکب ہورہا تھا جو اس گھرانے کی تہذیب سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کی حوصلہ افزائی اس طرح ہورہی تھی کہ کسی کی مجال نہیں تھی جو اسے ٹوک سکے کیونکہ اکلوتا ہونے کے سبب مرزا فضل حسین اسے نہایت عزیز رکھتے تھے اور اس کی جا و بے جا ضدیں پوری کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا کہ عربی کے استاد آئے بیٹھے ہیں اور وہ کہیں غائب ہوگیا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگ تھک گئے تو وہ گھر کے کسی گوشے سے خود ہی برآمد ہوگیا۔ کبھی کسی کی کوئی چیز چھپادی۔ اب سب پریشان ہیں کہ وہ چیز گئی تو کہاں گئی۔ جب سب تھک ہار کر بیٹھ گئے تو اس نے وہ چیز پیش کردی اور بھاگ کھڑا ہوا۔

اس کی شرارتیں روز بروز بڑھتی جارہی تھیں۔ ملازموں کا تو اس نے ناطقہ بند کیا ہوا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ حکیم صاحب سے شکایت کرکے دیکھ لی پھر کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ عربی کے استاد تو اس سے بہت ہی تنگ تھے۔ اسے گردانیں ہی یاد نہیں ہورہی تھیں تو آگے کیا پڑھتا البتہ فارسی میں وہ خوب چل نکلا تھا۔

لکھنو کے ہر گھر میں شاعری کا چرچا تھا۔ اس کا گھر تو یوں بھی فن کا گہوارہ تھا۔ خاندان کے اکثر بزرگ شاعر و ادیب تھے۔ اکثر رات کو سونے سے پہلے بیت بازی ہوا کرتی تھی۔ رشتے داروں کے گھر قریب قریب تھے۔ ان کے بچے بھی آجاتے تھے اور بچوں کے درمیان مقابلہ ہوتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اشعار یاد کیے جائیں۔ جعفر کے ہاتھ ایک نئی مصروفیت آگئی۔ وہ دن بھر اشعار یاد کرتا۔ شروع شروع میں اس کے پاس اشعار کا ذخیرہ بہت کم تھا۔ اسے شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی۔ اس کے ایک پھوپا اس کے ہم نام تھے۔ ان کے بیٹے کو لاتعداد اشعار یاد تھے۔ جعفر نے اس سے دوستی گانٹھ لی۔ بیت بازی کے مقابلے میں وہ ہمیشہ اس کا پارٹنر بن جاتا تھا اور یوں شرمندگی سے بچ جاتا تھا۔ یہ شرمندگی پھر بھی باقی تھی کہ وہ زیادہ شعر پیش کرتا ہے۔ جیت تو ہوجاتی ہے لیکن یہ خیال پھر بھی رہتا تھا کہ اس میں زیادہ حصہ اس کا نہیں پھوپی زاد بھائی کا ہے۔ پھر ایک دن اس پر عجیب انکشاف ہوا۔ مقابلہ چل رہا تھا۔ دونوں طرف سے اشعار دیے جارہے تھے۔ ایک جگہ آکر ان کی پارٹی اٹک گئی۔ اس کے پھوپی زاد بھائی کو بہت اشعار یاد تھے لیکن اس وقت اسے بھی کوئی شعر یاد نہیں آرہا تھا پھر اچانک اسے ایک شعر یاد آگیا۔ شعر غیر معیاری تھا لیکن اس وقت تو کام چل ہی گیا۔ بعد میں اس نے ایک راز کی بات بتائی۔

”جعفر، آج تو بال بال بچ گئے۔ کوئی شعر حافظے میں نہیں تھا۔ اسی وقت شعر بنادیا ورنہ کرکری ہوجاتی۔“

”تم نے وہ شعر خود بنایا تھا؟“

”اور نہیں تو کیا۔“

”واہ تم تو شاعر ہو۔ اب میں بھی شعر کہنے کی کوشش کروں گا۔ کبھی پھر اٹک گئے تو مجھے شعر کہنے کی مشق تو ہوگی۔“

”اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ پھر بھی کوشش کرکے دیکھ لو۔“

جعفر کو عجیب سا لگا کہ جو کام دوسرے کرسکتے ہیں وہ کیوں نہیں کرسکتا۔ وہ کمرا بند کرکے بیٹھ گیا اور الٹے سیدھے شعر کہتا رہا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ یہ اشعار بیت بازی میں پڑھنے کے لائق نہیں ہیں۔ اس نے سب پھاڑ کر پھینک دیے۔ اس نے سوچا، اس کا بھائی ٹھیک کہتا تھا۔ شعر کہنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ دوسرے دن وہ پھر کاپی پنسل لے کر بیٹھ گیا۔ اب یہ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ اس طرف راغب ہوا تو شرارتوں میں بھی کمی آگئی۔ ایک دن اس نے کچھ ڈھنگ کے شعر کہہ لیے اور جب گھر میں بیت بازی ہوئی تو آزمانے کے لیے اپنے گھڑے ہوئے شعر بھی پڑھ دیے۔ کسی نے کچھ بھی نہیں کہا یعنی کوئی بھی نہیں پہچان سکا تھا کہ یہ اس کے شعر ہیں۔ اس نے بعد میں اپنے پھوپی زاد بھائی کو بتایا کہ وہ شعر اس نے کہے تھے۔ اس نے بہت تعریف کی۔

”تم تو شعر کہہ سکتے ہو۔ تم شعر کہا کرو۔“

ان دنوں اتنی عقل کہاں تھی کہ اس حوصلہ افزائی پر کان دھرتا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جو شعر کہے جاتے ہیں انہیں سنبھال کر بھی رکھا جاتا ہے۔ وہ جو شعر کہتا کچھ دیر تو اسے گنگناتا پھرتا پھر بھول جاتا۔

اس کے گھر کا ماحول مشرقی تھا لیکن باہر کی دنیا میں اس میں کچھ اور رنگ بھی شامل ہوگئے تھے۔ اب نوابوں کا دور نہیں تھا انگریزی راج تھا۔ اردو اور فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی تھی۔ کچھ وقت کے تقاضے اور کچھ سرسید تحریک کے اثر سے جاگیردار طبقے نے بھی انگریزی سے سمجھوتا کرلیا تھا اور اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانی شروع کردی تھی۔ سرسید تحریک کا سب سے بڑا مخالف اخبار ”اودھ پنچ“ لکھنو ہی سے نکلتا تھا لیکن اس کے باوجود انگریزی تعلیم اپنا راستہ بناتی جارہی تھی۔ تہذیبی زندگی پر ایران کا سایہ تھا لیکن مصلحتِ وقت انگریزی تعلیم کا بھی تقاضا کررہی تھی۔ جعفر کے لیے بھی اس کے بڑوں نے طے کیا کہ عربی فارسی کے ساتھ ساتھ اسے انگریزی تعلیم سے بھی بہرہ ور کیا جائے۔ ماسٹر واجد حسین اسے انگریزی پڑھانے کے لیے آنے لگے۔

اس کی عمر گیارہ سال ہوگئی تھی۔ انگریزی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ چکا تھا۔ اب اس کے والد نے سوچا کہ اسے اسکول میں داخل کرادیا جائے۔ جوبلی ہائی اسکول لکھنو کا مشہور تعلیمی ادارہ تھا۔ اس اسکول میں اسے درجہ ششم میں داخلہ مل گیا۔ مرزا فضل حسین جہاں دیدہ تھے۔ روایتی والد کی طرح بے جا پابندیوں کے قائل نہیں تھے۔ وہ اسے عملی تجربات سے بے بہرہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اسی خیال سے انہوں نے اسے ہر صحبت، ہر مجلس، ہر محفل میں بھیجا۔ احباب ملنے آتے تو وہ اسے اپنے ساتھ بٹھاتے تاکہ وہ مجلسی ادب آداب سے واقف ہوجائے۔ مشاعروں میں اپنے ساتھ لے جاتے تاکہ وہ لکھنو کے اس عظیم ورثے سے بھی واقف ہوجائے۔ ان کے ملنے والے لکھنو کے اعلیٰ طبقے کے لوگ تھے لہٰذا جعفر کے مزاج میں بھی لکھنو کی پرانی وضع داری شریک ہوتی چلی گئی۔ حد درجہ انکسار اس کی طبیعت کا خاصہ بن گیا۔ شرمیلا پن جو تنہائی سے پیدا ہوتا ہے ختم ہوگیا۔ ملنے جلنے میں بے تکلف ہوگیا لیکن اس بے تکلفی میں سنجیدگی اور حکیمانہ امتزاج پیدا ہوگیا۔ اسکول میں انگریزی پڑھ رہا تھا۔ لباس بھی انگریزی ہوگیا تھا لیکن اٹھنا بیٹھنا ان بزرگوں کے ساتھ تھا جو مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے لہٰذا طبیعت میں اعتدال کا پیدا ہوجانا لازمی تھا۔ وہ کسی ایک طرف ضرورت سے زیادہ نہ جھک سکا۔ اس کی ذات قدیم و جدید کا پیکر بن گئی۔ نہ کوٹ پتلون سے نفرت نہ شیروانی پاجامے سے حد سے بڑھی ہوئی رغبت۔ باپ کے حکم کے مطابق ایک دن مغربی لباس زیب تن کرتا ایک دن مشرقی لباس پہنتا تاکہ دونوں کی اہمیت پیشِ نظر رہے۔ اس تربیت کا اثر بچپن ہی

ایک گفتگو

میں نے سترہ اٹھارہ کتابیں لکھی ہیں اور بہت سے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جن میں کے تقریباً 70 مضامین مجاہد حسین نے اکٹھے کرلیے ہیں جو ابھی کتابی شکل میں نہیں آئے۔ اردو میں تو اچھی تنقید کسی نے نہیں کی ہے۔ انگریزی تنقید البتہ اچھی ہے۔ نقاد کو شاعر کے کلام میں خوبی تلاش کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں جو خوبیاں نظر آئیں ان کو بھی بیان کردے۔ ایمانداری اور دیانت کا خاصہ ہے کہ کسی بھی کتاب کی خوبی اور خامی دونوں کو اجاگر کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس میں خوبی ہے تو کیا خوبی ہے اور خامی ہے تو کیا خامی ہے اور کیوں ہے۔ میں نے اکثر لوگوں کے کلام میں خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کردیا ہے۔ اس لیے لوگ مجھ سے ناراض رہتے ہیں کیونکہ میں نے ان کی خامیوں کو بھی بیان کردیا ہے۔“ (اثر)

سے اس کے برتاؤ میں دیکھا جانے لگا تھا۔ نرم گفتاری، شائستہ لب ولہجہ، ہمیشہ حفظِ مراتب کا خیال رکھنا اس کی عادتِ ثانیہ بن گئی۔

وہ انہی پھولوں پر چلتا ہوا تعلیمی سفر میں آگے بڑھتا گیا۔ 1902ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کیننگ کالج لکھنو میں داخلہ لے لیا۔

اب وہ عمر کے ایسے حصے میں تھا جہاں باہر کی دنیا کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ لکھنو میں شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ کوچہ بہ کوچہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اس نے ایسے ہی ماحول میں تربیت پائی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ شاعری سے دور رہتا جبکہ گھر میں بھی شاعری اور تنقید کے چرچے تھے۔ اس کی طبیعت مشاعروں کی طرف تو راغب نہیں ہوئی لیکن اس نے اپنے بزرگوں کا فنِ شاعری ضرور اختیار کرلیا۔ کبھی کبھار شعر کہہ کر وہ خود کو اس تہذیبی قافلے میں شامل کرلیتا تھا لیکن ابھی اس میں پابندی نہیں آئی تھی۔

1906ء میں اس نے بی اے پاس کرلیا۔ امتحان کے بعد فرصت ملی تو اس کا بیشتر وقت شعر کہنے اور اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ کرنے میں گزرنے لگا۔

ایک روز اس کے والد اس کے پاس آ کر بیٹھے اور اس سے اس کے آیندہ کے بارے میں پوچھنے لگے کہ اب وہ آگے کیا کرنا چاہتا ہے۔ تعلیم جاری رکھے گا یا ملازمت کا ارادہ ہے۔ اثنائے گفتگو اس کی شاعری کے بارے میں بھی بات نکل آئی۔

''سنا ہے تم شعر کہنے لگے ہو۔''

''جی ہاں۔ کبھی کبھار کہہ لیتا ہوں۔''

''شاعری کبھی کبھار کی نہیں ہوتی۔ شاعری شریفوں کا فن ہے۔ اگر اسے اختیار کرنا ہے تو وضع داری شرط ہے ورنہ ہماری طرح رہ جاؤ گے۔ نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے۔ شاعری کرنی ہے تو اسے وقت دو۔''

''اب میں پڑھائی سے فارغ ہوا ہوں۔ اب میرے پاس شاعری کے لیے وقت ہی وقت ہے۔''

''یہ لکھنو ہے صاحبزادے۔ یہاں لفظ پکڑے جاتے ہیں۔ محاورے تو لے جاتے ہیں اور تم جس خاندان کے فرد ہو اس کا احتساب تو نہایت کڑا ہوگا۔''

''کیا مجھے بات کرنی نہیں آتی۔''

''بات کرنی الگ بات ہے، شعر میں سمونا دوسری بات ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم کسی استاد کا انتخاب کرو جو تمہیں شعر کہنے کا سلیقہ سکھائے۔ شعر کہنا قدرت سکھاتی ہے سلیقہ استاد بتاتا ہے۔ تمہیں شعر گوئی کی صلاحیت خدا نے دی ہے۔ جو کچھ کہتے ہو وہ کسی استاد کو دکھاؤ۔''

''ابا جان، یہ ضرورت میں بھی محسوس کرتا ہوں لیکن لکھنو تو اساتذہ کا جنگل ہے۔ ہر شاعر کو استادی کا دعویٰ ہے۔ میں مشاعروں میں بھی نہیں جاتا کہ کسی استاد کو اپنے مزاج سے قریب دیکھوں اور اسے کلام دکھانے لگوں۔''

''میرے خیال میں تو تمہیں اپنا کلام عزیز لکھنوی کو دکھانا چاہیے۔ ان سے ہمارے خاندانی مراسم بھی ہیں۔ تمہاری اور ان کی عمر میں بھی چار چھ سال ہی کا فرق ہوگا۔ تم اپنی بات ان سے بے تکلف کہہ سکو گے۔''

''ابا جان، آپ مجھے ان کا دوست بننے کا مشورہ دے رہے ہیں یا استاد۔''

''عمر کا تذکرہ تو ضمناً نکل آیا ورنہ میری منشا یہ تھی کہ لکھنو کی شاعری اب جو رخ اختیار کر رہی ہے، جو جدت اختیار کر رہی ہے اس کے نمائندہ شاعر عزیز لکھنوی ہیں۔ کسی اور کو استاد کرو گے تو وہ تمہیں پرانی شاعری کی طرف موڑ دے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ لکھنو کی پُرتکلف شاعری کا رخ تجدد پسندی کی طرف موڑ رہے ہیں۔ تم ان کی شاگردی اختیار کر کے شاعری کی زیادہ خدمت کرسکو گے۔''

یہ وہ دور تھا جب شعر و ادب کا شعور رفتہ رفتہ بلوغت کی طرف گامزن تھا۔ غالب اور دبستان دہلی کو برا بھلا کہنے سے گریز کیا جانے لگا تھا۔ اہلِ علم کی نگاہیں صفی لکھنوی اور عزیز لکھنوی جیسے شعرا پر لگی ہوئی تھیں۔ میر اور غالب کو استادانِ غزل کا درجہ دیا جا رہا تھا۔ اسی دور میں شعوری طور پر زبان و بیان کی تمام خوبیوں، لطافتوں، مہارتوں اور فنی نزاکتوں کے ساتھ میر و غالب کا تتبع شروع ہوا۔ مرزا جعفر اس روشن خیال طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو اہلِ علم کی محنتوں پر بھی نگاہ رکھتا تھا اور مغربی ادب سے بھی واقف تھا۔ جو حالی اور آزاد کو نظرانداز نہیں کرسکتا تھا لیکن مغرب کی اندھی تقلید بھی نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے اپنے لیے عزیز لکھنوی کی شاگردی کو مناسب سمجھا۔ اس نے والد کی بصیرت کو داد دی اور ان سے کہہ دیا کہ وہ اسے عزیز لکھنوی کے پاس لے چلیں۔

''ان کے پاس چلنے کا کیا سوال، وہ آج شام میرے پاس آنے والے ہیں، میں تمہیں ان کے سامنے پیش کردوں گا۔ اب یہ بتایئے ہر شاعر کا کوئی تخلص ہوتا ہے۔ آپ نے

اپنے لیے کسی تخلص کا انتخاب کیا؟''

''ابھی تو یہ اتفاق ہوا نہیں۔ استاد نے جو تخلص بتایا اختیار کرلوں گا۔''

''صاحبزادے تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن ہم نے تمہاری پیدائش کے وقت تمہارے نام کے ساتھ تمہارا تخلص بھی رکھ دیا تھا۔ مرزا جعفر علی خاں اثر۔ اب اتنا بڑا نام لے کر کہاں پھرو گے۔ اس کا ایک جز و اختیار کرلو یعنی اثر لکھنوی بن جاؤ۔''

اسے بھی اپنے نام کی یہ تخفیف پسند آئی۔ اس دن سے وہ مرزا جعفر علی خان سے اثر لکھنوی ہوگیا۔

عزیز لکھنوی اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ عزیز لکھنوی مردانے میں آئے بیٹھے ہیں تو وہ خود ان کے پاس پہنچ گیا۔ مرزا افضل حسین بھی وہاں موجود تھے۔

''جعفر میاں شعر کہنے لگے ہیں۔'' حکیم صاحب نے عزیز لکھنوی کو مخاطب کیا۔ ''میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اس کی رہنمائی فرمائیں۔ ابھی اس کی ابتدا ہے آپ کی زیرِ تربیت اسے مشقِ سخن کا موقع ملے گا۔''

''انہیں تو شاعر ہونا ہی چاہیے تھا۔ یہ اطلاع مجھے بہت بعد میں مل رہی ہے۔ میں تو خود آپ کے گھرانے سے فیض اٹھاتا ہوں یہ تو پھر اس گھرانے کے فرد ہیں۔''

اس کے بعد عزیز لکھنوی نے ضد کر کے اس سے کلام سنا اور اپنی رائے دی۔

''اثر کو زبان دانی کا نہایت شوق ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ تخیل کے ساتھ ہے۔ حسن و عشق کے جذبات جگہ جگہ ملتے ہیں جو غزل کا تقاضا ہوتا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ابتذال اور سوقیانہ انداز سے پاک ہے۔ ذرا اور مشق و مطالعہ بڑھے گا تو تصوف اور فلسفے سے بھی شغف بڑھے گا۔ پھر ان کا کلام دیکھنے کے لائق ہوگا۔ مجھے یقین ہے یہ شاعری میں نام پیدا کریں گے۔''

یہ رائے گویا سند تھی اس بات کی کہ عزیز نے اسے اپنی شاگردی میں قبول کرنے کا اشارہ دے دیا۔ اسی وقت مٹھائی منگوائی گئی اور تقسیم کی گئی۔

''میاں کچھ غزلیں اصلاح کی نظر سے گزر جائیں تو مشاعروں کو ضرور رونق بخشیے گا۔ آپ مشاعروں کے لیے ایک اہم اضافہ ہوں گے۔''

''استاد شاعروں سے مجھے وحشت ہوتی ہے اس کے لیے مجبور نہ کیجیے گا۔''

''اے لو، یہ کیا شرط ہوئی۔ شاعر ہو اور مشاعروں میں نہیں جاؤ گے۔''

''آیندہ کے لیے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔''

''میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب اچھی طرح پختہ کار ہو جاؤ تو مشاعروں میں جانا۔''

''جی بہتر۔''

اس نے عزیز لکھنوی کی شاگردی میں بہت کچھ سیکھا۔ عزیز لکھنوی نئے زمانے کے جدید تر شاعر تھے۔ انہوں نے صنف غزل میں نئے نئے راستے نکالے تھے۔ اثر نے بھی جب ان کی رہنمائی قبول کی تو قدیم اساتذہ کی پرچھائیں بھی اپنی شاعری پر نہیں پڑنے دی البتہ ان کی لسانی خوبیوں کو فراخ دلی سے قبول کیا۔

اثر ہے نام وطن لکھنو عزیز استاد
نکالتا ہوں نئے راستے زباں کے لیے

خود اپنے استاد سے بھی بعض باتوں میں بغاوت کی۔ عزیز کی غزلوں میں لکھنو کے ماتمی ماحول کی مناسبت سے جنازہ، مرگ، مزار، تابوت اور میت و ماتم جیسے مضامین و موضوعات ملتے تھے۔ اثر نے ان مضامین سے اپنے کلام کو پاک رکھا جس سے اس کی غزل زیادہ متین، پاکیزہ اور ثقہ

خراجِ تحسین

نواب جعفر علی خاں ہمارے ملک کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن پر اردو ادب بجا طور پر ناز کرسکتا ہے۔ یوں تو عزیز لکھنوی ان ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے اردو شاعری کو چار چاند لگا دیے اور جن کے شاگردوں میں کئی اہلِ کمال ہوئے لیکن ان سب میں جتنی ہمہ گیر طبیعت اثر نے پائی اس کا جواب نہیں۔ نظم ہو یا نثر، تنقید ہو یا لسانیات، اثر صاحب کو سب پر عبور ہے۔ انہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ اردو ادب کی جو خدمت کی ہے اس سے کون اہلِ ادب واقف نہیں۔ عروسِ فطرت ان کی نیچرل نظموں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے کشمیر کے قیام کے دوران کہی تھیں۔ ان نظموں میں بھی وہی دل کشی ہے جو غزلوں میں ہے۔ دلکشی ہی کیا وہی نوک پلک بھی پائی جاتی ہے۔'' (گوپی ناتھ امن لکھنوی)

ہوگئی۔

وہ مشاعروں میں عدم شرکت کا قائل تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ شاید اس کا خاندانی پندار اسے روکتا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ مشاعروں میں پست و بلند ہر قسم کا کلام سننا پڑتا تھا اور رواج کے مطابق داد بھی دینی پڑتی تھی۔

وہ مشاعروں میں شرکت نہ کرنے کا عہد کرچکا تھا لیکن استاد کے آگے مجبور ہوگیا۔ وہ مشاعرہ گاہ میں داخل ہوا تو کئی نظریں ایک ساتھ اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اسے کون نہیں جانتا تھا۔ جو نہیں جانتے تھے انہوں نے دوسروں سے پوچھ لیا۔ اس کے باپ کو تو سب ہی جانتے تھے۔ لیکن وہ شاعر بھی ہے یہ عقدہ آج کھلا تھا۔ جب وہ اس ٹولی کے پاس جاکر بیٹھ گیا جو عزیز لکھنوی کے شاگردوں کی تھی تو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ عزیز لکھنوی کا شاگرد ہے۔ دستور یہی تھا کہ لکھنو کے ہر استاد کے شاگرد ٹکڑیوں کی صورت میں الگ الگ بیٹھتے تھے۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ شمعِ محفل حرکت میں آئی۔ ایک ایک لفظ پکڑ کر داد دی جارہی تھی۔ ایسے اشعار کثرت سے سنائی دے رہے تھے جن میں کوئی مضمون نہیں تھا محض کسی محاورے کی بندش نے شعر کو لائقِ تحسین بنادیا تھا بلکہ ایسے ہی اشعار قابلِ توجہ تھے۔ وہ اس معیار پر افسوس کررہا تھا لیکن یہی یہاں کا رواج تھا۔ اس کے خاندانی پس منظر کو دیکھتے ہوئے اسے بہت بعد میں پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اساتذہ سے مبتدی تک تمام شعرا ترنم سے کلام سنا رہے ہیں۔ اس کے پاس ترنم نہیں تھا۔ اس نے سیدھے سادے طریقے سے تحت اللفظ کلام سنانا شروع کیا۔ ایک ہاتھ سے شیروانی کا کونا مسل رہا تھا۔ یہ معلوم ہورہا تھا جیسے اس پر گھبراہٹ طاری ہو۔ یہ اس کی گھبراہٹ نہیں تھی بلکہ اس کی عادت تھی جو آخر دم تک قائم رہی۔ دو چار شعر پڑھنے کے بعد اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی۔ داد سے بے نیاز اپنا کلام سنائے جارہا تھا۔ جیسے کلام سنا کر جانے کی جلدی ہو یا پھر مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ کلام سنانے کی کوشش کررہا ہو۔

اس کے کلام میں لکھنو کے طرزِ سخن کی بدعتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ابتذال اور سوقیانہ پن سے تو کلام بالکل ہی خالی تھا۔ اس کے برعکس داخلی کیفیات زیادہ تھیں۔ اہلِ لکھنو شاید اسی لیے اسے نظر انداز کررہے تھے لیکن ابھی ابتدا تھی۔ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آگے چل کر کیا رنگ اختیار کرتا ہے۔

وہ جس خانوادے سے تعلق رکھتا تھا وہاں کا کوئی شخص محض شاعر ہوکر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ گھر میں دولت کی کمی تھی بلکہ اس لیے کہ حرکت و عمل کو یہاں فوقیت دی جاتی تھی۔ اس کے والد کا کہنا تھا کہ تفریحات کے ساتھ ساتھ کسبِ معاش کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے والد اور تمام چچا نامور حکیم تھے لیکن تقاضائے وقت کو دیکھتے ہوئے اسے حکمت کی تعلیم نہیں دلائی گئی تھی۔ اب پڑھے لکھے نوجوانوں کے لیے سرکاری ملازمت میں کشش تھی۔ شاعری کے ذوق نے مطالعے کی عادت ڈال ہی دی تھی۔ اساتذہ کے دواوین کھنگال ڈالے تھے خصوصاً میر اور غالب کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کس کی پیروی کی جائے کہ سیتاپور میں ملازمت کی سبیل نکل آئی۔ وہ سال بھر تک ایم۔ اے انگریزی کا کورس پڑھتا رہا تھا۔ ایل ایل بی میں بھی داخلہ لے لیا تھا لیکن اس ملازمت میں اسے کشش نظر آئی۔ اس ملازمت میں ترقی کے مواقع تھے لہٰذا تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور وہ سیتاپور چلا گیا۔ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر اس کا تقرر ہوا۔ اس وقت یہ عہدہ کوئی معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔ جن ہندوستانیوں کو یہ عہدہ نصیب ہوجاتا تھا ان کے سر ہی نہیں پاؤں بھی آسمان سے جا لگتے تھے۔ جوانی کی ترنگ تھی اور ایسا عہدہ مل گیا تھا لیکن اس نے اپنی شرافتِ نفسی میں فرق نہیں آنے دیا۔ سراپا انکسار بنا رہا۔ انگریزی داں ہونے کے باوجود مشرقیت اس کے رکھ رکھاؤ میں رچی بسی رہی۔ گھر کی فضا خالص ہندوستانی تھی۔ کمرے میں سفید چاندنی کا فرش اس پر جابجا قالین۔ گاؤ تکیے قرینے سے رکھے ہوئے۔ وضع داری ایسی کہ بچپن میں پتنگوں کو ہاتھ لگایا تو بڑی عمر تک ڈور کو ہاتھ سے نہ رکھا۔

غریبوں اور حاجت مندوں کی اعانت زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ شاعر کا حساس دل رکھتا تھا لہٰذا کسی کی ذرا سی بھی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اس طرح ان کی مدد کرتا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

حضرت آرزو لکھنوی کی زندگی انتہائی تنگ دستی میں بسر ہورہی تھی۔ ان کی غربت دیکھ کر ان کے چند مخلصین نے یہ سوچ کر ان کا دیوان شائع کرادیا کہ اس کی فروخت سے ان کے مسائل دور ہوجائیں گے۔ اثر لکھنوی ان دنوں سیتاپور سے لکھنو آیا ہوا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ ان کا دیوان شائع ہوا ہے تو وہ ان سے ملنے ان کے گھر گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا بڑا شاعر ایسی زندگی پر مجبور ہے۔ آرزو لکھنوی نے ایک نسخہ اس کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ اس نسخے کی ورق گردانی کررہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آرزو صاحب کی کس طرح مدد کی جائے۔ وہ اس ملاقات کے بعد جدا ہوا تو سوچ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

وہ دوسرے دن تانگے میں بیٹھا اور آرزو صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ آرزو صاحب کا یہ حال کہ تواضع کے لیے پان بھی گھر میں موجود نہیں۔ اثر نے جلد واپسی کا بہانہ بنایا تاکہ آرزو صاحب کو زیادہ دیر شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ پانوں کی ڈبیا تو ہاتھ میں رہتی ہی تھی خود بھی کھایا اور آرزو صاحب کو بھی پیش کیا۔

"آپ کے پاس کچھ نسخے ہیں جو فروخت سے رہ گئے ہوں؟"

"جی ہاں۔"

"کچھ نہیں تو پچیس نسخے مجھے دے دیجیے میں دوستوں میں تقسیم کردوں گا۔"

"بہت بہتر۔"

آرزو صاحب نے نسخے ان کے سامنے رکھ دیے۔ اثر نے ان نسخوں کی قیمت ادا کی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ آرزو صاحب یہ دیکھ ہی نہیں سکے کہ اثر ان نسخوں کو اپنے ساتھ لے جارہے ہیں یا نہیں۔ وہ اسے دروازے تک چھوڑ کر واپس آئے تو دیکھا وہ نسخے اسی طرح رکھے ہوئے ہیں۔ آرزو صاحب نے سوچا وہ بعد میں کسی وقت ملازم کو بھیج کر منگوالیں گے۔ یہ سوچ کر انہوں نے ان نسخوں کو اٹھایا تاکہ حفاظت سے رکھ دیں۔ ان نسخوں کے نیچے ایک لفافہ رکھا تھا جو اثر نے کسی وقت رکھ دیا ہوگا۔ آرزو صاحب نے لفافہ کھولا۔ اس میں پچیس روپے کے نوٹ تھے جو ان نسخوں کی اصل قیمت کے علاوہ تھے کیونکہ اثر نے قیمت پہلے ہی ادا کردی تھی۔

یہ تھا اس کی امداد کا طریقہ۔

سیتاپور میں اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ وسائل بھی بڑھ گئے تھے۔ اب وہ بڑے پیمانے پر کتابیں خرید اور پڑھ سکتا تھا۔ اس نے غالب اور میر کا مطالعہ خاص طور پر کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میر رومانوی شاعر ہے اور غالب کلاسیک۔ میر کی شاعری میں شخصیت جھلکتی ہے۔ غالب کی شاعری کردار کی آئینہ دار ہے۔ غالب کی شاعری غور و فکر سے وجود میں آئی ہے۔ میر کی شاعری وجدان کی سرکردگی میں جذبات و واردات کی حضوری ہے۔

عزیز لکھنوی نے لکھنو کی پُرتکلف غزل کا رخ تجدد پسندی کی طرف موڑ دیا تھا۔ اثر نے اس تجدد پسندی کو کلامِ میر کی سادگی سے ملانے کی کوشش کی۔ میر و غالب کا موازنہ کرتے وقت جب اس نے میر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو اس سادگی پر ایمان لے آیا۔

اثر ہوں میر سے نادیدہ بیعت
نہ کیوں تاثیر ہو میرے سخن میں

اثر نے میر کی شعوری پیروی کی اور میر کا سا شیوۂ گفتار اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اثر آفرینی پیدا نہ ہوسکی جو میر کا خاصہ تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی زندگی عیش و عشرت میں گزری تھی اور اب ڈپٹی کلکٹر تھا۔ ٹھاٹ باٹ سے گزر رہی تھی۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں میر کا سا قلندرانہ مزاج کہاں سے لاتا۔ اس نے تو مفلسی کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔ اس نے میر کے رنگ میں چلنے کی کوشش کی تو بس اسی حد تک جاسکا۔

ایک اجڑا دیار ہوں میں
آگے آیا ہے سب کیا میرا
ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے
آنسوؤں میں یہ رنگ جب آیا
دل کا رونا کھیل نہیں ہے منہ کو کلیجا آنے دو

"خراجِ عقیدت"

نواب جعفر علی خاں اثر مرحوم کے اٹھ جانے سے شرافت و شفقت اور شعر و ادب کے اعلیٰ اقدار اور پاکیزہ روایات کی پوری محفل اٹھ گئی۔ وہ لکھنو کی تہذیبی گراں مایگی کا بے مثل نمونہ اور نمائندہ تھے۔ انہوں نے اردو زبان اور شعر و ادب کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھا اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔ انہوں نے حال کے آشوب میں ماضی کی اہمیت کو واضح کیا۔ اپنی سیرت و شخصیت ہی سے نہیں اپنے فکر و فن سے بھی۔ ان کے دم سے شعر و ادب کے بڑوں کا بول بالا تھا۔ آج وہ خود ان بڑوں سے جاملے۔ خدا ان کی خدمات میں ان کو ہمیشہ سرفراز رکھے اور اپنی رحمتوں کی آغوش میں لے۔

(رشید احمد صدیقی)

تھمتے تھمتے اشک تھمیں گے ناصح کو سمجھانے دو

وہ کوشش کے باوجود میر جیسی تپش اور سوز تو پیدا نہ کرسکا لیکن اس پیروی نے اسے یہ فائدہ ضرور پہنچایا کہ میر کی سادگی اس کے کلام کا حصہ بن گئی۔ اس نے لکھنوی کی پیچیدہ زبانی سے نجات حاصل کرلی۔

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے
مستی میں چھوا صبا نے دامن
نہ کھلنے پہ بھی میرے دل کی کلی
گلِ تر کی صورت مہکتی رہی
نازک لبوں پر ہلکی سی لرزش
کھلتی کلی یا رتی گلابی
وہ پیچ وخم ساحل وامواج کا عالم
آئینے میں گیسو کوئی معشوق سنوارے
اک بار نقاب رخ الٹ دی
تھی اور ہی شان انجمن کی
انگڑائی جو کہکشاں کو آئی
بھیگی ہوئی رات کسمسائی

☆☆☆

وہ ملازمت کے سلسلے میں سیتا پور میں تھا۔ لکھنو آتا جاتا ضرور رہتا تھا لیکن والدین کو یہ احساس ضرور رہتا تھا کہ وہ نوجوان ہے، خوبصورت ہے، اچھی ملازمت ہے کہیں اچھی تربیت کے باوجود بھٹک نہ جائے۔ اب اس کی شادی ہوجانی چاہیے۔ مرزا افضل حسین کو تو ابھی جلدی نہیں تھی لیکن والدہ کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔

’’میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اگر اس کا سہرا بھی نہ دیکھا تو زندگی میں کیا دیکھا۔‘‘

’’سوچتا تو میں بھی یہی ہوں کہ اس کی شادی ہو اور میں خوب دل کے ارمان نکالوں۔‘‘

’’سوچتے ہی رہیں گے یا کوئی عملی قدم بھی اٹھائیں گے۔ اب ہمارا تمہارا زمانہ نہیں رہا۔ وہ سیتا پور میں اکیلا ہے۔ اگر کوئی لڑکی پسند کرلی تو خاندان میں دھبا لگ جائے گا۔‘‘

’’وہ ایسا ہے نہیں۔ جو کچھ کرے گا سوچ سمجھ کر کرے گا۔‘‘

’’بعض دفعہ انہونی بھی ہوجاتی ہے۔‘‘

’’اچھا، تم کہتی ہو تو میں نظر دوڑاتا ہوں۔ شاید کوئی ہمارا ہم پلہ خاندان ایسا مل جائے جہاں اس کے رشتے کی بات چلائی جائے۔‘‘

’’دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ عابد بھائی کی بیٹی فاطمہ موجود ہے۔ گھر کی بچی گھر میں رہے گی۔‘‘

’’ارے ہاں، یہ تم نے خوب یاد دلایا لیکن کوئی بات شروع کرنے سے پہلے ہمیں جعفر سے بھی معلوم کرلینا چاہیے۔‘‘

’’اس سے کیا پوچھنا۔ ایسی باتیں کوئی بچوں سے کرنے کی ہوتی ہیں۔‘‘

’’خود ہی کہتی ہو کہ اب ہمارا تمہارا زمانہ نہیں رہا اور خود ہی کہہ رہی ہو ہمیں جعفر سے نہیں پوچھنا۔‘‘

’’وہ کیوں انکار کرنے لگا تھا۔‘‘

’’مجھے بھی امید ہے وہ انکار نہیں کرے گا لیکن پوچھنا چاہیے بلکہ میں تو عابد سے بھی کہوں گا کہ وہ فاطمہ سے پوچھ لے اس کے بعد ہی بات آگے بڑھائی جائے۔‘‘

’’اے لو، اب یہ بھی کرو گے۔ لڑکیوں کا ان معاملوں میں کیا دخل۔‘‘

’’رسمی ہی سہی۔ اس کی اجازت بھی ضروری ہے۔‘‘

انہوں نے سوچا جعفر تو نہ جانے کب آئے۔ وہ خود ہی سیتا پور چلے گئے۔ انہوں نے اس سے بات کی۔ جعفر نے پہلے تو اپنی مصروفیت کا جواز پیش کیا لیکن پھر مان گیا۔

’’آپ یہ فرمائیں۔‘‘ اس نے والد سے کہا۔ ’’آپ میری شادی کرنا چاہتے ہیں، آپ نے کسی لڑکی کا انتخاب کیا ہے پھر یہ کیوں پوچھتے ہیں۔ آپ جہاں کہیں گے شادی کرلوں گا۔‘‘

’’تمہاری سعادت مندی کا یہی جواب ہونا چاہیے لیکن پوچھنا ہمارا فرض ہے۔‘‘

اس سے اجازت لینے کے بعد وہ لکھنو آئے اور بھائی حکیم عابد حسین سے بات کی۔

’’تم اپنی بیوی سے کہو وہ فاطمہ کے کان میں یہ بات ڈال دے۔ اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم تاریخ وغیرہ طے کریں۔‘‘

’’بھائی صاحب، جعفر میرا بھتیجا ہے۔ فاطمہ کے لیے بھی وہ کوئی غیر نہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہوا ہے۔ وہ انکار کیوں کرنے لگی۔‘‘

’’تم نہیں سمجھتے ان باتوں کو۔ کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہوئی تو وہ یہ تو نہیں کہہ سکے گی کہ مجھ سے کسی نے پوچھا نہیں تھا۔ اس کی رضامندی شامل ہونی چاہیے۔ ہمارا مذہب بھی یہی کہتا ہے۔‘‘

دونوں بھائیوں کی رضامندی سے فاطمہ بیگم اس کی رفیقۂ حیات بن کر اس کے گھر آگئی۔ اثر اس معاملے میں بھی خوش قسمت رہا۔ بیوی ملی تو ایسی کہ اس کی زندگی کو مسرتوں سے مالا مال کردیا۔ وہ شاعر تھا۔ طبیعت میں از حد بے پروائی تھی خصوصاً پیسے کوڑی کے معاملات، ذرا عقل نہیں تھی۔ جس نے جتنا مانگا اٹھا کر دے دیا پھر تقاضا کرنا بھی بھول گیا۔ فاطمہ بیگم نے آتے ہی اس کی زندگی میں نظم وضبط پیدا کردیا۔ پھر دوستوں نے دیکھا کہ وقت کی پابندی نے اس کی زندگی میں جگہ بنالی۔ چھت پر جمع ہونے والی چڑیوں کو دانہ ڈالنے سے صبح کا آغاز ہوتا۔ پھر چائے پیتا اور کچہری چلا جاتا۔ یہ بھی اس نے فاطمہ ہی سے سیکھا تھا کہ دفتر کا کام دفتر ہی میں چھوڑ آئے۔ گھر میں دفتر کے کاموں کا ذکر تک نہ ہوا البتہ کوئی غریب حاجت مند اپنی فریاد لے کر گھر آجاتا تو اس سے ملنے میں مضائقہ نہیں تھا۔ مشاعروں میں جانا اسے یوں بھی پسند نہیں تھا، شادی کے بعد بالکل ہی ترک ہوگیا۔ ہندوستان سے خصوصاً لکھنو سے شائع ہونے والے اخباروں میں اس کا کلام باقاعدگی سے شائع ہوتا رہتا تھا۔

☆☆☆

جیسے جیسے اس کی عمر اور مشق سخن بڑھتی گئی ویسے ویسے اس کے کلام میں لکھنوی شاعری کی بدعتیں کم ہوتی گئیں۔ لکھنوی شاعری میں جوڑ توڑ اور داؤ پیچ کی فضا ملتی تھی۔ شاعری لفظوں کی بازیگری کا نام ہوگیا تھا۔ اس کی شاعری داخلی کیفیات کا دوسرا نام تھا مگر اس کی ان ساری خصوصیات کے باوجود اسے نظر انداز کیا جارہا تھا۔ اس کا اسے دکھ تھا۔ اسے زود نویسی کی عادت تھی۔ طویل غزلیں کہتے ہوئے بھرتی کے اشعار بھی آجاتے تھے۔ اس کے مخالفین ان بھرتی کے اشعار کو نمایاں کرکے اس پر تنقید شروع کردیتے تھے۔ بامعنی اشعار اس شور میں دب جاتے تھے۔ اس پر توجہ کی آنکھ نہ پڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا کوئی گروپ نہیں تھا جو اس کی تعریف میں آوازیں بلند کرتا رہتا۔

زبان اور اس کے مسائل پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس کا ایک سبب تو اس کا خاندانی پس منظر تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے جب ہوش سنبھالا تو لکھنو میں لسانی بحثیں عروج پر تھیں۔ وہ خاموشی سے ان الفاظ اور محاورات کو جذب کرتا رہا تھا۔

اردو زبان کے رموز پر عالمانہ قدرت رکھنے کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ کوئی شاعر اپنے فن پاروں میں دلکش زبان استعمال کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہو۔ دونوں الگ الگ صلاحیتیں ہیں۔ اثر کی یہ خصوصیت تھی کہ اسے زبان پر جتنا عبور تھا اس سے زیادہ اس زبان کو استعمال کرنے کا سلیقہ بھی تھا۔ یہ اس کی شعوری کوشش ہی تھی کہ متقدمین کی پیروی کے باوجود اس کی زبان ان سے زیادہ صاف اور سلیس تھی۔ ناسخ کے دور میں زبان اور اچھی زبان کو رواج دینے کے معنی یہ تھے کہ ہندی الفاظ کو نکال کر فارسی الفاظ کو رواج دیا جائے۔ ان کوششوں سے لکھنوی شاعری میں ہندوستانیت کم ہوگئی تھی۔ یہ اعتدال کا نہیں تعصب کا راستہ تھا۔ اثر نے اس کی مخالفت کی۔

’’دوسری زبانوں کے الفاظ خصوصاً ہندی کے الفاظ سلیقے کے ساتھ لے کر داخل کیجیے لیکن یہ دھیان رہے کہ زبان کا سانچہ نہ بگڑنے پائے۔‘‘ (اثر لکھنوی)

اس نے صرف یہ دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ اپنے اشعار میں ہندی الفاظ استعمال کرکے دکھا بھی دیا۔

’’پتر کا جواب جب نہ پایا
منہ رنج کے مارے تمتمایا
ہلکان ہوئی جو روتے روتے
سنولا گئی شام ہوتے ہوتے
کلیاں کھلتے جھجک رہی ہیں
اندر اندر مہک رہی ہیں
جو ڈھیٹ ہیں وہ چٹک رہی ہیں
کچھ تیوری چڑھائے بلک رہی ہیں
ہنس مکھ ہیں جوان بچے بوڑھے
میلے کپڑوں میں بھی سجیلے
دوشیزہ شگوفہ یاسمن کا
چلتا ہوا سحر بھولے پن کا
اف وہ سجاوٹ اف وہ لگاوٹ
لینے بلائیں لپکا پانی
غرور کونپل کو ہے پھبن پر تو ناز پھولوں کو بانکپن پر
بنے ٹھنے بیٹھے ہیں شگوفے کلی کلی اک دلہن ہے
بناؤ ایسا سنگھار ایسا اور اس پہ اُف اُف یہ تنگ پوشی
کسی کا مونڈھا چلا ہوا ہے کسی کی چولی چسی ہوئی ہے

نظیر اکبر آبادی کے کلام میں ہندی الفاظ کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ فراق نے اپنی رباعیوں میں بھی اسے رواج دیا لیکن لکھنوی ہوتے ہوئے اس زبان کا استعمال، یہ اثر کی انفرادیت تھی جسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اسے صرف

غزل گو سمجھا گیا جبکہ ایک ماہر زبان کی حیثیت سے بھی اس کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ زبان و بیان کی خامیوں کی نشاندہی اس کا مشغلہ تھا۔ اس نے لسانیات کے موضوع پر بے شمار مضامین لکھے جو تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ بعد میں یہی مضامین ''فرہنگ اثر'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کی وجہ نزول جلال لکھنوی اور نیر کاکوروی کے فرہنگی تسامحات کا تنقیدی جائزہ تھا لیکن اس کی ایک انفرادی حیثیت اس لیے بن گئی کہ اس میں کئی نادر تحقیقات اور بحثیں شامل تھیں۔

اس کتاب کی اشاعت سے وہ غلط فہمیاں تقریباً دور ہوگئیں جو الفاظ ومحاورات کے بارے میں رائج ہوگئی تھیں اور صحت کا درجہ حاصل کرگئی تھیں۔

اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدرت نے وسائل بھی دیے تھے۔ فرصت بھی تھی اور قسمت سے بیوی بھی ایسی ملی تھی جو اس کی کتاب کے درمیان کبھی حائل نہیں ہوئی۔ عربی سے شغف کم تھا لیکن فارسی پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی ادب بقول شخصے گھول کر پی لیا تھا۔ انگریزی کے توسط سے کئی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ اس قدر مطالعے نے اس کے تنقیدی شعور کی تعمیر کی۔ اس کے اسی ذوق نے شاعر کے ساتھ ساتھ اسے نقاد بھی بنا دیا۔ اس کی رہنمائی ان علوم نے کی جو اس نے حاصل کیے تھے۔ وہ مشرقی اور مغربی علوم کا ماہر تھا۔ مشرق ومغرب کی خامیوں اور خوبیوں سے واقف تھا۔ قدیم وجدید ادب کے جمالیاتی پہلو اور جدید ادب کی افادیت اس کے سامنے تھی۔ اس نے ان معلومات کو جب نثر کی صورت میں اجاگر کیا تو وہ اس کی تنقید کہلائی۔ اس نے اظہار رائے کے لیے مضامین لکھے۔ یہی مضامین یکجا ہوکر کتابی شکل میں سامنے آئے۔ ''چھان بین' مطالعہ غالب، اثر کے تنقیدی مضامین ' انیس کی مرثیہ نگاری اس کی تنقیدی کتابیں ہیں۔ انہی خیالات کا عملی نمونہ اس کی شاعری تھی۔

وہ بنیادی طور پر شاعر تھا اور شاعر بھی ایسا جو زبان اور محاوروں کا ماہر تھا لیکن نہایت پُرگو تھا۔ اتنے زیادہ اشعار کہے کہ اچھے برے سب ایک ہوگئے۔ اتنی فرصت نہ اسے ہوئی نہ دوسروں کو کہ اس کی شاعری کا انتخاب ہو جاتا۔ غالب اور میر کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ غالب کا انتخاب شائع ہوا لہٰذا جو شائع ہوا لاجواب شائع ہوا۔ اس کے برخلاف میر نے جو کہا رطب و یابس سب شائع ہوگیا۔ بلند و پست سب دنیا کے سامنے آگیا۔ اس لیے میر بھی فن کی بلندیوں پر نظر آتا ہے کبھی نیچے گر جاتا ہے۔ یہی اثر لکھنوی کے ساتھ بھی ہوا۔ اس سے مقصد اسے میر تقی میر ثابت کرنا نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک مشابہت تلاش کرنی ہے حالانکہ اسے ''میر ثانی'' بھی کہا گیا۔

میر ثانی بھی اٹھ گیا افسوس
لکھنو آج بے چراغ ہوا

اثر کا تنقید کے میدان میں خاص و تیرا تحقیق و جستجو ہے۔ اس کی تنقید کا محور ومرکز شاعری اور شاعر تھا۔ کسی شاعر پر لکھتے ہوئے وہ اس کے کلام کا عارف بن جاتا تھا۔ سرسری نگاہ نہیں ڈالتا تھا یا صرف اس سے نہیں بہل جاتا تھا کہ کیا خوب کہا ہے بلکہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ کس طرح کہا ہے۔ تنقید میں وہ کسی مکتب فکر کا ترجمان نہیں تھا۔ وہ تو بس معیاری اور غیر معیاری کا فرق ظاہر کرنے کے لیے تنقید لکھ رہا تھا۔ اس نے ایک جگہ لکھا تھا۔

''میں تنقید میں کسی خاص اسکول یا اصول کا پابند نہیں ہوں گو اس موضوع پر اکثر کتب قدیم وجدید کا مطالعہ کیا ہے۔ جو کچھ پڑھتا ہوں اپنے ذوقِ وجدان کی رہبری میں اس کو جانچتا ہوں اور جو خوبیاں خامیاں نظر آتی ہیں مع وجوہ و دلائل پسندیدگی و ناپسندیدگی بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کسی سے ذاتی عناد یا پرخاش نہیں البتہ شخصیت سے مرعوب ہونا نہیں آتا۔''

وہ بڑی خوبی سے شعری سفر طے کر رہا تھا کہ ادبی سیاست نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس پر بعض گروہوں کی جانب سے ایسے اعتراضات کیے گئے جن کے جواب دینا اس کے لیے ضروری ہوگیا۔ دوسری جانب سے بھی جواب آئے اور اس جواب در جواب میں وہ بہت دن الجھا رہا۔ اس کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ اس کے تنقیدی مضامین میں اضافہ ہوا لیکن اس کی تخلیقی صلاحیتیں متاثر ضرور ہوئیں۔ کم از کم تین گروہ ایسے تھے جو فراق، جوش اور نیاز فتحپوری کی سربراہی میں کام کر رہے تھے۔ یہ حضرات معمولی حیثیت کے نہیں تھے۔ ان کے اعتراضات کے جواب دینا معمولی بات نہیں تھی جبکہ اثر کو ان تین محاذوں پر اکیلے لڑنا پڑ رہا تھا۔

فراق گورکھپوری پُرعشق شاعر بھی تھے اور نقاد بھی۔ وہ اپنے پورے ادبی گروہ کے ساتھ اثر کی شاعری پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ اثر کو ان باتوں کا جواب دینا ضروری تھا۔ فراق جیسے شاعر کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ اگر نشاندہی نہ کرتا تو یہ غلطی یونہی رائج ہو جاتی اور فراق کا حوالہ دیا جاتا۔ اثر کے لیے لازم تھا کہ وہ بتائے کہ فراق بھی غلط ہو سکتے ہیں۔

فراق کا مجموعہ رباعیات ''روپ'' شائع ہوا تو اثر نے اس پر سخت گرفت کی۔ یہاں مسئلہ لسانی مشکلات کا تھا لہٰذا اثر کو پورا موقع مل گیا۔

''مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ''روپ'' کی 35 رباعیوں میں مشکل سے دو ایک ایسی ہوں گی جس میں شاعرانہ لطافت اور بانکپن ہے، باقی یا تو پوری کی پوری ناقص ہیں یا جز خام ہے۔''

اثر کی طبیعت میں انصاف بھی تھا اور اعتدال بھی لہٰذا فراق کے کلام میں جو رباعیاں اچھی تھیں انہیں پسند بھی کیا اور جی کھول کر سراہا بھی۔

یہ انصاف پسندی اس وقت نظر آئی جب اس نے جوش کے کلام پر اپنی رائے دی۔ جوش نے اثر کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلائی ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تو جوش میں ہزارہا خامیاں نکال کر اچھال سکتا تھا، یہی انصاف کا تقاضا بھی تھا کہ جوش کے کلام کی تعریف کی جائے۔ اس نے اختلاف کے باوجود تعریف کی۔

''اردو شاعری کا دورِ جدید حالی اور آزاد کے زمانے سے شروع ہوا۔ ان حضرات نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نثر کی عبارت کو نظم کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ شاعرانہ زبان کا لوچ اور نزاکت ناپید ہے۔ ڈاکٹر اقبال پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفیانہ خیالات کو شاعرانہ لطافتوں اور رعنائیوں سے مزین کرکے پیش کیا۔ اس رنگ میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جوش کے سوا ان کا کوئی حریف نہیں۔ اقبال اور جوش کا موازنہ مقصود نہیں صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ اقبال کے خیالات میں عمق (گہرائی) زیادہ ہے لیکن جہاں تک زبان کی سحر کاریوں، تشبیہات، استعارات اور اسالیب بیان کا تعلق ہے جوش اقبال سے بھی پیش پیش ہیں۔''

اثر کی مخالفت میں کئی گروہ ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ ان میں ایک نیاز فتحپوری اور ان کے حاشیہ بردار بھی تھے۔ نیاز صاحب کسی موضوع پر ایک دو مضامین تحریر کرتے۔ اس کے بعد یا تو وہ خود مضامین لکھ کر ان حضرات کے ناموں سے شائع کراتے یا یہ حضرات خود بحث کو طول دینے کے لیے مضامین کی بوچھاڑ کر دیتے۔ جس کے خلاف یہ مضامین تحریر ہوتے وہ بوکھلا کر رہ جاتے لیکن اثر ان بوکھلانے والوں میں نہیں تھا۔ اس کا مطالعہ، اس کی تنقیدی نظر اس کے قلم کی سحرکاری ان مضامین کے جواب تحریر کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ہر مضمون کے جواب میں مضمون شائع کرتا اور ادبی دنیا میں ہلچل سی مچی رہتی۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے انیس کی مرثیہ نگاری پر چند اعتراضی مضامین لکھے جو ''نگار'' میں قسط وار چھپتے رہے۔ احسن فاروقی کو نیاز فتحپوری جیسے ادیب کی پشت پناہی حاصل تھی بلکہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ یہ تحریریں نیاز کے قلم سے ادا ہوئی ہیں اور احسن فاروقی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔

اثر نے ان مضامین کا بروقت اور مدلل جواب دیا۔ احسن فاروقی نے انیس پر جو اعتراضات کیے تھے ان کا بھرپور دفاع کیا۔ اس کے یہ مضامین ''نگار'' ہی میں شائع ہوئے اور بعد میں کتابی شکل میں ''انیس کی مرثیہ نگاری'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

اثر کمال کا ذہن رکھتا تھا۔ ایک طرف نوکری میں سرکھپا رہا تھا، دوسری جانب اشعار کے موتی رول رہا تھا۔ طویل غزلیں اور نظمیں لکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اتنا وقت بھی نکال لیتا تھا کہ اپنے ہم عصروں اور قدما کی کاوشوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان پر اپنی رائے تحریر کرتا اور کہیں شائع کرنے کا اہتمام کرتا۔ جو مناقشے اس کی ذات سے وابستہ تھے وہ الگ تھے۔

غالب اور میر کے بعد مومن اس کا پسندیدہ شاعر تھا۔ اس نے نہ صرف اس کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا بلکہ مکمل ترین تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا۔

''مومن کی شاعری میں چند ایسی خصوصیات ہیں جو اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں۔ اس نے اپنے دائرۂ تخیل کو بہت محدود کر دیا ہے۔ مسائلِ تصوف و سائنس یا فلسفہ کے بارے میں کہنا چاہیے کہ جھلک بھی نہیں۔ صرف ایک مشاہد مجازی سے محبت ہے اور اس کے تمام لوازم ہیں۔ تاہم اس محدود دائرے میں اس نے حیرت انگیز جدت اور تنوع سے کام لیا ہے کہ جو شعر ہے نیا ہے اور اس کے ساتھ بے حد دلکش...... جس خوبی سے وہ اپنا تخلص استعمال میں لاتے ہیں دوسرے شاعر کو یہ بات نصیب نہیں ہے۔ مومن کے دیوان میں ایک شعر بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس کی بندش سست ہو یا اندازِ بیان شاعرانہ نہ ہو۔ فن کے لحاظ سے بھی شاعری کی معراج ہے۔ مومن کو زبان پر ایسی قدرت ہے اور

فطرت انسانی کا ایسا گہرا مطالعہ ہے کہ واردات قلبیہ کو شکل دے کر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔" (اثر لکھنوی)

مومن کے بارے میں وہ خیالات تھے، وہ تجزیہ تھا جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ مومن کی جو خصوصیات اس نے متعین کر دیں لوگ آج تک انہی کو دہرائے جاتے ہیں۔

وہ مومن سے اتنا متاثر تھا کہ مومن کے رنگ میں شعر کہہ کر اپنے کلام میں شامل کیے۔ اس کے کلام میں اس طرز کے اشعار کثرت سے مل جاتے ہیں۔

آج کچھ مہربان ہے صیاد
کیا نشیمن بھی ہو گیا برباد
پوچھنے والے دردِ پنہاں کے
اپنے چہرے کا رنگ بھی دیکھا
حسرتیں دل کی پوچھنے والے
تیرے طرزِ سوال نے مارا
گلوں کی گود میں جیسے نسیم آ کر مچل گئی
اسی انداز سے ان پُرخمار آنکھوں میں خواب آیا

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر اچھا شاعر، ناقد بھی ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ شعر کہنے کے بعد شاعر اس پر ناقدانہ نظر ضرور ڈالتا ہے اور اسی تنقیدی نظر کے باعث وہ اس شعر میں کاٹ چھانٹ کرتا ہے لیکن بعض شعرا اپنی شاعری کی طرح تنقید کو ایک الگ صنف کے طور پر اسے فنی اور ادبی مرتبہ عطا کرتے ہیں۔ اپنے اشعار کے علاوہ دوسروں کے اشعار پر بھی تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ وہ چونکہ شاعر تھا اس لیے اس کی تنقیدی دنیا میں شاعر ہی آباد رہے۔ اس نے ہر اس شاعر پر قلم اٹھایا جس کے یہاں فنی محاسن نظر آئے۔ اگر اس شاعر کی مخالفت پر آوازیں بلند ہوئیں تو اس نے اس کا دفاع کیا۔

ڈاکٹر محمد اقبال کی دوسری تصنیف "بالِ جبریل" شائع ہوئی تو اس پر طرح طرح کی تنقیدیں کی جانے لگیں۔ معمولی سے معمولی افراد اقبال جیسے عظیم شاعر پر انگلیاں اٹھانے لگے اور اعتراض کو اپنا حق سمجھنے لگے تو اثر کا قلم خاموش نہ رہ سکا۔

اس نے ایک مضمون بالِ جبریل کی تائید میں لکھا لیکن تنقید کی تاریخ میں یہ مضمون اس ہنر سے لکھا کہ اقبال کی حمایت بھی ظاہر نہ ہو اور بال جبریل کے دوبارہ مطالعے کو جی چاہنے لگے۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ اس تصنیف کو بار بار پڑھا جائے تب اسے سمجھا جائے گا۔ اس مضمون کو اس طرح لکھا کہ غیر محسوس طریقے سے قاری وہ سب کچھ کرے جو وہ چاہتا تھا۔ "بانگِ درا کے بعد ڈاکٹر اقبال کی دوسری تصنیف اردو میں بال جبریل کے نام سے شائع ہوئی۔ عام خیال ہے کہ بال جبریل ہر اعتبار سے بانگ درا سے پست اور مایوس کن کتاب ہے۔ سطحی نظر جو چاہے فیصلہ کرے غائر بیں نگاہیں بال جبریل میں شاعر کے تخیلی ارتقا کی بلند تر منزلیں دیکھتی ہیں۔ خیالات بانگِ درا کی بہ نسبت زیادہ گہرے اور دقیق ہیں جن پر عبور کے لیے وقت درکار ہے۔"

اس کے بعد بھی اس نے دیگر مضامین کے ذریعے اقبال پر اٹھنے والے اعتراضات کے مدلل جواب دیے۔ اقبال کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے اقبال کے اشعار کی اس طرح تشریح کی کہ دلوں پر اقبال کا سکہ بٹھا دیا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ پنجاب سے باہر اقبال کو روشناس کرانے کا سہرا اسی کے سر تھا۔

اثر کی تنقید نگاری کا حسن ہی یہ تھا کہ کہیں بھی جانب داری کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا۔ جہاں خامیاں نظر آئیں وہاں سخت باز پرس کی، جہاں خوبیاں دکھائی دیں انہیں خوب سراہا۔ جہاں یہ کہا کہ اقبال کے مقابلے میں جوش زبان و بیان کے اعتبار سے برتر ہیں وہیں یہ بھی کہا کہ ان کے کلام میں گہرائی نہیں اور جوش کی اس خوبی کو اس وقت سراہا جب وہ اثر کے خلاف محاذ آرائی پر تلے ہوئے تھے۔

نظیر اکبر آبادی ترقی پسندوں کا محبوب شاعر رہا تھا لیکن جب وہ اس کے مطالعے میں آیا تو اس نے یہ نہیں سوچا کہ یہ کس قبیلے کا شاعر ہے۔ اس کا جو حق تھا اسے دیا۔ اپنے مضمون "نظیر اکبر آبادی پر ایک سرسری نظر" اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

"جس طرح اردو غزل کا باوا آدم ولی دکنی ہے اردو نظم کی اولیت کا سہرا نظیر اکبر آبادی کے سر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ولی سے پہلے اردو غزل میں اور نظیر سے پہلے نظم کا وجود نہ تھا۔ صرف مدعا یہ ہے کہ یہ چیزیں تکمیل کے اس درجے تک نہیں پہنچی تھیں جہاں سے ایک مستقل شاہراہ نکلتی ہے نظیر سے قبل بھی اردو شاعری میں بیانیہ نظم کے نمونے ملتے ہیں مگر ان کی حیثیت ضمنی تھی۔ نظیر نے اس قسم کی شاعری کو خاص موضوع بنا کر دادِ سخن دی...... نظیر کی انسان دوستی نے اس کو وہ مرتبہ دلایا ہے جو تا ابد اس سے نہیں چھینا جا سکتا اور انسان دوستی اور عوام پرستی ہی وہ مخزن ہے جہاں سے نظیر شاعری کے لیے قوت اور صداقت کے موتی چنتا ہے۔"

چکبست ایک وطن پرست شاعر تھے اور وطن ہندوؤں کا بھی تھا مسلمانوں کا بھی لیکن ایک متعصب گروہ ایسا سامنے آ رہا تھا جو یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ چکبست ہندوؤں کا شاعر ہے اور اس کا کلام ہندوازم کے فروغ کا ذریعہ ہے جبکہ اثر کا عقیدہ یہ تھا کہ شاعر ہندو یا مسلمان نہیں ہوتا وہ تو انسانیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ کسی گروہ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے خصوصاً چکبست کے ساتھ تو یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ اس نے چکبست کے کلام کا از سر نو جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا۔

"چکبست کا کلام اس کے کردار کا آئینہ ہے۔ انتہائی غیرت اور خودداری کے باوجود کبر و نخوت کا شائبہ نہیں، اس کا کلام مبالغہ سے پاک اور حقیقت سے قریب تر ہے۔ شدید جذبۂ حب وطن جاری ہے۔ چکبست کا کلام پڑھیے۔ آپ اعتراف کریں گے کہ وہ وطن کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا اور اس محبت میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے اور وہ زبان اردو کو مسلمان اور ہندوؤں دونوں کی زبان سمجھتا تھا۔"

وہ اتنے مضامین لکھنے کے بعد نقادانِ فن کی صفِ اول میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ ایک نقاد میں جو خوبیاں ہونی چاہیے تھیں وہ سب ان میں موجود تھیں۔ فیصلے کی پختگی، غیر جانب داری، کثرت مطالعہ، کھرے کھوٹے کی تمیز، دلفریب نثر غرض وہ سب کچھ تھا جو تنقید کے لیے ضروری ہوتا ہے۔"

اس نے اردو کتابوں سے نہیں سیکھی تھی بلکہ اس کے لیے لغات کھنگال ڈالی تھیں، علم عروض پر عبور تھا۔ فارسی اور انگریزی سے واقفیت نے اس کے اسلوب کو گنگا جمنی بنا دیا تھا۔

دنیا بھر کا ادب پڑھنے کے بعد بھی لکھنو کی روایات اسے عزیز تھیں۔ وہ جب بھی ان پر زک پڑتے دیکھتا اس کا قلم حرکت میں آ جاتا تھا۔ ہندوستان میں..... ترقی پسند ادب کو فروغ ہوا اور ادب کو پرکھنے کے لیے نئے معیارات سامنے آئے۔

یہ ثابت کیا جانے لگا کہ ادب سماج کی پیداوار ہے اور انقلاب لانے کا باعث بننا چاہیے۔ ان خیالات کے نتیجے میں بعض ادیبوں نے حقیقت بیان کی مگر حقیقت کی جمالیات کو فراموش کر دیا۔ معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے من وعن بیان کرنا ترقی پسندی کہلایا۔ ہر قدیم چیز سے بغاوت کی جانے لگی۔ مذہبی روایات بھی اس کی زد میں آ گئیں۔ اثر لکھنوی ترقی پسندی، اس کے نظریات و محرکات، اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل سے متفق نہیں تھا۔ اس نے ترقی پسند ادب کے خلاف ایک طویل مضمون لکھ کر یہ قرض اتارا۔

جب اس سیلاب میں سب بہے جا رہے تھے وہ اپنی جگہ جما کھڑا تھا اور خطرات کی نشاندہی کر رہا تھا۔

"شاعری کی بہترین اقدار کو پیش نظر رکھنا اور اس کی فوقیت کے بنیادی اصول سمجھنا کسی زمانے میں اتنا ضروری نہیں تھا جتنا آج ہے۔ سستا اور عامیانہ ادب سیل درسیل امڈا چلا آتا ہے اور اس کا واحد مقصد چند لمحوں کے لیے سامانِ تفریح مہیا کرنا ہے۔ مذاقِ سلیم کا روایاتی اقتدار ختم ہو رہا ہے۔"

"ایسی شاعری جو سیاسی پروپیگنڈا اور نفرت پھیلانے کا آلہ ہے اور جو کچھ ہے ادب کے قلمرو سے خارج ہے، انسانیت کے تقاضوں اور اپنے ملک کے حالات سے خالی الذہن ہو کر اشتراکیت کے نعرے لگانا، فسطائیت کو لباسِ نو میں جلوہ دینا ہی نہیں بلکہ فسطائیت کی طرح خطرناک بازگشت ہے۔"

اسے ترقی پسند ادب کی ترجیحات سے اختلاف تھا لیکن جو شعرا ترقی پسند ہوتے ہوئے ذوق، وجدان اور فن کی پاسداری کر رہے تھے انہیں اس نے محض اس لیے رد نہیں کر دیا کہ وہ ترقی پسند ہیں بلکہ ایسے شعرا اس کی کسوٹی پر پورے اترے۔ اس نے انہیں صرف تعصب کی وجہ سے مسترد نہیں کیا بلکہ جی کھول کر ان کی تعریف کی۔ اس نے فیض کی کئی نظموں پر ایسے دلکش تبصرے کیے کہ خود ترقی پسند شعرا بھی دنگ رہ گئے۔ اس نے سردار جعفری کی نظم "نئی دنیا کو سلام" پر اس وقت تعریفی تبصرہ کیا جب دوسرے لوگ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا لکھا جائے۔ معین احسن جذبی اور مجاز بھی ترقی پسند تھے لیکن انہوں نے جمالیاتی قدروں کا دامن نہیں چھوڑا تھا لہٰذا اثر ان کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ اس کا ذہن کسی سچے ادیب کی طرح تعصب سے پاک تھا۔

☆☆☆

اس نے ڈپٹی کلکٹر سے کلکٹر کے عہدے تک ترقی کی۔ الہ آباد ڈویژن کا ایڈیشنل کمشنر بھی رہا۔ پھر اسے مہاراجا کشمیر نے اپنے پاس بلا لیا اور کشمیر کی ریاست کا وزیر ترقیات اور وزیر داخلہ مقرر کیا۔ اس کی ذہانت ہر جگہ اپنا کام دکھاتی تھی۔ یہاں بھی اس نے ایسے بے مثل کام انجام دیے کہ مہاراجا کے دل میں جگہ بنا لی۔ اپنی شرافت اور اخلاقی محاسن سے ایسا دل جیتا کہ مہاراجا اسے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا۔

کشمیر پہنچنے کے بعد اس کی شاعری میں کچھ نئے رنگ شامل ہوئے۔ ابھی تک وہ غزلوں سے دل بہلا رہا تھا۔ کشمیر

کے مناظر دیکھ کر غزلوں کا میدان ناکافی نظر آنے لگا۔ ان مناظر کو سمیٹنے کے لیے تفصیل کی ضرورت تھی جس کے لیے نظموں کا پیمانہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔ اس نے فطری مناظر پر ایسی لاجواب نظمیں تخلیق کیں کہ کشمیر اس کی نظموں میں اتر آیا۔

ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی ہے ڈلک
یا ننھی سی پری کوئی رقصاں ہے آج کل
کہسار جو یوں تنے کھڑے ہیں
اینچی ہیں کہ بات پہ اڑے ہیں
کشمیر کی مندری میں وہ نگ ہے
جس پر لہلوٹ سارا جگ ہے
کھیتی یوں لہلہا رہی ہے
دریا کو پھریری آ رہی ہے
جو رسمی ادھ کھلی کلی ہے
جھومر سے اس کی کھلبلی ہے
ہنسی پر اس کی بیلیں تلملاتی پھر لجاتی ہیں
چلتر کوئی دیکھے بات کیا ہے کیا بناتی ہیں
اک چھیل چھبیلی نار آئی
جُوڑے میں لپیٹے ہار آئی

اس کی بڑھتی ہوئی مصروفیت اسے مشاعروں سے دور لے جا رہی تھی جبکہ شعر سنانا اور اپنے سامعین پیدا کرنا اس کی کمزوری تھی۔ اخبارات و رسائل میں اس کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا لیکن اس میں وہ لطف کہاں تھا جو داد وصول کرنے میں ہوتا ہے۔ اس کمی کو اس کے پاس آنے والے ضرورت مند خوشامدیوں نے پورا کر دیا تھا۔ وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ شاعر ہے لہٰذا اسے خوش کرنے اور اپنا کام نکلوانے کے لیے کام سے پہلے اس سے کلام سنانے کی فرمائش کرتے اور خوب جا و بے جا تعریفیں کرتے۔ اثر میں یہ کمزوری پیدا ہو گئی کہ اپنے معمولی سے معمولی شعر کو بھی فن کا نمونہ سمجھنے لگا اور توقع کرنے لگا کہ بڑے سے بڑا شاعر اس کا کلام سنے اور داد دے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ پیاس اور بڑھ گئی۔ ہر وقت کئی کئی بیاضیں ہاتھ میں رہنے لگیں۔ جہاں کسی سے ملاقات ہوئی دو چار باتوں کے بعد اپنا کلام سنانے لگا اور کلام بھی ایسا کہ جس کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا ہو۔ بعض لوگ اس سے ملنے سے گریز کرنے لگے کہ اثر صاحب سے ملاقات کا مطلب یہ ہے کہ گھنٹوں بیٹھ کر ان کا کلام سنا جائے۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ موقع بے موقع کلام سنانا اثر لکھنوی کی کمزوری ہے۔

کشمیر پہنچ کر یہ کمزوری تقریباً مرض بن گئی۔ اب عمر بھی بڑھاپے سے آن لگی تھی اور میل جول کا وہ موسم بھی نہیں رہا جو لکھنو میں میسر تھا۔ ایسے میں کوئی صاحبِ ذوق نظر آ جاتا تو بس اس کی شامت آ جاتی۔

”حضرت مومن کے رنگ میں کلام دیکھیے۔“

”اب ان غزلوں کو دیکھیے۔ آپ کو میر کی شاعری کا لطف آئے گا۔“

”نظیر اکبر آبادی کو آپ نے پڑھا ہوگا۔ میں نے اس کے رنگ میں بھی کہا۔“

”اب میں آپ کو کشمیر پر لکھی گئی طویل نظمیں سناتا ہوں۔“

”اب یہ میرا خاص رنگ ہے۔ ذرا اس کو بھی ملاحظہ کیجیے۔“

وہ تمہید باندھتا رہتا اور کلام سناتا رہتا۔ صبح سے شام ہو جاتی اور سیلاب تھا کہ تھمنے کا نام نہ لیتا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اس کی اس کمزوری کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

”اثر لکھنوی ریاست کشمیر میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے اور آنے جانے والوں کو اس اطمینان سے کلام سناتے تھے کہ دیر تک اردو شاعری سے دل اچاٹ ہو جاتا تھا۔“

ایک مرتبہ جوش اور مجاز کشمیر آئے۔ کشمیر آئیں اور اثر سے نہ ملیں یہ کیسے ہو سکتا تھا جبکہ وہ کشمیر میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ دنیاوی فوائد بھی پیش نظر۔ دونوں نے اس سے ملاقات کی اور گویا اس کے ہتھے چڑھ گئے۔ دونوں بڑے شاعر اس کی کوٹھی میں موجود تھے۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا ماجرا جوش نے اپنی آپ بیتی ”یادوں کی برات“ میں اس طرح کیا ہے۔

”ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ کوٹھی کے بالائی برآمدے میں پھاٹک کی طرف منہ کیے کھڑے ہیں۔ انہوں نے ہم کو دور سے دیکھ لیا۔ لکڑی کے زینے سے کھٹ کھٹ کرتے نیچے آئے۔ ہم سے بغل گیر ہوئے۔ پوچھا کب آئے۔ میں نے جواب دیا شام کو۔ انہوں نے کہا، ٹھہرے کہاں ہیں۔ میں نے کہا ہوٹل میں۔ انہوں نے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا، میرے ہاں سیدھے کیوں نہیں چلے آئے۔ کیا مجھ کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے آواز دی ”کوئی ہے؟“ اردلی دوڑا آیا۔ انہوں نے اس کو حکم دیا کہ وہ ہمارا سامان ہوٹل سے لے آئے اور بل ادا کر دے۔

اس کے بعد وہ ہمیں اوپر لے گئے اور ہم کو برآمدے میں بٹھا کر فوراً کمرے میں داخل ہو گئے اور زیادہ سے زیادہ

ایک منٹ کے اندر ایک موٹی سی بیاض لے کر باہر آئے اور ایک دم غزلوں کی گولیاں دن دنا دن چلانے لگے۔ جب اس طرح ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تو میں بوکھلا گیا کہ ابھی تک نہ میں نے خط بنایا ہے نہ حمام نہ ناشتا۔ میں نے مجاز کو اور مجاز نے مجھے بے کسی کے ساتھ دیکھا اور اس کے ساتھ ساتھ کلام کی داد بھی دیتے رہے۔ اتنے میں سیکریٹری نے آ کر کہا سرکار ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ دس بجے مہاراجا کی ڈیوڑھی پر آپ کو تشریف لے چلنا ہے۔ انہوں نے بڑی بے لطفی کے ساتھ بیاض بند کر دی۔ سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ کا سامان یہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ مہاراجا کے پیلس چلے گئے۔

غزلوں کے اس ڈونگرے کے بعد ہم نے خط بنایا اور حمام و ناشتا کر کے لیٹ گئے اور مسلسل غزلیں سننے اور پے در پے داد دینے کی تھکان کی بنا پر ہم کو نیند آ گئی۔

تین گھنٹے تک ہم برابر سوتے رہے اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا گھڑی ایک بجا رہی ہے اور حضرت اثر ایک لمبوترا سا رجسٹر بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ کو کشمیر کی سیر کرانے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ اتنا وقت دیجیے کہ دوبارہ نہا دھو کر کپڑے پہن لوں۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے کشمیر کی سیر کراؤں گا اور یہ کہتے ہی انہوں نے وہ لمبوترا رجسٹر کھول لیا۔ انہوں نے ابھی رجسٹر کھولا ہی تھا کہ اردلی نے آ کر کہا سرکار' لنچ تیار ہے۔ انہوں نے کہا، آیئے لنچ کر لیں، لنچ کی میز پر بیٹھتے ہی طعام و کلام کے دہرے مشاغل بہ یک وقت جاری ہو گئے اور ہمارا عجیب عالم ہو گیا۔ کانوں میں (مناظر کشمیر) نظمیں، منہ میں نوالے اور ہونٹوں پر سبحان اللہ کے جھوٹے نعرے اور اس طرح وہ لنچ ہم دونوں تناول فرمانے لگا۔

خدا خدا کر کے جب وہ کلام و طعام کا مرکب لنچ ہم کو ”کھا کر“ ختم ہوا تو دکھ کر ہم اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے اور ابھی شاید دو تین کروٹیں ہی بدلی ہوں گی کہ وہ ایک چوکور بیاض لے آئے اور یہ کہہ کر نظمیں سنانے لگے کہ دیکھیے بدنصیب شاعر ”سیفو“ کی ناتمام نظموں کو جوڑ جوڑ کر یہ نظمیں کہی ہیں اور جب نظمیں سنتے سنتے پانچ بج گئے تو میرا دماغ سنسنانے لگا۔ میں نے کہا میں دونوں وقت حمام کرتا ہوں۔ آپ اجازت دیں کہ حمام کر کے چائے پی لوں تاکہ تازہ دم ہو کر آپ کا کلام سنوں۔ میں غسل خانے چلا گیا۔ وہ مجاز کو کلام سناتے رہے اور مجاز کی داد کی آواز بتدریج دھیمی ہوتی چلی گئی اور تھکی ہوئی آواز کی مری ہوئی واہ واہ ہوا میں تیرنے لگی۔ میں غسل کر کے نکلا تو انہوں نے کہا میاں مجاز تم بھی حمام کر آؤ۔ انہوں نے کہا کہ میں تو صبح بھی حمام نہیں کرتا۔ یہ دہرا غسل جوش صاحب ہی کو مبارک ہو۔ اتنے میں چائے آ گئی اور چائے کا آدھا آدھا گھونٹ پی کر وہ ”سیفو“ کی نظموں کے آخری ٹکڑے سنانے اور ہم دونوں داد دینے لگے۔

اتنے میں بڑی کراہ کے ساتھ آفتاب ڈوب گیا۔ فضا سانولی سلونی ہو گئی۔ اثر صاحب نے ہم دونوں قربانی کے بکروں کو بڑے شاندار ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا۔ بلب روشن کر دیے، ہیٹر جلا دیا۔ اعلیٰ درجے کی وہسکی کی بوتل نہایت خوبصورت گلاس اور تلے ہوئے کاجو کی ڈشیں ہمارے سامنے رکھوا کر بہت سی اگر بتیاں جلوا دیں۔ اب ہم دن بھر کے جھنجوڑے بھنبھوڑے اور دہرے تھکے ماندے بندوں نے اپنے اپنے پیمانے بھرے، دو گھونٹ پیے۔ مجاز نے سگریٹ اور میں نے سگار جلا لیا اور وہ ایک بغلی کمرے سے نکل کر ہمارے پہلو میں بیٹھ گئے اور میر تقی میر کے رنگ کی غزلیں سنانے لگے اور میدانِ داد کے ہم دونوں جو ہر دکھانے لگے اور جب رات کے گیارہ بج گئے تو مجاز کو اُل الا کے قے ہو گئی۔ دو اردلی ان کو پکڑ کر خواب گاہ لے گئے اور فرش صاف کرنے لگے۔ اثر نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر مجھے ٹٹولا کہ مجھ میں اگر دم باقی ہو تو وہ میر کی غزلیں پھر سنانے لگیں۔ میں نے ان کے ارادے کو بھانپ کر گردن ڈال دی اور محفل برخواست ہو گئی اور صبح کے چار بجے میں نے جب مجاز کو جگایا تو وہ یہ سمجھ کر کہ اثر صاحب آ گئے اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہنا شروع کر دیا کہ ”سبحان اللہ! جواب نہیں اس شعر کا۔“

جوش کا یہ بیان ضروری نہیں کہ مکمل درست ہو۔ ”بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے“ اور پھر معاملہ جوش کا ہو تو وہ ذرے کو پہاڑ بنانے میں مہارت رکھتے ہی ہیں۔ بلکہ ذرہ نہ بھی ہو تو وہ پہاڑ کھڑا کر دیتے ہیں۔

ان کی اس عادت پر ”یادوں کی برات“ کے حوالے سے بہت کچھ لے دے ہو چکی۔ اثر کی اس عادت (شعر سنانے کی عادت) کو بیان کرتے ہوئے نہایت غلو سے کام لیا ہے۔ قصے کو بیان کرنے کا انداز بتاتا ہے کہ افسانے کو یقیناً طول دیا گیا ہے۔ اثر کو شعر سنانے کا از حد شوق تھا۔ اس کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا ہوگا۔ کشمیر جیسے دور دراز مقام پر

وہ کسی سے بات کرنے کو ترس گئے ہوں گے۔ بہت بڑے عہدے پر تھے اس لیے عام آدمی ملتے ہوئے بھی ڈرتا ہوگا۔ جوش اور مجاز کو دیکھ کر انہوں نے چاہا ہوگا جتنا کلام ہے سب سنا دیا جائے۔

جوش نے کچھ زیادہ ہی تفصیل سے کام لے لیا ورنہ خیال بہتوں کا یہی تھا۔

''کلام سنانا ان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ جب سنانے پر آتے تو دریا بہا دیتے۔ یہ نہ دیکھتے کہ رنگِ محفل کیا ہے۔ سفینہ سماعت کس گھاٹ لگے گا۔ سننے والے چاہے انگڑائیاں لیں یا جماہیاں، داد دیں یا نہ دیں ان کی بارشِ کرم کم نہ ہوتی۔''

کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں اس میں بھی تھیں لیکن اوصاف اتنے تھے کہ ہر شخص اسے دل سے لگاتا تھا۔ ظاہری شخصیت بھی ایسی تھی کہ دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا تھا۔ مہاراجا سے تو ایسی دوستی ہو گئی تھی کہ اکثر ایک ہی ٹیبل پر کھانا کھاتے تھے۔ ریاست کا تمام کام اس خوبی سے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا کہ مہاراجا بے فکر ہو گیا تھا۔

وہ اپنے محل نما مکان کے ایک کمرے میں جو اس نے لکھنے پڑھنے کے لیے مقرر کر لیا تھا قالین پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ میز پر چند کاغذ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ شاید کسی مضمون لکھنے کی تیاری تھی۔ اردلی اسے ابھی ابھی تازہ پان بنا کر پانوں کی ڈبیا اسے دے گیا تھا۔ اس نے ڈبیا سے ایک پان نکال کر کھایا۔ رومال سے منہ صاف کیا۔ کچھ دیر کچھ سوچتا رہا اور پھر قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔

''شاعری کی دنیا واقعات وجذبات ومحسوسات یا رسم و رواج کی عام دنیا نہیں بلکہ اس نقطہ نظر کا بیان ہے جس سے شاعر نے ان چیزوں کا مشاہدہ کیا یا محسوس کیا۔ بے شک اس میں وہ کلچر بھی آجاتا ہے جس میں شاعر کی ذہنی نشوونما ہوئی اور جس......''

اس کا قلم یکدم رک گیا۔ کوئی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دیکھا تو ایک ملازم جھجکتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔

''کیا تمہیں معلوم نہیں تھا اس وقت میں لکھ رہا ہوں۔ کیوں آئے ہو؟''

''حضور میں کبھی نہ آتا لیکن......''

''لیکن کیا۔ کوئی کام تھا تو بیگم صاحبہ کو پریشان کرتے۔ یہاں کیوں آئے ہو؟''

''مہاراجا کے پیلس سے ایک آدمی آیا تھا۔ آپ کو مہاراجا یاد فرما رہے ہیں۔ میں نے ضروری سمجھا کہ آپ تک یہ پیغام پہنچا دوں۔''

''یہ کون سا وقت ہے مہاراج کے یاد کرنے کا۔ اب تو ڈنر کا وقت ہونے والا ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور کاغذات سمیٹنے لگا۔ ''صحیح کہا ہے کسی نے ' زیادہ محبت بھی عذاب بن جاتی ہے۔ کوئی خاص ڈش تیار ہوئی ہوگی۔ بس کہلا بھیجا۔ انکار کی گنجائش بھی نہیں۔''

وہ اٹھ کر بیوی کے پاس گیا تاکہ وہ اسے بتا دے کہ وہ مہاراجا کے پاس جا رہا ہے، کھانے کا وقت ہے لہٰذا شاید وہیں کھانا پڑے۔

وہ پیلس پہنچا تو اس کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ کوئی سرکاری کام نہیں تھا بلکہ کھانے پر انتظار ہو رہا تھا۔ پیلس پہنچتے ہی اسے کھانے کی میز پر پہنچا دیا گیا۔ مہاراجا ابھی پہنچے نہیں تھے مہارانی ٹیبل پر تھیں۔ اسے بڑی شرمندگی ہوئی کہ اس کی وجہ سے مہارانی نے بھی کھانا شروع نہیں کیا۔ پھر یہ سوچ کر اطمینان بھی ہوا کہ خود مہاراجا ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ اس نے مہارانی کی اجازت کے بعد کرسی سنبھال لی۔

''شروع کیجیے۔ کس کا انتظار ہے۔''

''مہاراجا کو تو آنے دیں۔''

''ان کا انتظار نہ کریں۔ انہوں نے یہ فرض مجھے سونپا ہے کہ کھانے کی میز پر میں آپ سے بات کروں۔''

''اگر مجھے کشمیر سے چلے جانے کا حکم ملنے والا ہے تو میں وہ بھی سہنے کو تیار ہوں۔''

''مہاراجا آپ کو وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں۔''

''یہ بات تو وہ خود بھی مجھ سے کہہ سکتے تھے۔ ریاست کے معاملات اگر مہاراجا کی زبان ہی سے ادا ہوں تو اچھا ہے۔''

''ان کا خیال ہے کہ آپ میری بات نہیں ٹال سکیں گے۔''

''میں تو ان کی بات سے بھی سرِمو اختلاف نہیں کر سکتا۔''

''اثر صاحب یہاں جتنے بھی وزیر آئے کسی نہ کسی صورت میں وہ نااہل ثابت ہوئے اور یہاں سے جانے کے بعد ریاست کو بدنام کیا۔ اس لیے مہاراجا کا خیال ہے کہ اپنے ہی ہاں کا وزیراعظم ہو تو اچھا ہے۔ اس کی ذمے داری مہاراجا صاحب آپ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔''

''جو ذمے داری مجھے سپرد کی جائے گی اسے میں حتی الامکان ایمانداری اور دیانت داری سے نباہنے کی کوشش کروں گا۔''

مہاراجا نے اسے وزیراعظم مقرر کر دیا۔ اب اس کی تنخواہ چار ہزار روپے ماہوار تھی۔ یہ ایسی تنخواہ تھی جس کا کوئی خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

حاجت مندوں کی خبرگیری اس کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ اس کی کوٹھی کے گرد ضرورت مندوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ ایک ایک سے اس کی ضرورت دریافت کرتا۔ جس کے بیان میں صداقت معلوم ہوتی اس کی بھرپور مدد کرتا۔ خاندان کے لوگوں کی خبرگیری سے غافل نہ رہتا۔ عزیز رشتے داروں میں جو بھی کمزور گھرانا نظر آتا اس کی مدد کے لیے بے قرار ہو جاتا۔ رشتے دار جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اس کی راہ میں کانٹے بوتے رہتے لیکن وہ ان کے رویے کو فراموش کر کے اپنا فرض نبھاتا رہتا۔ اسے اللہ نے دے بھی اتنا دیا تھا کہ لٹاتا تھا اور کم نہ ہوتا تھا۔

وہ ہمہ گیر اور پہلودار شخصیت کا مالک تھا۔ جملہ اصنافِ سخن میں پوری طرح عمل دخل تھا۔ شاعری میں یکتا، نثر نگاری میں طاق، بہترین مترجم، بے مثال تنقید نگار، علمِ عروض میں اپنی مثال آپ، ادب ومحاورات کی معلومات میں منفرد، صورت حسین، سیرت دل نشین، سرکاری مصروفیات کے بعد خدا جانے اتنا وقت کیسے نکال لیتا تھا کہ مضامین اور غزلوں کے انبار لگا دیتا تھا۔ ایک مرتبہ تو دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ اس نے اپنے لیے سچ ہی کہا تھا۔

کیا چیز اثر بھی تھا سمجھا نہ کوئی اب تک
شاعر تھا کہ عاشق تھا، دیوانہ کہ دانا تھا

جب وہ ریٹائر ہونے والا ہوا تو اس نے مہاراجا سے درخواست کی کہ مجھے نئے وزیراعظم کے چارج لینے سے پہلے سبک دوش کر دیا جائے کیونکہ نئے وزیراعظم نے میری ماتحتی میں کام کیا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس کی ماتحتی کروں خواہ وہ ایک گھنٹے کی ہو یا ایک سال کی یا ایک دن کی۔ مہاراجا نے اس کی اس بات کو تسلیم کیا اور صبح کے وقت اس سے چارج لے کر شام کو نئے وزیراعظم کو چارج دے دیا۔

اس نے دکھی دل سے کشمیر کو چھوڑا اور لکھنو آ گیا۔ دل میں ٹھان لی تھی کہ اب وہ کہیں ملازمت نہیں کرے گا۔ اپنے وہ شوق پورے کرے گا جو ملازمت کے جبر سے بالائے طاق رکھ دیے تھے۔ ان میں اولین شوق کنکوے بازی کا تھا جسے باپ کی شفقتوں نے ہوا دی تھی۔ وہ نہایت اہتمام سے چھت پر جا کر پتنگیں اڑانے لگا لیکن اپنے والد کی طرح اس نے بھی اپنے اس شوق کو مبتذل نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ شرفا کے ساتھ ہی کنکوے بازی کی۔ ملازمت کے بکھیڑوں سے فرصت مل گئی تھی لہٰذا اب اس کے گرد شعرا وادبا کے جمگھٹے لگے رہتے۔ گھر پر مشاعرے ہونے لگے۔ وضع داری ہاتھ سے نہیں چھوٹی تھی۔ وقت کی پابندی بھی اسی وضع داری کا حصہ تھی۔ مشاعروں میں عام طور سے وقت کی پابندی نہیں ہو پاتی لیکن اس نے اپنے گھر پر ہونے والے مشاعروں میں اس پابندی کا بھی خیال رکھا۔ کتنے ہی اہم آدمی کی آمد متوقع ہو وہ اس کا انتظار نہیں کرتا اور مشاعرہ شروع کر دیتا۔ اتنے عرصے انگریز کی ملازمت کے باوجود اپنے گھر کی فضا کو ہندوستانی رکھا۔ لباس البتہ مشرقی بھی پہنا اور مغربی بھی لیکن جو پہنا اسے وضع داری ہی سمجھا۔ یہ نہیں کہ ملازمت کے دنوں میں سختی سے سوٹ زیب تن کیا اور ریٹائر ہونے کے بعد صرف شیروانی پر اتر آئے۔

دعوتوں میں اہتمام والتزام، خورونوش کے آداب و احترام کا وہی معیار رکھا جو ملازمت کے دوران تھا۔ یہ سب تو تھا لیکن ملک نہایت نازک دور سے گزر رہا تھا۔ آزادی کی جو چنگاری بھڑکی تھی اب شعلہ بن گئی تھی۔ ہر طرف آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ انگریز ملک چھوڑ کر جانے کو تیار ہو گیا تھا لیکن اس حال میں کہ ملک دو ٹکڑے ہونے کو تھا۔ مسلمانوں نے اپنا یہ حق منوا لیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے الگ خطۂ زمین دیا جائے۔

قیامِ پاکستان کی منزل سے قبل ہی ملک میں فسادات شروع ہو گئے۔ وہ شاعر تھا، حساس تھا۔ اسے ان فسادات پر دلی رنج ہو رہا تھا۔ وہ خوش تو تھا کہ مسلمانوں کو الگ ملک مل گیا لیکن اتنے بڑے پیمانے پر فسادات ہوں گے یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ اس نے انسان کو ہمیشہ انسان سمجھا تھا، ہندو مسلمان کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اب سوچ رہا تھا

نہ تو ہندو کبھی دیکھا نہ مسلمان دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

ایک انسان دوسرے انسان کو مار رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ بھی انگریزوں کی سازش ہے۔ اس نے جاتے جاتے نفرت کے ایسے بیج بو دیے کہ دونوں قومیں ہمیشہ لڑتی رہیں۔ اس نے انگریزوں کی طرف سے اپنی نفرت کا اظہار اس طرح کیا کہ حکمتِ ہند نے اسے جتنے خطابات واعزازات

دیے تھے اس نے ان کا استعمال ترک کردیا۔
ملازمت کے دوران اسے خان بہادر اور ایم بی ای (MBE) کے خطابات ملے تھے۔ جنگِ عظیم کے دوران Sword of honour کے اعزازات ملے تھے۔ اخبارات ورسائل اس کے نام کے آگے نواب خان بہادر کے خطابات لکھا کرتے تھے۔ آزادی کے بعد اس نے ان خطابات کا استعمال ترک کردیا۔ ویسے بھی ان خطابوں کے استعمال سے اس کے مرتبے میں اضافہ ہونے والا نہیں تھا۔ وہ مرزا جعفر علی خان نواب خان بہادر سے صرف اثر لکھنوی رہ گیا۔

وقت آگے بڑھتا رہا۔ اہلِ ادب نے یہ غضب کیا کہ اسے مختلف محاذ آرائیوں نے گھیر لیا۔ وہ ان مخالفتوں کے جوابات دینے کے لیے دن رات لکھتا رہا۔ اس سے اس کی صحت بھی متاثر ہوئی اور تخلیقی کاموں میں بھی دشواری ہوئی۔ گھریلو پریشانیاں اس کے علاوہ تھیں. رشتے داروں کی ریشہ دوانیوں نے اسے اتنا مجبور کیا کہ کڑہ ابوتراب کا خاندانی مکان چھوڑ کر کشمیری محلے میں رہائش اختیار کرلی۔ کوئی اولاد نرینہ بھی نہیں لیکن اس نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ ایک نہیں چھ لڑکیاں تھیں جن کی اس نے شادی کردی تھی۔ تین اس کی زندگی ہی میں بیوہ ہوگئیں لیکن اس کی جبیں پر شکن نہ آئی۔ اس کی بیوی نے اس کی زندگی کو مسرتوں سے بھردیا تھا لیکن اب وہ بھی بیمار رہنے لگی تھی۔ اور پھر موت کے بے رحم ہاتھوں نے دونوں کو جدا کردیا۔

اثر نے بیٹیوں کے بیوہ ہونے کے صدمے کو سہہ لیا تھا لیکن بیوی کی وفات نے اس کے شعلۂ دل کو بجھادیا۔ وہ یاسیت پسند نہیں تھا لیکن اس صدمے نے اسے بے زبان کردیا۔ کوئی ملنے آجاتا تو اس کے سامنے بیٹھ جاتا لیکن ایسے ”جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ۔“ ہروقت متحرک رہنے والا آدمی حوصلہ ہار بیٹھا۔

اس کی بے پناہ علمی، ادبی، تہذیبی وثقافتی سرگرمیوں اور خدمات جلیلہ کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے اسے ”پدم بھوشن“ کے خطاب سے نوازا۔ یہ خوشی بھی بس اسے کچھ دیر خوش کرکے رخصت ہوگئی۔ لوگ اسے مبارک باد دینے آرہے تھے اور اس کے قلم سے یہ شعر سرزد ہورہا تھا۔

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی
بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی

اس صدمے نے اثر دکھلایا۔ 1962ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ ایک عرصہ تک بات چیت کرنے میں دشواری محسوس کرتا رہا پھر رفتہ رفتہ زبان صاف ہوگئی۔

ڈاکٹروں نے ذہنی کاموں سے روک دیا تھا لیکن اس نے مطالعہ اور تحریری مشغلے پھر شروع کردیے۔

”کسی سے کہو وہ سانس لینا بند کردے تو وہ ویسے ہی مرجائے گا۔ لکھنا پڑھنا میرا سانس لینا ہی تو ہے۔ میں اس مشغلے سے کیسے دور رہ سکتا ہوں۔“

اب اسے خود بھی یقین ہوگیا تھا کہ زیادہ دن کی زندگی نہیں رہ گئی۔ اس نے اپنی غزلوں کے مختلف رنگوں کے اشعار الگ الگ کیے اور انہیں ترتیب دے کر مجموعے تیار کیے۔

دوسال بعد فالج کا دوسرا حملہ ہوا۔ اس مرتبہ نقاہت بہت بڑھ گئی اور آواز بھی پست ہوگئی۔ اس کی سیمابی طبیعت کب نچلا بیٹھنے دیتی تھی۔ کچھ دن احتیاط کرنے کے بعد پھر کام شروع کردیا۔ ملنے والے بھی چڑھتی اترتی دھوپ کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ اقتدار میں تھا تو خوشامدیوں کے ہجوم لگے رہتے تھے۔ اب وہ ملاقاتیوں کے لیے ترستا رہتا تھا۔ اپنے کمرے کے باہر زینے پر آکر کھڑا ہوجاتا۔ انتظار کرتا رہتا کہ شاید کوئی آجائے یا کسی کو بلا بھیجتا۔ اب اس کے پاس وقت تھا کسی اور کے پاس نہیں تھا۔

مسلسل تنہائی نے اسے پھر بیمار ڈال دیا۔ جس نے پوری زندگی امیرِ مجلس ہوکر گزاری ہو اب اسے یہ تنہائی کھل رہی تھی۔ بیٹیاں اور نواسیاں اس کی خدمت پر مامور تھیں لیکن وہ تو دوستوں کا متلاشی تھا۔

فالج کا تیسرا مہلک حملہ ہوا جو اس کے لیے پیغامِ اجل ثابت ہوا۔

6 جون 1967ء کو صبح پانچ بجے آفتابِ ادب 82 سال کی عمرِ طبعی مکمل کرکے غروب ہوگیا۔ یہ روشن چراغ نمازِ عصر کے بعد تال کٹورا (لکھنوی کربلا) میں دفنادیا گیا۔

قبرستان میں جتنے لوگ موجود تھے اس سے زیادہ تو کبھی اس کے ملازمین ہوا کرتے تھے۔

میرثانی بھی اٹھ گیا افسوس
لکھنو آج بے چراغ ہوا

ماخذات

اثر لکھنوی شخصیت اور فن، سید محمود خاور۔ یادوں کی برات، جوش۔ شخصیات نمبر، نقوش 56ء

وہ کون تھے

مختار آزاد

وہ ٹیکنالوجی جس پر ہم نازاں ہیں کہ یہ آج کی ایجاد ہے، کیا غلط ہے؟ ہماری معلومات خام ہے؟ آج سے ہزاروں سال پہلے، قبل از تاریخ میں بھی یہ ٹیکنالوجی عام تھی؟ کیا قبل از تاریخ بھی ہوائی جہاز بطور سواری استعمال ہورہے تھے؟ کیا اُس دور کے لوگ بھی سائنس میں معراج کمال پر تھے؟ ماہرینِ آثاریات نے اب تک جو کچھ دریافت کیا ہے وہ ورطۂ حیرت میں ڈال رہا ہے۔

زمانہ قدیم کی پُراسرار ٹیکنالوجی پر ایک چشم کشا تحریر

قاہرہ کے ایک عجائب گھر میں لکڑی سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا ماڈل رکھا ہوا ہے جسے دیکھنے والا کوئی بھی شخص پہچاننے میں رتی بھر بھی غلطی نہیں کرسکتا۔ عجائب گھر کے ’شعبہ سائنسی نوادرات‘ میں رکھے اُس ماڈل کے دائیں بائیں دو پَر بنے ہوئے ہیں۔ جس کے درمیان بیضوی شکل کا حصہ ہے۔ اس کے انتہائی آخر میں ایک دُم ہے۔ دُم کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے پَر لگے ہوئے ہیں۔ یہ خاصا چمکدار بھی ہے۔

پہچانا آپ نے یا ابھی تک دماغ کی ورزش جاری ہے۔ پہلی ہی نظر میں کوئی بھی شخص اُسے دیکھتے ہی کہہ اٹھتا ہے کہ ارے بھئی یہ تو ہوائی جہاز کا ماڈل ہے۔ اگر آپ بھی اُس ماڈل کو دیکھیں گے تو یہی کہیں گے۔

یہ ہوائی جہاز کا ہی ماڈل ہے مگر یہ اس کی اہمیت نہیں۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ ماڈل آج کا بنایا ہوا نہیں، اُس کی عمر تو دو ہزار برس سے بھی زیادہ ہے۔ تبھی تو اسے عجائب گھر کی زینت بنایا گیا ہے۔ وہ بھی قاہرہ کا عجائب گھر جس کی شہرت اپنے نوادرات کی قدامت کے سبب دنیا بھر میں ہے۔ کیوں...... ہے نا چونکا دینے والا انکشاف۔ آج کے ہوائی جہاز کا ماڈل اور عمر دو ہزار برس سے بھی زیادہ۔ ماڈل کو پہچاننے والے کسی بھی شخص کو جب یہ حقیقت پتا چلتی ہے تو پھر وہ حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے لگتا ہے۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت تو یہی ہے، جسے ماہرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔

لکڑی کے بنے اس ہوائی جہاز کے ماڈل کی لمبائی صرف پندرہ سینٹی میٹر ہے۔ اس کے ایک پَر کی لمبائی اٹھارہ سینٹی میٹر ہے۔ ہوائی جہاز کا یہ ماڈل انجیر کی لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ ننھے ماڈل ہوائی جہاز کی اب ایک خوبی سنیے۔ یہ اُڑتا بھی ہے۔ ہے نا ایک اور چونکا دینے والا انکشاف۔ اگر ماڈل ہوائی جہاز کو ہاتھ میں لے کر، فضا میں سیدھے رُخ پر پھینکا جائے تو یہ کئی گز تک بالکل ہوائی جہاز کی طرح اڑتا ہوا جاتا ہے۔ سائنسی بنیادوں پر تحقیق کے نتیجے میں ثابت ہوا ہے کہ اس ماڈل کا عہد کم از کم دو سو سال قبل از مسیح یعنی آج سے تقریباً بائیس سو سال پہلے کا ہے۔

آج ہوائی جہاز اور اس سے جُڑی جملہ ٹیکنالوجی جس بُلند معیار پر موجود ہے، وہ ہمارے عہد کے انسانوں کے لیے قابلِ فخر ہے لیکن اس ماڈل کی دریافت اور سائنسی بنیادوں پر اس کے عہد کے تعین کے بعد سائنس دانوں اور شعبہ ہوائی انجینئرنگ کے کئی عالی دماغوں نے سوال اٹھائے تھے کہ اُنیسویں اور بیسویں صدی سے پہلے بھی کیا ٹیکنالوجی نے ہمارے اجداد کے ہاتھوں اپنی معراج پالی تھی۔ ٹیکنالوجی کی وہ معراج جسے اس دنیا میں کمالِ فن تک پہنچانے کا ذریعہ اب تک ہم صرف خود کو ہی سمجھتے چلے آئے ہیں وہ بھی صرف گزشتہ دو صدیوں کے درمیان۔ مگر حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

عام طور پر ماہرینِ آثاریات نے اس طرف دھیان نہیں دیا لیکن جن ماہرین نے اس طرف رُخ کیا، انہوں نے اپنی دریافت سے مستقبل کے بارے میں سوچنے والے سائنسدانوں کی سوچ کا رُخ ماضی کی طرف بھی موڑ دیا ہے۔ قاہرہ کے عجائب گھر میں رکھا گیا ہوائی جہاز کا یہ ماڈل بھی ایسی ہی ایک دریافت تھا۔ وہ دریافت جو اُس عہد کے بارے میں ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جسے تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین صرف جنگ و جدل اور قبضے کی دوڑ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

عجائب گھر کی زینت بنے اس ماڈل کو دیکھ کر کوئی شخص بجا طور پر سوچ سکتا ہے کہ آج کے ہوائی جہاز کی ایجاد کا خیال شاید اسی ماڈل کو دیکھ کر رائٹ برادران کے ذہن میں آیا ہوگا مگر یہ بات بھی درست نہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ہمارے عہد کے ہوائی جہاز کی ایجاد اور عجائب گھر میں رکھے اس ماڈل کے مابین کوئی تعلق موجود نہیں۔ اس دعوے کی ٹھوس وجہ بھی موجود ہے۔

ہوائی جہاز کا یہ ماڈل 1898ء میں دریافت ہوا تھا لیکن اُس سے پانچ برس پہلے ہی رائٹ برادران نہایت کامیابی سے فضا میں پرواز کا تجربہ کر چکے تھے اور اُس پہلی پرواز کے ساتھ ہی آج کے ہوائی جہاز کی بنیاد بھی رکھی جا چکی تھی۔ جب یہ ماڈل دریافت ہوا، تب تک تو رائٹ برادران پہلی کامیاب پرواز کے بعد اپنے بنائے گئے ہوائی جہاز کو مزید بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ کامیابی کے کئی اور اہم سنگِ میل بھی طے کر چکے تھے۔ ویسے بھی مواصلات کے اعتبار سے اُس دشوار گزار دنیا میں یہ دریافت رائٹ برادران کی رسائی سے بہت ہی دور، قدیم مصر کے ایک مقبرے سے ہوئی تھی۔ مقبرہ جو پہلی بار بند کیے جانے کے لگ بھگ دو ہزار سال بعد کھولا گیا تھا۔

ہوائی جہاز کا یہ ننھا سا ماڈل مصری تاریخ کے نہایت اہم اور قدیم علاقے سقارہ کے ایک مقبرے میں موجود تھا۔ مقبرہ، جسے کچھ ماہرینِ آثار نے بڑی تگ و دو کے بعد کھولا تھا۔ یہ ماڈل مقبرے کے انتہائی اندرونی حصے میں پایا گیا تھا۔ اسے ایک چھوٹے سے ڈبے میں رکھا گیا تھا۔ ڈبے پر پرندوں کی متعدد شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔

دریافت کے وقت یہ ماڈل بظاہر اُن ماہرینِ آثاریات کے لیے بھی قابلِ فہم نہیں تھا جن کے ہاتھوں اس کی دریافت ہوئی تھی۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ بھی کہ اُس وقت تک کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ہوائی جہاز

کا نمونہ ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا تھا کہ رائٹ برادران جس شے کی تیاری میں جُتے ہوئے ہیں، یہ اُس کی نفیس ترین شکل ہے۔ ویسے اُس وقت تک رائٹ برادران خاصے مشہور ہو چکے تھے لیکن ابھی اُن کی شہرت اتنی زیادہ عام نہیں ہوئی تھی کہ ماڈل کو دیکھنے والوں کے ذہن میں فوراً اُن کا یا اُن کی ایجاد کا نام آجاتا۔ دریافت کرنے والوں کے لیے یہ شے بھی بالکل اُسی طرح ناقابلِ فہم اور اَسرار کے دبیز پردوں میں لپٹی ہوئی تھی جتنی کہ بُلند ترین اہراموں تلے بنے مقبروں سے ملنے والی فراعینِ مصر کی ممیاں، تصویری نقوش میں لپٹی تحریر اور وہ سب کچھ جس کی توجیہ فی الوقت انیسویں صدی کے آخر کے اُن ماہرینِ آثار کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ بس! وہ تلاش کے جنون میں دریافت پہ دریافت کیے جا رہے تھے۔

ماڈل کی دریافت، اپنے عہد کی نہایت اہم دریافت تھی۔ ایسی دریافت جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے لیکن اُس وقت اس کی اہمیت کا ادراک کسی کو نہیں تھا۔ شاید اسی لیے 1898ء میں ہونے والی یہ دریافت 1969ء تک غیر اہم یا اُس وقت تک غیر تحقیق نوادرات کے ساتھ عجائب گھر کے کسی گوشے میں پڑی رہی۔ یہ دریافت اُس وقت کی منتظر تھی جب کسی صاحبِ بصیرت ماہر کی نظر اُس پر پڑے۔ ماڈل کو اپنی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے مقبرے سے نکل کر عجائب گھر تک پہنچنے کے بعد مزید 72 سال تک انتظار کرنا پڑا۔ یہ انتظار ختم ہوا 1969ء میں مصر کے ماہرِ آثاریات ڈاکٹر خالد کے ہاتھوں۔ اس کے بعد اس ماڈل کی اصل اہمیت کا سفر شروع ہوا۔

ایک روز ڈاکٹر خالد قاہرہ میوزیم کے وسیع و عریض اسٹور میں رکھے گئے ایسے نوادرات کا جائزہ لے رہے تھے جن پر اب تک تحقیق نہیں کی جا سکی تھی، تبھی اچانک انہیں ایک چھوٹا سا ڈبہ نظر آیا۔ یہ ایک ایسا ڈبہ تھا جس پر پرندوں کی رنگوں سے بنی تصویروں نے فوراً اُن کا دھیان اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ کچھ دیر تک اُن تصویروں کو کھڑے دیکھتے رہے۔ اُن تمام تصویروں کی خاص بات یہ تھی کہ پرندے اپنے پنکھ پھیلائے، پنجوں اور گردنوں کو تانے یا تو اُڑان بھرنے کی تیاری کرتے دکھائی دیتے تھے یا پھر وہ پنکھ پھیلائے فضا میں اُڑتے جا رہے تھے۔ کچھ پرندے ایسے بھی تھے جن کی تصویروں کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اب وہ اُڑان پوری کر کے زمین پر واپس اتر رہے ہیں۔

''یہ تو بالکل ایسا ہی منظر ہے کہ جیسے کوئی ہوائی جہاز اُڑان بھرنے سے پہلے ٹیکسی کرتا ہے یا ٹیک آف کرتا ہے۔'' انہوں نے حیرت سے خود کلامی کی۔ ڈاکٹر خالد فطرت کے نظاروں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اُن کا ماننا تھا کہ انسان نے فطرت سے ہی سب کچھ سیکھا ہے۔ ہر ایجاد کا خیال دراصل فطرت کی کسی نہ کسی شے کا ہی مرہونِ منت ہے۔ اسی لیے پرندوں کی تصویریں دیکھ کر ہوائی جہاز کے اُڑنے کا خیال ان کے دل میں آگیا تھا۔ ویسے بھی 1969ء تک دنیا بھر میں فضائی سفر، مواصلات کے روایتی مگر جدید ذرائع میں شامل ہو چکا تھا۔ اب تک انہوں نے ڈبے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

کچھ دیر تک وہ کھڑے کھڑے اُن تصویروں کو دیکھتے رہے اور پھر ہاتھ بڑھا کر ڈبہ اٹھالیا۔ انہوں نے نہایت احتیاط سے ڈبے کا معائنہ کیا اور پھر جب اس کا ڈھکن کھولا تو سخت حیرت زدہ رہ گئے۔ اندر لکڑی سے بنا چھوٹا سا ایک ماڈل رکھا تھا۔

''ارے یہ تو ہوائی جہاز کا ماڈل ہے۔'' حیرت کے مارے انہوں نے کہا اور پھر اس ایک جملے سے اس ماڈل پر تحقیق اور اس کی شہرت کا نیا سفر شروع ہوا، ایسا سفر جس کے بارے میں اسے مقبرے سے دریافت کرنے والے نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔

جب سے ڈاکٹر خالد نے ماڈل کو دیکھا، تب سے وہ سخت پریشان تھے کہ اُنیسویں صدی کے آخر میں ایجاد اور بیسویں صدی کی شروعاتی دہائیوں میں مشہور ہونے والے ہوائی جہاز کا ماڈل میوزیم کے اُس حصے میں کیوں رکھا گیا ہے، جو کہ صرف قبل از مسیح دور کے فراعینِ مصر کے مقبروں کے نوادرات کے لیے مختص ہے۔

انہوں نے فوری طور پر تو کسی کو کچھ نہیں بتایا، البتہ ڈبے کو وہیں رکھ کر ریکارڈ کی جانچ پڑتال میں مصروف ہوگئے۔ بہت جلد انہیں پتا چل گیا کہ یہ ڈبہ اور اس میں رکھا ہوا ماڈل دراصل سقارہ کے علاقے میں واقع ایک مقبرے سے ملا تھا۔ اُس کے بعد سے اب تک ڈاکٹر خالد پہلے ماہرِ آثاریات تھے جنہوں نے اسے اہمیت دی۔ ریکارڈ سے ماڈل کے دریافت کی تصدیق ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنی جانچ شروع کی۔

ماڈل جس مقبرے سے ملا تھا، وہ وہاں بھی گئے لیکن یہ پتا چلانے میں ناکام رہے کہ وہ کس کا مقبرہ تھا۔ یہ مقبرہ

دراصل ایک اہرام کے قریب بڑی بڑی پہاڑی سلوں سے بنا ہوا مقبرہ تھا جو ریت میں دفن ہو چکا تھا اور پھر اُنیسویں صدی کے آخری چند برسوں میں پہلی بار انسانی ہاتھوں نے اُسے ریت کے مدفن سے نکال کر اندر جانے کا راستہ تلاش کیا۔ یوں صاحب مقبرہ کی تدفین کے بعد پہلی بار زندہ انسانوں نے اپنے پاؤں اُس کے اندر رکھے تھے۔ مقبرے کی شان وشوکت بھی وہ نہ تھی جو فراعینِ مصر یا اُن کے شاہی خاندان کے دیگر لوگوں کے مقابر کے لیے مخصوص تھی۔ اس لیے ڈاکٹر خالد نے صاحب قبر کے فرعون ہونے یا فراعین سے رشتہ داری، قرابت یا تعلق کو یکسر خارج از امکان قرار دے دیا، البتہ مقبرہ جس انداز میں تعمیر کیا گیا تھا، وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اپنے دور میں صاحب مقبرہ خاصے بڑے سماجی رتبے یا شان و شوکت کے حامل ہوں گے، ورنہ کسی اہرام کے قریب اتنا مضبوط مقبرہ اُس کے لیے تعمیر نہ کروایا جاتا۔ مقبرہ، جس پر یقیناً خاصا زرِ کثیر بھی صرف ہوا ہوگا۔ اتنا زر جو اُس وقت یقیناً کسی عام آدمی کے بس کی بات تو نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر خالد نے جب اپنے ان خیالات اور مقبرے کو سامنے رکھ کر صاحب مقبرہ کے سماجی رتبے پر غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ شخص جنگجو یا تاجر نہیں ہوسکتا۔ یقیناً وہ کوئی دانش ور، صاحب علم وبصیرت ہی ہوگا۔ اس خیال کی ایک ہی وجہ تھی۔ اُن کے نزدیک ڈبے سے ملنے والا ماڈل، اس پر پرندوں کی شکل میں بیان کیے گئے استعارے اور خود مقبرے کے اندر کی سادگی تھی۔ اگر یہ مقبرہ کسی جنگجو سپہ سالار یا تاجر کا ہوتا تو وہاں مظاہرِ قطرت کے شاہکار ان پرندوں کی شبیہیں اور ماڈل نہیں بلکہ کچھ اور ہوتا۔

ڈاکٹر خالد اپنی اس تحقیق کے دوران کئی بار حیرت کے ایسے سمندر میں غوطہ زن ہوئے جس کا کوئی سرا اُن کے ہاتھ نہیں لگتا تھا۔ وہ حیران تھے کہ مقبرے سے دریافت ہونے والا ماڈل وہاں کیوں رکھا گیا تھا؟ کیا یہ ایک پیغام تھا؟ اگر یہ پیغام ہی تھا کیا صاحب مقبرہ جانتا تھا کہ اُس کی موت کے بعد کوئی شخص اُس کے مقبرے میں داخل ہوگا اور یہ پیغام کیا اُس کے لیے تھا؟

ان سوالوں سے بھی زیادہ حیرت ڈاکٹر خالد کو اس بات پر تھی کہ ہزاروں سال پہلے صاحب مقبرہ یا پھر کسی اور شخص نے اتنی نفاست اور عمدگی سے آج کے ہوائی جہاز کا درست ترین ماڈل کیسے تیار کرلیا تھا؟ کیا یہ ایسی چیز تھی جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا جو اتنے درست انداز میں ماڈل تیار کرلیا؟

اُس کے چاروں طرف صرف سوالات تھے۔ ایسے سوالات جن کے جوابات یا تو ذاتِ باری تعالیٰ کے علم میں تھے یا پھر صاحب مقبرہ کے پاس مگر وہ اُن دونوں سے اپنے سوالات کے جوابات پوچھنے کی قدرت سے محروم تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ڈاکٹر خالد کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ جوابات کی تلاش میں وہ صرف بھٹکتا رہے گا۔ اس لیے اُس نے اپنی راہ بدلی۔ اب وہ قدیم مصر، گمنام مقبرے اور دریافت کے تناظر میں اپنی دریافتِ نو کو اس طرح دنیا کے سامنے پیش کرنے پر لگ گیا جو دنیا بھر کے سائنس وٹیکنالوجی کے عالی دماغوں کو بھی سوچ میں ڈال دے۔

اگرچہ کئی مہینوں تک ڈاکٹر خالد سقارہ کی اُڑتی ریت اور بنتے بگڑتے ٹیلوں کے درمیان موجود اُس مقبرے پر تحقیق میں لگے رہے مگر کوئی خاص کامیابی نہ حاصل کرسکے البتہ انہوں نے اتنی معلومات ضرور حاصل کرلی تھیں کہ اپنی دریافتِ نو پر ابتدائی اور تعارفی مقالہ لکھ سکیں اور پھر اُن کا لکھا ہوا یہ مقالہ دنیا بھر میں ہوائی جہاز کے ماڈل کی اہمیت اُجاگر کرنے کا سبب بن گیا۔

ڈاکٹر خالد کی دریافتِ نو کے وقت ہوائی جہاز اور فضائی (ایرو ناٹیکل) انجینئرنگ دنیا بھر میں اپنا لوہا منوا چکی تھیں۔ اُس وقت تک فضائی سفر ایجاد اور ایڈونچر کی فہرست سے نکل کر عام استعمال کی شے کا روپ لے چکا تھا۔ دنیا بھر میں ہوائی جہاز اب صرف ایک ایجاد کے روپ میں نہیں بلکہ مواصلاتی ضروریات پورا کرنے کے لیے تیز ترین ذریعۂ سفر کی شکل میں لوگوں کی رسائی میں تھا۔ اسی شے کے خیال سے راکٹ بنا تھا جو اُنہی دنوں انسان کو چاند پر لے جانے والا تھا، جب ڈاکٹر خالد اپنی تحقیق میں مصروف تھے۔

کئی مہینوں کی محنتِ شاقہ اور عرق ریزی کے بعد آخر ڈاکٹر خالد کا مقالہ مکمل ہوگیا۔ مقالے اشاعت کے ساتھ ہی اس پر فوری ردِعمل سامنے آنے لگا۔ ڈاکٹر کو مقالے کی اشاعت سے قبل ہی یقین تھا کہ اُس پر ایسا ہی ردِعمل سامنے آئے گا۔ وہ بہت خوش تھے کہ انہوں نے سرزمین مصر کے عجائبات میں سے ایک ننھے سے عجوبے مگر بہت بڑے خیال کو دنیا کے سامنے چونکا دینے والے انداز میں پیش کردیا تھا۔

مقالے کے مندرجات آثارِ قدیمہ اور فضائی ٹیکنالوجی کی دنیا میں اب تک کا نہایت چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ بہت جلد اس مقالے کی شہرت فضائی انجینئرنگ کی دنیا میں پھیل گئی۔ کوئی حیران تھا تو کوئی پریشان اور کسی کے خیال میں یہ پُراسرار ماڈل کسی اور دنیا سے تعلق رکھنے والوں کے اِس دنیا سے رابطوں کا اہم ثبوت تھا۔ ایسا ثبوت جو کسی اور سیارے کی بھٹکی مخلوق نے اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لیے بطور پیغام چھوڑا تھا۔

خیال پیش کیا جارہا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ وقت کے کسی دور میں، کسی اور دنیا سے، خلائی مخلوق نے ہزاروں برس پہلے زمین پر قدم تو رکھا لیکن بوجوہ وہ واپس جانے کی صلاحیت یا سہولت کھو بیٹھے اور پھر رفتہ رفتہ اسی دنیا کا حصہ بن گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے سیارے پر نہایت جدید ترین تکنیکی صلاحیتوں سے مالا مال تھے اور فضائی و خلائی سفر کی انجینئرنگ پر عبور رکھتے تھے۔ جب اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن کے اٹھنے کا وقت آیا یا اُن کی نسل معدوم ہونے لگی تو انہوں نے آنے والے دور کے انسان یا خود اپنی باقی ماندہ اگلی نسلوں کے لیے اُن اشیا کے بالکل درست ترین ماڈل بنائے، جنہیں وہ استعمال کرتے تھے اور پھر انہیں ایسے مقامات پر محفوظ کردیا، جہاں وہ ہزاروں برس تک انسانی دسترس سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ حفاظت کے خیال سے ہی شاید انہوں نے جہاز کا ماڈل محفوظ کرنے کے لیے اہرام نما مقبرے کا انتخاب کیا تھا۔ اہرام جن کی تعمیر نہایت تلاش کے باوجود اب بھی اسرار سے لبریز ہے۔

اس خیال کو پیش کرنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ جس ڈبے میں وہ ماڈل محفوظ تھا، اُس پر پرندوں کی بنی ہوئی مختلف انداز کی شبیہیں پرواز کا استعارہ ہیں۔ استعارہ جو ماڈل سے جُڑا ہوا تھا۔ استعارہ قوتِ پرواز کا جو شاید وہ کھو بیٹھے تھے لیکن پھر بھی وہ ماڈل اور استعاروں کی زبان میں سب کچھ بیان بھی کرگئے تھے۔ اس خیال پر بھی متعدد آرا سامنے آئیں مگر مذکورہ رائے عام لوگوں میں خاصی مقبول ہوئی۔ غرضیکہ مقالے کی اشاعت کے بعد اُس پر ردِعمل اور آرا کا سلسلہ اس مثل کی مانند تھا کہ 'جتنے منہ، اُتنی باتیں'۔

کئی ماہ کی رائے زنی کے بعد آخر اس ماڈل کا سائنسی تجزیہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ابتدائی طور پر ماڈل کی قدامت کا تجزیہ کیا گیا۔ اس تجزیے کے نتیجے میں یہ ثابت ہوا کہ وہ کم سے کم بھی بائیس سو سال یا دو سو سال قبل از مسیح میں تیار کیا گیا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ماڈل جس مقبرے سے دریافت کیا گیا تھا، اُس کی قدامت بھی کم وبیش اُتنی ہی ہے۔ ماڈل کی قدامت ثابت ہوگئی تو اب ماہرین کے لیے ضروری تھا کہ تحقیق کے اگلے مرحلے کی طرف بڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ یہ ماڈل صرف ایک کھلونا ہی ہے یا اُس سے آگے کی کوئی چیز، یعنی کہ ہم جدید انسانوں کے لیے اُن کے پُرکھوں کا کوئی خفیہ پیغام۔

کئی مہینوں کے بعد آخر دنیا بھر کے مانے ہوئے فضائی انجینئروں اور ماہرینِ آثار پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے ماڈل کی اس نکتۂ نظر سے تحقیق شروع کی کہ آیا یہ واقعی ایک ایسا ماڈل ہے جسے آج کے ہوائی جہاز کا ماڈل مان لیا جائے۔ فضائی انجینئروں نے اسے انجینئرنگ کے اصولوں پر پرکھنے کا فیصلہ کیا تھا جب کہ ماہرین آثار اس بات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ کم وبیش سوا دو ہزار سال پہلے کسی انسان نے ایسا ماڈل کیونکر بنالیا تھا، جس کا نقشہ ہُو بہو آج کی ایک اہم ترین کامیاب ایجاد جیسا ہے۔ اگر ایسا تھا تو انہیں اب بہت سے دیگر ایسے اہم آثار ملنے کی بھی توقع تھی جس سے اُس وقت کی ٹیکنالوجی کے مزید شواہد مل پاتے۔ اُن کے خیال میں فضائی سفر ٹیکنالوجی کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔ جو لوگ اس پر عبور پاسکتے ہیں وہ نہ جانے اور کیا کیا کچھ کرچکے ہوں گے۔ ماہرین نے دھڑکتے دلوں کے ساتھ ماڈل پر تحقیق شروع کردی۔

فضائی انجینئرنگ کے ماہرین نے طویل تحقیق اور سائنسی تجزیے کے اختتام پر نہایت حیران کُن انکشافات کیے۔ اُن کا کہنا تھا کہ آج کے جدید ترین ہوائی جہاز کا یہ بالکل درست ترین ماڈل ہے۔ انہوں نے باریک بینی سے ماڈل کے ہر حصے کا جائزہ لیا تھا۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ اس کے درمیانی حصے سے ذرا پہلے نصب دونوں پَر نہایت ماہرانہ انداز میں تیار کیے گئے تھے۔ یہ دونوں پَر بالکل اسی انداز میں تیار کیے گئے جیسا کہ آج کل کے ہوائی جہازوں کے پَر تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک عین اُس جگہ نصب کیے گئے تھے، جہاں آج کے ہوائی جہازوں میں ان کی تنصیب کی جاتی ہے۔ دونوں پَروں کی موٹائی اور پتلے پن میں بھی ماہرانہ کاری گری نظر آتی ہے۔

ہوائی جہازوں کے پَروں کے خم، اُن کی موٹائی اور پتلے پن کو ماہرانہ انداز میں ریاضی کے اصولوں پر تشکیل دیا جاتا ہے، جس سے جہاز ٹیک آف کے وقت فضا میں اٹھنے اور لینڈنگ پر صحیح سلامت زمین پر اُتر آتا ہے۔ ماڈل کے پَروں کی ساخت اور ڈیزائن میں آج مروّج جدید سائنسی

اصولوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ نیز، جہاز کے پَر فضا میں استحکام برقرار رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ماڈل کے پَروں میں اس بات کی خوبی بھی موجود تھی کہ اگر وہ ہوا میں اڑے تو جہاز کے پورے وجود میں استحکام اور توازن کو برقرار رکھ سکے۔

فضائی انجینئرنگ کے عالی دماغ ماہرین نے اس ماڈل کو ایک مکمل ہوائی جہاز کا ماڈل قرار دیا۔ اُن کی رائے تھی کہ یہ ماڈل ہوا میں گلائیڈر کی طرح پرواز کرسکتا ہے۔ یہی نہیں، یہ ماڈل اپنے ساتھ کئی گنا زیادہ وزن بھی لے کر اُڑ سکتا ہے۔ ماہرین نے تجزیوں کے بعد تسلیم کیا کہ اس ماڈل کی فضائی رفتار ساٹھ میل (یا پچانوے کلومیٹر) فی گھنٹا ہے۔ یہ سب کچھ اس ماڈل کی اُڑان کے نتیجے میں ثابت ہوا تھا۔

فضائی انجینئرنگ کے ماہرین نے ایک اور چونکا دینے والا خیال بھی پیش کیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ ماڈل کی دُم کے ساتھ کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا ہے۔ انہوں نے خیال پیش کیا کہ دُم کے ٹوٹے حصے کے اوپر یا قریب میں چھوٹا سا انجن نصب ہوگا، جس کی مدد سے اُسے مقبرے میں رکھنے سے پہلے بالکل آج کے ہوائی جہاز کی طرح اُڑایا بھی گیا ہوگا۔ البتہ یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی کہ مقبرے میں رکھنے سے پہلے اگر اس میں کوئی انجن نصب تھا تو وہ کہاں گیا۔ ماہرین کو یہ ماڈل ایک خالی ڈبے میں رکھا ہوا ملا تھا اور جس حالت میں ملا تھا، ڈاکٹر خالد تک پہنچتے ہوئے یہ بعینہٖ اُسی حالت میں موجود تھا۔

فضائی ٹیکنالوجی کے ماہرین تجزیے کے بعد سخت حیرت زدہ تھے۔ اُن کے نزدیک یہ بہت ہی حیران کردینے والی دریافت تھی۔ ایسی دریافت جس کا تعلق اُس دور سے تھا، جسے ہم اس طرح کی ٹیکنالوجی کے اعتبار سے یکسر مسترد کرتے چلے آئے ہیں مگر پھر بھی یہ ماڈل گواہی دے رہا تھا کہ سوا دو ہزار سال پہلے کا کوئی انسان فضائی سفر کی ٹیکنالوجی حاصل کرچکا تھا یا اُس کے قریب تر پہنچ گیا تھا۔ یہ ماڈل اُس گمنام موجد کی کامیابی کا وہ ناقابلِ تردید ثبوت تھا جو تجزیے کی ہر کسوٹی پر پورا اترا تھا۔ ماہرینِ آثاریات بھی بہت خوش تھے۔ ان کی تحقیق کو بھی ایک نیا باب مل رہا تھا۔ وہ باب جس میں وہ ایسی ٹیکنالوجی کی کھوج کرسکتے تھے جو آج کی جدید ترین تکنیکی مہارتوں کا ہم پلّہ تھی۔

ماہرین کی جانب سے تصدیق کے بعد اس ماڈل کو دنیا بھر کے متعلقہ شعبوں میں نہایت اہم سائنسی دریافت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ قاہرہ کے میوزیم میں اس اہم نمونے کی نمائش کے لیے خصوصی انتظام واہتمام کیا جائے۔ یہ بنی نوع انسان کے پُرکھوں یا اُن کی سرزمین پر بھٹک کر آجانے یا پھر دانستہ طور پر زمین دوست بن کر یہاں آنے اور پھر ہمیشہ کے لیے بوجوہ یہیں رہ جانے والے اُن لوگوں کی یادگار تھی، جن سے ہم اب تک پوری طرح واقف نہیں۔ یہ ایک ایسی یادگار ہے جو اس بات کی متقاضی تھی کہ اسے شایانِ شان مقام عطا کیا جائے۔

سائنسی و ماہرانہ تجزیے کے بعد ماڈل کو ایک طرف قاہرہ میوزیم کے شعبہ سائنسی نوادرات میں اہم جگہ پر اہتمام سے رکھا جاچکا تھا تو دوسری طرف پوری دنیا کے متعلقہ شعبوں میں یہ گفتگو کا اہم موضوع تھا۔ تیسری طرف ماہرینِ آثاریات مصر کے قدیم مقبروں کی کھدائی میں اب ٹیکنالوجی کو بھی ذہن میں رکھ کر نوادرات کی جانچ پڑتال کرنے لگے تھے۔

اس واقعہ کے مشہور ہونے کے بعد کئی قدیم مصری مقبروں کو کھولا گیا جہاں سے بڑی تعداد میں نوادرات کا ملنا یقینی تھا البتہ ایک حیران کن بات بھی سامنے آنے لگی۔ متعدد مقبروں سے ایسی اشیا ملی تھیں جن کی بناوٹ بالکل گلائیڈر جیسی تھیں۔ ایک دو نہیں، اس طرح کے نمونوں کی تعداد درجنوں میں ہے۔ دریافت کے اس سلسلے سے ایک یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا کہ کیا ہزاروں سال پہلے کرۂ ارض پر فضائی ٹریفک کا نظام موجود تھا؟ اس کا جواب یقین اور بے یقینی کے درمیان رہا ہے۔ ہوسکتا ہے یا شاید......

دریافت کے اس سلسلے اور مختلف آرا کی بدولت زیادہ تر لوگ قدیم ہوا بازوں کے بارے میں تصور قائم کرکے مختلف شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے لگے تھے۔ انہیں یقین آنے لگا تھا کہ کرۂ ارض کے مدار سے ہٹ کر بھی کہیں، کسی اور اجنبی سیارے پر ایسی مخلوق آباد تھی یا اب تک ہے جو ہم انسانوں کی طرح سوچتی، سمجھتی رہی ہے۔ اس طرح کے خیالات کے حامل لوگ اخبارات کے مضامین میں یہ بات کہنے لگے تھے کہ جس قسم کے فضائی سفر کے نمونے دریافت ہورہے ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ قدیم زمانے کے لوگ انہیں دوسرے سیاروں پر آباد مخلوق سے رابطوں کے لیے استعمال کرتے ہوں۔ ہمارے لیے گوکہ یہ آج صرف نمونے ہیں مگر ممکن ہے کہ اُن کے لیے یہ آلات کی حیثیت رکھتے ہوں۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہہ اور لکھ چکے ہیں کہ قدیم خلابازوں کا یہ سفر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بعد پہلے ہزاریے first millennium کی ابتدائی صدیوں تک جاری تھا۔

☆☆☆

ایک طرف جہاں آج کے فضائی ذرائع سے مشابہ نمونوں کی دریافت مصر کے قدیم مقبروں سے ہورہی تھی تو دوسری جانب یہاں سے ہزاروں میل دور واقع لاطینی امریکا کے کئی ممالک میں عقل کو دنگ کردینے والے متعدد نوادرات بھی دریافت ہورہے تھے۔

کوسٹاریکا، وینزویلا اور پیرو کے کئی مقامات پر سونے سے بنے زیورات نما اشیا ملی ہیں۔ ان میں سے ایک حیران کن شے کولمبیا کے آئیوان ٹی سینڈرسن کے نجی کلیکشن میں موجود ہے۔ سینڈرسن کا یہ کلیکشن قدیم فنون کے نادر نمونوں پر مشتمل ہے۔ موصوف امریکا کی ایک ایسی تحقیقی سوسائٹی سے وابستہ ہیں، جن کا کام اُن نوادرات پر تحقیق کرنا ہے، جن کے بارے میں اب تک عقل کسی قسم کی تشریح وتوضیح پیش نہیں کرپائی ہے کہ وہ کس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے یا اُن سے کیا کام لیا جاتا تھا۔ ہم سینڈرسن کے پاس موجود جس نمونے کی بات کررہے ہیں وہ دو انچ (پانچ سینٹی میٹر) حجم کی شے ہے جو نیکلس یا بریس لیٹ سے مشابہ ہے تاہم یہ زیور ہرگز نہیں ہے۔

کولمبیا کے ماہرینِ آثاریات نے اس نادر نمونے کو zoomorphic کا اصطلاحی نام دیا ہے، جس کا مطلب کسی شے کا جانور سے مشابہ ہونا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ نمونہ ایسے جانور یا پرندے کی اُنگلی کی مانند ہے، جس کا پنجا پھیلنے پر تکون کی شکل اختیار کرلیتا ہو اور یہ نمونہ جیسے اُس تکونی پنجے کی کوئی ایسی درمیانی اُنگلی ہو جو پنجہ پھیلنے پر بالکل عمودی رُخ پر باہر نکلی ہوئی نظر آتی ہے۔

اب سوچیں کہ ایک تکون پنجہ ہے۔ اُس پنجے کے کھلنے پر پیچھے کی طرف ایک چھوٹی اُنگلی دُم کی طرح نظر آتی ہے اور یہ بڑی اُنگلی بالکل سامنے کی طرف، عین پنجے کے درمیان سے بالکل سلاخ کی طرح سامنے رُخ پر نکلی ہوئی نظر آرہی ہے۔ اطراف میں تکونی پنجہ پھیلا ہوا ہے......

اس خیالی تصویر کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوچیے کہ یہ آج کی جدید ٹیکنالوجی کے کس شاہکار کا ممکنہ قدیم نمونہ ہوسکتا ہے۔

ماہرین نے اس چھوٹے سے نمونے کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ ان ماہرین میں آثاریات اور فضائی ٹیکنالوجی کے اعلیٰ ترین ماہر شامل تھے۔ سائنسی بنیادوں پر تفصیلی تجزیے کے بعد فضائی ماہرین کی متفقہ رائے تھی کہ یہ نمونہ متعدد اقسام کے جدید سپرسونک طیاروں کے پَروں جیسا ہی ہے۔ یہی نہیں، اس نمونے کی تیاری میں ریاضی کے اُن اصولوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے، جس کے تحت جدید سپرسونک طیاروں کے تکونی بغلی پَر بنائے جاتے ہیں۔ یہ نمونہ اُس تہذیب سے تعلق رکھتا ہے جو 500 سے 800 بعد از مسیح میں آج کے لاطینی امریکا میں پھلی پھولی تھی۔ ماہرین آثار اُس دور کو اصطلاحی طور پر pre-Incan society (قبل از انکا سماج) کا نام دیتے ہیں۔

خالص سونے سے بنا ہوا یہ نمونہ مصر کے مقبرے سے ملنے والے ہوائی جہاز کے ماڈل کی طرح فضا میں اُڑ تو نہیں سکتا لیکن پھر بھی یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اس کی ساخت ایسے جہازوں کے پَروں سے بھی مشابہ ہے جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد بننے شروع ہوئے اور اُس دور میں جدید ترین ہوائی جہاز کہلائے گئے تھے۔

فضائی انجینئرنگ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ گوکہ فضائی اُڑان والے ان نمونوں کی ایک قدر تو مشترک ہے کہ وہ تمام کے تمام آج کے جہازوں کے مکمل یا اُن کے بعض حصوں سے مشابہت رکھتے ہیں تاہم ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ سب کے سب نمونے پرندوں سے متاثر ہیں۔ پرندے، جن کے بارے میں ایک بات پر سب کا اتفاق ہے کہ یہی انسان کو فضا میں اُڑنے کی ترغیب دینے کا سبب بنے ہیں۔

کولمبیا سے ملنے والے اس نادر نمونے کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اُسے غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی بناوٹ انگریزی کے دوسرے حرف تہجی B سے خاصی مشابہ ہے۔ کچھ محققین نے اس حوالے سے یہ بھی خیال پیش کیا ہے کہ اس نمونے کا ذہنی یا تخلیقی سفر مشرقِ وسطیٰ سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتا ہے۔ اس بات کے پیچھے شاید یہ خیال رہا ہے کہ اب تک دریافت کیے گئے اس طرح کے نمونوں میں مکمل ترین ہوائی جہاز کا سب سے اعلیٰ ترین نمونہ خود مشرقِ وسطیٰ کے ملکِ مصر کے ایک مقبرے سے ملا تھا۔

مصری ہوائی جہاز کا ماڈل ملنے کے بعد سے اب تک اس نوع کی جتنی دریافتیں ہوئی ہیں، اُن کے موجدین یا

تخلیق کار اب تک اسرار کی گہری دھند میں کھوئے ہوئے ہیں اور اُن کے بنائے ہوئے یہ نمونے آج کی دنیا کے باسی ہم انسانوں کے لیے طرح طرح کے پُراسرار خیالات کو جنم دینے میں مدد دے رہے ہیں، تاہم سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جب تک ان نوادرات کے عہد کا تعین اور اُن کے تخلیق کاروں کے سماجی و علمی پس منظر کو بے نقاب نہیں کرلیا جاتا، تب تک ہر بات صرف قیاس آرائی ہے ماسوائے اُس حقیقت کے جو سائنسی تجزیوں میں ثابت ہوچکی ہو جیسا کہ مصری ماڈل کے ساتھ ہوا ہے۔

اب ایک اہم ترین بات کولمبیا سے ملنے والے اُس نمونے کی۔

یہ نمونہ ایک گلدان نما مرتبان کے اوپر آویزاں حالت میں ملا تھا۔ مرتبان سے دو پتلی پتلی تاریں باہر کو نکلی ہوئی تھیں جس سے یہ شے معلق حالت میں نظر آرہی تھی۔ اس چھوٹے سے پتلے مرتبان کی لمبائی چھ انچ (پندرہ سینٹی میٹر) تھی۔ اس مرتبان کے اندر تارکول جیسا مادہ بھرا ہوا تھا۔ جس میں چار انچ کی گہرائی تک تانبے کی دو پتلی پتلی تاریں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے تک اندر تک گئی ہوئی تھیں۔ تاریں تانبے کے ایک ڈھکن سے باہر نکل کر اُس تکون سے جُڑی ہوئی تھیں، جس پر وہ نمونہ جھولتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مرتبان ٹھوس تانبے کا بنا ہوا تھا اور جس طرح اس میں سے دو تاریں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر باہر نکلی ہوئی تھیں اور جس طرح مرتبان کے اوپر تانبے کا ڈھکن لگا کر اُسے سربہ مہر کیا گیا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے اس چھوٹے سے پتلے مرتبان کو ہم باآسانی آج کے بیٹری سیل سے مشابہت دے سکتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ یہ بیٹری سیل بنانے والے چھ انچ کے اس سیل سے اتنی توانائی حاصل کرچکے ہوں کہ وہ دو انچ کے تکونی ٹکڑے کو اُس بیٹری سیل کے ساتھ جوڑ کر اسے فضا میں اُڑا سکتے ہوں، البتہ اس نمونے کے تجزیے میں ماہرین ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔ اب اسی نوع کی بیٹری کے بارے میں ایک اور نہایت حیران کن انکشاف۔

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ماہرینِ آثاریات کو بغداد سے اسی نوع کا ایک چھوٹا سا مرتبان ملا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کے درمیان میں بالکل اُسی انداز میں ایک لوہے کی پتلی سی سلاخ گڑی ہوئی تھی، جیسا کہ آج کے بیٹری سیل میں سیسہ کی سلاخ نصب ہوتی ہے۔ ماہرین کو یقین تھا کہ یہ قدیم دور کی کوئی بیٹری ہے۔ جب اس نمونے کا سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا زمانہ 250 قبل از مسیح سے 224 سنِ عیسوی کے درمیان کا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عراق کے اس حصے پر وہ جنگجو آباد تھے جنہیں پارتھسین کہا جاتا ہے اور تاریخ میں ان کا تعلق جنگجویانہ اور خانہ بدوش سرگرمیوں سے بھی جُڑا ہوا ہے۔

ذرا سوچیے......

کولمبیا سے آج کے سپر سونک جہازوں کے پَروں سے مشابہ جو شے اور اُس سے منسلک بیٹری ملی ہے، اس کے بعد کئی ماہرین نے اپنے مضامین میں یہ خیال پیش کیا تھا کہ جہازوں اور فضائی سفر سے مشابہ اُن نمونوں کا تعلق مشرقِ وسطیٰ کی سرزمین سے ہوسکتا ہے۔

اس تناظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پارتھسین باشندوں کے کچھ دماغوں نے توانائی کے حصول کا وہ سائنسی ذریعہ تلاش کرنا شروع کردیا تھا جو بیٹری کی شکل میں پہلے بغداد اور پھر ہزاروں میل دور لاطینی امریکا سے دریافت ہوا۔ کیا پارتھسین ہی اس ٹیکنالوجی کو لے کر وہاں تک پہنچے تھے یا پھر اُنہی اجنبی خلائی مخلوق کے کچھ ساتھی اُس خطے میں کسی اور سیارے سے اُتر کر آئے تھے، جنہوں نے مشرقِ وسطیٰ میں ہوائی جہاز کا نفیس ترین، موثر اور کارگر ماڈل بنا کر مقبرے میں محفوظ کردیا تھا مگر کس کے لیے؟

☆☆☆

بغداد سے ملنے والی قدیم بیٹری کا یہ نادر نمونہ مغربی ماہرِ آثاریات ولہیم کونگ نے دریافت کیا تھا۔ 1937ء میں دریافت کے کچھ عرصہ بعد وہ اسے لے کر عراق کے ایک عجائب گھر پہنچا جہاں اس نے تحقیق کی کہ آیا وہ اس بیٹری سے بجلی پیدا کرسکتا ہے۔ اس نے بیٹری میں موجود تمام عناصر و اجزا کی کیمیائی جانچ پڑتال کی اور پھر اُس جیسی ایک اور نقل تیار کی اور تجربات شروع کردیے۔ بہت جلد وہ دریافت شدہ شے کی بناوٹ اور کیمیائی مادوں کے مطابق تیار کردہ نقل سے بجلی پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

ولہیم نے اپنے تجربے سے پتا چلا لیا تھا کہ اگر دریافت شدہ قدیم بیٹری میں تیزابی محلول ڈال دیا جائے تو وہ باآسانی بجلی پیدا کرسکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اُس نے سرکہ، لیموں کا تیزابی رس اور copper sulphete sollution کا استعمال کیا اور ان اجزا کو اپنی تیار کی گئی بیٹری کی نقل میں شامل کردیا۔ یوں اُس

نے قدیم طرز کی اُس بیٹری کی طرز پر بنائی گئی اپنی نقل میں مذکورہ بالا عناصر کا تیزابی محلول شامل کرکے ڈیڑھ سے دو وولٹ تک کی بجلی باآسانی پیدا کرلی تھی۔ اُس نے یہ بھی پتا چلا لیا تھا کہ اگر بیٹریوں کی تعداد اور مذکورہ تیزابی محلول کی مقدار کو بڑھایا جائے تو اس سے حاصل شدہ بجلی کی مقدار بھی بڑھتی جائے گی۔

ولہیم کا تجزیہ اور تجربہ، کیمیا اور ریاضی کے سیدھے سادے اصولوں پر مبنی تھا۔ بجلی کی مقدار بڑھانے کی بات ریاضی کا سیدھا سادہ ضرب کا اصول تھا۔ کامیاب تجربے کے بعد اب اُسے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہ تھی کہ سرکہ یقیناً اُن قدیم باشندوں کے لیے جانا پہچانا محلول ہوگا اور شاید وہ اس کے کیمیائی خواص سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے۔ اسی لیے وہ بیٹری سیل بنا چکے تھے۔ ممکن ہے کہ اس نوع کے بیٹری سیلوں کی مدد سے وہ بجلی یا پھر توانائی کی اچھی خاصی مقدار حاصل کرکے اُس سے ہزاروں سال پہلے ہی اسے استعمال کرچکے تھے، جب دورِ جدید کے انسان نے بیٹری سیل اور بجلی ایجاد کرکے ٹیکنالوجی کے بلند ترین مینار پر کھڑے ہو جانے کا دعویٰ کیا تھا۔

اسی طرح بغداد کے ایک قدیم مقام پر مٹی سے بنے کچھ برتن دریافت ہوئے تھے۔ یہ عام طرز کے برتن نہیں تھے۔ ان کی بناوٹ سے کچھ خاص اظہار ہوتا تھا۔ ان برتنوں کی بناوٹ کے باعث آثاریات اور بجلی کے ماہرین نے ان میں دلچسپی لی اور پھر مختلف تجربات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ برتن بڑے پیمانے پر بجلی پیدا کرنے کے عمل کا حصہ تھے۔ اس حوالے سے ان ماہرین نے طویل مگر تکنیکی زبان میں رپورٹ لکھی تھی۔

اس رپورٹ کا لُبِ لباب یہ تھا کہ یہ برتن اُس تکنیکی عمل کا ایک اہم عنصر تھے جن کی مدد سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ ان کی رائے میں وہ قدیم لوگ نہ صرف یہ کہ بجلی پیدا کرچکے تھے بلکہ سائنسی اصولوں پر استوار طریقۂ کار پر دسترس کے علاوہ اُس کا استعمال بھی جانتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ بجلی پیدا کرنے کے اس اہم بنیادی اصول کو بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ جب ایک الیکٹرون کو رگڑ پہنچائی جائے تو وہ ہلکے اجسام (مثلاً بال، مٹی کے ذرات وغیرہ) کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ یہ سائنسی اصول اب بھی بجلی کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔

اگرچہ بیٹری سیل اور اُن برتنوں کے علاوہ وہاں سے ایسی کوئی اور اہم شے نہیں مل سکی تھی کہ جس سے قدیم دور کے اُن لوگوں کی ٹیکنالوجی پر دسترس کے حوالے سے مزید آگاہی مل سکتی، تاہم اس سے دنیا کے کئی علمی حلقوں میں نئی بحث چھڑ گئی تھی۔

چند صاحبانِ بصیرت کی رائے تھی کہ صرف عراق کے پارتھسین ہی نہیں، اُن سے بھی پہلے کی کئی اقوام مثلاً قدیم مصری باشندے بھی بجلی کی پیداوار اور اُس کا استعمال کرتے تھے۔

یہ ایسا دعویٰ تھا کہ اسے سننے والا سنتے ہی جھٹلا سکتا ہے لیکن جس کے ذہن میں ولہیم کونگ کی دریافت، اُس کے تجربات اور اُس کے بعد سرزمینِ بغداد کے مضافات سے مٹی کے برتنوں کی دریافت اور اُس پر کی گئی تحقیق ہو، اگر وہ اقرار نہیں کرتا تو سرے سے انکار بھی نہیں کرے گا۔ اسرار کے پردے میں یہ حقیقت اب تک بدستور یقین اور بے یقینی کے درمیان جھول رہی ہے۔

☆☆☆

اُنیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے لے کر بیسویں صدی کے پہلے نصف تک، دنیا کے بڑے حصے پر مختلف نوآبادیاتی نظاموں کا قبضہ تھا۔ اگرچہ نوآبادیاتی تسلط کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ جس عرصے کا ذکر کیا گیا ہے یہ آثارِ قدیمہ اور دریافت کے حوالے سے دنیا بھر بالخصوص اُن تمام ممالک میں جو تاریخ کے کسی ادوار میں نوآبادیاتی نظام کا حصہ رہے ہیں، اہم ہے۔

مغرب کے قابضین کے دور کے اِس حصے میں آثارِ قدیمہ نے دنیا کے مختلف حصوں میں تیزی سے فروغ پایا۔ وقت کے اُس دور میں تیزی سے دریافتوں کا سلسلہ شروع ہوا جس نے کئی اَن کہی کہانیاں اور ذہن کو حیران کردینے والے سوالات دنیا کے سامنے پیش کیے۔ کچھ سوالات ایسے بھی ہیں کہ جن پر اب تک تحقیق جاری ہے۔ کچھ ایسے معمے بھی ہیں کہ جو ہمیں یہ باور کرواتے ہیں کہ پچھلی دو صدیوں میں انسان نے ٹیکنالوجی کے میدان میں جتنی نمایاں کامیابیاں .... حاصل کی ہیں، ہزاروں سال پہلے شاید ہم انسانوں کے اجداد یا پھر کوئی اور اجنبی مخلوق اُن پر عبور حاصل کرچکی تھی۔ زمین پر ان کے آثار بکھرے ہوئے ہیں مگر سمجھنے کے لیے صاحبِ نظر ہونا لازم ہے۔

☆☆☆

یہ 1900ء کی بات ہے۔ یونان کے

جزیرہ Antikythra کے قریب چند غوطہ خور سمندر میں غوطہ خوری کر رہے تھے کہ انہیں ایک ڈوبے ہوئے بحری جہاز کے آثار نظر آئے۔ ان غوطہ خوروں کا مطمح نظر ڈوبے ہوئے جہازوں کو تلاش کرکے ان سے نوادرات اور مال و دولت کا حصول تھا۔ سمندر کی تہہ میں پڑے جہاز کا ملبہ ان کے لیے دولت کے حصول کا ذریعہ تھا۔ وہ تیزی سے اُس کی طرف لپکے مگر جو کچھ اُن کے ہاتھ لگا، اُسے دیکھ کر وہ بہت مایوس ہوئے مگر آثاریات کے ماہرین کے لیے وہ چونکا دینے والی حقیقت تھی۔ ایسی حقیقت جس کا ایک راز تو تقریباً نصف صدی بعد جا کر کھلا۔ البتہ اس سے جُڑے کئی سوالات اب بھی دماغ کو چکرا دینے کے لیے کافی ہیں۔

ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی عہد رفتہ کی اس دریافت کا قصہ کچھ یوں ہے کہ جس ڈوبے ہوئے بحری جہاز کے آثار یونان کے ساحل سے کچھ فاصلے پر ایک جزیرے کے قریب ذرا اُتھلے پانی میں پائے گئے تھے، سائنسی تجزیے کے بعد اُس کی قدامت دو ہزار برس ثابت ہوئی۔

غوطہ خوروں کی اس اتفاقی دریافت پر کانسی کے بنے ہوئے مجسمہ نما اشیا لدی ہوئی تھیں، جن کی ہیئت سمندر کے نمکین پانی میں ہزاروں سال تک ڈوبے رہنے کے باعث بڑی حد تک تبدیل ہو چکی تھی لیکن اُس کے باوجود بعض اشیا اتنی درست حالت میں ضرور ملی تھیں کہ اُن پر تحقیق ممکن ہو سکتی۔ کئی برس کی تحقیق کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جہاز یونان جا رہا تھا اور اُس کے ڈوبنے کا زمانہ 65 قبل از مسیح تھا۔

جہاز سے لکڑی کے نمونے اور کانسی کی بنی جو چیزیں دریافت ہوئی تھیں، وہ حیرت انگیز طور پر بحری سفر میں رہنمائی کے ایسے آلات سے مشابہ تھے جن کا استعمال بیسویں صدی کی ابتدا تک جہاز رانی میں کیا جاتا تھا اور وہ اپنے وقت کے جدید ترین بحری رہنمائی کے آلات سمجھے جاتے تھے۔

اس جہاز سے لکڑی اور کانسی کا بنا ہوا ایک بڑا سا ٹکڑا بھی نکالا گیا تھا۔ اس کی ہیئت بہت بدل چکی تھی لیکن اس کے باوجود اُس آلہ نما شے سے نصب ہندسے، اعداد و شمار، گراریاں اور گاڑی کے اسٹیئرنگ وہیل جیسی کئی چیزیں کسی حد تک سلامت تھیں۔ کانسی اور لکڑی سے بنی یہ شے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں ماہرین نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہو نہ ہو، یہ اُس دور کی بحری جہاز رانی میں استعمال ہونے والا کوئی اہم میکانیکی آلہ ہوگا مگر کئی دہائیوں کی تحقیق کے بعد بھی اُن کی سمجھ میں یہ نہیں آ سکا کہ آخر وہ شے کیا تھی مگر تحقیق بدستور جاری رہی۔ آخر 1954ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے محقق ڈیرک جے ڈی سولا پرائس یہ عقدہ حل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ڈیرک نے انکشاف کیا تھا کہ یہ ایک ایسا قدیم آلہ ہے جو رہنمائی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ آلہ میکانیکی خطوط پر تیار کیا گیا تھا اور بحری جہاز میں اُس کی تنصیب کا مطلب ہے کہ وہ سمندری سفر میں رہنمائی کے لیے کئی حوالوں سے استعمال ہوتا ہوگا۔ نیز، یہ آلہ تجرباتی مراحل میں نہیں بلکہ کامیاب تکمیل کے بعد اُس وقت کی جہاز رانی میں بالعموم استعمال کیا جاتا ہوگا۔ اُن کا مزید کہنا تھا کہ یہ بالکل اُسی طرح کا ایک آلہ تھا جیسا کہ گزشتہ دو تین صدیوں سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ کے بحری جہازوں میں سمت کی رہنمائی اور وقت کے تعین وغیرہ کے لیے استعمال کیے جاتے تھا۔

ڈیرک کے یہ الفاظ اس آلے کی افادیت اور اس کے درست ترین میکانیکی نظام کا اعتراف تھا "یہ آلہ جب نیا ہوگا اور کام کرتا ہوگا تو یہ بالکل اُسی طرح مفید ہوگا کہ جیسے آج کے ہمارے بحری رہنمائی کے وہ آلات جو سمت اور وقت کا درست ترین تعین کرتے ہیں۔"

ڈیرک نے جن دو میکانیکی چیزوں کے باہمی تعلق اور کارکردگی کی مثال پیش کی ہے، اُن دونوں کے درمیان دو ہزار سال سے زائد کا فرق طے کر لیا گیا ہے۔ یعنی کہ آج ہم جس جدید ترین بحری میکانیکی نظام پر کاربند ہیں، ویسا ہی یا کم و بیش اُس جیسے .... میکانیکی نظام پر دو ہزار سال پہلے بحری جہاز رانی ہو رہی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ لوگ ٹیکنالوجی میں اس قدر آگے تھے کہ بحرِ بیکراں میں بھی اپنے آلات کی مدد سے درست ترین سمت کا تعین کرکے منزل پر پہنچا دینے والے آلات کی تیاری اور استعمال پر قدرت حاصل کر چکے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنے آلات کی مدد سے وقت کے گزرتے ہر لمحے کو جان لیا کرتے تھے، ویسے ہی جیسے کہ ہم آج کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ دن یا رات کا کون سا پہر اور کون سی گھڑی گزر رہی ہے.... بات مختصر یہ کہ وہ گھڑی بھی بنا چکے تھے۔

گھڑیال اور رہنمائی کے لیے جس قدیم آلے کی بات ہو رہی ہے، اُس میں بڑی بڑی بیس گراریاں نصب تھیں۔ یہ گراریاں لکڑی کے ایک ڈبے کے اندر نصب کی گئی تھیں اور باہر کی جانب ایک گول بڑا سا ڈائل لگا ہوا تھا بالکل آج کے گھڑیال جیسا۔ کانسی کے بنے اُس گول پلیٹ نما ڈائل پر ہندسے بھی لکھے ہوئے تھے۔ ڈیرک کہتے ہیں کہ یہ ہندسے ہماری گھڑیوں کے ہندسوں کی مانند ہی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گراریاں گھومنے سے ڈائل پر بنی سوئیاں بھی گھومتی تھیں۔ یہ عمل بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ ہماری روایتی طرز کی عام سی گھڑی کی مشین اور اس کے کام کرنے کا طریقہ ہے۔

ڈیرک کا کہنا تھا کہ یہ مشین صرف وقت ہی ظاہر نہیں کرتی تھی بلکہ سمت کی درست ترین رہنمائی بھی کرتی تھی۔ وہ یہ بھی بتا سکتی تھی کہ جہاز کا رخ کیا ہے۔ وہ چاند، سورج اور زمین کی سمتوں کا درست ترین تعین کرتی تھی۔ اس مشین سے سیاروں کے رخ کا بھی پتا چل جاتا تھا۔ یہ وہ سیارے ہیں جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے آسمان پر دیکھ سکتے ہیں مثلاً مریخ، زہرہ، عطارد وغیرہ۔

واضح رہے کہ روایتی بحری جہاز رانی میں آسمان پر ستاروں کا رخ کھلے سمندر میں سفر اور سمت کے درست ترین تعین کے لیے ہمیشہ سے مددگار رہا ہے۔ آج بھی آسمان پر ستاروں کی یہ چال صرف سمندر میں ہی نہیں، زمین پر بھی رات کے اندھیرے میں سفر کرنے والوں کے لیے 'سمت نما' کا فرض سرانجام دیتی ہے۔

ڈیرک نے دو ہزار برس قبل کی بحری ٹیکنالوجی کے اس پُراسرار عجوبے کا راز کھولنے والی اپنی تحقیق میں لکھا ہے "دنیا بھر میں اس نوع کا کوئی دوسرا قدیم ترین تکنیکی آلہ موجود نہیں جو ہمارے مشاہدے کے لیے محفوظ ہو۔ دنیا بھر میں ٹیکنالوجی کے حوالے سے کسی کتاب یا دستاویز میں نہ تو اس طرح کے کسی آلے کا تذکرہ موجود ہے اور نہ ہی تصور...... یہ نہایت منفرد اور حیران کر دینے والا ایسا آلہ ہے جو ثابت کرتا ہے کہ دو ہزار برس قبل بھی ٹیکنالوجی اپنے عروج پر تھی مگر کن لوگوں کے ہاتھوں اسے یہ مقام ملا، ٹیکنالوجی کو ایسا زوال کس طرح پیش آیا کہ ہمارے عہد کی پچھلی دو صدیوں تک اُسے دوبارہ اپنے عروج ملنے کا انتظار کرنا پڑا...... یہ سب کچھ عقل کو حیران اور دماغ کو ششدر کر دینے والا ہے۔ میں نے صرف ایک آلے کا راز پایا ہے مگر ابھی تک اس کے بنانے والے، استعمال کرنے والے، اُن کا عروج و زوال اور پھر ہمارے عہد کے انسانوں کے ذہنوں تک اسی طرح کی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کا خیال...... کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ماجرا کیا ہے۔"

ڈیرک نے آگے چل کر ایک اور دلچسپ بات بیان کی ہے۔ اگر ان کی رائے کا غور سے جائزہ لیا جائے تو اُن لوگوں کے خیالات کو تقویت ملتی ہے جو کولمبیا سے ملنے والے سپرسونک کے بغلی پَروں سے مشابہ دریافت کے بعد سے قدیم ٹیکنالوجی اور اس کی کرۂ ارض کے دیگر خطوں کو منتقلی کا سرچشمہ مشرقِ وسطیٰ کی زمین سے جوڑتے ہیں۔ ڈیرک لکھتے ہیں:

"یونان کے جزیرے کے قریب سے ملنے والے بحری جہاز کے آثار اس بات کا ثبوت ہیں کہ روم کے ساحل پر صرف بحری جہاز ہی نہیں بلکہ علم بھی پہنچا تھا، وہ علم جسے ہم نے بھلا دیا مگر عربوں نے کسی حد تک اس سے رشتا جوڑے رکھا۔ جہاز سے جو شے ملی تھی وہ وقت کا درست ترین تعین کرتی تھی۔ کہیں یہ وجہ تو نہیں کہ انہوں نے قرونِ وسطیٰ کے اُن یورپی لوگوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑا جو وقت کے تعین کے لیے آلہ (گھڑی) بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب اس ضمن میں اُس وقت تک بہت آگے نکل چکے تھے۔ وہ وقت کے تعین کے لیے گھڑی بنا چکے تھے۔"

یاد رہے کہ قرونِ وسطیٰ کے آخری ایام یعنی پندرہویں صدی عیسوی میں میکانیکی طرز کی گھڑی جرمنی میں سامنے آئی تھی۔ یہ گھڑی لکڑی کے ایک چوکھٹے میں گراریاں اور دیگر آلات نصب کرکے تیار کی گئی تھی۔ اُس کے اوپر ہر گھنٹے پر بجنے والی ایک گھنٹی لگی تھی جو ایک ڈور اور لیور کی مدد سے گراریوں کے ساتھ منسلک تھی۔ چوکھٹے کے باہر پہیے کی شکل کا ڈائل نصب تھا۔ جس کے بیچ کا حصہ گولائی میں کٹا ہوا تھا۔ اس گھڑی کے ڈائل پر ہندسے رومن میں تھے۔ ڈیرک نے اسی گھڑی کا حوالہ اپنی تحقیق میں بیان کیا ہے۔

☆☆☆

فضا اور پانی پر سفر کے آلات و ذرائع اور توانائی کے حصول کی حیران کن ٹیکنالوجی حاصل کر لینے والے تاریخ کے گمنام مگر پُراسرار لوگوں سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ زمین کو بھول چکے تھے۔

آج ناہموار زمینوں کو ہموار کرنے اور پہاڑوں سے سڑکیں گزارنے کے لیے بلڈوزر کا استعمال کوئی اہم بات نہیں۔ بطور انسان ہم سمجھتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کے انقلابی سفر میں اس کام کے لیے یہ ایجاد صرف ہمارے عہد کے

انسانوں کی ہی مرہونِ منت ہے مگر 1920ء میں پناما کے ایک علاقے سے سونے سے بنا ہوا۔ ایک ایسا نمونہ ملا ہے جو ہمارے بلڈوزر سے مشابہ ہے۔

سونے سے بنے اس نمونے کو اگر کھلونا سمجھ کر پہلی نظر ڈالیں تو یہ ہمیں وسطی اور جنوبی امریکا میں پائے جانے والے تیندوے سے مشابہ نظر آئے گا مگر جب قریب سے جائزہ لیں تو حیران کن انکشاف ہوتا ہے۔ اس نمونے کی تیاری میں تکنیکی اصولوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے کام کرنے کے تمام تکنیکی اوصاف آج کے بلڈوزر میں موجود تمام تر خاصیتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

بلڈوزر سے مشابہ اس ماڈل میں مٹی اٹھانے کے لیے آگے کی جانب گھومنے اور دائیں بائیں حرکت کرنے والا لمبا سا بازو نصب ہے۔ اس کے پہیے بھی ہیں، جن کا جائزہ لو تو پتا چلتا ہے کہ کنویئر بیلٹ کے درمیان میں نصب یہ پہیے اُس بیلٹ کے حرکت میں آنے پر گھومتے ہیں اور ایک بلڈوزر کی طرح آگے پیچھے کی طرف اپنا سفر طے کرتے ہیں۔

بعض مغربی ماہرینِ آثاریات کا کہنا ہے کہ یہ اُس مشین کا نمونہ ہے جو ماچوپیچو کے 'شہرِ گمشدہ' کی تعمیر میں زمین کی ہمواری، تعمیراتی سامان کی فراہمی (جس میں ٹنوں وزنی ہموار پہاڑی پتھر شامل تھے) کو دشوار گزار مقام تعمیر پر پہنچانے اور تنگ پہاڑی گھاٹی میں زمین ہموار کرنے کے لیے استعمال کی گئی تھیں۔ واضح رہے کہ تنگ پہاڑی گھاٹیوں میں ماچوپیچو کا یہ 'شہرِ گمشدہ' سطح سمندر سے 2340 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔

پیرو میں ماچوپیچو کی دو تنگ پہاڑی چوٹیوں میں سے ایک پر یہ شہر آباد کیا گیا تھا۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان دریائے یورو بامبا بہتا ہے۔ ماچوپیچو کے اس پُراسرار مگر ویران شہر کو، تنگ پہاڑی چوٹیوں کو ہموار کرکے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس تک پہنچنے کا راستا بھی نہایت دشوار ترین ہے۔ صرف ایک ہی راستا ہے، جس کے ذریعے یہاں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

دشوار گزار پہاڑی چوٹی کو ہموار کرکے باقاعدہ طور پر منصوبہ بندی کے ذریعے مندر، انتظامی دفاتر اور رہائشی علاقے تعمیر کیے گئے تھے۔ مدتوں یہ شہر ویران اور دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا۔ اس شہر کو امریکا کی Yale یونیورسٹی کے شعبہ آثاریات کے پروفیسر ہیرم بینگھم نے 1911ء میں ڈھونڈا تھا۔ جس کے بعد اُسے انکا تہذیب سے جوڑ دیا گیا مگر بعد میں جب سائنسی تجزیہ کیا گیا تو بات کچھ اور نکلی۔

1980ء میں اس آثار کی ریڈیو کاربن ڈیٹنگ کی گئی، جس کے نتیجے میں پتا چلا کہ یہ علاقہ 1000 قبل مسیح میں بھی آباد رہ چکا تھا۔ تجزیے کی روشنی میں اس شہر کی آبادی کا دوسرا عہد ساتویں صدی عیسوی کا تھا۔ اس بارے میں ماہرینِ آثاریات کا دعویٰ ہے کہ دوسرے عہد میں یہاں بسنے والوں کا اِنکا تہذیب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تیسرے عہد کا تعین 1200 سے 1450 عیسوی لگایا ہے۔ ماہرین نے یہ طے کردیا کہ شہرِ گمشدہ کو بنانے والے اِنکا باشندے نہیں تھے تاہم یہ کہنے سے وہ قاصر ہیں کہ پھر وہ لوگ کون تھے؟

شہرِ گمشدہ کا حقیقی نام کیا ہے؟ یہ راز بھی اس کے بنانے والوں کی طرح اب تک معما بنا ہوا ہے۔ دشوار ترین پہاڑی مقام پر کس طرح تعمیرات کی گئیں، اس بارے میں بھی ماہرین خاموش ہیں۔ بڑے بڑے تراشیدہ پہاڑی سلوں کو کس طرح تیار کیا گیا، کیسے اس مقام تک پہنچایا گیا اور زمین سے اٹھا کر انہیں کس طرح اُس مقام پر رکھا گیا، جہاں اب تک یہ موجود ہیں......

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ ٹیکنالوجی کا دور نہیں تھا۔ یہ بات سچ ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اُس کے بنانے والے کیا نہایت طاقت ورترین لوگ تھے کہ جو وہ کام کر گئے جو پہلی نظر میں انسان کے بس کی بات نظر نہیں آتی یا پھر وہ مافوق الفطرت قوت کے حامل تھے کہ اُن کے لیے یہ کام کرنا بے حد آسان ثابت ہوا۔ اسی قوت کے بل پر انہوں نے اپنا پُراسرار شہر بسایا اور پھر اسے ویران چھوڑ کر خود کہیں اور چل دیے۔

اب اس تناظر میں پلٹتے ہیں۔ پناما سے ملنے والے سونے سے بنے بلڈوزر کے نمونے کی طرف، جس کے عہد کا حتمی تعین ابھی تک نہیں ہوا تاہم ماہرین کا خیال ہے کہ وہ بھی کم سے کم ہزار سال کے ارد گرد قریب ہوگا۔

اب اگر اس تناظر میں ہم کہیں کہ شہرِ گمشدہ کے باسی بلڈوزر تیار اور استعمال کرنا جانتے تھے تو پھر سوال ہے کہ ان کی وہ ٹیکنالوجی کس طرح روبہ زوال ہوئی کہ اسے محفوظ کرنے کے لیے نمونوں کی شکل دینا پڑی۔ صرف اسی ایک سوال کا جواب درکار نہیں، ان گنت سوال موجود ہیں۔

☆☆☆

قدیم ٹیکنالوجی کے پُراسرار سفر میں اب جائزہ لیتے ہیں برصغیر کا اور مثال کے لیے ذکر ہے بھارت کے دارالحکومت دہلی کے نواحی مقام مہراؤلی میں نصب لوہے کی لاٹھ کا۔

لوہے کی یہ لاٹھ بائیس فٹ بلند ہے۔ اس کا قطر سوا چار فٹ ہے۔ اس کے انتہائی بلند سرے پر واقع حصہ منقش ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پوری لاٹھ بے جوڑ ہے۔ اتنی لمبی لوہے کی لاٹھ کی تیاری یقیناً اُس وقت بھی اور آج بھی حیرت ناک عمل تھا اور ہے۔

اِس لاٹھ کی تیاری اِس لیے حیرت کا سبب بنی کہ تب ٹیکنالوجی اتنی جدید نہ تھی اور آج وہ قدیم ٹیکنالوجی پُراسرار اہمیت کی حامل ہے۔ کسی کو علم نہیں کہ وہ کیا ٹیکنالوجی تھی جس کے ذریعے یہ لاٹھ تیار کی گئی تھی۔ ماہرین سوال اٹھاتے ہیں کہ اس لاٹھ کی تیاری اور تنصیب کا مقصد کیا تھا؟ کیا اس کی تیاری اور تنصیب صرف آرائشی مقصد یا بطور یادگار تھی یا یہ کسی اور خاص مقصد کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اتنے بلند مینار پر چڑھ کر اطراف کے علاقے پر باآسانی نظر رکھی جاسکتی ہے مگر اس لاٹھ پر ایسی سیڑھیاں یا کوئی اور چیز موجود نہیں جس سے اُس کے سرے تک پہنچا جاسکے۔

لوہے کی اس لاٹھ کا وزن چھ ٹن سے زیادہ ہے۔ مغربی ماہرینِ ٹیکنالوجی نے اس لاٹھ کے لوہے کا سائنسی تجزیہ کرکے پتا چلایا ہے کہ یہ خالص لوہے سے بنی ہوئی ہے۔ یہ وہ لوہا ہے جس پر ہوا، زنگ یا سلفر، کچھ اثر نہیں کرتا۔ شاید اسی لیے یہ اب تک اپنی اصل ہیئت میں موجود ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان پر راجا چندر گپت کی حکومت تھی، اُس عہد میں یہ لاٹھ زمین پر نصب کی گئی تھی۔ اس لحاظ سے لاٹھ کی تنصیب گزشتہ ڈیڑھ ہزار برس قدیم ثابت ہوتی ہے۔

Mysterious of Mind, space & Time نامی کتاب میں ماہرینِ آثار نے دعویٰ کیا ہے کہ اگرچہ اس لاٹھ کی تنصیب پانچویں اور چھٹی عیسوی میں بیان کی جاتی ہے مگر اس دعوے سے قطع نظر، اس کی تیاری میں جو لوہا استعمال کیا گیا ہے، وہ کم و بیش چار ہزار سال سے سطحِ زمین پر موجود ہے مگر اس کے باوجود وہ ہر طرح کے زنگ سے محفوظ ہے۔

لاٹھ چار ہزار سال پہلے تیار ہوئی ہو یا ڈیڑھ ہزار سال پہلے...... یہ تو راز ہے مگر ایک بات صاف ہے۔ وہ بات اس کا بے جوڑ ہونا ہے۔ کبھی ماہرینِ آثاریات کا خیال تھا کہ یہ لاٹھ پہلے ٹکڑوں میں تیار کرکے، بعد میں ایک ساتھ جوڑی گئی تھی مگر بعد میں کیے جانے والے سائنسی تجزیوں نے اس طرح کے تمام خیالات کی نفی کردی ہے۔ یہ لاٹھ مکمل طور پر ایک لوہے کے ٹکڑے سے بنی ہوئی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اتنی بڑی لاٹھ کو خالص لوہے کے ایک بہت بڑے ٹکڑے سے تیار کرنے والوں کے پاس آخر ایسی کون سی ٹیکنالوجی تھی، جس کے استعمال سے انہوں نے یہ کام کردکھایا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے ماہرین نے اس لاٹھ کو دیکھنے کے بعد یہ جاننے کے لیے سرتوڑ کوششیں کیں کہ صرف ایک ٹکڑے کی مدد سے اتنی بلند و بالا لاٹھ کی تیاری کس طرح کے مراحل سے گزری ہوگی؟

برسوں کی کوششوں، تجربات پر تجربات اور تمام تر دستیاب متعلقہ ٹیکنالوجی کے استعمال کے بعد آخر یورپ میں اُنیسویں صدی کے آخر میں ماہرین ایک ایسی بے جوڑ لوہے کی لاٹھ تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے جو صرف لمبائی اور موٹائی میں مہراؤلی کی لاٹھ کے برابر تھی۔ البتہ اس کے باوجود اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ اُس جیسی دیگر خاصیتیں میں بھی اُس میں موجود ہوں گی۔

یورپ میں تیار کی گئی نقلی لاٹھ کی تیاری میں تمام تر جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کیا گیا تھا مگر کیا ہزاروں برس پہلے، مہراؤلی میں نصب لاٹھ بنانے والے بھی ایسی کسی ٹیکنالوجی پر دسترس رکھتے تھے کہ جو انہوں نے لاٹھ بناڈالی؟ یہ سوال اب تک تشنہ ہے مہراؤلی کی لاٹھ کے پسِ پردہ موجود حقیقت کی طرح۔

کرۂ ارض کے باسی انسانوں کے ماضی سے متعلق یہ وہ اَن گنت سوالات جن کے جوابات تاریخ اور علمِ بشریات کی روایتی کتابوں کے صفحات میں نہیں بلکہ پُراسراریت کے لبادے میں لپٹی کائنات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ابھی ان بکھرے جوابوں کو سمیٹنے والا آیا نہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے اور تمہارے بہت بعد، ان سارے تشنہ سوالوں کے جوابات مل جائیں جواب تک ہم سب کے دماغوں کو اسرار کے دھند کی دبیز چادر میں اب تک لپیٹے ہوئے ہیں۔

Patria

Minerva

Maria Teresa

ابن کبیر

وطن کی آزادی رکابی میں رکھ کر نہیں ملتی اور نہ ہی کوئی بھیک میں دیتا ہے۔ اس کے لیے جہد مسلسل کی ہمہ وقت ضرورت ہوتی ہے۔ اس ملک پر ایک ڈکٹیٹر نے قبضہ کررکھا تھا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا، اس کے سامنے کسی کو سر اٹھانے کی بھی جرات نہ تھی۔ ایسے پرآشوب دور میں ان تین نازک اندام بہنوں نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ یہ انہی کی قربانی کا ثمر ہے کہ آج ان کا ملک آزاد ہے

لاطینی امریکا کی تین بہنوں کی روداد جرات

وہ ایک حبس زدہ شام تھی۔ اندھیرا ہوتے ہی طوفانی بارش شروع ہوگئی۔

شہر سے آنے والی سڑک پر ایک جیپ دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیور کی نظریں راستے پر گڑی تھیں۔ تیز بارش کے باعث اُسے تھوڑی دقت پیش آرہی تھی۔ جیپ کے پچھلے حصے میں تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ تینوں آپس میں بہنیں تھیں اور اُس لمحے کچھ مغموم معلوم ہوتی تھیں۔

وہ ڈومینیکن ری پبلک نامی ایک چھوٹی سی ریاست تھی،

جس پر عرصۂ دراز سے ایک آمر مسلط تھا۔ اس اداس شام میں وہ عورتیں شہر لاکوارینٹو کی بدنام زمانہ جیل سے لوٹ رہی تھیں جہاں اُن تینوں کے شوہر بغاوت کے الزام میں قید تھے۔ انہیں شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اپنے شوہروں کی حالت نے عورتوں کو اداس کر دیا تھا۔

اچانک ہیڈ لائٹس کی تیز روشنیاں دکھائی دیں۔ ڈرائیور کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ دو گاڑیاں سڑک کے عین درمیان کھڑی تھیں۔ اس نے پوری قوت سے بریک دبا دیا۔ بارش کے شور میں ٹائر چرچرائے۔

اس سے قبل کہ جیپ میں موجود لوگ کچھ سمجھ پاتے، دراز قد اور خونخوار آدمیوں نے جیپ کو گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا اور چہروں پر وحشت منجمد تھی۔

سڑک سے کچھ دُور گنے کے کھیت تھے جس کے آگے گہری کھائی تھی۔ وہ ان چاروں کو گھسیٹتے ہوئے اس سمت لے گئے۔ جیپ اور اپنی گاڑیاں انہوں نے کچے میں اتار کر کھیتوں میں چھپا دیں۔ اپنا ایک آدمی سڑک پر تعینات کر دیا۔

تینوں عورتیں اب ان بدمعاشوں کے رحم و کرم پر تھیں مگر بارش میں بھیگتے ان کے چہروں پر خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ان کے سر بلند تھے۔

کیا وہ بھیڑیے ان خوبرو عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتے تھے؟

نہیں... اُن کے ارادے اس سے زیادہ مکروہ اور گہرے تھے۔ کھیتوں میں پہنچ کر انہوں نے تینوں عورتوں کو الگ کر دیا۔ جدا ہوتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے پر الوداعی نظر ڈالی۔

اُن میں سے ایک نے کہا۔ ”مجھے اپنی موت کا قطعی غم نہیں ہوگا، اگر یہ یقین ہو کہ میرے بعد کوئی میری بندوق اٹھا لے گا اور جنگ جاری رکھے گے۔“

”چے گویرا؟“ ان نامساعد حالات میں باقی دو بڑی سہولت سے مسکرائیں۔

”ہاں۔“ پہلی نے گردن ہلائی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

دو بدمعاش ڈرائیور کو دھکیلتے ہوئے ایک کونے میں لے گئے۔ کچھ دیر بعد اس کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا اور پھر چیخوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس پر ڈنڈے برسائے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ادھ موا ہو کر بے ہوش ہو گیا۔

ان چیخوں نے عورتوں کو ذرا خوفزدہ نہیں کیا۔ وہ ایک عزم کے ساتھ کھڑی رہیں۔ اگلے ہی لمحے بھیڑیے پوری قوت سے ان نہتی عورتوں پر حملہ آور ہو گئے۔ ان پر لاٹھیوں کی بارش کر دی۔

کیا ان کی چیخیں بھی سناٹے میں گونجیں؟

نہیں... گنے کے کھیتوں میں چیخیں بلند نہیں ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ہونٹ بند کر لیے۔ وہ ہر ضرب خاموشی سے سہتی رہیں۔ ان کی حیران کن برداشت نے دشمنوں پر وحشت طاری کر دی۔ انہوں نے مزید تشدد کیا۔ ان کی پسلیوں میں ٹھوکریں ماریں۔ مُکّے برسائے، مگر عورتوں نے رحم کی بھیک نہیں مانگی۔ وہ ہونٹ دبائے درد سہتی رہیں۔

کچھ دیر بعد تینوں بے ہوش ہو گئیں۔ بدمعاشوں نے انہیں اور ڈرائیور کو جیپ میں ڈالا اور اسے کھائی میں دھکیل دیا۔

جیپ ڈھلوان پر لڑھکتی ہوئی ایک دھماکے سے زمین سے ٹکرائی۔ اس میں سے شعلے اٹھنے لگے۔ قاتل اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد صدارتی محل میں رکھا سرخ فون بجا۔ اس مکروہ منصوبے کے خالق تک تینوں بہنوں کی موت کی اطلاع پہنچا دی گئی۔ ڈومینیکن ری پبلک کے صدر رافیل ٹروجیلو کے ہونٹوں پر وحشی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”میں نے تتلیوں کو مسل دیا۔“ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ ”اب کوئی مجھ سے ٹکرانے کی جرأت نہیں کرے گا۔“

وہ غلط تھا۔ 25 نومبر 1960 کے اس لرزہ خیز قتل کے بعد، جسے حکومت نے حادثہ قرار دینے کی بھرپور کوشش کی، ملک میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ تتلی بہنیں آزادی کا استعارہ بن گئیں۔ ہر شخص آمر کے خلاف سڑکوں پر نکل آیا۔ اگلے ہی برس ٹروجیلو کا تختہ الٹ دیا گیا۔ موت اُس کا مقدر بنی۔

☆☆☆

کسی زمانے میں لاطینی امریکا کو ایک بدنصیب خطہ تصور کیا جاتا تھا۔

برسا برس یہ بیرونی دنیا کے مفادات کی کھیتی بنا رہا۔ نوآبادیات کے زمانے میں غیروں نے اسے خوب لوٹا۔ اس کے وسائل کا بے دریغ استعمال کیا۔ پھر یہ خطہ امریکا بہادر کی توجہ کا مرکز بن گیا جو یہاں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کا متمنی تھا۔ اُسے معاشی اور سیاسی مفادات کے شکنجے میں جکڑنے کے لیے وہاں کبھی جمہوریت کو پنپنے نہیں دیا گیا۔ اس کام کے لیے ہمیشہ مقامی آمروں کو اپنا آلہ کار بنایا گیا۔

رافیل ٹروجیلو بھی ایک ایسا ہی آمر تھا۔ یہ شاطر شخص مقتدر حلقوں کی حمایت سے 1930 میں برسرِ اقتدار آیا۔ وہ فوج کا سابق افسر تھا۔ اس نے اعلیٰ عہدوں تک رسائی کے لیے جہاں چاپلوسی سے کام لیا، وہیں چالیں بھی خوب چلیں۔

اقتدار میں آنے کے بعد اس نے طاقت کا بھرپور استعمال کیا۔ جو اس کے محسن تھے، ان ہی کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ Partido Dominicano کے نام سے ایک جماعت قائم کی، جو ریاست کی اکلوتی سیاسی پارٹی تھی۔ نوجوانوں کے لیے اُس نام نہاد جمہوری جماعت میں شمولیت لازمی تھی۔ شہریوں کو اپنی کمائی کا دس فیصد چندے میں دینا ہوتا تھا۔

1938 میں اس کی میعاد پوری ہو گئی مگر وہ ظالم مسندِ اقتدار سے چمٹا رہا۔ سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعے بالآخر فوج کا سربراہ بن گیا۔ اپنی پالیسیوں کے اطلاق کے لیے بے رحمی سے قوت کا استعمال کیا۔ عوام کو بنیادی حقوق سے محروم کر دیا۔ مخالفین کو بے دردی سے قتل کیا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لیں۔ 1937 میں اس کے حکم پر سرحدی علاقے ”ہیٹی“ میں بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہوا۔ ہزاروں لوگ اپنی جان سے گئے۔ تاریخ میں اس ہیبت ناک واقعے کو سانحہ پیرسلے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے تیس سالہ دورِ حکومت کو ڈومینیکن کا تاریک ترین دور کہنا غلط نہیں ہوگا۔ لگ بھگ 50 ہزار افراد ان برسوں میں قتل کیے گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ ٹروجیلو نے تاتاریوں کے مظالم کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ایک پتا بھی اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا تھا۔ لوگ سانس لینے کو بھی اس کی اجازت کے محتاج تھے۔ لگتا تھا، وہ تاحیات ملک کا صدر رہے گا۔ ٹروجیلو کو تو اس بات کا یقین بھی تھا۔ مگر وہ بدبخت یہ نہیں جانتا تھا کہ رات جوں جوں گہری ہوتی ہے، صبح قریب آتی جاتی ہے۔ ظلم کی انتہا ظالم کو اُس کی موت تک لے جاتی ہے۔ اس کے دورِ ظلمت کو اپنے انجام تک پہنچانے کا انتظام قدرت نے کر رکھا تھا... یہ چار عورتیں تھیں۔ چار نہتی عورتیں جو اپنی جہدِ مسلسل سے وہ مقام حاصل کرنے والی تھیں، جو لاطینی امریکا میں فقط چے گویرا ہی کو نصیب ہوا تھا۔ وہ ڈومینیکن ری پبلک میں امید کی شمع روشن کرنے والی تھیں۔ عوام میں نئی روح پھونکنے والی تھیں۔ وہ چار عورتیں تھیں... جنہیں تاریخ میں میرابَل سسٹرز کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

سالسیڈو ایک شانت اور سرسبز شہر تھا۔ گرد و نواح میں میلوں زرعی زمینیں تھیں۔ وہاں ایک قصبہ تھا، اوجوڈی آگوا۔ وہیں میرابَل گھرانا آباد تھا۔

وہ ایک خوشحال خاندان تھا۔ اس کا سربراہ ایزخ میرابَل ایک باصلاحیت اور ذہین آدمی تھا۔ اس کا شمار شہر کے بڑے تاجروں اور زمین داروں میں ہوتا تھا۔ زرعی زمین تو تھی ہی، ساتھ ہی وہ گوشت کی مارکیٹ اور چاول صاف کرنے والی فیکٹری کا بھی مالک تھا۔ قصبے میں اس کی کئی دکانیں تھیں۔ ایزخ کی بیوی، جسے سب پیار سے ڈوناچی کہتے، ایک مستحکم گھرانے کی بیٹی تھی۔ وہ خوبرو، سگھڑ اور سلیقہ شعار تھی۔ وہ اپنی بیوی کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

بہ ظاہر تو زمین دار کی زندگی پُرسکون اور مکمل تھی۔ لوگ اکثر کہتے: ”ایزخ کو تو ہر خوشی میسر ہے“... مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ بیٹے کی نعمت سے محروم تھا۔

عورت کو اِس بات کا خاصا قلق تھا۔ ایک زمانے میں ایزخ بھی اس تذکرے پر ملول ہو جایا کرتا تھا، مگر جوں جوں بیٹیاں بڑی ہوتی گئیں، اس کے خیالات بدلتے گئے۔ خدا نے اُسے چار بیٹیوں سے نوازا تھا۔

روشن آنکھوں اور حلیم مسکراہٹ والی پیٹریا خاندان کی بڑی بیٹی تھی۔ وہ ایزخ اور ڈوناچی کی شادی کے اگلے برس، ٹھیک ڈومینیکن کے یومِ آزادی والے روز پیدا ہوئی۔ اس مناسبت سے اس کا نام رکھا گیا۔ مصوری کی وہ دلدادہ تھی۔ مذہب کی جانب گہرا رجحان تھا۔ وہ نن بننے کے سپنے دیکھا کرتی۔

دوسری لڑکی بلجیکا بچپن میں تو کچھ خاص نہیں تھی مگر کچھ عشروں بعد وہ ریاست کی ہر دل عزیز شخصیت بننے والی تھی۔ احتراماً اسے ”ڈیڈی“ کہہ کر پکارا جانے والا تھا۔ مگر وہ وقت... ابھی دور تھا۔

تیسری منروا تھی۔ تیکھے نین نقش والی ایک ذہین لڑکی۔ مطالعے کی شائق۔ سات برس کی عمر میں اسے کلاسیکی فرانسیسی شعرا کے کئی اشعار ازبر ہو گئے تھے۔ اپنی ذہانت کے باعث وہ باپ کی لاڈلی تھی۔ سچ کہیں تو یہی وہ لڑکی تھی جو میرابَل گھرانے کا نام تاریخ میں امر کرنے والی تھی۔

ماریا سب سے چھوٹی، سب سے پیاری۔ جتنی خوبصورت اتنی ذہین۔ چٹان جیسا حوصلہ تھا اس کا۔

تو یہ میرابَل گھرانا ہے جو شہر سالسیڈو میں پُرسکون زندگی

گزار رہا تھا کہ اچانک ایک عفریت... ڈومینیکن کے تخت سے چپک گیا۔ خون اس کی غذا تھی اور ظلم اس کا ہتھیار۔

آمریت کے طوفان اور جبر کی بارش نے ریاست کو یکسر بدل دیا۔ بے چینی پھیلنے لگی جو قریے قریے ہوتی سالسیڈو بھی پہنچی جہاں تتلیاں اپنے حسین پر پھیلائے پرواز کی تیاری کر رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ قدیم طرز کی ایک کشادہ عمارت تھی۔ بڑے سے دروازے کے اوپر صلیب نصب تھی۔ صبح کا آغاز حمدیہ گیتوں سے ہوتا تھا۔

یہ سالسیڈو کا کیتھولک بورڈنگ اسکول تھا۔ شہر کی سب سے بڑی اور معیاری درسگاہ۔ سیاست دان، فوجی افسران اور تاجروں کے بچے اس کا حصہ تھے۔ یہیں ایزخ کی تین لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں۔ پیٹریا، منروا اور بلجیکا اپنے اعتماد اور ذہانت کے سہارے اس نئی دنیا سے ہم آہنگ ہو چکی تھیں۔ جی لگا کر پڑھائی کر رہی تھیں، مگر کچھ ایسا تھا جو انہیں بے کل رکھتا۔ شاید ماحول میں گھٹن تھی۔ شاید اضطراب کہیں چھپا بیٹھا تھا۔

جلد انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ ٹروجیلو کا جبر ہے جس کے باعث پوری ریاست گھٹن کا شکار ہو گئی ہے۔ اس نے جو وعدے کیے تھے، اقتدار میں آنے کے بعد وہ انہیں بھلا بیٹھا۔ عوام پر نئے نئے ٹیکس لگا دیے۔ وہ طاقت کے ذریعے اپنے مخالفین کو دبا رہا تھا۔ اور پھر ”ہیٹی“ کا افسوسناک واقعہ ہوا جس میں ہزاروں معصوم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بگاڑ کی خبریں عام تھیں۔ اسکول کے طلبا و طالبات ان پر روز ہی بحث کیا کرتے۔ میرابیل ایک مشہور گھرانا تھا۔ شہر کی کئی باعزت اور بارسوخ شخصیات ایزخ میرابیل کی دوست تھیں۔ جب ہفتے کی شام وہ سب اس کے گھر اکٹھے ہوتے تو سیاسی موضوعات پر بحث ضرور ہوتی۔ لڑکیاں بھی ان میں حصہ لیتیں۔

یوں تو تینوں ہی بہنیں سیاسی بالیدگی کے اس عمل سے گزر رہی تھیں مگر یہ منروا تھی جس کی جرأت نے مباحثوں سے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے اس معاملے کا گہرائی سے جائزہ لینے کی جوت جگائی اور اس معمولی کوشش نے اس کی زندگی بدل دی۔

اسے شہر کے تعلیمی اور ثقافتی مراکز میں جاری مباحثوں میں ایک خاص نوع کی ترتیب نظر آئی۔ یہ مختلف عمروں سے تعلق رکھنے والے چند افراد تھے جو نہ صرف بحث کا آغاز کرتے بلکہ بڑی خاموشی سے اُسے آگے بھی بڑھاتے۔ وہ ایسے سوالات کھڑے کرتے، جن کے جوابات سے ٹروجیلو کی ایک مکروہ صورت سامنے آتی۔ مثلاً وہ بڑی معصومیت سے لوگوں سے پوچھتے ”ہیٹی واقعے کا ذمے دار ٹروجیلو کو کیوں ٹھہرایا جا رہا ہے؟“

اور کبھی کہتے ”میعاد پوری ہونے کے باوجود ٹروجیلو عہدہ چھوڑنے کو تیار نہیں، اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟“

منروا سمجھ گئی کہ یہ ایک منظم گروہ ہے۔ ٹروجیلو کے خلاف کوئی زیرِ زمین تحریک۔ سیاسی شعور تو تھا ہی پھر اس موضوع میں دلچسپی بھی تھی، سو وہ ان مباحث میں شامل ہونے لگی۔ دیگر افراد کے برعکس وہ اپنا تجزیہ بڑے نپے تلے انداز میں پیش کرتی۔ کیوبا کے ریڈیو اسٹیشن پر یوں تو پابندی تھی مگر اچھے ٹرانسمیٹر سگنل پکڑ لیتے تھے۔ منروا کیوبن اسٹیشن سے ڈومینیکن کے متعلق نشر ہونے والی خبریں اور مذاکرے بڑی توجہ سے سنا کرتی تھی۔ درسگاہ اور ثقافتی مرکز میں ہونے والے مباحثوں میں وہ ان کا حوالہ بہ کثرت دیتی۔

سامنے والے بھی جلد ہی تاڑ گئے کہ منروا عام شہریوں کے برعکس سیاسی شعور کی حامل ایک باصلاحیت لڑکی ہے۔

ایک گرم دوپہر اسکول کی راہداری میں ایک پستہ قد نوجوان اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”پیلیپس کی لائبریری میں آج شام ایک میٹنگ ہے۔“

وہ مسکرا دی۔ وہ اُسے جانتی تھی۔ وہ گارشیا تھا۔ ایک ناکام طالب علم، مگر ایک ماہر مقرر۔

پیلیپس کی لائبریری میں کوئی میٹنگ نہیں ہوئی۔ کتب خانے کے مالک نے فقط اُسے ایک پیشکش کی۔

”ڈیئر منروا میرابیل۔ ہم بدکردار ٹروجیلو کے خلاف ایک زیرِ زمین تحریک کے لیے کام کر رہے ہیں، کیا آپ اس میں شامل ہونا چاہیں گی؟“

”آپ لوگ کون ہیں اور آپ کے مقاصد کیا ہیں؟“ اس نے اعتماد کے ساتھ سوال کیا۔

”ہم سوشلسٹ ہیں۔ اور ہم ٹروجیلو سرکار کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں، جو درحقیقت ایک آمر ہے۔“

پیلیپس نے اسے اپنے ساتھیوں کی لرزہ خیز کہانیاں سنائیں، جنھیں آواز اٹھانے کے پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں سہنی پڑیں، جنھیں شدید اذیت پہنچائی گئی... بہت سوں کو تو قتل کر دیا گیا۔

ان کرب ناک قصوں نے لڑکی کو جذباتی کر دیا تھا۔

ٹروجیلو کے خلاف نفرت اس کے دل میں پنپنے لگی۔ پیلیپس نے اسے کچھ کتابچے، رسائل اور اخبارات دیے۔

”سوشلسٹ لٹریچر!“ منروا نے کتابیں دیکھ کر کہا۔

”ہاں۔“ لڑکے نے سر ہلایا۔ ”ساتھ ہی کچھ اخبارات اور رسائل ہیں، جن پر سرکار نے پابندی لگا رکھی ہے کیونکہ وہ جھکنے کو تیار نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کا مطالعہ کریں۔ اگر آپ اس تحریک کا حصہ بننا چاہتی تھیں تو اگلے ہفتے اسی وقت، اسی جگہ چلی آئیں۔ اچھا الوداع۔“

کیا منروا اگلے ہفتے وہاں گئی؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔

آنے والے دن بھرپور تھے۔ مطالعے کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا۔ سوشلسٹ نظریات میں اُسے نوعِ انسان کی بقا کا امکان نظر آیا۔ کیوبن ریڈیو نے ڈومینیکن کے حقیقی حالات سے آگاہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ ہی روز میں وہ پختہ کامریڈوں کی طرح بات کرنے لگی۔

انقلابیوں کے گروہ میں لڑکیاں خاصی کم تھیں۔ تعداد بڑھانے کی ذمے داری منروا کو سونپی گئی۔ اس نے آغاز اپنی بہنوں سے کیا۔

بڑی بہن پیٹریا نن بننے کا سپنا تج کر پیا گھر سدھار گئی تھی۔ وہ کونکو میں مقیم تھی۔ منروا جب اس کے گھر گئی، وہ شفیق عورت اپنے تین بچوں میں گھری بیٹھی تھی۔

اپنی بہن کی بات سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ منروا کو لگا کہ اپنی گھریلو ذمے داریوں کے پیشِ نظر شاید وہ انکار کر دے۔ مگر جب پیٹریا نے سر اٹھایا، اس کی آنکھوں میں عزم تھا۔

اپنے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہماری نئی نسل جابر حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔ ہمیں اس کے خلاف لڑنا ہو گا اور اس کے لیے میں اپنی زندگی بھی قربان کرنے کو تیار ہوں۔“

پیٹریا کا شوہر کارپیڈرو ایک کاشت کار تھا۔ ٹروجیلو کا وہ سخت ناقد تھا۔ جب اسے اپنی سالی کے نظریات کا علم ہوا، اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں اور مرتے دم تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

بلجیکا نے تو غور و فکر کے لیے کچھ وقت مانگا مگر ننھی ماریا تو فوراً راضی ہو گئی۔

”یہ سب بہت ہی پُرتجسس ہو گا۔ ہیں ناں؟“ گیارہ سالہ بچی نے تالی بجائی۔

چوبیس گھنٹے بعد بلجیکا بھی منروا کے ساتھ کھڑی تھی۔

”چلو بہن، اپنے ملک کے لیے کچھ کر گزریں۔“

ڈوناچی کو جب اپنی لڑکیوں کے عزائم کا علم ہوا تو بڑی سٹپٹائی۔ انہیں ان حرکتوں سے باز رہنے کی نصیحت کی۔ مگر جب دیکھا کہ وہ اپنی زندگیوں کا فیصلہ کر چکی ہیں تو انہیں ڈرانے لگی۔ ”تمہارا باپ اس حماقت کی کبھی اجازت نہیں دے گا۔ سمجھیں۔“

”میں انہیں منا لوں گی۔“ منروا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

اس شام چائے کی میز پر لڑکی نے اپنے باپ کے سامنے ایک پُراثر تقریر کی۔ بگڑتے حالات کا ذکر کیا۔ منطق کا استعمال کرتے ہوئے انقلاب کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ آخر میں اُس نے پوچھا۔ ”کیا اس جابر حکومت کے خلاف جنگ میں آپ ہمارے ساتھ ہیں؟“

”اوہ.. ہاں۔ کیوں نہیں، کیوں نہیں بیٹا۔“ آدمی نے اتنا کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کی بیوی پیچھے پیچھے گئی۔ وہ باڑ کے قریب کھڑا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

”تمہیں برا لگا؟“ ڈوناچی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا۔ ”قطعی نہیں۔ مجھے تو بس یہ قلق ہے کہ خدا مہربان نے مجھے اتنا نوازا، مگر میں اس کی عطا کردہ نعمتوں کا ادراک نہیں کر سکا۔ آہ، میری پیاری بیٹیاں کتنی بہادر ہیں۔ کیا یہ بیٹوں سے کم ہیں۔ مجھے اُن پر فخر ہے۔“

ڈوناچی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ ”ہاں، وہ تم پر گئی ہیں۔“

بادلوں کے پیچھے سورج مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

”تمہیں قانون داں بننا چاہیے۔“

فرانکو کے اس جملے نے منروا کو چونکا دیا۔

”قانون داں۔“ اس نے ایک لمحے توقف کیا۔ ”سچ کہوں تو میں اس بارے میں اکثر سوچا کرتی تھی۔“

”سوچنے کا وقت گزر گیا پیاری لڑکی۔ یہ عمل کرنے کا وقت ہے۔“ فرانکو نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

دراز قد، وجیہہ اور پُراعتماد فرانکو اورتس پاپولر سوشلسٹ پارٹی کا سربراہ تھا۔ وہ ٹروجیلو کی کھل کر مخالفت کرتا تھا اور اپنے نظریات کے پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی سہہ چکا تھا۔ اس پر تین قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ بگڑتے حالات کے پیشِ نظر وہ روپوش ہو گیا تاہم جدوجہد ترک نہیں کی۔ پارٹی انڈرگراؤنڈ رہتے ہوئے کام کر رہی تھی۔ جلسے جلوسوں کی جگہ

اسٹڈی سرکل نے لے لی۔ ممنوعہ کتابوں کے سرورق بدل دیے گئے۔

فرانکو کی سالسیڈو آمد کا مقصد اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا تھا۔ پیلیپس کی لائبریری میں میٹنگ ہوئی۔ وہیں منروا کی اُس سے پہلی ملاقات ہوئی۔

وہ شخص نہ صرف شان دار خطیب تھا، بلکہ سوشلسٹ نظریات پر بھی خوب گرفت رکھتا تھا۔ پورا فلسفی تھا۔ وہ تین دن شہر میں ٹھہرا۔ اور وہ دن... منروا کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ اسے ایک ایسا استاد ملا، جو منطق اور دلائل کے استعمال میں ماہر تھا۔ سامعین کو عزم سے بھر دیتا۔ چٹکلوں میں پیچیدہ سے پیچیدہ معاشی مسئلہ سلجھا دیتا۔

فرانکو نے جہاں لڑکی کے نظریات کے لیے مہمیز کا کام کیا، وہیں اسے ایک سپنا بھی دیا۔ قانون داں بننے کا سپنے۔

جاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”پیاری لڑکی، تمہارا کردار ایک کارکن کا نہیں بلکہ ایک راہبر کا ہے۔ تم ہی اس ملک کی قسمت بدلوگی۔“

فرانکو ذہین اور دور اندیش ضرور تھا مگر یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے قطعی نہیں سوچا تھا کہ کچھ برس بعد... یہ سچ کا روپ دھار لیں گے۔

☆☆☆

”عظیم ضیافت“ کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی، اپنا سر پیٹ لیا۔

یہ اکتوبر 1949 کا ذکر ہے۔ ٹروجیلو کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ وہ عظیم مہم جو کرسٹوفر کولمبس کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے صوبہ اسپیلاٹ میں واقع اپنے محل میں ایک بڑی دعوت کرنے جا رہا ہے۔ ایسی شان دار دعوت، جو ڈومینیکن کی تاریخ میں مثال بن جائے گی۔

ٹروجیلو کے مخالف جانتے تھے کہ اس دعوت کا مقصد کرسٹوفر کولمبس کو خراجِ تحسین پیش کرنا نہیں بلکہ امریکا بہادر کو خوش کرنا، اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہے۔

دراصل یہ ایک چال تھی۔ ملک بھر کے بااثر اور رئیس خاندانوں کو دعوت نامے بھیجے جانے تھے۔ ٹروجیلو کو خبریں مل رہی تھیں کہ روسا میں کئی گھرانے اُس کے مخالف ہیں لیکن کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے۔ اس ضیافت کا ایک مقصد اس بات کا تعین کرنا تھا کہ طبقۂ امرا میں کون کون اس کے خلاف ہے۔ اس نے وزیر کو ہدایت کر رکھی تھی کہ جو ضیافت میں نہ آئے، اس کا نام نوٹ کر لیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ جن افراد کے بارے میں یہ شبہ ہے کہ وہ ٹروجیلو مخالف ہیں، انہیں شہروں کے گورنر خود دعوت نامہ پیش کرنے جائیں، تاکہ ان کے پاس انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ رہے۔

میرابیل خاندان کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ حکومتی حلقوں میں یہ افواہ پھیل چکی تھی کہ سالسیڈو کے ایک رئیس کی بیٹی انقلابیوں میں شامل ہو چکی ہے اور اسے اپنے باپ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اسی باعث اسپیلاٹ کا شاطر گورنر حوان روجاز، جو ٹروجیلو کا چمچہ تصور کیا جاتا تھا، خود دعوت نامہ لے کر آیا۔

”دعوت کے لیے 12 اکتوبر کا دن چنا گیا ہے۔“ گورنر کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ تھی۔ ”جناب صدر نے نہ صرف آپ کے گھرانے کو دعوت دی ہے، بلکہ آپ کی دونوں بیٹیوں پیٹریا اور بیلجیکا کے شوہر مسٹر پیڈرو اور مسٹر ژامے بھی مدعو ہیں۔“

”ہم نہیں جائیں گے۔“ دعوت نامے کا سنتے ہی پیٹریا اور بیلجیکا نے صاف انکار کر دیا۔

منھی ماریا نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ ”جس شخص سے ہم نفرت کرتے ہیں، اس کی دعوت میں شرکت سے تو موت بہتر ہے۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”ہمیں سمجھ داری کا ثبوت دینا ہوگا۔“ منروا بولی۔ ”ٹروجیلو اس ضیافت کی مدد سے اپنے دوست اور دشمنوں کی شناخت کرنا چاہتا ہے۔ بے شک ہم اس کے دشمن ہیں، مگر... فی الحال ہم اپنی شناخت ظاہر نہیں کر سکتے۔ ہم اس کی دعوت میں شرکت کریں گے۔“

12 اکتوبر والے روز ایزخ میرابیل نے اپنی بیٹیوں اور دامادوں کے ساتھ ضیافت میں شرکت کی۔ ڈونا چی کی طبیعت خراب تھی۔ منھی ماریا کو انہوں نے اس کی دیکھ ریکھ کے لیے چھوڑ دیا۔

اس شام بلا کا حبس تھا۔ جیپ میں سوار ہوتے ہوئے منروا نے کہا۔ ”شاید آج رات تیز بارش ہو۔“

اُس کی بات درست ثابت ہوئی۔ ٹروجیلو نے ضیافت کا اہتمام سبزہ زار میں کیا تھا۔ عشائیے سے قبل ہی بادل اُمڈ آئے۔ کچھ دیر میں گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ منتظمین بوکھلا گئے۔

”تمام لوگ محل کے اندر آجائیں۔“ وہ پاگلوں کی طرح چلّا رہے تھے۔ ”کوئی نہ جائے۔ جناب صدر ابھی خطاب فرمائیں گے۔“

میرابیل گھرانے نے اِس افراتفری کو موقع غنیمت جانا۔ وہ خاموشی سے محل سے نکل گئے۔

ٹروجیلو کے چمچے مہمانوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ اطلاع فوراً اُس تک پہنچا دی۔ آمر آگ بگولا ہو گیا۔ آسمان پر چھائے سیاہ بادلوں کی طرح گرجنے لگا۔

”یہ بے ادبی ہے۔ انہوں نے میری تذلیل کی۔“ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ”انہیں سبق سکھانا پڑے گا۔“

ایک فوجی افسر نے اس کے حکم پر قریبی چوکی فون کیا۔ ”میرابیل گھرانے کی گاڑی روک لی جائے۔ یہ جناب صدر کا حکم ہے۔“

”مرابیل گھرانا...“ چوکی پر تعینات سپاہی کے لہجے میں تذبذب تھا۔ ”وہ تو...“

”وہ تو کیا...“ افسر دہاڑا۔ ”ہکلا کیوں رہے ہو۔ کہیں تم اُسی گھرانے کے وظیفہ خور تو نہیں؟“

”نہیں۔ وہ...“ سپاہی منمنایا۔ ”ان کی جیپ تو کب کی یہاں سے گزر گئی۔“

”دھت تیرے کی۔“ افسر نے ریسیور پٹخ دیا۔

پیچھے ٹروجیلو دہاڑ رہا تھا۔ وہ غصے سے پاگل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”عزت مآب ایزخ میرابیل، جناب صدر آپ سے شدید ناراض ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ ایک دوست کی حیثیت سے میری درخواست ہے کہ آپ ان سے معافی مانگ لیں۔ ہم سب کے حق میں یہی بہتر ہے۔ آپ کا خیر خواہ، حوان روجاز، گورنر اسپیلاٹ۔“

”خیر خواہ...!“ خط پڑھنے کے بعد ایزخ نے منہ بنایا۔ پھر وہ گورنر کے ہرکارے سے مخاطب ہوا۔ ”میں انہیں اپنا جواب روانہ کر دوں گا۔“

کچھ دیر بعد وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ مکان کے صحن میں بیٹھا تھا۔ باہر سیاہ رات اور خاموشی تھی۔

”مجھے تمہارا مشورہ چاہیے۔“ اس نے منروا سے کہا۔

لڑکی نے اپنی بہنوں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے باپ سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ کسی سے معافی مانگیں، یہ ہمیں قطعی گوارا نہیں۔ آپ نے کچھ غلط نہیں کیا ہے، مگر...“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ”اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو ٹروجیلو کے ہاتھ ایک جواز آجائے گا۔ گو مجھے یہ کہتے ہوئے انتہائی اذیت ہو رہی ہے، مگر ہمیں معافی نامہ صدارتی محل روانہ کر دینا چاہیے۔“

”میں اِس بات کی مخالفت کروں گی۔“ منھی ماریا کھڑی ہو گئی۔ لہجے میں غصہ تھا۔ پیٹریا اور بیلجیکا نے بھی مخالفت کر دی۔

”میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ ایزخ کے بڑے داماد پیڈرو نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”ہماری جدوجہد کا مقصد ٹروجیلو کی جابر حکومت کا خاتمہ ہے۔ اِس کے لیے ہم ہر قربانی دینے کو تیار ہیں، مگر اِس جدوجہد کے لیے جیل کچھ مناسب جگہ نہیں۔“

”میں متفق ہوں۔“ بیلجیکا کے شوہر ژامے نے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ایزخ نے گردن ہلائی۔ ”گو مجھے یقین ہے کہ معافی نامے سے ٹروجیلو کے انتقام کی آگ سرد نہیں ہوگی۔“

ایزخ درست تھا۔ ٹروجیلو نے معافی نامہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ ”تو اب ایزخ کو اٹھا کر جیل میں ڈال دو۔“

چند گھنٹے بعد ایزخ کو گرفتار کر لیا گیا۔ بغیر مقدمہ چلائے اُس شریف آدمی کو دارالحکومت سانتو ڈومنگو کی ایک تاریک جیل میں ڈال دیا گیا۔ اسے بھوکا پیاسا رکھا گیا۔

ٹروجیلو اب بھی بے چین تھا۔ غصے سے پھنکار رہا تھا۔ دیوانگی انتہا کو پہنچ گئی تو اگلے روز اس نے ڈونا چی اور منروا کی گرفتاری کے احکامات بھی جاری کر دیے۔ دونوں عورتوں کو ان کے گھر سے گرفتار کیا گیا۔ منروا کو دھکے دیے گئے۔ وہ زمین پر گر گئی۔

عورتوں کو جیل میں ڈالنے کے بجائے نیشنل ہوٹل میں رکھا گیا اور ایسا مصلحت کے تحت کیا گیا تھا۔

اُسے اطلاع مل چکی تھی کہ میرابیل گھرانے کو اس کی مخالفت پر اکسانے کا فریضہ کسی اور نے نہیں... منروا نے انجام دیا ہے۔ یہ خبر بھی مل گئی کہ وہ انقلابیوں کے گروہ کی سرگرم کارکن ہے اور اس کے دشمن نمبر ایک فرانکو اورنس سے مل چکی ہے۔ اگر اسے جیل میں ڈال دیتا تو دیر سویر سے سہی، مگر مقدمہ درج کرنا پڑتا۔ معاملہ قانون کے دائرے میں آجاتا۔ وہ منروا سے معلومات اگلوانا چاہتا تھا اور اس کے لیے ہوٹل میں نظر بند کرنا ہی بہتر تھا۔

☆☆☆

”تم لوگوں کے مقاصد کیا ہیں؟ ٹروجیلو کا تخت الٹنے کا منصوبہ کب بنایا گیا؟ انقلابیوں کو اسلحہ کہاں سے ملتا ہے؟“

اس نوع کے سیکڑوں سوالات کیے گئے، مگر منروا نے مسکراتے ہوئے ایک ہی جواب دیا۔ ”میں قطعی نہیں جانتی جناب کہ آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔“

پولیس اہل کار ہر صبح اسے ہوٹل سے تفتیشی مرکز لے جاتے۔ اس دوران اس کی ماں ڈوناچی ہوٹل میں قید رہتی۔

تفتیشی مرکز درحقیقت ایک چھوٹی سی سیلن زدہ اور تاریک عمارت تھی۔ یہ بات مشہور تھی کہ اسے ٹروجیلو کے مخالفین پر تشدد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

جس کمرے میں منروا سے پوچھ گچھ کی جاتی، وہاں کا ماحول خاصا خوفناک تھا۔ دیواروں پر خون کے دھبے تھے۔ درمیان میں ایک پھندا لٹک رہا تھا۔ سوالات سے قبل افسر اپنی بندوق نکال کر میز پر رکھ دیتا۔ دورانِ تفتیش وہ غصے سے میز بجاتا۔ چیختا، چلاتا۔ مگر ان کوششوں کا لڑکی پر چنداں اثر نہیں ہوتا۔ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی رہتی۔ اُس کے چنگھاڑتے ہوئے سوالات کا بڑے اطمینان سے مختصر جواب دیتی۔

چند روز بعد اسے تفتیشی مرکز میں دو نئے چہرے نظر آئے۔ ان پر کرختگی اور خباثت عیاں تھی۔ وہ دونوں اسلحہ ہاتھ میں تھامے رکھتے، جیسے محاذِ جنگ پر ہوں۔ بات کرتے ہوئے ان کے منہ سے کف اڑ رہا ہوتا۔

ان میں سے ایک کا نام فاسٹو تھا، دوسرے کا مینوئل۔ وہ ٹروجیلو کے خاص چمچے تھے۔ اس کے مخالفین پر نظر رکھتے۔ چند انقلابیوں کے قتل میں بھی ان کا نام لیا جاتا ہے۔

”تم کمیونسٹ ہو؟“ فاسٹو نے پوچھا۔

اُس کے انداز پر وہ ہنس پڑی۔

”ہنسنا بند کرو، ورنہ ابھی تمہارے سر میں گولی اتار دوں گا۔“ مینوئل دہاڑا۔

”اچھا؟“ اس نے ہنسی روکی۔

”تم کمیونسٹ ہو۔ ہم جانتے ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے، مگر تم میرا کہا تو مانو گے نہیں۔ اس لیے وہ بات کہو، جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔“

دونوں سٹپٹا گئے۔ پہلی بار ان کا سامنا اتنی بلند حوصلہ اور ذہین عورت سے ہوا تھا۔

”تم... ایک۔“ فاسٹو تھوڑا متذبذب تھا۔ ”تم معافی نامے پر دستخط کردو۔“

”کس بات کی معافی؟“ اس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”تم نے تخت الٹنے کی کوشش کی۔“

لڑکی نے جماہی لی۔ ”مجھے نہیں پتا کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو۔“

دونوں دانت پیستے ہوئے چلے گئے۔ اگلے روز آئے تو ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

”تمہارے دیگر ساتھی گرفتار ہوگئے ہیں۔“ فاسٹو نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”انہوں نے اپنا جرم قبول کرلیا ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ اس نے تیزی سے کہا۔

دونوں بوکھلا گئے۔ ”تو... تم بھی اپنا جرم قبول کرلو۔“

”کون سا جرم؟ دیکھو، تم دونوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں کسی معافی نامے پر دستخط نہیں کرنے والی۔ میرے خلاف مقدمہ درج کرو اور عدالت کو فیصلہ کرنے دو۔“

اس روز بھی وہ دونوں بدبخت پیر پٹختے لوٹے۔

نواب ایزخ ایک جانا مانا آدمی تھا۔ اس کی گرفتاری نے ملک گیر توجہ حاصل کی۔ طبقۂ امرا میں اس واقعے سے بے چینی پھیل گئی۔ وہ عدم تحفظ کا شکار ہوگئے۔ آج ایزخ گرفتار ہوا، کل انہیں نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔

نواب کے قریبی حلقوں نے ٹروجیلو کے بھائی سے رابطہ کیا۔ اس معاملے میں اس کے دامادوں نے کلیدی کردار ادا کیا، جو اپنے علاقوں میں خاصا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ بالآخر معاملات طے پاگئے۔ کچھ روز بعد ایزخ، ڈوناچی اور منروا کو رہا کردیا گیا۔

شہر لوٹنے پر ان کا شان دار استقبال ہوا۔ ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ لوگ ہجوم کی صورت انہیں گھر چھوڑنے آئے۔

اس واقعے نے آمر کو آگ بگولا کردیا، مگر ابھی معاملہ گرم تھا۔ فوراً انتقامی کارروائی رائے عامہ کو اس کے خلاف کر دیتی، اس لیے وہ چپ رہا، مگر وہ غافل نہیں ہوا۔ اُس کے جاسوس مسلسل میرابیل گھرانے کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان کا پیچھا کیا جاتا۔ ان کے ملاقاتیوں پر نظر رکھی جاتی۔

منروا کو اس بات کا علم تھا۔ اس نے اپنی سرگرمیاں محدود رکھیں۔ چھ ماہ بعد جاسوس اوب گئے۔ نگرانی ہٹا دی گئی۔ اور تب... منروا نے پیلیپس کی لائبریری کا رخ کیا جہاں انقلابی اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

”شکریہ! مگر میں یہ کتاب نہیں خریدنا چاہتی۔“

”مگر یہ جناب صدر کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ حکومتی ہدایت ہے کہ تمام نوجوان اس کا مطالعہ کریں۔“

”دراصل...“ وہ مسکرائی۔ ”مجھے ان کے کارناموں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں، شکریہ۔“

یہ مکالمہ سالسیڈو کی ایک بک شاپ میں منروا اور دکان کے مالک کے درمیان ہوا۔ وہ 1951 کی ایک گرم دوپہر تھی۔ سڑکوں پر دھول اڑ رہی تھی۔

ہر آمر کی طرح ٹروجیلو بھی اپنی ستائش کا بھوکا تھا۔ اس نے زور طاقت ملک کے ایک معروف ادیب سے اپنی سوانح عمری لکھوائی۔ اسے ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا گیا اور ہدایت جاری کردی کہ اس کتاب کو ہر صورت خریدا جائے۔ مجبور شہریوں نے بلاچون وچرا اس ہدایت پر عمل کیا مگر منروا ان لوگوں میں سے نہیں تھی۔

بک شاپ کا مالک ایسپیلاٹ کے گورنر کا چمچہ تھا۔ اس نے فوراً یہ خبر اسے پہنچا دی۔ موقع پرست حوان روجاز نے ایک خط ٹروجیلو کے نام روانہ کردیا جس میں اس واقعے کو خوب مرچ مسالا لگا کر بیان کیا۔

خط پڑھ کر آمر کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دو برس سے اس لمحے کا منتظر تھا۔

کچھ گھنٹوں بعد پولیس اہل کار نواب ایزخ کی جاگیر پر پہنچ گئے۔ ان کے پاس تین افراد کی گرفتاری کا حکم نامہ تھا۔

”مگر کس جرم میں ہمیں گرفتار کیا جارہا ہے؟“ ایزخ نے سوال کیا۔

افسر نے حکم نامہ پڑھا۔ ”عزت مآب جناب صدر کی کتاب خریدنے سے انکار اور اُن کی تذلیل کرنے کے جرم میں۔“

”مگر میں نے ان کی تذلیل نہیں کی۔“ منروا نے تیزی سے کہا۔

”آپ نے کہا کہ آپ کو ان کے کارناموں میں دلچسپی نہیں۔“ افسر نے مشینی انداز میں کہا۔

”تو اس میں تذلیل کا پہلو کہاں ہے؟“ اس نے ہاتھ جھٹکے۔ ”اور پھر تذلیل میں نے کی ہے، باقیوں کو کیوں گرفتار کیا جارہا ہے؟“

”ہمارے پاس آپ تینوں کو گرفتار کرنے کا حکم ہے۔“ افسر نے مشینی انداز برقرار رکھا۔

”بھینس کے آگے بین بجانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”چلیں۔“

اس بار ایزخ کے لیے اوزاما کے قلعے کا انتخاب کیا گیا۔ وہ ایک گھٹن زدہ اور تاریک عمارت تھی۔ آدمی کو ایک تہ خانے میں ڈال دیا گیا۔ لڑکی اور اس کی ماں کو پریذیڈنٹ ہوٹل میں نظربند کیا گیا۔

اس موقع پر شاطر ٹروجیلو نے ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے کہا کہ وہ عورتوں کا دل سے احترام کرتا ہے، اگرچہ منروا اور ڈوناچی اس کی مخالفین ہیں مگر وہ ان کے ساتھ مہمانوں والا سلوک کرے گا۔

تتلیوں کو خراجِ تحسین

جدوجہد کا استعارہ ٹھہرائی جانے والی میرابیل بہنوں کو پوری دنیا نے شان دار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ڈومینیکن کے عوام نے شہر سالسیڈو کے اس 137 فٹ بلند مینار کو ان بہنوں سے منسوب کردیا، جو ٹروجیلو نے اپنے نام نہاد کارناموں کی علامت کے طور پر تعمیر کروایا تھا۔ ان کے تذکرے کو نصابی کتب میں لازم ٹھہرایا گیا۔ یادگاری ٹکٹ جاری ہوئے۔ ان کی یاد میں ایک میوزیم تعمیر کیا گیا، جہاں ان کی زندگی سے جڑی اشیا محفوظ کی گئیں۔ اکیلی زندہ بچنے والی بیلجیکا میرابیل اس کی نگران رہی۔ 2004 میں اس کا انتقال ہوا۔ میرابیل گھرانے کے تمام مکانات کو قومی ورثہ قرار دے دیا گیا۔

1994 میں امریکی نژاد ڈومینیکن ادیبہ Julia Alvarez نے ان کی زندگی کو اپنے ناول In the Time of the Butterflies میں بیان کیا، جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ 2001 میں ہالی وڈ نے اسے فلم کے قالب میں ڈھالا۔ سیلما ہائیک نے منروا امربیل کا کردار ادا کیا۔ ناقدین کی اکثریت نے اس فلم کو سراہا، البتہ کچھ حلقوں کا خیال تھا کہ اس میں حقائق کو بری طرح مسخ کیا گیا ہے، افسانہ حقیقت پر غالب ہے۔

2010 میں ریلیز ہونے والی ڈراما فلم Trópico de Sangre کو اس ضمن میں زیادہ بہتر خیال کیا جاتا ہے، مگر اس پر بھی کچھ مورخین کی جانب سے شدید تنقید کی گئی۔

”اسی وجہ سے تو میں نے انہیں پریذیڈنٹ ہوٹل میں رکھا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ وہاں کی سروس کتنی اچھی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

اس بار بھی منروا سے خاصی پوچھ گچھ کی گئی، دباؤ ڈالا گیا، دھمکایا گیا، مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ بہت سخت جان تھی۔ یہی معاملہ اس کے باپ کا تھا۔ اسے توڑنا آسان نہیں تھا، البتہ ڈوناچی دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے سے وہ سخت بیمار تھی۔ اوپر سے یہ سختیاں۔ ایک روز وہ اپنے کمرے میں بے ہوش پائی گئی۔ تشخیص سے پتا چلا کہ اس کی قوتِ مدافعت خطرناک حد تک کم ہوچکی ہے۔

ٹروجیلو کے مشیروں نے اسے صلاح دی کہ فی الحال میرابَل خاندان سے جان چھڑالی جائے۔ اگر بڑھیا دورانِ قید مرگئی تو بہت تھوتھو ہوگی۔

بات ٹروجیلو کی سمجھ میں آگئی۔ گرفتاری کے تین ہفتے بعد انہیں رہا کردیا گیا۔

وہ ایک ایمبولینس میں گھر لوٹے۔ ڈوناچی ڈھل چکی تھی۔ اس کی صحت مسلسل گر رہی تھی۔ عورت کی کمر بستر سے لگ گئی۔ میرابَل گھرانے نے ہر ٹوٹکا آزمایا مگر وہ جان بر نہ ہوسکی۔ 1953 کی ایک سرد شام اُس کا انتقال ہوگیا۔

چاروں بہنیں صدمے سے ٹوٹ گئیں۔ وہ دہاڑیں مار کر رونے لگیں، مگر گھرانے کے سربراہ کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اپنی بیوی کی تدفین کے بعد اس نے اپنی بیٹیوں سے کہا۔ ”وابستگی ہمیں محدود کردیتی ہے۔ اب تمہاری ماں ہمارے ساتھ نہیں۔ خدا اسے جنت نصیب کرے، بڑی اچھی عورت تھی۔“ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ”اب تمہاری جدوجہد کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں میرے بچو۔ اور میری پروا مت کرنا... میں تو ہوں ہی تمہارے ساتھ۔“

”اوہ پاپا!“ لڑکیاں اپنے باپ سے لپٹ گئیں۔ اس سرد رات ان کے دل ایک ہی تھاپ پر دھڑک رہے تھے اور آزادی کی وہ تھاپ... ایک عظیم گیت تھا۔

☆☆☆

موسم سرما آچکا تھا۔ برف گرنے لگی۔ آتش دان ہمہ وقت روشن رہتے۔ چمنیاں کسیلا دھواں اگلتی رہتیں۔

منروا آگ کے نزدیک بیٹھی تھی۔ کمرے میں ریڈیو کی آواز تھی۔ کیوبن اسٹیشن کے بلیٹن میں ڈومینیکن ری پبلک کا ذکر آیا تو شمالی علاقوں کے ان بدقسمت خاندانوں کا بھی تذکرہ کیا گیا جو سہولیات کے فقدان اور غذائی قلت کی وجہ سے اس موسم میں انتہائی کرب سے گزر رہے تھے۔

یہ 1954 کا سال تھا۔ پورا ایک برس گزر گیا مگر منروا اب تک اپنی ماں کی موت کے سانحے سے نہیں ابھر سکی تھی۔ وہ گھر تک محدود ہوگئی تھی۔ زیادہ وقت مطالعے میں صرف ہوتا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

”اس وقت کون ہوسکتا ہے؟“ اس نے گھڑی کی سمت دیکھا۔

دروازے پر کھڑے شخص کے چہرے کو ہیٹ اور مفلر نے بڑی حد تک ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے کوٹ پر برف تھی۔ اس نے لڑکی کو ایک خط تھمایا اور کوئی لفظ ادا کیے بغیر الٹے پیر چلا گیا۔

وہ دوبارہ آتش دان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ خط پر کسی کا نام نہیں تھا مگر پہلی سطر پڑھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ یہ فرانکو اورنس کی طرف سے ہے۔

”میری پیاری منروا، تمہاری ماں کی موت کا سنا۔ دکھ ہوا۔ شاید ہم انقلابی پیدا ہی قربانیاں دینے کے لیے ہوئے ہیں۔ جینے کا سہارا فقط یہ امید ہے کہ ہماری قربانی رائگاں نہیں جائیں گی۔ اور سناؤ، پابلو نرودا کی کون سی کتاب پڑھ رہی ہو۔ سنا ہے کہ تمہیں پکاسو کی پینٹنگز بہت پسند ہیں۔ اچھا سنو، کیا تمہارا وکیل بننے کا سپنا اب تک برقرار ہے؟ میرے خیال میں تمہیں سانتو دامنگو یونیورسٹی کا رخ کرنا چاہیے۔ داخلے شروع ہونے کو ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں تمہیں کوئی ایسا شخص مل جائے گا جو بالکل تمہاری طرح سوچتا ہوگا۔ ایک انقلابی۔ مگر محبت کرنے والا انقلابی۔ اور ہمیں انقلابیوں کی ضرورت ہے۔ میری پیاری، تم بہت بہادر اور باہمت ہو۔ ریاست کی بقا تم سے ہے۔“

وہ آتش دان کے نزدیک بیٹھی رہی۔ آگ کی روشنی چہرے پر پڑ رہی تھی۔

☆☆☆

موسم بہار عروج پر تھا۔ رنگوں نے جہان کو ڈھانپ لیا۔ دنیا بازو کھولے اس کی منتظر تھی۔

نوجوان پُرامید تھے۔ حالات انہیں توڑ نہیں سکے۔ وہ ایک بہتر دنیا کا سپنا سجائے حصولِ علم میں جتے تھے اور علم ان میں آمریت مخالف احساسات کو جنم دے رہا تھا۔

منروا کو قطعی توقع نہیں تھی کہ سانتو دامنگو یونیورسٹی کے طلبا و طالبات اتنے پُرجوش نکلیں گے۔ وہ دارالحکومت میں کچھ

ڈرے ہوئے نوجوانوں سے ملنے کی توقع کر رہی تھی مگر وہ تو جذبے سے لبریز تھے۔ وہ منروا کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے احترام تھا۔ وہ اسے ایک لیڈر کے طور پر دیکھتے تھے۔ البتہ یونیورسٹی انتظامیہ کا معاملہ دوسرا تھا۔ جب ان کے پاس منروا میرابَل کا داخلہ فارم آیا، اُن کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ اس فتنے کو درس گاہ سے دور رکھا جائے مگر اس کے کاغذات پورے تھے، کوئی اعتراض لگا کر فائل واپس بھیجنے کا امکان نہیں تھا۔ مجبوراً داخلہ دینا پڑا۔ بعد میں بھی وہ اُس سے کھنچے کھنچے رہے۔ اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرتے۔ دورانِ کلاس اس کے سوالات کا مختصر جواب دیا جاتا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ اساتذہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ وہ قابل طالبہ تھی۔ ان میں سے کئی تو اس کی جدوجہد کے حامی تھے مگر حکومتی دباؤ کی وجہ سے وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہتے۔

یونیورسٹی میں اس کی ملاقات ایک پُرجوش نوجوان مانولو سے ہوئی جو منروا کی مانند فیڈل کاسترو کا مداح تھا اور لیفٹ کے نظریات پر کامل یقین رکھتا تھا۔ ان کی دوستی کا آغاز ایک شدید قسم کے مباحثے سے ہوا۔ کئی روز تک دونوں نے بات نہیں کی۔ اگلی بار وہ لائبریری میں ملے جہاں دونوں ایک ہی کتاب ایشو کروانے آئے تھے۔ تیسری بار کینٹین میں چائے پیتے ہوئے انہوں نے ہلکی پھلکی گفتگو کی۔

یہ ملاقاتیں محبت میں کب ڈھلیں، انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ مگر جب اُن کے رشتے نے محبت کی شکل اختیار کرلی تو اس کی مسحورکن خوشبو پوری یونیورسٹی میں پھیل گئی۔ کچھ جھونکے اس کی بڑی بہن پٹیریا اور بلجیکا تک بھی پہنچے۔

پٹیریا نے منروا کو مشورہ دیا کہ مانولو اچھا لڑکا ہے، دونوں کو شادی کرلینی چاہیے۔ انقلابی منروا تیار نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شادی اور خاندان اس کی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں گے۔

”بچوں جیسی باتیں مت کرو۔“ پٹیریا نے ہاتھ جھٹکے۔ ”کیا ہم فقط اپنے لیے جدوجہد کر رہے ہیں؟ نہیں، ہماری جدوجہد درحقیقت اپنے بچوں کے لیے ہے۔ میری پیاری بہن، مانولو تمہارا ہم خیال ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ گھر بسانا چاہیے اور پھر مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے۔“

پٹیریا اپنی بہن کو سمجھا رہی تھی، تو بلجیکا اپنے متوقع بہنوئی سے گفتگو کر رہی تھی۔

دونوں عورتوں کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ نومبر 1955 میں وہ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔

اسے سیکڑوں گلدستے موصول ہوئے۔ ان میں ایک گلدستہ عجیب تھا۔ وہ فقط دو سرخ پھولوں پر مشتمل تھا، جن کے تنے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ کارڈ پر صرف ایک سطر تھی۔

”تمہیں محبت کرنے والا انقلابی مل گیا اور اب ہمارے پاس دو گلاب ہیں۔“

”ہاں فرانکو، مجھے وہ مل گیا۔“ منروا نے دھیرے سے کہا۔

☆☆☆

شادی کے دو ہفتے بعد منروا کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔

اس فیصلے کا سبب اس کی سیاسی سرگرمیاں نہیں تھیں۔ نہ ہی یونیورسٹی والوں کو یہ اعتراض تھا کہ اس نے مانولو سے شادی کیوں کی... یہ تو اس کا تھیسس تھا، جس کی خبر ٹروجیلو تک پہنچ گئی تھی۔

منروا نے ”قوانین کی تاریخ اور ڈومینیکن ری پبلک میں قانون سازی“ کے موضوع پر مقالہ لکھا تھا۔ کوئی اور لکھتا تو مصلحت سے کام لیتا مگر منروا اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرسکتی تھی۔ جب اس کے تھیسس میں قوانین کی تاریخ کا ذکر آیا تو انسانی حقوق کا بھی تذکرہ ہوا۔ وہ حقوق جس سے ان کے ملک کے باسی یکسر محروم تھے۔ اس نے اپنی ریاست کے قوانین میں سقم کی نشان دہی کی تو انہیں بنانے والا شخص بھی زیر بحث آیا۔ یعنی ٹروجیلو۔ اس نے بنیادی انسانی حقوق پر زور دیتے ہوئے ریاستی ڈھانچے میں تبدیلیوں کا تقاضا کیا تھا۔ آمر کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس کے حکم پر یونیورسٹی نے اس کی رجسٹریشن منسوخ کردی۔

ہمت ہارنے کی بجائے اس نے قانونی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے عدالت میں درخواست دائر کردی۔ اسی زمانے میں اس کے ہاں پہلا بچہ ہوا مگر نئی ذمے داری نے اسے اپنی جدوجہد سے غافل نہیں کیا۔

ایک برس بعد اچھی خبر ملی، عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ یونیورسٹی والوں کو اس کی رجسٹریشن بحال کرنی پڑی۔

1957 میں اس کے ہاں دوسرے بچے کی پیدائش ہوئی... اُسی برس یونیورسٹی سے اسے گریجویشن کی ڈگری ملی۔

اور اسی برس کیوبا سے اہم خبر آئی۔
فیڈل کاسترو اور چے گویرا نے ظالم بیتستا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ کیوبا انقلاب کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

خاموشی اتنی گہری تھی کہ ٹروجیلو ڈر گیا۔ پورے ملک پر یاسیت طاری تھی۔ انقلابی چپ تھے۔ بغاوت کی کوئی بازگشت سنائی نہیں دیتی تھی۔ نہ کوئی مظاہرہ، نہ کوئی احتجاج۔ عوام بلاچون وچرا ٹیکس ادا کر رہے تھے۔

آئین مسخ کرکے اب ٹروجیلو فوج کا سربراہ بن گیا تھا۔ ایجنسیوں نے ملک کو شکنجے میں لے رکھا تھا۔ ان کی گرفت مضبوط تھی۔ ڈومینیکن ایک پولیس اسٹیٹ بن چکا تھا اور اس کے چمچے اس بات پر بہت خوش تھے۔

کچھ عرصے تو ٹروجیلو بھی اطمینان سے بیٹھا رہا مگر پھر مبہم خوابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جنہوں نے دھیرے دھیرے انتہائی خوفناک شکل اختیار کرلی۔ خواب میں اسے تختۂ دار نظر آتا۔

اس کی نیند غارت ہوگئی۔ وہ ساری ساری رات سگار منہ میں دبائے ٹہلتا رہتا۔

اس نے چند نجومیوں سے خواب کی تعبیر پوچھی۔ سچ بولنے کی کون جرأت کرتا۔ الٹی سیدھی تعبیریں کرکے سب نے جان چھڑا لی۔ بہ ظاہر وہ مطمئن ہوگیا تھا، مگر ملک میں چھائی خاموشی اُسے کبھی کبھار پریشان کر دیتی۔ یوں لگتا، جیسے طوفان آنے والا ہے۔

بہت عرصے سے اسے میرابیل گھرانے کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اس نے اسپیلاٹ کے گورنر حوان روجاز سے رابطہ کیا۔

خوشامدی حوان روجاز کے جوابی خط کا آغاز ٹروجیلو کے قصیدے سے ہوا۔ آگے اس نے لکھا کہ تین بہنوں کی شادی ہوچکی ہے، وہ بال بچے دار ہیں اور اپنے گھروں کی دیکھ ریکھ کر رہی تھیں جب کہ چھوٹی لڑکی کسی درس گاہ سے عمرانیات میں گریجویشن کر رہی ہے۔ سنا ہے، وہ کسی انجینئر سے محبت کرنے لگی ہے۔ ممکن ہے، جلد اس کی بھی شادی ہوجائے۔

ٹروجیلو مطمئن نہیں ہوا۔ ”اس فتنہ گر منروا کے بارے میں مجھے بتاؤ۔ اس کے حالات فوراً لکھ بھیجو۔ وہی تو فساد کی جڑ ہے۔“

منروا ان دنوں جارابا کوانامی شہر میں مقیم تھی، جہاں وہ اپنے چچا کا ان کے مطب میں ہاتھ بٹایا کرتی۔ مانولو بھی اس کے ساتھ تھا۔ بہ ظاہر دونوں میاں بیوی سیاسی سرگرمیوں سے دور ایک عام سی زندگی گزار رہے تھے، مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

ٹروجیلو مخالف پاپولر سوشلسٹ پارٹی دھیرے دھیرے قوت حاصل کر رہی تھی۔ اس کے حامی پورے ملک میں پھیل چکے تھے۔ لوگ انہیں چندہ دے رہے تھے۔ کیوبا اور وینزویلا کی سوشلسٹ پارٹیوں سے اُنہیں امداد مل رہی تھی۔ وہ عسکری طور پر مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔

میرابیل گھرانا خاموشی سے اس عظیم مقصد کے لیے کام کر رہا تھا۔ بہ ظاہر پیٹریا اور بلجیکا شادی شدہ زندگی گزار رہی تھیں، اپنے بچوں کو سنبھال رہی تھیں مگر حقیقت میں وہ اور ان کے شوہر کاشت کاروں کو منظم کر رہے تھے۔ منروا کی مانند اس کا شوہر بھی ٹروجیلو سے شدید نفرت کرتا تھا۔ وہ پاپولر سوشلسٹ پارٹی کا رکن تھا جو جلد ایک بڑی تحریک بپا کرنے والی تھی۔ تاہم تحریک کی کامیابی کے لیے احتیاط لازم تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی بھنک حکومت کو پڑے، اس لیے وہ خاموشی اختیار کیے اپنے روزمرہ کے معمولات انجام دیتے رہے۔

1958 میں ماریا ایک انجینئر لیونارڈو سے رشتۂ ازدواج میں بندھ گئی۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا، جو ٹروجیلو کا سخت ناقد تھا اور اس کا تختہ الٹنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ حیران کن حد تک پُرجوش تھا۔

اس رات جب وہ کھانے کی میز پر اکٹھے ہوئے تو چاروں عورتوں نے اپنے شوہروں کو دیکھا۔ وہ پُرعزم اور حوصلہ مند تھے۔

”تو ہم تیار ہیں۔“ منروا نے دھیرے سے کہا۔

”ہاں۔“ بڑے داماد پیڈرو نے میز بجائی۔ ”ہم سب تیار ہیں۔“

بلجیکا کے شوہر ژائمے اور مانولو نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ انہوں نے میز بجاتے ہوئے ایک قدیم لوک گیت گایا۔ پھر دولھا میاں نے جام اٹھایا۔ ”تو آج کا جام ہماری عظیم جدوجہد کے نام۔“

برتن سمیٹتے ہوئے نئی نویلی دلہن نے اپنی بہن سے پوچھا۔ ”پیاری منروا، کیا صبح ہونے کو ہے؟“

”صبح...“ اس نے ایک لحہ توقف کیا۔ ”ممکن ہے سورج ہماری زندگیوں میں طلوع نہ ہو، مگر یاد رکھنا... اس کا طلوع ہونا طے ہے۔“

ماریا نے گہرا سانس لیا۔ ”شاید جو شے ہمارے سب سے قریب ہے، وہ موت ہے۔ لیکن اس کا تصور مجھے خوفزدہ نہیں کر رہا۔ ہم اپنے نصب العین کے لیے آخری دم تک لڑتے رہیں گے۔“

عروسی جوڑے میں ملبوس اپنی چھوٹی بہن کے ان پُرقوت الفاظ نے سب کو جذباتی کر دیا۔ وہ اس سے لپٹ گئیں۔ ”ہاں ہم آخری دم تک لڑتے رہیں گے۔“

وہ چار بہنیں تھیں، جو جبر اور گھٹن کی شکار اس ریاست کی قسمت بدلنے والی تھیں۔

کیوبا میں عظیم انقلاب آخری مراحل میں تھا اور ڈومینیکن ری پبلک میں... ایک عظیم جنگ شروع ہونے کو تھی!

☆☆☆

شمالی شہر جنگی گیتوں سے گونج اٹھے۔ ان گیتوں میں اُجلی صبح کی امید تھی۔ تبدیلی کا عزم تھا۔ جینے کی آرزو تھی۔

تین شمالی شہروں میں باغی اکٹھے ہونے لگے تھے۔ یہ ”ڈومینیکن لبریشن موومنٹ“ کے دستے تھے، جنہوں نے تبدیلی کے لیے سیاسی جدوجہد کی بجائے عسکری جدوجہد کی راہ چنی تھی۔ دستوں کی قیادت ایزخ مویا نامی ایک باہمت شخص کر رہا تھا۔ یہ گروہ ان باغیوں پر مشتمل تھا جنہیں جلاوطنی کا کرب سہنا پڑا تھا۔ وہ عرصے تک کیوبا اور وینزویلا میں روپوش رہے اور پھر ایک بڑی جنگ لڑنے اپنے وطن لوٹ آئے۔

ان کی منظر میں آمد نے ڈومینیکن کے عوام کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی ٹروجیلو کی ظالم اور منظم فوج سے ٹکر لے سکتا ہے مگر کچھ دیوانے ایسا کر گزرے تھے۔ شمال کے علاقوں میں ایزخ مویا نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ ایک سوشلسٹ حکومت۔ جو مساوات پر، برابری پر یقین رکھتی تھی۔

شمالی علاقوں میں گونجتے گیت ٹروجیلو پر بجلی بن کر گرے۔ وہ حواس باختہ ہوگیا۔

لاطینی امریکا کی دیگر ریاستوں کے سربراہان نے ٹروجیلو کو معاملہ افہام وتفہیم سے حل کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ پاگل ہوچکا تھا۔ اس نے فوج کو حکم صادر کر دیا کہ باغیوں کو نیست ونابود کر دیا جائے۔

جدید اسلحے سے لیس فوج کے دستے شمالی شہروں کی سمت بڑھنے لگے۔ وہ جس شہر سے بھی گزرے، وہاں انہیں بغاوت کی چاپ سنائی دی۔ کسی شہری نے ان پر پھول نہیں برسائے۔ کسی نے انہیں خوش آمدید نہیں کہا۔

14 جون کو جب دونوں فوجیں مدمقابل آئیں تو عددی فرق واضح تھا۔ باغیوں کی تعداد قلیل تھی۔ دشمن تعداد میں تین گنا تھا۔ ان کی پرانی بندوقوں کے مقابلے میں آٹومیٹک اسلحہ تھا۔

گھمسان کا رن پڑا۔ باغی بڑی دلیری سے لڑے۔ ایک موقع پر تو وہ غالب آگئے تھے، مگر پھر... فضائیہ میدان میں کود پڑی۔ گن شپ ہیلی کاپٹرز سے اُن پر فائرنگ کی گئی۔ فائٹر طیاروں نے ان کے اڈوں پر بم گرائے۔

ٹروجیلو کی فوجوں نے شمالی علاقے میں بڑے پیمانے پر قتل عام کیا۔ باغیوں کے سر قلم کر دیے گئے۔ ان کے حامیوں کو گرفتار کرلیا۔ گھر نذرِ آتش کر دیے گئے۔ ظلم کی وہ داستان اتنی لرزہ خیز تھی کہ لوگ ہٹلر کو بھول گئے۔

”ڈومینیکن لبریشن موومنٹ“ کی کوششیں سودمند ثابت نہیں ہوئیں۔ باغی دستوں کو کچل دیا گیا... لیکن کیا باغیوں کی موت کے ساتھ بغاوت بھی دم توڑ گئی؟

نہیں۔ درحقیقت یہ بغاوت ہی اس ملک گیر تحریک کا نقطۂ آغاز تھا، جو ٹروجیلو کو تختۂ دار تک لے گئی۔

☆☆☆

بلا کی گرمی تھی۔ سورج کچھ نیچے آگیا۔ جس ایسا کہ دم گھٹنے لگے۔ مگر گزشتہ برس کے برعکس اس بار عوام گھروں میں بیٹھ کر گرمیاں گزارنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

ڈومینیکن بدل رہا تھا۔ غم وغصہ اس کے رگ وپے میں دوڑنے لگا۔ بغاوت پنپ رہی تھی۔

”ڈومینیکن لبریشن موومنٹ“ کی بغاوت نے عوام کو حوصلہ دیا۔ وہ باغی جو عرصے سے زیرزمین کام کر رہے تھے، ایک نئے عزم کے ساتھ منظم ہونے لگے۔ میرابیل گھرانے نے بھی خاموشی توڑ دی۔

”14 جون تحریک“ نامی ایک انقلابی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی۔ منروا کا شوہر... باہمت مانولو اس کا صدر منتخب ہوا۔

اس خبر کو پورے ملک میں خوشی اور حیرت سے سنا گیا۔ ”ڈومینیکن لبریشن موومنٹ“ کے بچے کھچے لوگ بھی ان سے آن ملے۔ سوشلسٹ ممالک نے اپنے تعاون کی یقین دہانی کروا دی۔ وہ خاموش طبقہ، جو ٹروجیلو سے تنگ تھا، ان کی جانب سے بھی ”14 جون تحریک“ کی حمایت کا اعلان کر دیا گیا۔

ٹروجیلو کو سب خبریں مل رہی تھیں مگر وہ فوری کوئی

کارروائی نہیں کرسکتا تھا۔ گزشتہ برس اس نے ظلم کی جو مکروہ داستان رقم کی تھی، وہ طوقِ ندامت بن چکی تھی۔ بین الاقوامی میڈیا میں اسے ایک جابر شخص کے طور پیش کیا جارہا تھا۔ آس پڑوس کے ممالک میں میرابَل گھرانے اور دیگر باغیوں کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔ پھر "14 جون تحریک" کے رہنماؤں نے تاحال حکومت کے خلاف جدوجہد کا اعلان نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے ٹروجیلو کو قانونی کارروائی کا جواز نہیں مل رہا تھا۔

کیوبا کے انقلاب کے بعد ان کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ تبدیلی کی ہوا چل پڑی۔ امکانات دکھنے لگے۔ جنوری 1960 میں تحریک کے سرکردہ رہنما ماؤ نامی ایک قصبے میں اکٹھے ہوئے۔

یہ ایک خفیہ میٹنگ تھی جس کا مقصد حکومت مخالف کارروائیوں کا دائرہ کار متعین کرنا تھا۔

ایجنسیوں کو اس کی بھنک پڑگئی.... انہوں نے چھاپا مارا اور میٹنگ کے تمام شرکا کو گرفتار کرلیا۔

اس واقعے نے لوگوں کو مزید بھڑکا دیا۔ ٹروجیلو مخالف جذبات بڑھنے لگے۔ درس گاہوں میں باغیانہ خیالات اس تیزی سے پروان چڑھے کہ حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ملک بھر میں مظاہرے شروع ہوگئے۔ مانولو تو پہلے ہی گرفتار تھا، اب پیٹریا کے شوہر پیڈرو اور ماریا کے شوہر لیونارڈو کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ طلبا نے اس فیصلے پر شدید احتجاج کیا۔ کاشت کار اور صحافی بھی ان کے ساتھ آن ملے۔ منروا نے ایک نڈر عورت کی طرح ان مظاہروں کی قیادت کی۔

حکومت نے طاقت کے زور سے مظاہرین کو کچلنے کا فیصلہ کیا۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ عورتوں کو بھی تاریک کوٹھریوں میں ڈال دیا گیا۔ منروا، پیٹریا اور ماریا بھی اس ظالمانہ فیصلے کی لپیٹ میں آگئیں۔

حکومت گرفتاریوں ہی پر نہیں رکی، اُن کی جائداد ضبط کرلی گئی۔ اثاثے منجمد کردیے۔ انہوں نے قیدیوں پر تشدد کیا۔ معافی نامے پر دستخط کے لیے دباؤ ڈالا جانے لگا۔

جب بین الاقوامی میڈیا کو خبر ملی کہ "14 جون تحریک" کے سو کارکنان کو گرفتار کرلیا گیا ہے تو انہوں جابر ٹروجیلو کو نشانے پر رکھ لیا۔ انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں نے بھی اس واقعے کی شدید مخالفت کی، خصوصاً عورتوں کو قید میں رکھنے کے فیصلے کو مکروہ اور کریہہ ٹھہرایا۔ ویٹی کن سے بھی بیان جاری ہوگیا جس کے بعد ڈومینیکن ری پبلک کے چرچ کو بھی ایک مذمتی بیان جاری کرنا پڑا۔

ٹروجیلو کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ اس نے تمام خواتین قیدیوں کی رہائی کا اعلان کردیا۔ خود کو ایک شریف انسان ثابت کرنے کے لیے اُس نے بین الاقوامی میڈیا کے نمائندوں سے ایک میٹنگ کی، جس میں اس نے کہا۔ "میں جانتا ہوں، اُن کے بچے گھروں میں انتظار کر رہے ہیں۔ نہ جانے یہ شریف عورتیں کن بدمعاشوں کے بہکاوے میں آگئیں۔ تاہم میں انہیں معاف کرتا ہوں۔"

اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹنے کی یہ کوشش کام نہیں آئی۔ منروا نے رہائی کے بعد بی بی سی کو جو انٹرویو دیا، اس میں ٹروجیلو کا اصل چہرہ عیاں کردیا۔ اس نے کہا۔ "جب تک ہمارے تمام ساتھیوں کو رہا نہیں کیا جاتا، ہماری تحریک جاری رہے گی۔"

ٹروجیلو کو مجبوراً مزید چند قیدی رہا کرنے پڑے مگر اس نے فقط انہیں آزادی دی جن پر معمولی الزامات تھے۔ پیڈرو، مانولو اور لیونارڈو کے معاملے میں وہ نرمی برتنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ انہیں عبرت کا نشان بنا دینا چاہتا تھا۔

"یہی تو وہ تین بدمعاش ہیں جنہوں نے یہ سارا بکھیڑا کھڑا کیا۔ انہیں میں کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "سڑنے دو انہیں جیل میں۔"

☆☆☆

"ٹروجیلو انسانیت کا قاتل ہے، جسے فی الفور پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے۔" یہ بیان وینزویلا کے صدر رومولو بٹیان نے دیا تھا، جسے عالمی میڈیا نے خصوصی اہمیت دی۔

ٹروجیلو جل کر کباب ہوگیا۔ وہ دہاڑا۔ "رومولو ایک سوشلسٹ ہے اور سوشلسٹ کافر ہوتے ہیں۔"

ایسے احمقانہ بیان کو بھلا کون خاطر میں لاتا۔ الٹا اسی کا مذاق اڑایا گیا۔ ایک امریکی مبصر نے لکھا، ٹروجیلو فقط ظالم ہی نہیں، بلکہ ایک احمق بھی ہے۔

اب تو ٹروجیلو غصے سے پاگل ہوگیا اور اسی پاگل پن میں اس نے رومولو کے قتل کا حکم صادر کردیا۔

اس نے دانت پیستے ہوئے اپنے دستِ راست جوان روجاز سے کہا۔ "اس جاہل کی وجہ سے مجھے احمق کہا گیا... اسے واصلِ جہنم کردو۔ قتل کروا دو۔"

"قتل؟" جوان متذبذب تھا۔ "جناب وہ ایک ملک کا سربراہ ہے، موجودہ حالات میں یہ فیصلہ کچھ مناسب نہیں لگتا۔"

"کیا تم میرا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو؟" وہ چلایا۔

جوان بوکھلا گیا۔ "میں... جناب میری کیا مجال... قتل کر دیں گے اس احمق... میرا مطلب ہے اس جاہل کو۔ میں ابھی انتظامات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں۔"

جوان وہاں سے کھسک گیا۔ اسی شام وینزویلا کے مافیا لارڈز سے رابطہ کیا گیا۔ انہیں منہ مانگی قیمت ادا کی گئی۔

ٹھیک تین دن بعد رومولو کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی۔ خوش قسمتی سے وہ محفوظ رہا۔ ابھی اس واقعے کو چوبیس گھنٹے نہیں گزرے تھے کہ اس کے دفتر میں زوردار دھماکا ہوا۔

جب ٹروجیلو کو دھماکے کی اطلاع ملی، وہ بغلیں بجانے لگا مگر کچھ ہی دیر بعد اس کے ارمانوں پر اوس پڑگئی۔ رومولو نے ایک بیان جاری کیا تھا کہ وہ زندہ ہے اور جلد اپنے دشمن کو بے نقاب کرے گا۔

اگلے ہی دن منروا میرابَل کا ایک بیان بین الاقوامی اخبارات میں شائع ہوا جس میں اس نے براہِ راست ٹروجیلو کو رومولو پر ہونے والے حملے کا ذمے دار ٹھہرایا۔

"کیا کوئی اس کی زبان کو لگام دے گا؟" وہ دہاڑا۔ "جیل میں ڈال دو اسے۔ ہڈی پسلی ایک کردو۔ بڑی آئیں تتلیاں کہیں کی۔"

"جناب... عورتیں ہیں۔ جانے دیں۔" جوان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ویسے اگر آپ حکم دیں، تو میں ان کے شوہروں کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں؟"

"ہاں، انہیں سبق ملنا چاہیے۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔

☆☆☆

مظاہرین سڑکوں پر تھے۔ احتجاجی ریلیوں نے زور پکڑ لیا۔ پولیس حرکت میں آگئی۔ شہریوں پر ربڑ کی گولیاں برسائی گئیں۔ بہت سوں پر تشدد کیا گیا۔ لوگوں کو اٹھا کر جیل میں ڈال دیا گیا۔

سوشلسٹ ممالک تو ٹروجیلو کے مخالف تھے ہی، مگر اب امریکیوں نے بھی اس پر تنقید شروع کردی تھی۔ مشہور تنظیم "آرگنائزیشن آف امریکن اسٹیٹس" نے خدشہ ظاہر کیا کہ ڈومینیکن میں انسانی حقوق کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزی ہو رہی ہے، جس کی تحقیق کے لیے وہ مبصرین کی ایک ٹیم وہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔

ٹروجیلو ٹپٹا گیا۔ وہ انکار نہیں کرسکتا تھا۔ لامحالہ اُسے بہت سے قیدیوں کو رہا کرنا پڑتا۔ حالیہ آپریشن میں میرابَل بہنوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا، مگر "آرگنائزیشن آف امریکن اسٹیٹس" کے وفد کی آمد کے پیشِ نظر انہیں چھوڑ دیا گیا، البتہ جائداد نہیں لوٹائی گئی۔ اُن کے اثاثے ہنوز منجمد تھے۔

رہائی کے بعد منروا نے عوام کے نام ایک خصوصی بیان جاری کیا۔ اُس نے کہا، "مصائب میں گھرے اپنے ملک کے لیے جدوجہد کرنے سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہوسکتی ہے اور اِس سے بڑا المیہ کیا ہوگا ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ ہمیں جاگنا ہوگا۔ وقت آن پہنچا ہے۔"

اس نے کیوبا کے انقلاب کا خصوصی طور پر حوالہ دیتے ہوئے فیڈل کاسترو اور چے گویرا کو شان دار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

ٹروجیلو نے سنا تو بڑا سیخ پا ہوا۔

"وہ عوام کو گمراہ کر رہی ہے۔ اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔ بس بہت ہوگیا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اسے راستے سے ہٹانا پڑے گا۔"

جوان روجاز نے اختلاف کیا تو اسے ڈانٹ دیا۔ "تم چپ کرو۔ یہ تمہارے بس کا کام نہیں۔ یہ ذمے داری مجھے اپنی خفیہ پولیس کو سونپنی پڑے گی۔"

خفیہ پولیس سے مراد ایجنسیوں کی وہ شاخ تھی جو براہِ راست ٹروجیلو سے احکامات وصول کرتی اور اس کے ایک اشارے پر لوگوں کے سرتن سے جدا کردیتی۔

قاتلوں پر مشتمل یہ محکمہ ٹروجیلو نے اُس زمانے میں منظم کیا تھا، جب وہ ایک فوجی افسر کی حیثیت سے اونچے عہدوں کے حصول کے لیے تیزی سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اُس زمانے میں امریکی میرین سے اس کا رابطہ ہوا۔ ان کی سرپرستی میں لاطینی امریکا میں ہونے والی خفیہ کارروائیوں میں اُس نے حصہ لیا۔ یوں وہ ان کے تمام ہتھکنڈے سیکھ گیا۔ اقتدار میں آنے کے بعد اُس نے ایسی ایجنسیاں قائم کیں جو عوام کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ قانون میں ترمیم کرکے اُنہیں بے تحاشا اختیارات تفویض کیے گئے۔ ہر شہری کے لیے پولیس کا جاری کردہ شناختی کارڈ ساتھ رکھنا لازم تھا۔ اس کے بغیر گھر سے نکلنا جرم تصور کیا جاتا۔

وقت کے ساتھ خفیہ پولیس کا محکمہ انتہائی طاقتور ہوگیا۔ ٹروجیلو نے انہیں اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کیا۔ ظالم اہل کار پلک جھپکتے ہی لوگوں کو قتل کر ڈالتے۔ ان کے اپنے تفتیشی مراکز، اپنے عقوبت خانے تھے۔ بجٹ میں اُن کے

لیے خاصی رقم مختص کی جاتی۔

تو اب اس ظالم شخص نے میرابئل بہنوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس مکروہ منصوبے کے لیے اس نے ایسے شقی القلب افراد کا انتخاب کیا جو ماضی میں بھی اس نوع کی درجنوں وارداتیں کر چکے تھے۔ پیسے اور ترقی کے لیے لوگوں کا قتل کرنا اُن کے لیے معمولی بات تھی۔ محکمے کا سربراہ سیریا کوروزا نامی ایک حیوان تھا جو دولت کے لیے اپنے بیٹے کو بھی قتل کرسکتا تھا۔

رات گئے جب پورا ملک اپنے بستروں میں تھا، ٹروجیلو نے صدارتی محل میں نصب سرخ فون سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف موجود شخص سے کہا۔ ”میرابئل بہنوں کو راستے سے ہٹا دو۔ واقعے کو حادثے کا رنگ دے دینا۔ کام مکمل ہوتے ہی مجھے اطلاع دی جائے۔“

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ چہرے پر کرختگی تھی۔

حوان روجاز ہاتھ باندھے سامنے کھڑا تھا اور سچ کہا جائے تو اس لمحے وہ دکھی تھا۔ بہت دکھی۔

☆☆☆

25 نومبر کی اُس شام بلا کا حبس تھا۔

منروا نے جیپ میں سوار ہوتے ہوئے آسمان کی سمت دیکھا۔ ”شاید آج تیز بارش ہو۔“

اسے یاد آیا کہ یہی بات اس نے کئی برس قبل، عظیم ضیافت والی شام بھی کہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

پٹیریا اور ماریا اس کے ساتھ تھیں۔ آج ملاقات کا دن تھا۔ وہ تینوں اپنے شوہروں سے ملنے لاکوارینٹو جارہی تھیں۔

شوہروں کی حالت انتہائی خستہ تھی۔ جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ انہیں گزشتہ دو دن سے بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔ عورتوں کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ شوہروں نے یہ دیکھا تو اُن کی ہمت بڑھانے لگے۔

مانولو نے کہا۔ ”ہم انقلابی ہیں اور انقلابیوں کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔“

”مگر انقلابی بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں۔“ خوبرو ماریا نے اپنے شوہر کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وجیہہ نوجوان کی بائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی۔

”بلاشبہ وہ انسان ہوتے ہیں۔“ پیڈرو نے جو سب میں بڑا تھا، گردن ہلائی۔ ”عظیم مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے والے انسان اور عظیم مقاصد قربانیوں کا تقاضا کرتے ہیں۔“

”ہم قربانیوں کے لیے تیار ہیں۔“ منروا کے لہجے میں عزم تھا۔ ”تحریک ایک اہم موڑ پر پہنچ چکی ہے۔ ٹروجیلو کا زوال قریب ہے۔ ہمارے بچے ایک نئے ڈومینیکن میں آنکھ کھولیں گے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ اس کا شوہر مانولو بولا۔ ”پوری دنیا کو اس جابر شخص کے کرتوتوں کا پتا چل گیا ہے۔ تاریخ اپنا فیصلہ دینے کو ہے۔ ہمیں خود کو مضبوط رکھنا ہوگا۔“

”تم تو بچے گویرا کی طرح بات کر رہے ہو۔“ منروا دھیرے سے ہنسی۔

”وہ ایک عظیم مصلح ہے۔“ پیڈرو نے سر ہلایا۔ ”اور ہم اس کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ اگر ہمیں قتل کیا گیا تو ہم شان سے موت کو گلے لگائیں گے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ منروا نے کہا۔

تاریخ نے جیل کے اُس سیلن زدہ کمرے میں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ محفوظ کرلیا... یہ اُن سچ پرستوں کے درمیان ہونے والا آخری مکالمہ تھا۔

جب عورتیں جیل کی عمارت سے باہر آئیں، تاریکی چھا چکی تھی۔ آسمان پر دبیز بادلوں کا بسیرا تھا۔ جیپ کا ڈرائیور روفینو کروزان کا منتظر تھا۔

”میں نے سنا ہے کہ آج تمہاری شادی کی سالگرہ ہے۔“ پٹیریا نے نوجوان سے کہا۔

”جی...جی ہاں۔ ہم نے گھر میں چھوٹی سے دعوت رکھی ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ اور یہ آخری موقع تھا، جب معصوم روفینو کے چہرے پر ہنسی کھیلی۔ ہاں، یہ اُس کی آخری رات تھی۔

شہر سے نکلتے ہی طوفانی بارش شروع ہوگئی۔ ہائی وے پر بھیڑیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ ان چاروں کو گنے کے کھیتوں میں لے گئے۔ ان پر شدید تشدد کیا گیا۔ ظالم چاہتے تھے کہ عورتیں روئیں، گڑگڑائیں، اپنی زندگی کی بھیک مانگیں، مگر وہ باہمت بہنیں حق کی پیروکار تھیں۔ مرنا تو قبول تھا مگر جھکنے کو وہ تیار نہیں تھیں۔

انہوں نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لیے۔ وہ تشدد سہتی رہیں۔ نہ چلائیں، نہ ہی رحم کی بھیک مانگی۔

قاتلوں نے ان کی جیپ کھائی میں دھکیل دی۔ درندہ صفت سیریا کوروزا نے اپنے آقا ٹروجیلو کو اس کارنامے سے آگاہ کردیا۔

آمر نے رعونت سے کہا۔ ”میں نے تتلیوں کو مسل دیا۔ اب کوئی مجھ سے ٹکرانے کی جرات نہیں کرے گا۔“

وہ غلط تھا اور یہ بات تاریخ نے ثابت کردی۔ رات کے اندھیرے میں ہونے والے لرزہ خیز واقعے کو حادثے کی شکل دینے کی ہر حکومتی کوشش ناکام گئی۔ اِس قتل کی روداد پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس واقعے نے ڈومینیکن میں بغاوت کی آگ لگادی۔ لوگ پاگل ہوگئے۔ ہر شخص انتقام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

ہزاروں لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ وہ احتجاج نہیں کر رہے تھے، یہ تو انقلاب تھا... تبدیلی کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

ہر شہر میں ناظم اور گورنر کے محلوں کا محاصرہ کرلیا گیا۔ انہوں نے عمارتوں اور گاڑیوں کو آگ لگادی۔ سرکاری اہل کار بھی عوام کے ساتھ آن ملے۔ حکومتی عہدے دار روپوش ہوگئے۔ سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ دارالحکومت میں باغیوں کے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ ہزاروں افراد انتقام کے ہتھیاروں سے لیس صدارتی محل کی سمت بڑھ رہے تھے۔

ٹروجیلو نے فوج کو کریک ڈاؤن کا حکم جاری کردیا۔ چند افسران اس سے متفق نہیں تھے، مگر بادلِ ناخواستہ انہیں حکم ماننا پڑا۔

سیکیورٹی فورس نے اپنی سی کوشش کی، مگر انسانی سمندر بے قابو ہوچکا تھا۔ لوگ فیصلہ کرکے آئے تھے کہ تتلی بہنوں کا انتقام لیے بغیر وہ گھر نہیں لوٹیں گے۔

”اگر وہ مرنا ہی چاہتے ہیں تو مریں۔ بھون ڈالو انہیں۔“ آمر دہاڑا۔

سپاہیوں نے ٹروجیلو کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔ بہت سوں نے ہتھیار رکھ دیے۔ کچھ مظاہرین کے ساتھ جاملے۔ افسران کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خصوصی اجلاس بلایا گیا۔ فوج کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ لوگ پاگل ہورہے تھے۔

چند ہی گھنٹوں بعد فوج کے اعلیٰ افسران نے بغاوت کردی۔ ٹروجیلو حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور 30 مئی 1961 کی دوپہر... دارالحکومت کی ایک سڑک پر اُس جابر شخص کو گولیاں مار کر ہلاک کردیا گیا۔

وہ جو خدا کے لہجے میں بات کیا کرتا تھا، خاک میں مل گیا!

☆☆☆

میرابئل بہنوں کی عظیم قربانی کے طفیل ریاست ڈومینیکن ٹروجیلو نامی بھیڑیے سے آزاد ہوگئی۔

عوام نے نئی حکومت سے اُن کے قتل کی تحقیقات کا مطالبہ کردیا۔ کئی گرفتاریاں ہوئیں۔ قاتل گروہ کا سربراہ سیریا کوروزا بھی پکڑا گیا۔ اس نے اعترافی بیان میں اپنے گناہ کی ہیبت ناک تفصیلات فراہم کیں۔ ٹریبونل کے سامنے اس نے کہا۔ ”میں عدلیہ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا، اس لیے میں نے صاف صاف ہر بات بیان کردی، مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ...وہ تینوں عظیم تھیں۔ ان کا حوصلہ پہاڑ سے بلند اور عزم صحراؤں سے وسیع تھا... میں اس تباہی کو، اس جرم کو روک نہیں سکا تھا۔ ورنہ ٹروجیلو ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیتا...آہ، میں شرمندہ ہوں۔“

اس کیس میں خفیہ ایجنسی کے ایک ڈائریکٹر جونی ابیس کو بھی گرفتار کیا گیا۔ اس بدکردار شخص سے جب سوال ہوا کہ اس نے میرابئل بہنوں کے قتل میں کیوں معاونت کی تو اس نے رعونت سے کہا۔ ”باقی دو کو تو ہم بخش سکتے تھے، مگر منروا کو مرنا ہی تھا۔ اسی نے اپنے گھرانے میں بائیں بازو کی سیاست کا بیج بویا۔ وہ ریڈیکل لیفٹ ازم کی مریضہ تھا۔ اسی باعث اسے اور اس کے گھرانے کو المناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔“

اُس متکبر انسان کا اپنا انجام بھی عبرت ناک ہوا۔ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

تتلی بہنوں کی عظیم قربانی نے دنیا بھر کی توجہ حاصل کی۔ شاعروں نے ان کے لیے گیت لکھے، ادیبوں نے اس کہانی کو کتابوں میں سمویا۔ اپنے عہد کے تمام بڑے دانشوروں نے ان بہادر عورتوں کو شان دار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ انہیں 25 نومبر کو قتل کیا گیا تھا...اقوام متحدہ نے اس تاریخ کو ”عورتوں پر تشدد کے خلاف مزاحمت کا عالمی دن“ قرار دے دیا۔

یوں تو انہوں نے اپنی موت کے ساتھ ہی ڈومینیکن میں ایک اساطیر کی شکل اختیار کرلی تھی، مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا، ان کی شہرت پھیلتی گئی۔ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ان کی قربانی کا چرچا ہونے لگا۔ اُنہیں جدوجہد کا استعارہ، امید کا مینار قرار دیا گیا۔ انہوں نے آزادی کی علامت کی حیثیت اختیار کرلی۔

سچ تو یہ کہ تتلی بہنوں نے یہ ثابت کردکھایا کہ ظلم کا مقدر رسوائی ہے۔ آزادی کی راہ روشن ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرنا ہر زندہ انسان کا فرض ہے۔

ترکی نمی دانم

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کرہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست وبرخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔
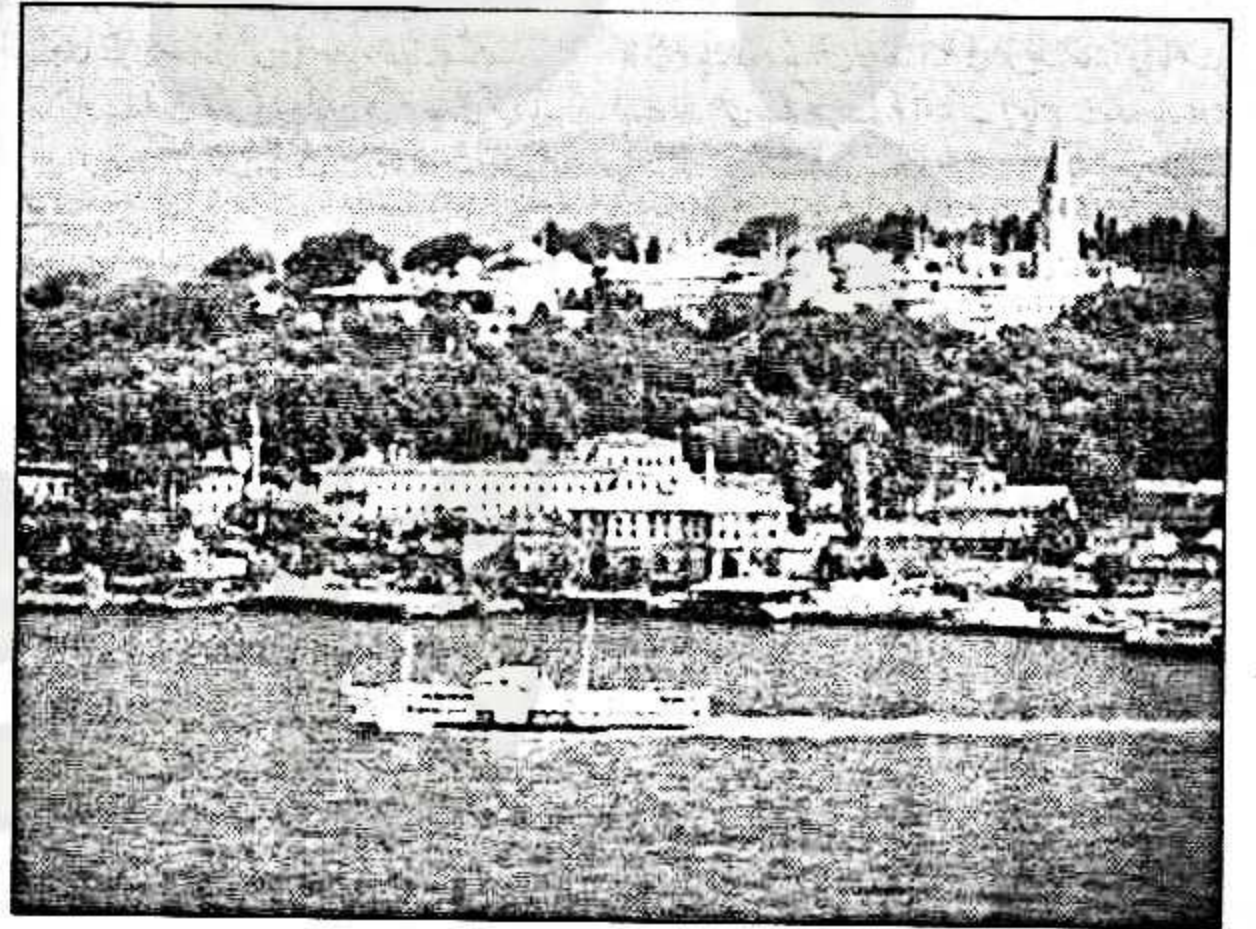
ترکی کے سفرکی دلچسپ روداد، سفرکہانی کی چودھویں کڑی

جیسے ہی ہم لوگ باہر نکلے بٹ صاحب نے ایک بہت لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری۔"بٹ صاحب اپنی آہ کی ٹھنڈک ذرا کم کردیں۔ ہمیں تو سردی لگنے لگی ہے۔" خان صاحب نے چھیڑا۔

بٹ صاحب نے آسمان کی طرف دیکھ کر پھر ایک ٹھنڈی آہ بھری مگر یہ ذرا کم ٹھنڈی تھی۔

"بٹ صاحب خیر تو ہے' آپ آہیں کیوں بھر رہے ہیں۔ اگر آہ لبوں تک آجاتی ہے تو اسے روکنا سیکھیے۔ دیکھنے

اور سننے والے کیا سوچیں گے۔"

وہ بولے "مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔ نہ میں جانتا ہوں نہ یہ مجھے جانتے ہیں جو چاہیں سوچتے رہیں۔ آپ نے وہ شعر نہیں سنا کسی فلسفی کا۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے۔"

"جی نہیں۔ مگر میں نے یہ گانا سنا ہے۔

آہیں نہ بھریں، شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے ہاتھوں سے کلیجا تھام لیا۔"

ہم نے سوچا کہ اگر دخل اندازی نہ کی تو ان دونوں حضرات کی بیت بازی نہ جانے کب تک جاری رہے گی اس لیے دخل درمعقولات کرتے ہوئے پوچھا۔"بٹ صاحب براہ کرم یہ آہوں کا فلسفہ بند کیجیے اور یہ بتایئے کہ اس کا سبب کیا ہے؟"

بٹ صاحب نے پھر ایک آہ بھری، کہنے لگے۔ "ڈائمنڈ آئی لینڈ بہت یاد آرہا ہے۔ وہاں کتنا سکون اور اطمینان ہے۔ کتنی خاموشی ہے۔ ہر طرف ساحل ہے۔ چاہے کپڑے دھوئیں۔ چاہے مچھلیاں پکڑیں۔ چاہیں تو کتاب پڑھیں اور نیند آجائے تو سوجائیں۔

ہم نے کہا"بٹ صاحب یہ سارے کام تو آپ استنبول میں بھی کرسکتے ہیں۔ یہاں بھی ہر طرف ساحل اور سمندر ہے۔ ساحل پر خاموشی اور اطمینان بھی ہے۔ یہاں بھی باسفورس ہے۔ مچھلیاں ہوتی ہیں۔ مچھلی پکڑنے کا شوق تو آپ یہاں بھی پورا کرسکتے ہیں ہم ہر روز صبح ناشتے کے بعد آپ کو یہاں چھوڑ دیا کریں گے۔ شام کو لے جایا کریں گے۔ اگر کوئی مچھلی غلطی سے پھنس گئی تو اسے واپس سمندر میں پھینک دیں گے۔"

"اتنی محنت سے پکڑی ہوئی مچھلی کو واپس کیوں پھینک دیں گے؟"

"آپ پر صدقہ کرکے۔ صدقے کے بہت فائدے ہوتے ہیں۔"

ایک ٹیکسی کو اشارہ کرکے روکا۔ اس میں ایک نوجوان لیکن خاصا معتبر ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔ یقین نہیں آیا کہ یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ بقول بٹ صاحب کے ایسا جنٹلمین آدمی ٹیکسی چلائے تو اسے کرایہ دیتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔"

ٹیکسی بہت اچھی حالت میں تھی۔ استنبول میں ہم نے دیکھا کہ ہر کار اور ٹیکسی چمکیلی نظر آتی ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور باہر نکل کر کھڑا ہوگیا اور سوالیہ نظروں سے ہم سب کو دیکھ رہا تھا مطلب یہ کہ "یہیں کھڑے رہیں گے کہ کہیں جانا بھی ہے۔"

"ویئر گو سر؟" مطلب یہ کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔ مگر اتنا پتا چل گیا کہ یہ "جنٹلمین آدمی" انگریزی سے پیدل ہے۔

ہم نے انہیں اپنے ہوٹل کے نام کا کارڈ نکال کر دکھایا۔

یہ ترکی زبان میں تھا اور اس کو دکھا کر ہر مشکل آسان ہوجاتی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے ادب سے دروازہ کھولا اور ہم سب کو ٹیکسی میں بٹھایا۔ ٹیکسی نے حرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کی فرمائش۔

اس نے اشارے سے ریڈیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔"یو لائیک سونگ" ہم سب نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

"یو پرمیشن": اس نے پوچھا۔ اس مختصر فقرے کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو ریڈیو کھول دوں۔

ہم سب نے پھر سر ہلا کر اجازت دے دی۔ اس نے بڑی بے تابی سے ریڈیو آن کردیا۔ ایک بھاری لیکن سُریلی زنانہ آواز گونجنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گانے والی ابھی سو کر اٹھی ہے۔ ایسی لگی لگی مگر سُریلی آوازوں میں بہت کشش ہوتی ہے اور انفرادیت بھی، اس آواز میں ایک مخصوص قسم کی جنسی کشش ہوتی ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے فخر سے گانے والی کا تعارف کرایا۔ ہم سب نے سر ہلا کر اتفاق کیا۔ "گڈ ویری گڈ وائس۔"

ٹیکسی ڈرائیور یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس خوشی میں اس نے زیادہ انگریزی بولنے کی کوشش کی۔ "یو لسن ہر سانگ، بی فور کی جگہ اس نے ایک ترکی لفظ بول دیا۔ شاید Bofore کہنا نہیں آتا تھا۔

ہمارے جواب دینے سے پہلے اس نے اچانک ریڈیو کی آواز کم کردی۔ پاس ہی کسی مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ جب تک اذان کی آواز سنائی دیتی رہی آواز ہلکی رہی۔ اذان ختم ہوئی تو ٹیکسی ڈرائیور نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لیے۔ دراصل اس زمانے میں ترکی میں اسلام کا اثر

بڑھتا جارہا تھا اور سیکولر مغربی اثرات کم ہوتے جارہے تھے۔ لوگ مذہب کی طرف راغب ہورہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور کی یہ ادا ہمیں بہت پسند آئی۔ کسی زمانے میں ہمارے ہاں بھی اذان کی آواز کا اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر احترام کیا جاتا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ وہ قومیں جو مذہب سے دور ہوگئی تھیں مذہب کی طرف ان کا رجحان بڑھتا جارہا ہے جبکہ ہم مذہب پرست مذہب سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ اذان ختم ہوتے ہی اس نے ریڈیو کی آواز پھر بلند کردی۔

ہم نے یہ دیکھا کہ مصری اور ترک موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ ہم مصر گئے تو ام کلثوم کا بہت چرچا تھا۔ ہر ٹیکسی میں ام کلثوم کے نغمے گونجتے رہتے تھے۔ کلبوں وغیرہ میں مصری اپنے خاندان سمیت گاتے ہوئے آتے تھے، رخصت ہوتے وقت بھی وہ گاتے ہوئے ہی جاتے تھے۔

ترک بذاتِ خود گانے کے قائل تو نہیں مگر موسیقی ان کی روح کی غذا ہے۔ گھروں میں گانے بج رہے ہیں۔ ٹیکسیوں میں موسیقی کی آواز گونج رہی ہے۔ ریستورانوں میں موسیقی کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ عربی موسیقی میں بڑی نغمگی ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں تو سبھی عربی گانے ایک جیسے لگے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں ہوٹل کے دروازے پر اتارا۔ اور ہم اپنے دروازے کی جانب بڑھے۔ ہم نے چپکے سے کہا۔ ''انہیں ٹپ دینی چاہیے۔''

بٹ صاحب بول پڑے۔ ''اتنا جنٹلمین آدمی لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ برا مان جائے۔''

''برا کیوں مانے گا۔ ہے تو ٹیکسی ڈرائیور۔''

اتنی دیر میں ٹیکسی ڈرائیور ہاتھ سے ہمیں سلام کرتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

آئے بھی وہ گئے بھی وہ
ختم فسانہ ہوگیا

''بٹ صاحب!'' آپ بے وقت شعر نہ پڑھا کیجیے اور وہ بھی فلمی۔''

''بھئی بہت برمحل شعر ہے۔ مطلب یہ کہ ٹیکسی ڈرائیور چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹپ کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔''

ہم سب نے اپنا اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور ہوٹل کے اندر داخل ہوئے۔ عمارت تو پرانی تھی لیکن ٹیپ ٹاپ کرکے بالکل نیا بنالیا گیا تھا۔ استنبول اور ترکی کے دوسرے شہروں میں پرانی عمارتیں بہت ہیں لیکن انہیں مرمت اور تزئین کے بعد بالکل نیا بنالیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی میں کوئی عمارت پرانی نظر نہیں آتی حالانکہ یہ سیکڑوں سال پرانی ہیں۔ انہوں نے پرانی عمارتوں کو نیا بنا کر ان کا بہت اچھا استعمال کیا ہے۔ مثلاً استنبول میں ایک خوبصورت شاہراہ کا نام چراغاں اسٹریٹ ہے۔ سڑک کا نام چراغاں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اسی سڑک پر ایک پرانا شاندار تاریخی محل ہے۔ جس کا نام چراغاں پیلس ہے۔ اس محل کو ایک تاریخی ہوٹل میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ یہاں آرائش وہی پرانے محل جیسی شاندار اور شاہانہ ہے۔ وہی فرنیچر، وہی قالین، وہی پردے۔ لیکن اندر جاکر دیکھو تو لگتا ہی نہیں ہے کہ پرانا محل ہے۔ اس کا کرایہ بہت زیادہ ہے مالدار مقامی لوگ اور سیاح یہاں قیام کرتے ہیں لیکن یہ ہوٹل کسی وقت بھی خالی نہیں رہتا۔ بکنگ کے لیے کئی کئی روز تک کمرا خالی نہیں ہوتا۔

نگہداشت، صفائی، سلیقہ، تہذیب و اخلاق ان پر ختم ہے۔ انہیں دیکھ کر یقین آجاتا ہے کہ واقعی اس قوم نے آدھی دنیا کو فتح کرلیا تھا اور یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ان کے آگے سرنگوں تھیں۔ ترک ساری دنیا میں پھیل گئے تھے۔ جب یورپ اور دوسرے علاقوں کو چھوڑنا پڑا تب بھی ترکوں نے ہار نہیں مانی۔ آج کے ترکی کو دیکھ کو کوئی یقین نہیں کرسکتا کہ کبھی یہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا۔ اب ترکی اپنی حدود کے اندر ہے لیکن ایک باوقار، غیور اور بہادر قوم ہے جو ترقی میں بھی یورپ کے کئی ملکوں سے آگے ہے۔ ترکوں کی معیشت اس وقت دنیا میں دسویں نمبر پر ہے۔ آج بھی ترکی ایک بڑی طاقت ہے جو دنیا کے بڑے سے بڑے ملکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتا ہے۔ وہ نہ کسی سے ڈرتا ہے، نہ دبتا ہے۔ جو بھی اپنے ملک و قوم کے مفاد میں ہوتا ہے وہی کرتا ہے۔ ترکی اسی لیے ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک طرف یہ خوبیاں اور دوسری طرف قدرت کے حسن سے مالا مال ہے جسے انہوں نے اور زیادہ خوبصورت بنادیا ہے۔

ہوٹل کا لاؤنج کافی خوبصورت تھا۔ لیکن جب ریسپشن کی طرف نظر پڑی تو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ استقبالیہ پر ایک ادھیڑ عمر کے مگر صحت مند اور خوش شکل صاحب تشریف فرما تھے۔ ہم نے انہیں اپنے ویزے اور دوسرے کاغذات پیش کیے۔ انہوں نے ایک ایک فارم پُر کرنے کے لیے ہمارے حوالے کردیا۔ اسی وقت سیاحوں کا ایک

گروہ اندر داخل ہوا اور استقبالیہ پر ہلچل سی مچ گئی۔ اب انہیں بیک وقت سب کو بھگتنا پڑرہا تھا۔

ہم نے ازراہِ ہمدردی کہا۔ ''کیا آپ استقبالیہ پر تنہا سب سے ڈیل کرتے ہیں۔''

''نہیں، میرے ساتھ ایک اور مددگار ہیں۔ وہ ایک خاتون ہیں۔ ان کی ڈیوٹی علی الصباح سات بجے شروع ہوتی ہے۔ آج وہ چھٹی پر ہیں۔''

خاتون کا تذکرہ سنتے ہی بٹ صاحب کے کان کھڑے ہوگئے مگر بولے کچھ نہیں۔ انہوں نے کمروں کی چابیاں ہمارے حوالے کیں اور لوڈر ہمارا سامان ایک ٹرالی میں رکھ کر چل پڑا۔

ہمارے کمرے تیسری منزل پر تھے۔ ہوٹل بہت صاف ستھرا اور آراستہ تھا۔ کھڑکیوں سے سامنے کشادہ اور صاف سڑک نظر آتی تھی جس پر کاریں بسیں اور ٹرام رواں دواں تھیں۔

ہم سب نے اپنے اپنے کمروں کا انتخاب کیا۔ کافی دیر ہوچکی تھی۔ کافی پی کر اور تھوڑی بہت گپ شپ کرکے ہم سب نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا۔ تھکے ہوئے تھے اس لیے فوراً ہی سوگئے۔ ڈنر کی جگہ ہم نے سینڈوچ کھالیے تھے تاکہ صبح تک پیٹ میں چوہے نہ دوڑنے لگیں۔

صبح اٹھ کر تیار ہونے کے بعد ہم سب کا دستور تھا کہ ایک دوسرے سے فون پر بات کرکے ناشتے کے لیے ڈائننگ روم پہنچ جاتے تھے۔ حسبِ معمول ہم نے سب سے پہلے بٹ صاحب کو فون کیا کیونکہ وہ سب سے آخر میں تیار ہوکر اپنے کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔ کافی دیر تک فون کی گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ غسل خانے میں تشریف فرما ہوں گے کیونکہ ہوٹل کے کمرے کے ساتھ باتھ روم میں بھی فون کا ایکسٹینشن تھا۔ مایوس ہوکر ہم نے فون بند کردیا۔

خان صاحب کو فون کیا تو وہ بالکل تیار تھے۔

''بٹ صاحب آپ کے پاس ہیں کیا؟'' ہم نے پوچھا۔

''نہیں۔ ان کا تو کوئی فون بھی نہیں آیا۔''

''اچھا، آپ نیچے پہنچیے۔ ہم بٹ صاحب کو تلاش کرکے لاتے ہیں۔''

اس کے بعد مرزا مشرف کی باری تھی۔ وہ بالکل تیار ہوکر اخبار پڑھ رہے تھے۔ (استنبول سے انگریزی اخبار بھی شائع ہوتے ہیں)

ہم نے کہا۔ ''آپ تو اخبار پڑھ رہے ہیں اور بٹ صاحب کیا آپ کو ترجمہ کرکے بتارہے ہیں۔''

وہ بولے۔ ''میں نے صبح سات بجے بیڈ ٹی پی تھی۔ تیار ہونے کے بعد اخبار پڑھنے لگا۔ بٹ صاحب کا تو مجھے ٹیلی فون تک نہیں موصول ہوا۔''

خدایا! تو پھر بٹ صاحب کہاں چلے گئے۔

ہم نے دوبارہ خان صاحب کو فون کیا ''خان صاحب، بٹ صاحب کا کوئی پتا نہیں چل رہا۔ آخر وہ گئے کہاں۔ شاید سامنے کے باغ میں ٹہلنے چلے گئے ہوں گے۔''

خان صاحب ہنس پڑے۔ ''بٹ صاحب اور صبح سویرے باغ کی سیر کو جائیں اور وہ بھی تنہا۔''

''تو پھر کیا ہوا۔ کہیں کسی نے انہیں اغوا تو نہیں کرلیا؟''

خان صاحب پھر ہنسنے لگے۔ ''آفاقی صاحب، یہ پاکستان نہیں ترکی ہے۔ اور یہ شہر کراچی نہیں استنبول ہے۔ یہاں اغوا برائے تاوان کی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ البتہ اگر وہ خود اپنی مرضی سے کسی لڑکی کے ساتھ اغوا ہوگئے ہوں تو اور بات ہے۔''

ہم نے فون بند کردیا۔ اچانک خیال آیا کہ استقبالیہ سے تو دریافت کرنا چاہیے۔ استقبالیہ پر فون کیا۔ ایک بڑی سُریلی زنانہ آواز نے انگریزی میں کہا۔ ''گڈ مارننگ سر! میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟''

ہم نے کہا۔ ''ہمارے ایک ساتھی بٹ صاحب ہوٹل میں موجود نہیں ہیں۔ کیا وہ آپ کو اطلاع دے کر ہوٹل سے باہر گئے ہیں؟''

لڑکی ہنسی تو بقول بٹ صاحب کے جلترنگ سے بجنے لگے۔ ''سر، مسٹر بٹ تو میرے پاس بیٹھے ہیں۔''

''آپ کے پاس! کب آئے تھے؟''

جواب ملا۔ ''صبح سات بجے کے قریب آئے تھے۔''

''مگر وہ آپ کے پاس کیا کررہے ہیں!''

لڑکی پھر ہنسی، بولی۔ ''جی سر، وہ مجھے میری قسمت کا حال بتارہے ہیں۔ بہت دلچسپ اور قابل آدمی ہیں۔''

''آپ کی قسمت کا حال؟'' ہم نے حیران ہوکر کہا۔ ''کیا انہوں نے آپ کا زائچہ بنایا ہے؟''

''نہیں سر، وہ میرے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر

بتارہے ہیں۔"

اب پتا چلا کہ بٹ صاحب صبح سویرے کس مشن پر نکلے ہیں۔ ہم نے اپنے کمرے کو بند کرکے تالا لگایا اور تیزی سے نیچے لاؤنج میں پہنچے۔ دراصل ہم بٹ صاحب کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے تھے۔

لابی میں لفٹ سے باہر نکلے تو عجیب منظر نظر آیا۔ ایک خوش شکل اور خوش لباس لڑکی استقبالیہ کے نزدیک والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسی صوفے پر بٹ صاحب اس لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے اس کے ہاتھ کی لکیروں پر لکیریں کھینچ کر کچھ بتارہے تھے۔

ہم نے اچانک نزدیک پہنچ کر "ہیلو' السلام علیکم!" کہا تو دونوں چونک گئے۔ لڑکی نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

بٹ صاحب نے حسب معمول ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ارے آفاقی صاحب' مجھے بتائے بغیر ناشتے کے لیے آگئے؟" ہماری گفتگو اردو میں ہورہی تھی۔

"بتاتے کس کو' درودیوار کو۔ آپ تو صبح سویرے سے غائب ہیں۔"

"دراصل میں جلدی تیار ہوگیا تھا۔ سوچا ذرا گھوم پھر کر ہوٹل کا جائزہ لوں۔ لابی میں آیا تو یہ بے چاری لڑکی اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ اگلی فلائٹ کے مسافروں کی آمد تک وہ اکیلی بیٹھ کر انتظار کرے گی۔ اس لیے میں اس کے ساتھ بات چیت کرنے لگا۔ اس نے استنبول کے بارے میں بہت اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ ارے بھئی یہ تو پیدا ہی اس شہر میں ہوئی تھی......"

ہم نے ان کی بات کاٹ دی۔ "اتنی لمبی کہانی سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بتائیے کہ اس کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آپ بہت اچھے پامسٹ ہیں؟"

"بھئی یہ بڑے غور سے اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھ لیا کہ کیا آپ پامسٹری میں انٹرسٹ لیتی ہیں۔ اس نے کہا مجھے پامسٹری کے بارے میں جاننے کا شوق ہے مگر میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ کیا آپ جانتے ہیں۔"

"میں نے کہا تھوڑا تھوڑا۔ ایکسپرٹ نہیں ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔ ظاہر ہے وہ بھکارن تو تھی نہیں کہ مجھ سے بھیک مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلا رہی ہو۔ میں سمجھ گیا اور میں اس کو جو کچھ جانتا تھا اس کے مطابق بتانے لگا۔

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب آپ ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں کیا جانتے ہیں بس اتنا ہی نا کہ دل کی لکیر کون سی ہے۔ دماغ کی لکیر کون سی ہے۔ قسمت کی کون سی ہے۔ آپ نے یہ چند لکیروں کے بارے میں جاننے کے بعد پامسٹری کا دعویٰ کردیا اور پچھلے دو گھنٹے سے اس لڑکی کا ہاتھ تھامے اس کی قسمت کا حال بتارہے ہیں؟"

بٹ صاحب بولے "یار اب میری بے عزتی نہ کرادینا پردیس میں۔ وقت گزاری کے لیے یہ اچھا مشغلہ ہے۔"

لڑکی حیرت سے خاموش بیٹھی ہماری گفتگو سن رہی تھی مگر کچھ سمجھ نہیں رہی تھی۔

ہم نے اس کو انگریزی میں مخاطب کیا۔ "ہیلو مس......"

"غزالہ' میرا نام غزالہ سلیم ہے۔"

"اچھا تو آپ شادی شدہ ہیں؟"

وہ مسکرائی "آپ غلط سمجھے۔ سلیم میرے والد کا نام ہے۔"

"اوہ آئی ایم سوری! ہمارے دوست نے آپ کو جو بھی بتایا کیا وہ صحیح تھا؟"

"جی ہاں۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کا ساتھی ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کے کندھوں پر بہت ذمے داریاں ہیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ کتنے اچھے پامسٹ ہیں۔ اس کے بعد بھی انہوں نے بہت سی باتیں بتائیں جو درست تھیں۔"

"مثلاً؟"

"انہوں نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اس سال میری شادی ہوجائے گی۔" اس نے خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے کو جھکاتے ہوئے کہا۔

اسی وقت باقی دوست بھی آگئے۔

غزالہ صوفے سے اٹھ کر استقبالیہ پر واپس کھڑی ہوگئی اور سب کو مسکرا کر گڈ مارننگ کہا۔

ناشتے کے بعد ہم سب گھومنے پھرنے نکل گئے۔

"ٹیکسی نہ لے لیں۔" بٹ صاحب نے کہا۔

"بٹ صاحب، ہم یہاں گھومنے پھرنے کے لیے ٹیکسی میں یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر تو ہم استنبول آئے ہیں۔ اگر ٹیکسی میں بیٹھ کر ہی استنبول دیکھنا تھا تو نہیں دیکھ سکتے۔ ہم تصویروں اور فلموں میں دیکھ لیتے۔ اتنا پیسا خرچ کرکے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

بٹ صاحب بے چارے خاموش ہوگئے۔ جانتے تھے کہ اگر پھر کچھ بولیں گے تو ہم سب پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑجائیں گے۔

ہوٹل سے نکل کر ہم نے پیدل چراغاں اسٹریٹ کا رخ کیا۔ استنبول اس قدر خوبصورت اور صاف ستھرا شہر ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بس گھومتے ہی رہو۔ ہر موڑ کے بعد ایک نیا نظارہ آپ کا منتظر ہوتا ہے۔ خاک دھول اور مٹی نام کی کوئی چیز یہاں نہیں ہوتی۔ پختہ صاف ستھری کشادہ سڑکیں ہیں یا فٹ پاتھ اور سبزہ۔ ہم نے یہاں کوئی ٹوٹا ہوا فٹ پاتھ نہیں دیکھا۔ ہر سال ساڑھے چار لاکھ سے زیادہ سیاح استنبول آتے ہیں مگر کیا مجال جو کہیں کوڑے یا کاغذ کا کوئی ٹکڑا نظر آئے۔ صبح جب ہم ہوٹل سے نکلتے تھے تو سارا شہر اتنا صاف نظر آتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی کہ شاید کوئی جن یا بھوت صفائی کرگیا ہے۔ ہاں وردی پوش صفائی کرنے والے البتہ نظر آتے تھے جو لمبے لمبے کھرپے نما ڈنڈے صفائی کے لیے ساتھ لیے پھرتے تھے۔ جہاں کوئی کوڑا نظر آیا اسے اپنے کھرپے میں سمیٹا اور کوڑے دان میں ڈال دیا۔ کوڑے دان سڑکوں پر کافی تعداد میں نظر آتے ہیں تاکہ آپ کو فالتو چیزیں اپنے ساتھ لے کر نہ پھرنا پڑے۔

چراغاں اسٹریٹ ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہاں ہر وقت رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ خوبصورت مرد اور خواتین اسمارٹ ملبوسات میں آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ استنبول ہر اعتبار سے قدیم وجدید کا مجموعہ ہے۔ اردگان کی اسلامی حکومت کے دور میں بھی یہی رواج رہا۔ مغربی لباس، ترشے ہوئے بال' جینز اور بلاؤز پہنے خواتین بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور اسکارف' عبایہ پہنے خواتین بھی ان کے دوش بدوش چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ مرد بھی ہر لباس میں پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دیہاتی ترک بھی عباؤں اور قدیم ملبوسات میں لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے جبے پہنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

یہ منظر بہت تفصیل کے ساتھ ہم نے انقرہ جاتے ہوئے ریل گاڑی میں دیکھا تھا۔ دیہاتی خواتین اپنے برتن بھانڈے اور کپڑوں کی پوٹلیاں .... سمیٹ کر اپنے پاس رکھتی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنا قدیم دیہاتی کلچر آج بھی نہیں چھوڑا۔

چراغاں اسٹریٹ سے مغرب کی جانب ایک سڑک جاتی ہے۔ چراغاں اسٹریٹ باسفورس کے مغربی کنارے پر ہے اور یہاں سے آس پاس کا منظر بہت بھلا لگتا ہے۔ ہم لاہور والے .... جو دریائے راوی کے پانی سے بھی محروم ہوچکے ہیں سمندر کے مناظر کو دیکھ کر بہت خوش اور تازہ دم ہوجاتے ہیں۔

اس سڑک پر چلتے ہوئے معلوم ہوا کہ کسی زمانے میں یہ استنبول کی ایک منفرد آبادی تھی۔ جہاں ہر قوم اور مذہب کے لوگ رہتے تھے۔ یہ صحیح معنوں میں استنبول کا کاسموپولیٹن علاقہ تھا۔ یہاں بہت رونق اور گہما گہمی رہتی تھی۔ یہودی، یونانی، کرسچن، آرمینیا کے لوگ، غرضیکہ مختلف اقوام کے لوگ یہاں مسلمان اکثریت کے ساتھ بہت آرام اور سکون سے رہتے تھے۔ مسلمان ہمیشہ سے کشادہ دل اور غیر متعصب ہیں۔ یہ ان سب کے ساتھ بہت پیار محبت سے گھل مل کر رہتے تھے۔ بعد میں یہ غیر ملکی رفتہ رفتہ استنبول سے رخصت ہوگئے۔ اب تو چند غیر ملکی ہی رہ گئے ہیں۔ مثلاً ایک تمباکو کی چھوٹی سی دکان میں ایک سفید بالوں والی بڑی بی بیٹھی نظر آئیں۔

بٹ صاحب کو یہ منظر اچھا نہیں لگا۔ کہنے لگے۔ "جوان اور خوبصورت لوگ تو رخصت ہوگئے۔ ہمارے لیے دادی اماں کو چھوڑ گئے۔"

یہ خاتون اس وقت کوئی معما حل کررہی تھیں۔ ہم اس زمانے میں سگار اور پائپ پیا کرتے تھے۔ پیا کیا کرتے تھے دراصل پھونکا کرتے تھے۔ تمباکو نوشی کے ہم بھی عادی نہیں ہوئے۔ دراصل پائپ کے تمباکو کو آئرن مور کی خوشبو نے ہمیں پائپ نوشی کی طرف مائل کیا تھا۔ پھر فلموں میں اداکاروں کو سگار پیتے ہوئے دیکھا تو محسوس ہوا کہ اس سے شخصیت بارعب ہوجاتی ہے۔ شخصیت تو کیا بارعب ہوتی لیکن سگار نوشی کرنے لگے۔

ہم نے پاس جاکر کہا۔ "ایکسکیوزمی میڈم!"

انہوں نے نگاہ اٹھا کر بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔ بدستور معما حل کرنے میں مصروف رہیں۔ اچانک ان کی نظریں معمے سے ہٹیں تو ہم لوگ انہیں نظر آگئے۔ انہوں نے فوراً میز پر سے آلہ سماعت اٹھایا اور اپنے کان میں لگالیا۔ پھر مسکرا کر پوچھا۔ "یس ینگ مین! وہاٹ آئی کین

ڈوفاریو۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ کے پاس آرین مور تمبا کو ہوگا؟“

”آرن مور۔ آرن مور۔“ انہوں نے دو تین بار دوہرایا۔ پھر دکان کے اندر چلی گئیں۔ ان کی دکان کون سی بڑی تھی۔ اندر رکھا ہوا سامان باہر سے بھی نظر آتا تھا۔ مگر بڑی بی کی کچھ مشکلات تھیں۔ وہ غالباً قریب دیکھنے کے لیے دو عینکیں استعمال کرتی تھی۔ ایک نزدیک دیکھنے کے لیے اور دوسری زیادہ قریب دیکھنے کے لیے۔ انہوں نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھی اور ایک اور عینک لگا کر آرن مور کا ڈبا تلاش کرنا شروع کردیا۔ دوسری عینک لگانے کے باوجود انہیں ہر چیز کو اٹھا کر بہت قریب سے دیکھنا پڑتا تھا۔ ہمارے جی میں آئی کہ انہیں محدب شیشہ استعمال کرنے کا مشورہ دیں مگر پھر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس چھوٹی سی دکان میں تمباکو کا ایک ڈبا ڈھونڈنے میں انہوں نے پندرہ بیس منٹ صرف کردیے مگر آرن مور نہیں ملا۔ انہوں نے دوسری عینک اتار کر پہلی عینک لگائی اور ہمیں بتایا کہ آرن مور ختم ہو چکا ہے اگر کوئی دوسرا تمبا کو چاہیں تو پیش کروں۔

ہم نے معذرت کی اور شکریہ ادا کرکے آگے بڑھ گئے۔ اس دوران میں ہمارے ساتھی ہمیں برا بھلا کہتے رہے کہ خوامخواہ ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے۔

اس علاقے کا نام اورتا کوئے تھا۔ شاید ترکی زبان کا کوئی لفظ تھا۔ ان بڑی بی کے سوا اس کاسموپولیٹن علاقے میں کوئی غیر ملکی نظر نہیں آیا۔ آگے بڑھے تو ایک قدیم گرجا نظر آیا۔ بتایا گیا کہ یہ آرتھوڈاکس چرچ کے نام سے مشہور ہے۔ گرجا سے تھوڑے فاصلے پر مسجد یا مسجد کی خوبصورت عمارت ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مسجد 19 ویں صدی میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی عمارت بہت خوبصورت ہے۔ بٹ صاحب نے فوراً کیمرا نکال کر اس کی چند تصاویر بنائیں۔

اچانک گھرے بادل گھر آئے اور بہت تیز بارش شروع ہوگئی۔ کچھ احتیاط پسند لوگوں نے تو سایہ دار جگہیں تلاش کرکے ان کے نیچے پناہ لے لی لیکن سیاحوں کی اکثریت کے لیے یہ ایک اضافی لطف تھا۔ انہوں نے ساحل پر واقع ریستورانوں کا رخ کیا۔ چائے، کافی شراب کا کاغذی گلاس ہر ایک کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔

یہ ریستوران ترکی کھانوں کے لیے مشہور ہیں۔ منور مرزا نے مشورہ دیا کہ ہمیں ”لوکوم“ ضرور کھانا چاہیے۔

”لوکوم، کیا ہوتا ہے؟“ بٹ صاحب نے دریافت کیا۔

”یہ ترکی کی ایک مخصوص ڈش ہے۔ گوشت کو مٹھاس میں پکایا جاتا ہے۔ قہوے کے ساتھ اس کا لطف بڑھ جاتا ہے۔“

”میٹھا گوشت۔“ خان صاحب کو بہت حیرت ہوئی۔ ”نہ تو ایسی ڈش کے بارے میں کچھ پتا ہے اور نہ ہی کبھی چکھا ہے۔“

”تو پھر آج چکھ کر دیکھ لیجیے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک طاقتور غذا بھی ہے۔“

تو پھر میں تو ضرور چکھوں گا۔ سفر کرکر کے بہت کمزور ہوگیا ہوں۔ مجھے توانائی کی ضرورت ہے۔“

”بٹ صاحب، دیکھنے میں تو لگتا ہے کہ آپ کا وزن بڑھ گیا ہے۔“

”بھائی یہ تو ہوا ہے۔ وزن کروگے تو معلوم ہوجائے گا کہ وزن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا کیونکہ ہوا کا تو کوئی وزن ہی نہیں ہوتا۔“

ان ریستورانوں میں مختلف قسم کے ترکی کھانے بھی تھے۔ مختلف قسم کے کباب، پھلوں کے جوس، راکھ میں بھونے ہوئے بینگن (یہ یہاں کی خاص ڈش ہے) ثابت بینگن کو تراش کر اس کا کچھ گودا نکال کر اس کی جگہ قیمہ یا دوسری اشیا بھر دی جاتی ہیں اور پھر بینگن کو راکھ میں رکھ کر بھونا جاتا ہے۔ اس کو بھوبھل میں بھوننا بھی کہا جاتا ہے۔ اس جگہ ریستورانوں میں ہر قسم کے ترکی کھانے ملتے ہیں جو شاید عام ریستورانوں میں دستیاب نہ ہوں۔ یہاں بیٹھ کر نہ صرف باسفورس کا خوبصورت منظر نظر آتا ہے بلکہ باسفورس کا شاندار پل بھی اس منظر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔

چراغاں اسٹریٹ پر آگے چل کر بلویز پارک ہے۔ یہ بہت وسیع اور کشادہ باغ ہے جس میں نہایت خوبصورتی سے پھولوں کے تختے بنائے گئے ہیں جس کی وجہ سے باغ ایک گلدستہ معلوم ہوتا ہے۔ پارک میں صفائی دیکھنے کے قابل ہے۔ ہر طرف رنگوں کی بہار نظر آتی ہے۔ یہ باغ ہمارے اسلام آباد کے شکر پڑیاں سے ملتا جلتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ شکر پڑیاں ایک اونچائی پر ہے جہاں سے اسلام آباد کا تمام تر حسن اور رعنائیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اسلام آباد کو اگر مکمل رعنائی کے ساتھ دیکھنا ہے تو شکر پڑیاں اس کے لیے بہترین مقام ہے۔

اس کی اگلی منزل نطاشی اسٹریٹ تھی۔ ہوٹل کے

بروشر میں بتایا گیا تھا کہ یہ بھی سیاحوں کے لیے ایک بہت دلکش مقام ہے۔

بٹ صاحب نے اب ہینڈز اپ کردیے تھے اور فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ گئے تھے۔

”کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جی، ٹھیک ہے مگر میری ٹانگوں نے جواب دے دیا۔“

”آپ نے کیا سوال کیا تھا اپنی ٹانگوں سے؟“

”مذاق نہ کرو، میں تھک گیا ہوں۔ اب میں ایک قدم بھی پیدل نہیں چلوں گا۔“

خان صاحب بولے۔ ”ایسی صورت میں دو باتیں ہوں گی۔ یا آپ کو ہم یہیں چھوڑ جائیں گے یا پولیس کو فون کردیں گے۔“

”پولیس کو فون کیوں کریں گے؟“

”ہم انہیں اطلاع دیں گے کہ ایک سیاح راستہ بھول گیا ہے اور فٹ پاتھ پر بیٹھا ہے۔ ایسی صورت میں دو باتیں ہوں گی۔ یا تو پولیس آپ کو ہوٹل پہنچا دے گی یا پھر حراست میں لے کر آوارہ گردی کے الزام میں حوالات میں بند کردے گی۔ ایسی صورت میں دو باتیں ہوں گی۔

”بس بس۔ اپنی تقریر بند کیجیے۔ مجھے صورتوں کی نہیں ٹیکسی کی ضرورت ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب آپ ماشاءاللہ ہٹے کٹے، صحت مند سرخ و سفید رنگت کے کشمیری ہیں اور تھوڑا سا پیدل نہیں چل سکتے؟“

”تھوڑا نہیں میں بہت زیادہ پیدل چل سکتا ہوں۔ میں یہاں سے پاکستان تک پیدل جاسکتا ہوں۔ مگر یہ تو سوچیے کہ یہاں ہم سیاح ہیں۔ سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں۔ پیدل چلنے یا جوگنگ کرنے نہیں آئے۔ فقیروں کی طرح استنبول کی سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔“

”مگر بٹ صاحب، نشان تماشی یا جو بھی نام ہے وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

اگر وہ دو قدم پر بھی ہے تو میں وہاں پیدل نہیں جاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

مرزا اشرف کافی دیر سے خاموش تھے، کہنے لگے۔ ”انہوں نے تو اپنا آخری فیصلہ سنا دیا ہے۔“

مجبوراً ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔ سامنے سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارہ کرکے روکا۔ ٹیکسی والا تیس بتیس سال کی عمر کا نوجوان ترک تھا۔ ہر اعتبار سے وہ ترک نظر آتا تھا۔ سرخ و سفید رنگت، بھورے بال، نیلی آنکھیں، بھورے رنگ کی مونچھیں۔ انتہائی خوش لباس۔

وہ ٹیکسی روک کر کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ ہم بتائیں کہ جانا کہاں ہے۔ ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں میں یہ دستور ہے کہ اگر آپ ٹیکسی میں سوار ہوکر کہیں جانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ٹیکسی والے کو بتاتے ہیں کہ کہاں جانا ہے اور ٹیکسی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی طرح ایسا نہیں ہوتا کہ ٹیکسی ڈرائیور کوئی عذر کرکے آپ کو ٹیکسی میں نہ بٹھائے۔ ہمارے ہاں تو ٹیکسی اور رکشا والے ہاتھ کے اشارے سے ”نہیں“ کہہ کر چلے جاتے ہیں۔ یا پھر کہتے ہیں کہ اس طرف نہیں جانا۔ یا پھر یہ کہ میں تو گھر جارہا ہوں۔ آپ کوئی دوسرا بندوبست کرلیجیے۔

خان صاحب نے ہم سے کہا۔ ”ٹیکسی ڈرائیور کو بتاؤ کہ ہمیں کہاں جانا ہے؟“

ہمیں خاموش دیکھ کر اس نے ترکی میں شاید پوچھا کہ کہاں جانا ہے۔ وہ ہمیں بھی ترک ہی سمجھ رہا تھا۔

ہم اچانک نشان تماشی کا نام بھول گئے مگر خان صاحب نے یاد دلاکر ہماری مشکل آسان کردی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سر کے اشارے سے ہم لوگوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ اسٹریٹ واقعی نزدیک ہی تھی اور خاصی لمبی تھی۔ اس لیے ٹیکسی ڈرائیور نے ایک جگہ ہماری زبان سے ”عام“ سن کر بے حد خوشی کا اظہار کیا کیونکہ یہ ترکی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور اب تک یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم لوگ ترک ہیں اس لیے بے تکان ترکی میں باتیں کرتا رہا تھا مگر ہمارا معاملہ یہ تھا ”زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم“ (یہ جو میرے محبوب کی زبان ترکی ہے مگر بدقسمتی سے میں ترکی نہیں جانتا)

جب ہم نے اسے بتایا کہ پاکستانی ہیں تو اس کی خوشی دوچند ہوگئی۔ اس نے فوراً ٹیکسی سے باہر نکل کر ہم سب کو السلام علیکم مرحبا کہا۔ سب سے دو دو بار ہاتھ ملایا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے پر پھیرا۔

”کاردوش“ اس نے بہت محبت بھرے لہجے میں کہا۔

ہم نے ترکی کے جو چند الفاظ سیکھے تھے ان میں ایک ”کاردوش“ بھی تھا۔ کاردوش کا مطلب ہے عزیز ترین دوست۔

وہ اس طرح رخصت ہوا کہ لگ رہا تھا کہ وہ کچھ وقت ہم لوگوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ ہم اس کے جانے کے بعد بھی ہاتھ ہلاتے رہے اور وہ بھی ہاتھ ہلاتا ہوا رخصت ہوا۔

بٹ صاحب بولے ”یہ تو اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ میں سمجھا کہ شاید کرائے کے پیسے ہمیں لوٹا دے گا۔“

خان صاحب نے کہا۔ ”بٹ صاحب وہ کاروباری ہے۔ بیوقوف نہیں ہے۔“

بٹ صاحب بھلا کہاں ماننے والے تھے۔ بولے۔ ”اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو ہرگز کرایہ نہ لیتا۔“

مرزا مشرف نے کہا۔ ”بٹ صاحب، ہمارا کرایہ بھی کتنا تھا۔ اتنا کم کرایہ واپس کرتے ہوئے وہ اچھا لگتا۔ پھر ہم نے کون سی وضع داری دکھائی۔ ٹپ تک تو اس کو دی نہیں۔“

بٹ صاحب کچھ قائل ہوگئے تھے۔ کہنے لگے ”اور دیکھو، ہم نے اس کا نام تک نہیں پوچھا۔“

کیا نام پوچھ کر آپ اس کو خط لکھ دیتے اور آپ نے آج تک ہر ملک اور ہر شہر میں ہزاروں لڑکیوں کے نام پوچھ رکھے ہیں۔ کیا وہ سب نام آپ کو یاد ہیں؟“

”اس طرح معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔“ بٹ صاحب نے دلیل پیش کی۔

”تو پھر آپ ڈکشنری یا تاریخ کی کتابوں میں نام دیکھ کر یاد کرلیا کیجیے۔“

”ایسا نہ کہیے۔ مجھے مغلیہ بادشاہوں کے نام یاد ہیں۔“

ہم نے تنگ آکر کہا۔ ”مہربانی سے یہ بحث ختم ہی کردیجیے۔ آخر ان بے کار باتوں کا فائدہ کیا ہے؟“

”علم میں اضافہ ہوتا ہے۔“ بٹ صاحب اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ ”اور پھر ذہنی ورزش بھی ہوجاتی ہے۔“

استنبول اور ترکی کے دوسرے شہروں میں، ہم نے یہ تبدیلی دیکھی کہ دکانوں کے سائن بورڈ اور سڑکوں کے نام ترکی کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھے ہوئے تھے۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ اب ترک تعلیم یافتہ ہوگئے ہیں مگر ترک ہمیشہ سے پڑھے لکھے ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے حکومت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ حکم نامہ جاری کردیا کہ ترکوں کو تعلیم دی جائے۔ اتاترک بذاتِ خود وقت نکال کر دیہات میں بلیک بورڈ اور چاک لے کر جاتا تھا اور سب کو پڑھاتا تھا۔“

”مگر یہ انگریزی تو جانتے نہیں ہیں۔ انہیں پڑھانے کا فائدہ کیا ہوا؟“

”یہ جہالت صرف ہمارے ملک میں ہے کہ جو انگریزی نہیں جانتا وہ اَن پڑھ ہے۔ ہر قوم اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرتی ہے اور ترقی کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ فرانس، جرمنی، اٹلی، یہاں تک کہ تھائی لینڈ اور سری لنکا میں کتنے لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ ہر قوم اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کرتی ہے اسی لیے ترقی بھی کرتی ہے۔ روس نے ایٹم بم بنالیا۔ ہوائی جہاز بنالیے حالانکہ وہ انگریزی نہیں جانتے۔ چین اور جاپان نے کتنی ترقی کرلی ہے مگر انگریزی نہیں جانتے۔ قومی زبان ہی ہر قوم کی پہچان ہوتی ہے۔“

”یار تم نے تو شرمندہ ہی کردیا۔“ بٹ صاحب واقعی لاجواب ہوگئے تھے۔ ”اب دیکھ لو ایران نے کتنی ترقی کرلی ہے۔ وہ لوگ بھی انگریزی نہیں جانتے۔ اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور انگریزی جانے بغیر ہی ایک بڑی طاقت بن گئے ہیں۔“

بھئی مان گئے، مان گئے۔ سوری، معاف کردو۔ تم نے تو مجھے انگریزی سے نفرت ہی دلادی ہے۔ اب میں انگریزی کتابیں ردی میں ڈال دوں گا۔“

”بٹ صاحب، واقعی بیوقوف ہونے کے لیے بٹ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ ارے بھئی انگریزی دنیا بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ترکوں نے بھی انگریزی کا استعمال اب اسی لیے شروع کیا ہے کہ اب یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ دنیا بھر سے انہیں کاروبار کرنا پڑتا ہے۔ ساری دنیا ترکی نہیں جانتی۔ اسی لیے اب یہ انگریزی بھی سیکھ رہے ہیں۔“

بٹ صاحب تنگ آگئے۔ ”بس کرو بھائی۔ تم نے تو لیکچر ہی شروع کردیا۔ اگر تعلیم دینی ہے تو ہوٹل چل کر کلاس شروع کردینا۔“

اگر بٹ صاحب ہار مان لیں یا قائل ہوجائیں تو سمجھیے کہ امن وامان قائم ہوگیا۔

ہم نے سڑک پر گھومنا شروع کردیا۔

”یہ ہم کیا کررہے ہیں۔“ بٹ صاحب نے پوچھا۔

”دیکھ نہیں رہے کہ ہم سیر کررہے ہیں کیونکہ ہم سیاح ہیں۔“

یہ جگہ بھی استنبول کی دوسری سڑکوں کی طرح بارونق اور خوبصورت ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھاس کے تختوں میں مختلف رنگوں کے پھول مسکرا رہے تھے۔ جابجا سرسبز درخت تھے جنہیں مختلف شکلوں میں تراشا گیا تھا۔ سڑک کے ایک جانب دکانیں اور شاپنگ سینٹر تھے جن میں سیاحوں اور مقامی خریداروں کا ہجوم تھا۔ لوگ باہر سے اندر اور اندر سے باہر جاتے ہوئے یوں لگ رہے تھے جیسے یہ عمارتیں انسانوں کو اگل رہی ہیں یا نگل رہی ہیں۔

یہ دولت مندوں کا علاقہ ہے جسے انگریزی میں ”پوش“ کہتے ہیں۔

خان صاحب کو لفظ Posh بہت برا لگتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ”پوش“ علاقہ سن کر یوں لگتا ہے جیسے پاپوش۔ ہمارے کراچی میں تو ایک پاپوش نگر بھی ہے مگر وہاں موچی نہیں رہتے۔ خدا جانے اس اچھے بھلے علاقے کو پاپوش نگر کیوں کہتے ہیں۔ وہاں تو جوتوں کی دکانیں بھی نہیں ہیں۔

دراصل موسم اچھا تھا۔ فضا میں دلکشی تھی اور یہ سب کچھ دیکھ کر دل بہت خوش ہو رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں زیادہ تر خواتین جینز اور قمیص یا بلاؤز میں ملبوس تھیں۔ مرد پتلون کوٹ میں لپٹے ہوئے تھے۔ یہ طیب اردگان کے برسراقتدار آنے سے پہلے کا تذکرہ ہے۔ اس وقت ترکی میں اسلام کی لہر تو شروع ہوگئی تھی مگر اس کے اظہار پر سیکولر ملک ہونے کی وجہ سے پابندیاں تھیں۔ پھر بھی حجاب اور عبا پہنے خواتین نظر آجاتی تھیں۔ حکومت نے اسکولوں میں تو لڑکیوں کے حجاب پہننے پر پابندی لگادی تھی مگر عام زندگی میں ایسی پابندیاں نہیں تھیں۔ کام کرنے والی عورتوں اور طالبات کا لباس عموماً جینز، جیکٹ ہی نظر آیا۔ ہم نے کئی عورتوں کو سگریٹ نوشی کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ مگر یہ بات عام نہیں، فیشن زدہ علاقوں میں عورتیں سگریٹ نوشی کرتی نظر آتی ہیں۔

ایک جگہ ایک نسبتاً پتلی، گلی نما سڑک دائیں ہاتھ کو نظر آئی۔

”کیا یہ بھی کوئی بازار ہے یا ریستورانوں کا مرکز ہے؟“

مرزا صاحب بولے۔ ”اس گلی میں یوں تو کئی قسم کی دکانیں ہیں مگر زیادہ نوادرات کی ہیں۔“

خان صاحب نے کہا۔ ”چلیں، ذرا ترکی کے نوادرات بھی دیکھ لیں۔“

مرزا مشرف نے فوراً متنبہ کیا کہ اول تو یہاں قابلِ قدر نوادرات نہیں ملتے۔ بلکہ یہ بھی سنا ہے کہ بہت سی پرانی چیزوں کو یہ نوادرات کہہ کر فروخت کردیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مول تول بہت کرنا پڑتا ہے۔ یہ دکاندار سیاحوں سے بہت زیادہ قیمتیں وصول کرتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”مرزا صاحب ایک قیمتی اور نادر چیز تو ہمارے پاس بھی ہے۔ موقع ملا تو ادل بدل کرسکتے ہیں۔“

بٹ صاحب فوراً بول پڑے۔ ”آپ کا اشارہ میری طرف ہے میں سمجھ گیا۔“

”آپ اتنے سمجھدار کب سے ہوگئے؟“

”کیا عرض کروں۔ آپ جیسے بزرگوں کی صحبت کا اثر ہے۔“ انہوں نے بہت انکساری سے کہا۔

”شاباش! بزرگوں کی عزت کروگے تو دنیا میں بہت ترقی کروگے۔“ خان صاحب نے مشورہ دیا۔

یہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اس پر یک طرفہ ٹریفک تھا۔ ایک جانب کاریں پارک کی جاتی تھیں مگر بہت نظم وضبط اور سلیقے کے ساتھ۔ ہم جب پہلی مرتبہ یورپ گئے تو یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ کاریں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی کھڑی تھیں۔ اب کاروں کے درمیان میں مشکل سے چھ انچ کا فاصلہ ہوگا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اس قدر نزدیک کاریں کھڑی کیوں کی جاتی ہیں اور انہیں قطار سے باہر کیسے نکالا جاتا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک کار آئی۔ کار پہلے کھڑی ہوئی کار کے متوازی آگے گئی پھر ڈرائیور نے اس کو بیک اس طرح کیا کہ کار اتنی کم جگہ میں فٹ آگئی۔

ہم اس ہنرمندی پر حیران رہ گئے۔ ایک انگلستان میں رہنے والے دوست سے ذکر کیا تو وہ ہنسنے لگے اور کہا۔ ”آفاقی صاحب، اگر تھوڑی سی بھی مشق ہو تو آپ بھی اس طرح کار پارک کرسکتے ہیں۔ بس ایک معمولی سی ترکیب استعمال کرنی پڑتی ہے۔“

”اچھا، اب وہ ترکیب بھی بتادو۔“

انہوں نے کہا۔ ”پہلے آپ اپنی کار کو کھڑی ہوئی پارک کے متوازی کرکے آگے کیجیے۔ جب دونوں کاریں برابر ہوجائیں تو اپنی کار کو ریورس کیجیے مگر اس طرح کہ جب آپ کی کار کا بونٹ پہلے سے کھڑی ہوئی کار کی ڈرائیونگ سیٹ تک پہنچ جائے تو پھر اس کو آہستہ آہستہ خالی جگہ کی طرف موڑتے ہوئے ریورس کیجیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی کار قطار میں سامنے اور پیچھے کھڑی ہوئی کار کے درمیان میں

بالکل سیدھی کھڑی ہوجائے گی۔"

ہم نے یورپ میں تو یہ ترکیب نہیں آزمائی مگر جب پاکستان آئے تو ڈرتے ڈرتے دو کاروں کے درمیان میں خالی جگہ پر اپنی کار پارک کرنے کے لیے وہی ترکیب استعمال کی۔ ہم خود حیران رہ گئے کہ ہم نے کار بالکل صحیح پارک کی تھی۔ دراصل جو قومیں ڈسپلن کی عادی ہوتی ہیں وہی ایسے تجربے کرتی ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جس نے جہاں چاہا جس طرح چاہا کار پارک کردی۔ نہ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ کوئی بتانے والا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس جگہ بہت زیادہ رش ہوتا ہے وہاں لوگ اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس طرح کار پارک کرتے ہیں کہ پہلے کھڑی ہوئی کار کے اور اپنی کار کے درمیان میں اتنا فاصلہ بھی نہیں چھوڑتے کہ کوئی دوسرا شخص اپنی کار وہاں پارک کرسکے۔

آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ یہ عجیب وغریب قسم کا سیاح ہے۔ جب موقع ملتا ہے لیکچر شروع کردیتا ہے مگر ہمارے خیال میں جو کوئی سیاحت کے لیے ملک سے باہر جاتا ہے اس کو وہاں، کے اچھے طور طریقے بھی دیکھنے اور اپنانے چاہئیں ورنہ سیاحت کا فائدہ کیا؟ یہی نا کہ چند ملکوں کی سیر کرلی۔ کھایا پیا ان کی خوبیوں کی تعریف کی مگر جب واپس اپنے ملک میں آئے تو ویسے کے ویسے ہی بے ربط اور بد نظم رہے۔

جب ہم اس طرف گئے جہاں سے فیری سروس چلتی ہے تو وہاں سیاحوں کا ہجوم تھا۔ کچھ ریستورانوں کے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ فٹ پاتھ پر بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ جو لوگ تنہا تھے وہ کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔ چند خواتین (جو الگ الگ تھیں) فٹ پاتھ پر بیٹھی خط لکھ رہی تھیں۔ کوئی آئس کریم کھا رہا تھا۔ کوئی کافی کا گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ کوئی کباب خرید کر لایا تھا اور بیٹھا کھا رہا تھا۔ ساتھ ہی تماشا بھی دیکھتا جاتا تھا۔ بہت ہی عجیب اور انوکھا سا ماحول تھا۔ ایک بار پیرس میں اسپینش اسٹیپس دیکھنے گئے تو کچھ ایسا ہی ماحول نظر آیا۔ یہ جگہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی پیرس جائے اور اسپینش اسٹیپس نہ دیکھے۔ پہلی بار ہم نے فلم "رومن ہالی ڈے" میں ہیرو اور ہیروئن کو ان سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ فلم میں یہ منظر بہت خوبصورت لگا۔

پیرس جاکر ہم نے فلم یونٹ کے ساتھیوں کے ساتھ بس میں سوار ہوکر اسپینش اسٹیپس جانے کو دوسرے کاموں پر ترجیح دی۔ ماحول تقریباً وہی تھا جو بیان کرچکے ہیں۔ ہم بذاتِ خود اسپینش اسٹیپس کی سیڑھیوں پر چڑھنا چاہتے تھے۔

یہ سیڑھیاں جو فلم میں بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں پتھروں کی بنی ہوئی سادہ سی سیڑھیاں تھیں اور کافی کشادہ تھیں۔ ان سیڑھیوں پر سے سیاحوں کا ہجوم اوپر چڑھتا اور نیچے اترتا ہوا نظر آرہا تھا۔

ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ سامنے سے تو کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ ان سیڑھیوں کے اوپر کیا ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر کوئی دلکش نظارہ دیکھنے کی امید میں اوپر گئے تو دیکھا کہ سیڑھیوں کے اوپر ایک سڑک تھی اور کچھ نہ تھا۔ بہت مایوسی ہوئی۔

دیکھیے اگر آپ نے مختلف ملکوں کی سیاحت کی ہو تو ہر جگہ کی بعض چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ جب آپ اپنے ملک میں یا کسی دوسرے ملک میں بیٹھ کر یاد کرتے ہیں تو مختلف شہروں کے مختلف خوبصورت مقامات فلم کی طرح آپ کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ بہت سے لوگ یاد آتے ہیں جو اتفاقاً کچھ دیر کے لیے آپ سے ملے تھے مگر ان کی بعض خوبیوں یا عادتوں کی وجہ سے آپ انہیں کبھی بھلا نہیں سکے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ہدایت کی ہے کہ دنیا دیکھو۔ قدرت کے کرشمے دیکھو اور غور کرو۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت واقعی قابلِ قدر ہے۔ اگر دنیا کو نہیں دیکھیں گے تو قدرت کی بہت سی کاری گریاں دیکھنے سے محروم رہ جائیں گے۔

ترکی کے ذکر سے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ تذکرہ یہ تھا کہ ہم نوادرات کی دکانوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دکان پر ایک چھوٹے سے قالین کے بارے میں پوچھا۔ دکاندار تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا کیونکہ سیاحوں سے واسطہ پڑتا رہتا۔

دکاندار نے اس کی اتنی زیادہ قیمت بتائی کہ ہم حیران رہ گئے۔

"اتنا چھوٹا سا پرانا قالین اور اتنا مہنگا؟"

"یہ قالین معمولی قالین نہیں ہے؟"

"کیا یہ ہوا میں اُڑتا ہے؟"

"نہیں یہ تاریخی قالین ہے جو سلطان یلدرم کے بیڈروم میں بچھا ہوا تھا۔"

"مگر ہر ایک کو یہ پرانا قالین دیکھ کر کیسے پتا چلے گا کہ یہ سلطان یلدرم کے بیڈروم کی زینت تھا۔"

دکاندار نے جواب دیا۔ "دیکھیے محترم، یہ تو آپ کسی بھی نادر چیز کے بارے میں ہر ایک کو نہیں بتا سکتے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اس پر لکھ کر لگا دیں۔"

"پھر بھی پڑھنے والے کو یہ کیسے یقین آئے گا کہ جو ہم نے لکھا ہے وہ درست ہے۔ اس کی کوئی سند یا ثبوت تو ہونا چاہیے۔"

"سر آپ کوئی پروفیسر یا فلسفی تو نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"آپ نے کبھی نوادرات خریدے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"پھر تو ہم دونوں نے بیکار ہی اپنا وقت ضائع کیا۔" دکاندار نے ہماری طرف سے منہ موڑلیا اور چیزوں کو سجانے لگا۔

"یہ تو آپ سے ناراض ہوگیا۔"

"اگر خوش ہوتا ہمیں کون سا فائدہ ہوجاتا۔"

کچھ آگے چلے تو ایک دکان پر ایک انگریزی اور ترکی سائن بورڈ لکھا ہوا نظر آیا۔

"تاش کے پتوں کی مدد سے قسمت کا حال جانیے۔"

"صرف دو ورڈ الر میں۔"

ہم لوگ یہ سائن بورڈ دیکھ کر رک گئے۔

"بیٹے! جنوں کو قابو کرنے والا عامل اور قسمت کا حال بتانے والا بنگالی بابا یہاں بھی آگیا۔"

ہم نے کہا۔ "بنگالی بابا کے پاس تو کبھی نہیں گئے۔ ان کے پاس چل کر دیکھتے ہیں۔"

بٹ صاحب رضامند نہیں تھے مگر دوسرے سب لوگ یہ تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ ہم لوگ دکان کے اندر چلے گئے۔ چھوٹی سی دکان تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے دو حصے ہیں ایک بیرونی اور دوسرا اندرونی، دکان میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف ایک مندروں جیسی چھوٹی سی گھنٹی لٹکی ہوئی تھی، ہم نے ڈرتے ڈرتے گھنٹی بجائی تو اس کی آواز ساری دکان میں گونجنے لگی۔

سامنے والا دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے ایک موٹی سی ادھیڑ عمر خاتون برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ایک لمبا سا فراک پہنا ہوا تھا۔

ہم سب کو دیکھ کر وہ مسکرائیں کہ اتنے بہت سے گاہک ایک ساتھ آگئے ہیں۔ انہوں نے ایک عجیب سی زبان میں ایک فقرہ کہا جو ہم میں سے کوئی نہیں سمجھا۔ بہت سوچا پھر اندازہ ہوا کہ وہ ہسپانوی زبان بول رہی ہیں۔

ہم نے کہا "اسپیک انگلش؟"

انہوں نے اچھی خاصی انگریزی میں بتایا کہ وہ بہت اچھی انگریزی جانتی ہیں۔ 25 سال سے ترکی میں رہتی ہیں اس لیے ترکی بھی جانتی ہیں۔"

پھر بولیں۔ "ہاں تو کون اپنی قسمت کا حال جاننا چاہتا ہے؟"

ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر بٹ صاحب نے فوراً ہماری طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے کہا۔ "آپ سب لوگ اسی جگہ ٹھہریں۔ یہ عمل صرف اکیلے میں ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے اندر چلے گئے۔

یہ ایک مختصری جگہ تھی۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی میں وہ خاتون سما گئیں اور سامنے والی کرسی پر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اب غور سے سنو۔" انہوں نے ہمیں مخاطب کیا پھر میز کی دراز میں سے تاشوں کی ایک موٹی سی گڈی نکالی اور ہمارے سامنے میز پر رکھ دی۔

"ان پتوں کو اٹھا کر تین بار پھینٹو اور پھر ان میں سے تین پتے نکال کر مجھے دے دو۔"

ہم نے ان کے کہنے کے مطابق میز پر سے تاش کے پتوں کی موٹی سی گڈی اٹھا کر تین بار پتوں کو پھینٹا اور پھر ان میں سے تین پتے نکال کر میز پر ان کے سامنے رکھ دیے۔ ہمیں یاد ہے کہ ان میں ایک پان کا اِکا تھا۔ دوسرا اینٹ کا غلام تھا اور تیسرا حکم کا بادشاہ۔

میڈم نے تینوں پتوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر دو پتے اٹھا کر انہیں الٹا کر کے رکھ دیا۔ اب ان کے سامنے حکم کا بادشاہ رہ گیا تھا جس کو انہوں نے بہت غور سے چاروں طرف سے گھما کر دیکھا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف نیم دراز ہوگئیں۔ حکم کا بادشاہ ان کے ہاتھ میں تھا جسے وہ بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ نے اب تک شادی نہیں کی۔"
ہم خاموش رہے۔
"کیوں نہیں کی؟"
ہم نے کہا۔ "کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔"
"ابھی اور بھی کئی سال آپ کی شادی نہیں ہوگی۔ آپ بہت دیر سے شادی کریں گے۔"
"ہماری کتنی شادیاں ہوں گی۔"
"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی صرف ایک شادی ہوگی مگر وہ بہت کامیاب ہوگی۔" ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔
"بچے؟"
"آپ کے دو بچے ہوں گے۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کو لڑکے اچھے لگتے ہیں یا لڑکیاں؟"
"لڑکیاں۔"
"تو پھر آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آپ دو بچیوں کے باپ بنیں گے۔ اگر آپ کی مسز کو لڑکے کا شوق ہوا تو ایک لڑکا ہوگا اور ایک لڑکی۔"
"ہماری مالی حالت کیسی ہوگی؟"
"آپ آج کل بھی آرام کی زندگی گزار رہے ہیں اور تھوڑی بہت اونچ نیچ کے ساتھ آپ ایک آرام کی زندگی ہی بسر کریں گے۔"
"صحت کے بارے میں بتائیے۔"
"آپ کی صحت بہت اچھی نہیں رہے گی۔ دو تین آپریشنز بھی ہوں گے۔"
"مگر کوئی شدید بیماری تو نہیں ہوگی؟"
"بہت زیادہ سیریس تو نہیں مگر آپ بیمار ہوتے رہیں گے لیکن کام بھی کرتے رہیں گے۔"
"ہمارے کیریئر کے بارے میں بتائیے۔"
"آپ اس وقت جو کام کر رہے ہیں اس میں تبدیلی ہوگی لیکن آپ جو بھی دوسرا کام کریں گے اس کا اور موجودہ کام کا آپس میں تعلق ہوگا۔ مگر آپ جو بھی کام کریں گے اس میں آپ کو کامیابی حاصل ہوگی۔ اس معاملے میں آپ خوش نصیب ہیں۔"
"میرے دل اور دماغ کے بارے میں کچھ بتائیے۔"
"آپ ایک ہمدرد اور نیک دل انسان ہیں۔ ہر ضرورت مند کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور اپنی بساط سے زیادہ مدد بھی کرتے ہیں۔ آپ کچھ لڑکیوں کو پسند کریں گے مگر دیوانگی کی حد تک کسی سے عشق نہیں کریں گے۔ عشق کرنے کا خانہ آپ کے دماغ میں موجود ہی نہیں ہے۔
آپ کو قدرت نے بہت اچھا ذہن دیا۔ آپ نئی نئی باتیں سوچتے ہیں اور ان پر کامیابی سے عمل بھی کرتے ہیں۔ آپ ہر وقت جلدی میں رہتے ہیں اور ہر کام بہت تیزی سے کرتے ہیں۔ آپ دوسروں سے بھی یہی امید کرتے ہیں کہ وہ بہت تیزی سے کام کریں۔
آپ کو زندگی میں کچھ ناکامیاں بھی ملیں گی لیکن ایسی نہیں کہ جن سے آپ ہمت ہار جائیں۔ آپ میں ایک خوبی یہ ہے کہ آپ کبھی حوصلہ نہیں ہارتے۔ ناکامی کے بعد بھی کامیابی کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ آپ اور کیا جاننا چاہتے ہیں؟"
"بس کچھ نہیں۔ شکریہ۔" یہ کہہ کر ہم نے ایک ایک ڈالر کے دو نوٹ ان کے سامنے رکھ دیئے جو انہوں نے شکریہ ادا کیے بغیر اٹھا کر اپنی میز کی دراز میں ڈال لیے۔
"نیکسٹ؟" انہوں نے کہا۔ مطلب یہ کہ اب دوسرے کی باری ہے۔
ہم باہر نکلے تو سارے دوست ہمارے منتظر تھے، ہمیں دیکھتے ہی ہماری طرف لپکے اور بے تابی سے دریافت کیا۔ "کیوں، کیا بتایا؟"
"بہت کچھ۔" ہم نے کہا۔
"صحیح یا غلط؟"
"کچھ صحیح اور کچھ غلط۔ اب وہ اندر انتظار کر رہی ہیں۔ آپ میں سے اب جو قسمت کا حال جاننا چاہتا ہے اندر چلا جائے۔"
بٹ صاحب بولے۔ "دیکھیے آفاقی صاحب، ہم اس کو بدعت سمجھتے ہیں۔ مستقبل کا حال صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اگر دو دو ڈالر وصول کر کے کوئی دوسروں کی قسمت کا حال بتا سکتا ہے تو وہ خود اپنی تقدیر کیوں نہیں بنا لیتا؟"
"مگر اس نے بہت سی باتیں صحیح بتائی ہیں۔"
"اٹکل سے تو سبھی جان سکتے ہیں۔ بہت سی باتیں درست نکل آتی ہیں۔ چلو بس دو ڈالر خیرات میں چلے گئے۔ اب ساری زندگی ہمیں اس موٹی بھینس کے پاس تو نہیں گزارنی۔"
ہم پھر بڑی سڑک پر آگئے کیونکہ نوادرات اور قسمت کا حال ہم سب جان چکے تھے۔ اب پھر وہی استنبول تھا اور وہی ہم۔ سچ جانیے استنبول ایک خوبصورت شہر ہی نہیں بہت خوبصورت شہر ہے۔ کچھ قدرت نے نوازا ہے، کچھ انسانوں کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اگر بس چلے تو ہم اس کو اپنا دوسرا وطن بنالیں۔
پبلک ٹرانسپورٹ کا سسٹم اتنا اچھا ہے کہ ہر شخص کو ہر وقت، ہر قسم کی سواری مل جاتی ہے اور ہر ایک کے کرائے مقرر ہیں۔ قانون کا احترام اتنا ہے کہ ہر کوئی خلاف قانون کام کرنے سے گریز کرتا ہے۔ کیونکہ جانتا ہے کہ اگر پکڑا گیا تو کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اس کی مدد نہ کر سکے گا۔ نہ داد نہ فریاد۔ جو کیا ہے اس کا نتیجہ بھی خود ہی بھگتو۔ ٹریفک میں بھی نظم و ضبط ہے۔ کاروں والے اپنی قطاروں میں ایسے چلتے ہیں کہ اگر سامنے سے دیکھو تو یوں لگتا ہے جیسے صرف ایک ہی کار چلی آرہی ہے۔
استنبول میں قوم پرستی کا ایک مظاہرہ یہ دیکھا کہ ہر جگہ ترکی کے جھنڈے لہراتے نظر آتے ہیں۔ اسلامی حکومت آنے کے بعد حجاب اور عبایا پوش خواتین زیادہ تعداد میں نظر آتی ہیں۔ صوفی ازم کا یہاں بہت چرچا ہے۔ اس کا مرکز مولانا رومی کا مزار ہے۔ درویشوں کا رقص ترکی کا پسندیدہ رقص ہے جس میں لمبی لمبی سفید قبائیں، گول اور اونچی پرانی ترکی ٹوپی کے انداز کی ٹوپیاں پہن کر یہ ایک دائرے کی شکل میں خاص قسم کا رقص کرتے ہیں۔ سیاحوں کے لیے یہ ایک بہت دلچسپ نظارہ ہوتا ہے اس لیے ترکی کے ہر شہر میں درویشوں کے رقص کا بندوبست کیا گیا ہے۔ استنبول کی سڑکوں پر قومی جھنڈے اور رنگین غباروں کی آرائش دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی قومی دن منایا جارہا ہے۔
مرزا منور نے بتایا تھا کہ سرکیسی اسٹریٹ پر چند بہت اچھی یادگاریں ہیں۔
"کیسی یادگاریں۔"
"میوزیم وغیرہ۔"
بٹ صاحب بیزاری سے بولے۔ "پھر وہی میوزیم، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میوزیم میں پرانی چیزیں دیکھنے کا کیا فائدہ۔ اس سے اچھا ہے کہ کسی سینما گھر میں فلم دیکھی جائے، نائٹ کلب میں ڈانس دیکھا جائے۔"
"اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔"
"ارے بھئی ذہن تازہ اور روح خوش ہو جاتی ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ قاہرہ میں بے شمار سیاح اہرام کے نیچے اندھیرے مقبروں میں ہزاروں سال پہلے مرنے والوں کی ممی دیکھنے کیوں جاتے ہیں۔"
خان صاحب نے کہا۔ "ٹھیک ہے، اگر آپ میوزیم نہیں جانا چاہتے تو سینما گھر یا کلب چلے جائیں ورنہ ہوٹل میں آرام کریں۔ ہم لوگ تو جا رہے ہیں۔"
"تم لوگ جانتے ہو کہ میں اکیلا کہیں نہیں جا سکتا۔ اس لیے مجھے بلیک میل کرتے رہتے ہو۔ کہاں چلنا ہے؟"
خان صاحب نے کہا۔ "ہم لوگ پہلے تو سیکڑوں سال پرانے حمام دیکھیں گے۔"
"ایک بات سن لو۔ میں اس وقت کسی پرانے حمام میں جا کر نہانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"
"یہ حمام سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے کے ہیں لیکن اب ان کو نئے سرے سے بہت خوبصورت بنالیا گیا ہے۔ کوئی بتا رہا تھا کہ یہ حمام ساڑھے پانچ سو سال پرانے ہیں۔"
"بھلا بتاؤ۔" بٹ صاحب بولے۔ "ساڑھے پانچ سو سال پرانے پانی سے نہانا کون سی عقلمندی ہے؟"
"بٹ صاحب، اب حمام نہیں رہے۔ باہر سے ان کی شکل وہی ہے جو ساڑھے پانچ سو سال پہلے تھی مگر اب یہاں کلب، ریستوران اور نائٹ کلب بنالیے گئے ہیں۔ سیاحوں کے لیے یہ بہت اچھی تفریح گاہ ہے۔"
"ٹھیک ہے، اگر وہاں کلب اور ڈانسنگ فلور بن گئے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
"مگر سن لیجیے۔ آپ وہاں لاحول نہیں پڑھیں گے۔"
"بھئی آپ لوگوں کے مشورے پر اب میں دل ہی دل میں لاحول پڑھ لیتا ہوں۔ یا پھر ہوٹل واپس جا کر سارے دن کی لاحول ایک ہی بار پڑھ لیتا ہوں۔"
خان صاحب ہنسنے لگے۔ "سارے دن کی قضا نمازیں پڑھنا تو سنا تھا لیکن سارے دن کی قضا لاحول رات کو اکٹھی پڑھنا بٹ صاحب ہی کی ایجاد ہو سکتی ہے۔"
"اچھا، اب ہم ٹیکسی میں چلیں گے۔" بٹ صاحب نے اعلان کیا۔
"وہ جگہ زیادہ دور نہیں ہے۔"
"مگر ساڑھے پانچ سو سال پرانی یادگار کو دیکھنے کے لیے پیدل جانا بڑے شرم کی بات ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے خود ہی اشارہ کر کے ایک ٹیکسی کو روک لیا۔
(جاری ہے)

جرمِ وفا
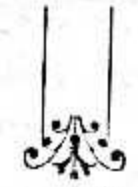
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

دوسری جنگِ عظیم کے وقت بے شمار حیران کن واقعات رونما ہوئے۔ انہی واقعات میں سے ایک واقعہ جو انسانی جبلت کی نشاندہی کرتا ہے، بطورِ خاص ہٹلر کے مزاج کی تشریح ہے۔ جنگِ عظیم کے دوران ایسے واقعات بے شمار رونما ہوئے' کچھ سامنے آئے کچھ مخفی رہے۔

دوسری جنگِ عظیم کا ایک انوکھا واقعہ

وہ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک اہم عہدے پر فائز تھا اور اس عہدے تک پہنچنے میں نہ صرف اس کی ذہانت اور بہادری کو دخل تھا بلکہ اپنے وطن سے بے پناہ محبت نے اس کے دل میں عزم وجرأت کے وہ چراغ روشن کردیے تھے جو کسی صورت نہیں بجھ سکتے۔

وہ پوجنے کی حد تک ہٹلر کی پرستش کرتا تھا اور ہٹلر کو ملک وقوم کا عظیم سرمایہ تصور کرتا تھا۔

ہرچند کہ وہ ہٹلر سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اس کے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ کبھی اسے یہ سعادت نصیب ہوسکے کہ وہ اس عظیم رہنما سے ہاتھ ملاسکے، اسے قریب سے دیکھ سکے، اس سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل کرسکے۔

کچھ دن قبل اس کی یہ خواہش شدید ہوگئی تھی جب اس نے ایک اخبار میں ہٹلر کی تازہ تصویر دیکھی تھی جس میں کسی فوجی افسر کے سینے پر خود اپنے ہاتھ سے تمغا سجا رہا تھا۔ اس نے چشمِ تصور سے دیکھا تھا کہ اس فوجی افسر کی جگہ وہ خود ہے اور ہٹلر اس کے سینے پر تمغا سجا رہا ہے۔ اس افسر نے جنگ کے دوران میں کوئی عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی دن کھویا کھویا سا رہا تھا۔

اس کے سارے وجود پر جیسے وہ تمغا محیط ہوگیا تھا اور اس نے سوچا تھا۔ کیا وہ بھی کبھی ایسا کوئی کارنامہ انجام دے سکے گا کہ اس کے سینے پر بھی تمغا سجے، وہ بھی ہٹلر سے ہاتھ ملائے اور مستقبل کا مورخ اس کا نام بھی جرمنی کے ان عظیم سپوتوں میں درج کرے جس کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

جنگِ عظیم دوم...... اب اس مرحلے میں داخل ہوچکی تھی کہ ہر محاذ پر جرمن فوجیں پسپا ہورہی تھیں۔ اتحادیوں نے اب جرمن علاقے کی طرف پیش قدمی شروع کردی تھی اور بہت سے جرمن گاؤں اور قصبے ان کے قبضے میں آچکے تھے لیکن ابھی جرمن قوم کے حوصلے بلند تھے کیونکہ اس میں شیفر جیسے جوان موجود تھے جو ہٹلر کے حکم کو آخری حکم تصور کرتے تھے۔ چاہے انہیں اپنی زندگی ہی سے کیوں نہ گزر جانا پڑے۔

انہی دنوں شیفر کو اس کے چیف نے طلب کیا۔ وہ شیفر...... جو تمغے کے خواب دیکھتا تھا جو ہٹلر کو جرمن قوم کا نجات دہندہ تصور کرتا تھا اور وہ شیفر جو اپنے ملک وقوم کے لیے جان بھی دے سکتا تھا۔ جب اسے طلب کیا گیا تو اس کے ذہن میں ایک بار پھر تمغا ناچنے لگا۔ شاید اسے کوئی اہم کام سونپا جائے گا۔ اس نے سوچا۔

چیف ملٹری انٹیلی جنس کے احکامات اسے مختلف ذرائع سے ملتے رہتے تھے اور وہ ان پر عمل کرتا رہتا تھا مگر ایسے موقع بہت کم آتے تھے کہ اسے طلب کیا جاتا۔ وہ ان مواقع کی اہمیت سے آگاہ تھا۔ جب بھی اسے طلب کیا گیا تھا تو کوئی اہم کام سپرد کیا گیا تھا جس میں انتہائی رازداری کی ضرورت ہوتی تھی۔

شیفر انہی خیالات میں غلطاں چیف کے کمرے میں

داخل ہوا۔ چیف نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بیٹھ گیا وہ جانتا تھا کہ اس ساؤنڈ پروف کمرے میں ہونے والی گفتگو انتہائی اہم نوعیت کی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"شیفر تمہارا ریکارڈ اس بات کا گواہ ہے کہ تم ذہین' بہادر اور محبِ وطن ہو۔ تم جرمن قوم کے لیے جان تک دے سکتے ہو۔ تمہاری وفاداری اور جان نثاری پر رشک کیا جاسکتا ہے۔" یہ کہہ کر چیف نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ شیفر کا چہرہ جوش کے سبب سرخ ہورہا تھا۔ چیف کے ہونٹوں کو پھر حرکت ہوئی۔

"دراصل میں نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے طلب کیا ہے اور میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں سر!" شیفر نے چیف کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

"دراصل ہائی کمان نے پانچ ایسے افراد کے نام طلب کیے تھے جن کا ریکارڈ بے داغ ہو۔ جو ذہین، بہادر اور وطن پرست ہوں اور جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ تمہیں شاید یہ جان کر خوشی ہو کہ ان پانچ افراد میں تمہارا نام بھی شامل تھا۔" چیف نے رک کر شیفر کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"میرا...... میرا نام سر!" شیفر کے لہجے میں دبا دبا جوش اور مسرت کا عنصر تھا۔

"ہاں! شیفر تمہارا نام! اور یہ جان کر تمہیں بے حد مسرت ہوگی کہ وہ پانچوں نام اور ان کے متعلق تفصیلات عظیم فیوہرر نے خود ملاحظہ کیں پھر وہ نام مجھے واپس بھیج دیے گئے۔ کیا تم یقین کروگے شیفر کہ عظیم فیوہرر نے جس نام پر خود اپنے دستِ مبارک سے نشان لگایا وہ نام تمہارا نام تھا۔ شیفر تمہارا نام!"

شیفر کا دل چاہا کہ وہ خوشی سے چیخ پڑے، رقص کرنے لگے، جھومنے لگے، اتنا بڑا اعزاز، وہ خوابوں میں کھوگیا اور پھر اس وقت چونکا جب چیف نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"کیا تمہیں اس بات سے خوشی نہیں ہوئی شیفر۔"

"سر! سر! م...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ...... م...... مجھے...... مجھے اتنا بڑا اعزاز ملے گا۔" شیفر نے خوشی

سے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

”ملک وقوم کے لیے جان قربان کردینے کے مواقع خوش نصیبوں ہی کو میسر آتے ہیں شیفر! اور تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں ایک ایسے ہی کام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔“ چیف برنارڈ کی آواز پُرجوش ہوتی گئی۔ ”تمہیں ایک عظیم مقصد کے حصول کی خاطر ملک وقوم کے حضور نذرانۂ جاں پیش کرنا ہے۔ کیا تم ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ ہو شیفر؟“

”میں اپنی خوش نصیبی پر جتنا ناز کروں، کم ہے سر!“ شیفر نے بھی پُرجوش لہجے میں کہا۔

”تو سنو شیفر! تمہیں اس مشن پر جانا ہے جس کا نام ہم نے ”ڈیتھ مشن“ رکھا ہے۔ یہ حقیقتاً بھی موت کا مشن ہے اور اسے تم جان دے کر ہی پورا کر سکتے ہو۔“ چیف برنارڈ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم واقف ہو کہ اتحادی درندوں کے ناپاک قدم اب جرمن علاقوں تک بھی آپہنچے ہیں۔ تمہیں انہی مقبوضہ علاقوں میں سے ایک علاقے میں بھیجا جائے گا۔“

چیف برنارڈ نے بہت مدھم لہجے میں شیفر کو اس علاقے کا نام بتایا اور یہ نام سن کر شیفر چونک پڑا وہ اس علاقہ کی اہمیت سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

شیفر جب برنارڈ سے مکمل تفصیلی گفتگو کر کے باہر نکلا تو اس کے چشم تصور میں تمغا رقص کر رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش! اسے کسی ایسی مہم پر بھیجا جاتا جس میں اس کے زندہ بچنے کے امکانات ہوتے۔

شیفر کو جرمن مقبوضہ علاقہ میں ایک ایسے فوجی ہیڈ کوارٹر کو تباہ کرنا تھا جو اتحادیوں کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا تھا۔

اتحادیوں نے اسی لیے اس کی حفاظت کے زبردست انتظامات کر رکھے تھے۔ اگرچہ اس مقبوضہ علاقہ کی جرمن آبادی اتحادیوں کے حق میں نہیں تھی لیکن انہوں نے مقامی آبادی کو جبر وتشدد سے دبا رکھا تھا۔ اس علاقے کی حفاظت کے لیے اتحادیوں نے جدید ترین وسائل سے کام لیا تھا اس کا سبب وہ فوجی ہیڈ کوارٹر تھا جو ایک مٹیالے رنگ کی عمارت میں تھا اور اس عمارت سے بہت سے اسرار وابستہ تھے۔

منصوبے کے مطابق ایک جرمن جنگی جہاز کو اینٹی ایئر کرافٹ گنز کی فصیل عبور کرنی تھی کیونکہ جہاز کے اس علاقے میں داخل ہوتے ہی اسے دیکھ لیا جاتا۔ قدم قدم پہ ریڈار نصب تھے۔ جرمن جہاز کو دیکھتے ہی اتحادیوں کی گنز آگ برسانے لگتیں جن کی زد سے جہاز کا بچ نکلنا معجزے سے کم نہ ہوتا۔

شیفر کو جہاز تباہ ہونے سے پہلے کسی مناسب مقام پر چھلانگ لگانی تھی۔ اس مہم کی کامیابی شیفر کی موت کے بغیر ممکن نہیں تھی اور وہ مرنے کے لیے تیار تھا۔

شیفر کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ کسی مرحلے پر کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جو اسے دوسرے لوگوں سے ممتاز کر دے۔ کچھ نہ کچھ کرنے کی آرزو اسے ہمیشہ مضطرب رکھتی تھی۔

جب عظیم جرمنی کے عظیم رہنما ہٹلر نے آگ اور خون کا کھیل شروع کیا تھا تو شیفر اس میں شریک ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ جنگ میں شریک ہو کر کوئی یادگار کارنامہ انجام دینے کے مواقع بہرحال زیادہ تھے۔ اس نے اپنی بے جگری اور جیالے پن سے بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کی تھیں۔ اس نے عظیم جرمن پر اپنی جان نثار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے سکے کہ آئندہ نسلیں اسے عزت واحترام سے یاد کریں۔ اس پر فخر کریں' اس کے کارنامے کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اب اسے یہ موقع نصیب ہو گیا تھا۔

جب وہ چیف برنارڈ سے مل کر لوٹ رہا تھا تو بار بار اس کے ذہن میں چیف کا کہا ہوا ایک جملہ گونج رہا تھا۔

”شیفر! تم مادرِ وطن کی خاطر جان دینے جا رہے ہو۔ وطن کا ذرہ ذرہ تمہاری اس قربانی کو یاد رکھے گا۔“

☆☆☆

وہ حیات شکن جھٹکا شیفر کے لیے حیات بخش تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی پیراشوٹ کھل گیا تھا۔ وہ کافی دیر سے فضا میں کلابازیاں کھاتا ہوا زمین کی طرف گر رہا تھا۔ اس کے صحیح سلامت بچنے کا امکان پیراشوٹ کے کھلنے پر تھا۔

لمحے صدیوں پر محیط لگ رہے تھے اور وہ خوف کا احساس لیے ہر ممکن حادثے کے لیے تیار تھا۔ اس کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز سے تیز ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے میں پیراشوٹ کھلنے کا مخصوص جھٹکا اسے زندگی کی نوید دے گیا۔ ہوا نارمل تھی اس لیے پیراشوٹ آہستہ روی سے فضا میں تیرنے لگا۔ اس نے طویل سانس لے کر پیراشوٹ کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ

شخص پچھلے آدھے گھنٹے میں دوبارہ شدید خطرے سے گزر چکا تھا۔ وہ جس مہم پر نکلا تھا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فولادی اعصاب اور مضبوط ارادے والے شخص کی ضرورت تھی اور وہ اس معیار پر پورا اترتا تھا جب ہی اسے اس مہم کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

اس نے اپنی پشت پر بندھے تھیلے میں اس مخصوص بم کو محسوس کیا جو اس منصوبے کی جان تھا۔ اسے یہ بم سینے سے باندھ کر اس عمارت میں داخل ہونا تھا۔ یہ بم انتہائی طاقت ور اور اثر انگیز تھا۔

دفعتاً...... فضا پے در پے دھماکوں سے گونج اٹھی۔

اینٹی ایئر کرافٹ گنز کے دہانے کھل گئے۔ چند لمحے بعد ہی اس نے ایک زبردست دھماکا سنا۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آگ کا ایک گولا زمین کی طرف گر رہا تھا۔ اسے جو جہاز اس علاقے میں لے کر آیا تھا اسے دشمن نے مار گرایا تھا چند لمحے اس کا ذہن سائیں سائیں کرتا رہا پھر پُرسکون ہو گیا۔

اس نے منصوبے کی جزئیات سوچیں۔ وہ جس عمارت کو تباہ کرنے جا رہا تھا وہاں بھی حفاظت کا کڑا انتظام تھا۔ اس عمارت میں داخل ہونے کا واحد راستہ وہ آہنی گیٹ تھا جو صرف صبح شام کے وقت کھلتا تھا، اس کے علاوہ یہاں چیکنگ کا اتنا سخت انتظام تھا کہ کسی غیر متعلقہ شخص کا صحیح سلامت داخل ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ شیفر کو انہی مواقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اسے گیٹ کھلتے ہی پوری قوت سے عمارت کے اندر داخل ہونا تھا۔ ظاہر ہے اسے دیوانہ وار عمارت میں گھستا دیکھ کر وہاں متعین محافظ اس پر گولیاں برساتے اور ادھر وہ بم کا سیفٹی کیچ ہٹا چکا ہوتا۔ بم ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتا اور ساتھ ہی وہ عمارت بھی نیست ونابود ہو جاتی۔

اسے زمین کے قریب آنے کا احساس ہوا تو اس نے زمین پر اترنے کی پوزیشن لے لی۔ زمین نے آہستگی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے جلدی جلدی پیراشوٹ سے نجات حاصل کی اور اسے ایک طرف پھینک کر سمت کا اندازہ کیا اور اپنی مطلوبہ سمت کی طرف دوڑنے لگا۔ پتھریلی اور دشوار گزار راہ سے نسبتاً ہموار جگہ آکر اس نے طویل سانس لیا اور چہرے کا پسینا پونچھا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے چوکنا نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس وقت اس نے اچانک دوڑتے قدموں کی آواز سنی پھر معاً فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ مخالف سمت بھاگ کھڑا ہوا مگر دوسری جانب سے بھی گولیوں نے استقبال کیا۔ قریب ہی کسی آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ اس سمت لپکا لیکن آبادی سے پہلے ہی ایک گولی نے اس کی پنڈلی چھید دی وہ گرا اور پھر اٹھ کر بھاگا۔ اسے اپنی جان سے زیادہ اس بم کی فکر تھی جو اس کی پشت سے بندھا ہوا تھا، اگر کوئی بھولی بھٹکی گولی اس سے ٹکرا جاتی تو نہ صرف اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر جاتا بلکہ اس کا منصوبہ بھی ناکام ہو جاتا۔ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا کہ ایک اور گولی اس کے بازو میں بھی پیوست ہو گئی۔ اسے دیکھ لیا گیا تھا اور یہ بہت خطرناک تھا۔ اس کی پنڈلی اور بازو سے تیزی کے ساتھ خون بہہ رہا تھا اور اب وہ ایک طرح گھسٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا آجاتا لیکن وہ مسلسل بڑھتا رہا۔

وہ کوئی ابھرا ہوا پتھر تھا جس سے ٹکرا کر وہ گر پڑا تھا اور اس کا سر دوسرے پتھر سے ٹکرایا تھا۔ حواس کھونے سے پہلے اس نے بہت سے لوگوں کو اپنی جانب دوڑتے دیکھا تھا اور اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ اس کی طرف دوڑنے والے اس کے دشمن ہی ہو سکتے تھے جو اس پر گولیاں برساتے رہے تھے اور ہر قیمت پر اسے ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔

☆☆☆

ہوش آنے پر شیفر نے خود کو چند اجنبی چہروں کے درمیان پایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ایک نوجوان بول پڑا۔ ”ہم نے تمہیں جرمن جنگی جہاز سے کودتے دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ تم اپنے ہو، اس لیے ہم نے تمہیں اتحادی کتوں سے بچا لیا۔ تم یقیناً کوئی عظیم مقصد لے کر یہاں آئے ہو گے۔“

شیفر تکلیف سے کراہا اور اس وقت ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کے زخموں کی ڈریسنگ کی جا چکی ہے۔ ابھی شیفر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور نوجوان گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی جرمن زبان میں چیخا۔

”اتحادی کُتے اِدھر آ رہے ہیں۔“

شیفر کو تین چار نوجوانوں نے تیزی سے اٹھایا اور اس مکان کے پچھلے دروازے سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد ہی شیفر ایک اور بوسیدہ سے مکان میں تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے بچانے والے مقامی جرمن ہیں۔

دو دن تک شیفر ایک مکان سے دوسرے اور دوسرے

سے تیسرے میں منتقل کیا جاتا رہا اور پھر اسے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا گیا جہاں خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ عمارت بمباری کے سبب تباہ ہوچکی تھی۔ عمارت کی جگہ اب کھنڈر رہ گئے تھے۔

جس شب شیفر کو اس کھنڈر نما عمارت میں پہنچایا گیا اس کی صبح ایک حسین و نوجوان لڑکی شیفر کے لیے ناشتا لے کر آئی۔

اس لڑکی نے اپنا نام جیمی بتایا تھا۔ شیفر کو پہلی ہی نظر میں وہ گڑیا سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔

شیفر کے زخم ابھی پوری طرح بھرے نہیں تھے۔ جیمی صبح شام آتی رہی پھر ایک دن جیمی نے شیفر سے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ شیفر اس حسین و معصوم لڑکی سے جھوٹ نہ بول سکا کیونکہ اس نے بھی لڑکی کی آنکھوں میں محبت کی تحریر پڑھ لی تھی۔ دوسرے دن جیمی آئی تو اس کے ہمراہ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ وہ نوجوان جیمی کا بھائی تھا۔ اس نے اپنا نام ہیون بتایا تھا۔ اس نے شیفر سے اپنا مکمل تعارف کرایا۔ ہیون نوجوان جرمنوں کی ایک خفیہ تنظیم کا رکن تھا جو اتحادیوں کے خلاف کام کررہی تھی۔ ہیون کو بھی تمام منصوبے سے آگاہ کردیا۔

ہیون نے کچھ سوچتے ہوئے شیفر کو مخاطب کیا۔ ”شیفر، تمہارا مقصد وہ عمارت تباہ کرنا ہے نا؟“

”ہاں!“ شیفر نے مختصراً کہا۔

”اگر تم چاہو تو ایک متبادل راستے سے اس عمارت میں داخل ہوسکتے ہو۔“ ہیون نے انکشاف کیا۔

”لیکن میرے دوست اس عمارت میں داخل ہونے کا واحد راستہ......“

”پہلے میری بات سن لو! یہ بتاؤ کیا تم اپنے پروگرام میں خاطر خواہ تبدیلی کرسکتے ہو؟“

”میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔“ شیفر بولا۔

”میں تمہیں ایک دوسرے راستے سے عمارت میں داخل کراسکتا ہوں، اگر تم چاہو تو......“

”......مگر یہ ناممکن ہے کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق عمارت کی حفاظت کا بہت کڑا انتظام ہے۔ اس عمارت میں کسی اور طریقے سے داخل ہونا ناممکن ہے۔“

”میرے دوست یہ تمہاری لاعلمی ہے جو تم اپنی بات پر اصرار کررہے ہو، غور سے سنو! عمارت کے عقب میں سیکڑوں میل پر محیط خوفناک جنگل ہے۔ یہ جنگل دلدلی سرزمین کی وجہ سے بدنما ہے۔ اتحادی فوجوں نے عمارت کی حفاظت کے لیے وہاں فوجی دستے متعین کرنا چاہے مگر ان کے بہت سے سپاہی دلدل کا شکار ہوگئے۔ دوسرے یہ جنگل حشرات الارض اور درندوں کی وجہ سے اب تک کسی کے قابو میں نہیں آیا ہے۔ اجنبی لوگ یہاں داخل ہوکر زندہ واپس نہیں نکلتے۔ مجھے اس علاقے سے مکمل واقفیت ہے۔ تم چاہو تو میں تمہیں عمارت کی عقبی دیوار تک پہنچانے کا ذمہ لے سکتا ہوں۔ تم غور کرلو، کل میں پھر آؤں گا۔“

یہ کہہ کر ہیون اٹھ کھڑا ہوا اور جیمی بھی اس کے ساتھ ہی اٹھی۔ اسی وقت شیفر اور جیمی کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور شیفر نے محسوس کیا جیسے جیمی کی خاموش نگاہیں اس سے التجا کررہی ہوں کہ وہ ہیون کی بات مان لے۔ ان دونوں کے قدموں کی دور ہوتی چاپ کے ساتھ ساتھ شیفر کے چشم تصور میں تمغا رقص کرنے لگا۔ وہ زندہ رہ کر تمغے کا حق دار بن سکتا تھا۔

ہیون کی پیش کش معمولی نہ تھی۔ اس نے زندگی کی نوید دی تھی۔ وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ زندگی ست رنگ آرزوؤں اور رعنائیوں کا محور! زندگی کے ساتھ ہی جیمی کا سراپا بھی منسوب تھا۔ جیمی جوأب اس کی دوسری بڑی آرزو بن گئی تھی۔ ہیون کی بات مان کر وہ جیمی کے ساتھ ساتھ اپنی سب سے بڑی خواہش پوری ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے سوچا جب وہ زندہ سلامت اپنے چیف کے سامنے پہنچے گا تو وہ حیرت زدہ رہ جائے گا پھر اس کے کارنامے کی دھوم مچ جائے گی۔ وہ ناممکن بات ممکن کردکھائے گا۔ وہ عمارت تباہ کرنے کے باوجود زندہ بچ سکتا ہے، زندہ رہنے کی آرزو نے اسے ہیون کی بات ماننے پر اکسایا۔ جیمی کے تصور نے اس کی تائید کی اور وہ فیصلے پر پہنچ گیا۔ ابھی اس کے پاس عمارت تباہ کرنے کے لیے دو دن باقی تھے۔ محکمے کے پروگرام کے مطابق اسے جو مدت دی گئی تھی وہ دو دن بعد ختم ہورہی تھی، اسے یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا۔ مقبوضہ علاقے کے باشندوں نے اسے اتحادی دشمنوں سے بچالیا تھا اور ہیون نے اسے جینے کی راہ دکھائی تھی۔

لوگوں کے ستے ہوئے چہرے، بے رونق ماحول، جنگ سے تباہ شدہ عمارتیں اور دن رات طیاروں کی گھن گرج نے لوگوں کی صلاحیتوں کو مفلوج کردیا تھا۔ ان کے ذہن میں زندہ رہنے کی خواہش نے انہیں بڑی حد تک مفاد پرست اور مطلبی بنادیا تھا۔ دنیا تباہ ہورہی تھی۔ بھوک اور افلاس کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ لہو بہہ رہا تھا اور لوگ جینے کی خواہش میں بھٹک رہے تھے۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے ان سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ لیکن ان کے سینوں میں جینے کی آرزو اب بھی باقی تھی۔ ایسے میں کچھ لوگوں نے وطن پر جان نثار کرنے کا عزم کررکھا تھا۔ یہ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر لیے جدوجہد میں مصروف تھے اور انہی جیالوں میں سے ایک ہیون تھا جس نے شیفر کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

یکایک ہوائی حملے کا سائرن ہوا۔ اور شیفر کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ اینٹی ایئر کرافٹ گنز کے دہانے شعلے اُگلنے لگے۔ دھماکے، آگ اور دھوئیں کے بادل۔ شاید دشمن اپنے حریف کو غافل جان کر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا مگر اس کا وار ناکام ہوگیا۔ جہاز کے ساتھ ہی اس کے سوار بھی گوشت کے لوتھڑوں کی شکل میں بکھر گئے۔ کون جانے دور کہیں کوئی اکیلی نار اکیلی سوتے ہوئے اٹھ بیٹھی اور اس کا دل سینے سے نکلتا محسوس ہوا ہو یا کچھ ننھے منے بچے اپنی آنکھوں میں اپنے ڈیڈی کی چاہت کے گلاب سجائے سوتے میں مسکراتے مسکراتے رو پڑے ہوں۔ کون جانے......کون جانے۔

”جاناں! تم رورہی ہو؟“ شیفر نے بوکھلا کر جیمی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

”نہیں، نہیں تو۔“ جیمی نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

”دیکھو جان! اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ذرا مسکرا کر الوداع کہو تاکہ اگر کسی مشکل میں پھنس جاؤں تو تمہاری مسکراہٹ کے سہارے زندہ رہنے کا حوصلہ پاسکوں۔“

”ڈیئر! نہ جانے کیوں میرا دل لرز رہا ہے، تم آج نہ جاؤ۔“

”کیسی احمقانہ باتیں کررہی ہو۔ میں نے کل وہاں جاکر حالات کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں، آج میں عمارت میں داخل ہوکر کسی مناسب جگہ بم رکھ دوں گا۔“

”یہ سب ٹھیک ہے ڈیئر! لیکن نہ جانے کیوں میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔“

”نہیں جان! میں خواہ مخواہ کے واہموں میں پڑ کر نہیں رکوں گا۔ مجھے مسکرا کر الوداع کہو۔“

”اچھا تو خدا حافظ!“ جیمی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور پھر اسے نہ جانے کیا ہوا وہ تیزی سے شیفر کی بانہوں میں سما گئی۔ شیفر نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ جیمی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اضطراری کیفیت میں وہ اسے دیکھنے لگا۔ جذب و شوق کے بے شمار لمحے گزر گئے پھر شیفر کو احساسِ فرض نے چونکا دیا۔

اس نے آہستگی سے جیمی کو الگ کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ جہاں ہیون اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

سورج غروب ہونے کے آدھے گھنٹے بعد وہ عمارت کے عقبی حصے تک پہنچ چکے تھے۔

ہیون نے اپنے ساتھی کو ایک درخت پر چڑھنے کا اشارہ کیا اور خود شیفر کے ہمراہ دوسرے درخت کی طرف بڑھ گیا۔

شیفر نے چھت تک پہنچنے میں بڑی پھرتی سے کام لیا تھا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے اطراف کا جائزہ لیا، اس کے اندازے کے مطابق نیچے اترنے کا راستہ سرچ لائٹوں کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ نیچے جانے والے زینے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ہیون سے حاصل کی ہوئی معلومات تازہ ہوگئیں پھر اس نے زینے سے نیچے اترنا شروع کردیا۔ زینے کا اختتام ایک راہداری پر

کدو ریس

کینیڈا کے علاقے نووا اسکاٹیا میں ہر سال بڑے بڑے کدوؤں کی بنائی ہوئی کشتیوں کی ریس ہوتی ہے۔ دی ونڈسر پمپکن ریگاٹا اینڈ پریڈ کے نام سے منعقد ہونے والے اس ایونٹ کا آغاز 1999ء میں کیا گیا۔

ریس شروع ہونے سے پہلے پریڈ ہوتی ہے، جس میں لوگ اپنی اپنی اگائی ہوئی سبزیاں لے کر آتے ہیں۔ اس پریڈ میں کھوکھلے کیے ہوئے بڑے بڑے کدوؤں کی نمائش بھی کی جاتی ہے۔ بعد ازاں یہی کھوکھلے کدو پیس کونڈ جھیل میں 0.8 کلومیٹر کی ریس کے لیے کشتی کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی کدو کشتی کو کھینچنے کے لیے چپو استعمال کرتے ہیں جبکہ بعض لوگ اپنی کدو کشتی کو جھیل کے دوسرے کنارے تک پہنچانے کے لیے موٹر بوٹ کے چھوٹے انجن بھی استعمال کرتے ہیں۔

ہوا تھا۔ جس کے ساتھ نچلی منزل تک جانے کا راستہ تھا۔ معاً اس کی چھٹی حس بیدار ہو کر خطرے کا سگنل دینے لگی۔ اس نے چوکنا انداز میں راہداری کا جائزہ لیا۔ اسے نچلی منزل کے زینے کی طرف آہٹ محسوس ہوئی تو وہ تیزی سے ایک جانب کو لپکا۔ کئی کمروں کے سامنے سے گزر کر نسبتاً الگ تھلگ ایک کمرا منتخب کر کے اس نے پشت سے بیگ اتارا اور دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھل گیا۔

کمرے میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ شیفر نے پھرتی سے بیگ اس کباڑ کے اندر چھپا دیا۔ اسی وقت کمرے کے سامنے آہٹ ہوئی۔ کسی نے دروازے پر پے در پے کئی ضربیں لگائیں۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ سامنے موجود سپاہی نے اپنی گن اس کی طرف تان لی اور اسے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ سر جھکا کر باہر نکل آیا۔

اسے گرفتار کرنے والا محافظ دستے کا نگراں تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے لوٹ رہا تھا کہ اسے راہداری میں کسی کی جھلک دکھائی دی۔ یہاں اس کے سوا کسی اور کی رہائش نہیں تھی۔ اس وقت یہاں کسی کی موجودگی خلافِ معمول تھی اس لیے اسے غیر معمولی نقل و حرکت نے چوکنا کر دیا اور اس نے بالآخر شیفر کو گرفتار کر لیا اور ایک نوجوان اس عمارت میں موجود کرنل کو خبر دینے روانہ ہو گیا۔ کرنل نچلی منزل میں مقیم تھا۔

بے وقت کی مداخلت نے کرنل پر جھنجلاہٹ طاری کر دی تھی لیکن معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے کمرے سے باہر نکلنا پڑا۔ محافظ دستے کا نگراں شیفر سے کچھ اگلوانے کی کوشش میں تھا۔ شیفر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کچھ نہیں بولے گا۔ چاہے اس پر کچھ ہی بیت جائے۔

کرنل کمرے میں آیا تو نگراں نے مختصراً اسے تمام رُوداد سنا دی اور حکم کا انتظار کرنے لگا۔

”کیپٹن کرٹس کو بلاؤ۔“ وہ غصے سے بولا۔ ایک نوجوان بجلی کی تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد کیپٹن وہاں موجود تھا۔ وہ بھی اپنی شبینہ مصروفیات میں مگن تھا کہ نادر شاہی حکم نے اسے حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا۔

کرنل نے اس قیدی سے عمارت میں داخل ہونے کا سبب اگلوانے کا حکم دیا۔ کیپٹن آگے بڑھا اور نرمی سے کچھ پوچھنے لگا۔ شیفر نے ظاہر کیا جیسے اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آ رہی ہو۔ کیپٹن نے چیخ کر ہیٹر اور لوہے کی سلاخیں منگوائیں اور شیفر کا بایاں ہاتھ آہنی کڑے میں پھنسا کر اسے قریبی روشندان کے سہارے کھڑا کر دیا۔ اب شیفر بایاں ہاتھ اوپر اٹھائے دیوار کے سہارے سر جھکائے کھڑا تھا۔ کیپٹن سلاخیں سرخ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک آواز گونجی۔

”اوہ کرنل! یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ شیفر نے یہ آواز سن کر اس طرف دیکھا۔ ادھ کھلے دروازے میں ایک نیم عریاں لڑکی بڑے بے ہودہ انداز میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے بے حیائی جھلک رہی تھی۔

”اوہ ہنی، تم جا کر آرام کرو۔ چلو جاؤ۔“ کرنل نے اسے جانے کے لیے کہا مگر وہ اس کے قریب آ کر اس کے شانے سے ٹک گئی۔

”کرنل، کون ہے؟“ لڑکی کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کرنل نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ وہ آگے بڑھی اور شیفر کی آنکھوں کے سامنے انگلی نچاتے ہوئے بولی۔ ”اے تم کون ہو؟“

”تم نے آ کر ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال دیا کمینے! کہیں کے۔“ لڑکی کا لہجہ اس کے جرمن ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ شیفر نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف رخ کر لیا۔

”اوہ ہنی! اِدھر آؤ۔“ کرنل نے اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ ”تم بڑی جلدی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ تم اتنی زیادہ مت پیا کرو۔“ کرنل نے اسے سرزنش کی۔

”نہیں کرنل! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایک دم فِس کلاس۔ ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں پی۔“ وہ ٹھنکتے ہوئے بولی پھر اس نے سامنے کھڑے فوجی سے کہا۔ ”اے سنو! نیچے سے ہماری بوتل اور گلاس لے آؤ۔ ہم اپنی محفل یہیں سجائے لیتے ہیں۔“

وہ کرنل کی محبوبِ نظر کے حکم سے سرتابی کرنے کی ہمت کہاں سے لاتا۔ چنانچہ وہ حکم ملتے ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

واپسی پر اس کے ہاتھ میں خوبصورت ٹرے تھی جس میں شراب کی بوتل اور نازک سے جام تھے۔ لڑکی نے شراب انڈیلی اور جام کرنل کے منہ سے لگا دیا۔ کرنل نے جلدی سے پینا چاہا تو اسے اُچھو لگ گیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ لڑکی نے قہقہے برساتے ہوئے باقی شراب اس کے اوپر انڈیل دی۔ اسی لمحے کمرے میں ایک انسانی سسکی ابھری۔ تیز اور روح میں سرایت کر جانے والی سسکی۔ لڑکی نے چونک کر شیفر کی طرف دیکھا جسے کیپٹن سرخ سلاخوں سے داغ رہا تھا۔ یہ سسکی اس کے انتہائی ضبط کے باوجود صرف ایک بار نکلی۔ فضا میں انسانی گوشت جلنے کی بو لہرا رہی تھی۔ شیفر سختی سے منہ بند کیے اذیتیں برداشت کرتا رہا۔

”یہ کتا چپ کیوں ہے؟ چیخ کیوں نہیں رہا؟“ لڑکی نے کیپٹن سے سوال کیا۔

”کُتیا، ضمیر فروش، بے غیرت، بے حیا۔“ شیفر کے ہونٹوں نے جرمن میں ایک جملہ ادا کیا اور اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ کرنل نے چونک کر لڑکی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں! یہ اپنی ماں کو یاد کر رہا ہے۔“ لڑکی نے جھوٹ بولا۔

”ہنی، تم ایک کام کر سکتی ہو؟“ کرنل نے اس کے کان میں سرگوشی کی پھر جواب سنے بغیر آگے بولا۔ ”تم اپنے جرمن ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے ہمدردی کا اظہار کرو اور اس سے یہاں آنے کا مقصد پوچھو۔“ کرنل نے اسے ہدایت کی۔

”اوہ...... کیوں نہیں...... لیکن......“ لڑکی نے کیپٹن اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کچھ اشارہ کیا۔ کرنل نے کیپٹن کو روکا پھر ایک طرف لے جا کر کچھ سمجھایا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں کرنل اور لڑکی کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا۔

”اے سنو!“ لڑکی نے آگے بڑھ کر شیفر کو ہلایا۔ شیفر نے غضب آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس پر غشی سی طاری ہو رہی تھی۔

”میں...... میں عظیم جرمن پر جان دے دوں گا...... لل...... لیکن۔“

شیفر نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے اور جملہ پورا کیے بغیر ہی بے ہوش ہو گیا۔

”کرنل! یہ تو بے ہوش ہو گیا۔“ لڑکی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ جلد ہی ہوش آ جائے گا اسے۔“ کرنل نے بڑے اطمینان سے کہا اور پھر دھیمے لہجے میں لڑکی کو کچھ سمجھانے لگا۔ لڑکی اس کی باتیں سننے کے دوران میں جیسے کہیں اور رہی تھی۔ شاید وہ کسی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ کیا وہ اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کر سکتی تھی۔ مگر کس طرح؟ اس نے سوچا۔

عظیم جرمن! میں تیرے بیٹے کا مقصد پورا کرنے کا ایک موقع ضرور فراہم کروں گی۔“ یہ فیصلہ کر کے وہ لہراتی ہوئی آگے بڑھی اور بے حجابانہ کرنل کے قریب ہو گئی۔ اسی دوران کرنل کو کچھ خیال آیا تو اس نے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شیفر کو ہوش آیا تو کمرا خالی پڑا تھا۔ اس نے زخمی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ لوہے کی زنجیر میں اس کا ہاتھ بدستور جکڑا ہوا تھا۔ زنجیر کا دوسرا سرا روشندان سے نکل کر دوسری طرف کہیں بندھا ہوا تھا۔ کمرے میں شراب کی خالی بوتل اور جام پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک لمحے اپنی حالت پر غور کیا اور پھر اسے یاد آ گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔

تو کیا وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے گا۔ اس نے سنجیدگی سے سوچا۔ نہیں مجھے ہر قیمت پر اپنا مشن پورا کرنا ہے۔ میں ناکام نہیں رہ سکتا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ بدقسمتی سے وہ بم میں ٹائم فکس کرنے سے پہلے ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گرفتاری سے پہلے ہی بم چھپانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اتحادی اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے وہ تو صرف اس سے عمارت میں داخل ہونے کا راستہ اور یہاں آنے کا سبب جاننا چاہتے تھے۔ یہ ان کی توقع کے خلاف تھا کہ ایک اجنبی شخص ان کے سارے حصار توڑ کر اس عمارت میں داخل ہو گیا تھا جہاں ان کی مرضی کے بغیر ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس کا واضح جواب تھا کہ ان کے انتظامات میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور موجود ہے۔ وہ اس بارے میں جاننے کے خواہاں تھے۔ شیفر نے بڑی تیزی سے اس نایاب موقع سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچا۔

اچانک اس کی نگاہ فولادی زنجیر پر پڑی جو اس کے بائیں ہاتھ کو جکڑے ہوئے تھی۔ اس کمرے سے نکلنے کے لیے زنجیر سے نجات پانا ازبس ضروری تھا مگر کس طرح؟ ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ اسے دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کوئی شخص اسے چیک کرنے آیا تھا۔

”یہ تو ابھی تک بے ہوش ہے۔“ اس نے کسی سے

کہا۔

"ممکن ہے یہ صبح تک زندہ نہ بچے۔" دوسرے شخص نے رائے دی۔ "بے حد زخمی ہو چکا ہے۔"

"اچھا چلو کرنل صاحب کو مطلع کریں۔" پہلے شخص نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ دونوں ایک ساتھ کمرے سے نکل گئے۔

اس کے سارے جسم سے آگ کی لپٹیں سی اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ آزاد کرنے کی ترکیب سوچی۔ زنجیر کٹنا یا ٹوٹنا ناممکن تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس طرح اسے آزادی نصیب ہو سکتی تھی۔ یہ مہنگا سودا ضرور تھا مگر جان سے زیادہ نہیں۔ اس کی نگاہ شراب کی اس خالی بوتل پر جمی ہوئی تھی جو اس کے نزدیک ہی پڑی تھی۔ اس نے پاؤں آگے بڑھا کر بوتل اپنی طرف لڑھکائی۔ پاؤں ہی کی مدد سے اس نے بوتل اوپر اٹھائی۔ اب بوتل شیفر کے دائیں ہاتھ میں تھی۔ اس نے بوتل ایک خاص انداز سے پکڑی اور دیوار سے ٹکرادی۔ پہلی ہی بھرپور ضرب میں بوتل ٹوٹ گئی۔ اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر بوتل کی دھار اپنی کلائی کے جوڑ پر رکھی اور آنکھیں بند کرلیں۔ دوسرے ہی لمحے اس کے دائیں ہاتھ کو حرکت ہوئی۔ گرم گرم خون بھل بھل بہہ کر اس کے اوپر گرنے لگا وہ اپنے دانتوں میں زبان بھینچے کلائی کا جوڑ کاٹتا رہا۔ جب کھال اور نسیں کٹ گئیں تو اس نے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ اس کا پنجہ آہنی کڑے میں رہ گیا اور کٹا ہوا ہاتھ گرفت سے آزاد ہو گیا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کو اندھیرا چھا گیا مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس نے پھرتی سے قریب پڑی قمیص پھاڑی اور کلائی پر باندھ دی۔ خون بہنا کم ہو گیا۔ اس نے خنجر نما بوتل اٹھائی اور تیز قدموں سے دروازے تک پہنچا اور ہوشیاری سے باہر جھانکا۔ راہداری خالی پڑی تھی۔ اس نے زقند بھری اور کمرے سے باہر آگیا۔ اب اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں اس نے بم چھپایا تھا۔ اس سمت جاتے ہوئے اس کی بے چین نگاہ اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔

مطلوبہ کمرے کے سامنے جا کر اس نے دروازے کے ہینڈل پر زور آزمایا۔ دروازہ حسب سابق مقفل نہ تھا۔ اس نے آہستگی سے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور کباڑ میں سے بم نکالنے لگا۔ بم موجود تھا اس نے دیوار کے سہارے ٹک کر بم دونوں گھٹنوں کے درمیان دبایا پھر اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آگیا۔ دوسرے ہی لمحے بم دس منٹ بعد پھٹنے...... کے لیے تیار تھا۔

کمرے سے باہر آنے سے پہلے اس نے راہداری خالی ہونے کا اطمینان کیا اور دبے پاؤں آگے بڑھتا چلا گیا۔ بم اب بھی اس کے پاس تھا۔ اس نے بم ایک روشن دان کے ذریعے درمیانی کمرے میں ڈالا اور تیزی سے چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ آخری سیڑھی طے کر کے جیسے ہی اس نے چھت پر قدم رکھا اسے ایک کرخت آواز سنائی دی۔

"ہینڈز اَپ!"

سپاہی نے چیخ کر کہا اور رائفل کی نال اس کی طرف سیدھی کرلی۔ اس نے گولی کی پروا کیے بغیر سپاہی پر حملہ کردیا اور اپنا دایاں بازو سپاہی کی گردن میں ڈال دیا۔ سپاہی نے اس پر حملہ کرنے کی غرض سے رائفل نیچے گرادی اور جوابی حملہ کرنا چاہا مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ شیفر پر خون سوار تھا۔ وہ سپاہی کی گردن دباتا چلا گیا۔ جیسے ہی سپاہی کا جسم جھول گیا، شیفر نے اسے فرش پر پٹخ دیا اور سیڑھیوں کی طرف متوجہ ہوا جن پر آنے والوں کے قدموں کی دھمک گونج رہی تھی۔ اس نے پھرتی سے دروازہ بند کیا اور چٹخنی چڑھادی۔ دوسری طرف سے دروازے پر چوٹیں پڑنے لگیں۔ کسی نے خطرے کا سائرن بجادیا تھا۔ شیفر دوڑتا ہوا اس جگہ آیا جہاں اس نے کمند ڈالی تھی۔ کمند بہ دستور موجود تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے رسی تھامی اور نیچے اترنے لگا۔ چھت سے فائرنگ کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ شاید اتحادی فوجی دروازہ توڑنے میں ناکام ہو کر اپنی حسرت نکال رہے تھے یا ان کے خیال میں یہی مناسب تھا۔

شیفر تیزی سے پھسلتا چلا گیا۔ ابھی زمین اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا کہ اس نے رسی چھوڑ دی اور زمین پر آرہا۔ نیچے گرتے ہی اس نے سمت کا اندازہ کیا اور دوڑنا چاہا مگر اب اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ ایک بار لڑکھڑا کر گرا اور پھر اٹھ کر بھاگنے لگا۔ اس نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کے عقب میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس نے مڑے بغیر جان لیا کہ اس کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ عمارت تباہ ہو گئی تھی۔ پے در پے دھماکے اب بھی سنائی دے رہے تھے اور شیفر زمین پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل شیفر نے ہیون کو اپنے اوپر جھکتے دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

"جیمی...... جیمی......! میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں صحیح سلامت نہ لوٹ سکا۔"

شیفر نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑایا۔ اس کے قریب موجود جیمی نے اس کے چہرے پہ اپنی زلفیں بکھیر دیں۔ شاید وہ شیفر کو قربت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔

"شیفر! میرے محبوب! میری زندگی!" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

شیفر نے کسمسا کر رخ بدلنا چاہا۔ جیمی نے اس کی تپتی پیشانی پر اپنے حیات بخش ہونٹ رکھ دیے۔

"میرے محبوب! میں ہر حال میں صرف تمہاری ہوں۔ تمہاری رہوں گی۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا اور اس کا بازو سہلانے لگی۔

شیفر کی واپسی کے بعد وہ مسلسل اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ مسلسل شب بیداریوں نے اس کے صبیح چہرے پہ اپنے تاثرات چھوڑ دیے تھے۔ وہ حزن و ملال کی تصویر بنی اپنے محبوب کی تیمارداری کر رہی تھی۔ شیفر جب عمارت تباہ کرنے روانہ ہوا تھا تو اسے احساس تھا کہ جیمی کی چند روزہ رفاقت نے اس کے دل پر کتنے نقش چھوڑے ہیں۔

ہیون نے اپنے ذرائع کے مطابق اس کے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ خون کی کمی نے شیفر کی ساری توانائیاں چھین لی تھیں پھر رہی سہی کسر ان زخموں نے پوری کردی تھی جو گرم گرم سلاخوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ابتدا میں اس کا سانس بھی رک رک کر چل رہا تھا۔ اسے مناسب علاج اور دواؤں کی ضرورت تھی جبکہ جنگ کے دوران میں دواؤں کی فراہمی مشکل تھی پھر بھی اس تنظیم کے جیالے ہر قیمت پر شیفر کی جان بچانے کے خواہاں تھے۔

رفتہ رفتہ شیفر کی حالت سدھرتی چلی گئی۔ اس نے پہلی بار آنکھ کھولی تو اس کے سامنے اپنے مسیحا کا چہرہ آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ بکھری بکھری زلفوں اور سوجی ہوئی آنکھوں نے شیفر کو بے چین کردیا۔

"جیمی...... جان!" اس نے بے اختیار کہا۔

جیمی نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے خود کو اس کے سینے سے لگا دیا۔

"جان! تم رو رہی تھیں؟" اس نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"نہیں...... نہیں تو......" جیمی نے چہرہ اٹھا کر مسکراتے ہوئے جھوٹ بولا۔

اس لمحے اس نے دوسرا ہاتھ اٹھانا چاہا تو اس نے کلائی پر بندھی پٹیاں دیکھیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ماضی زندہ ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی مہم میں اپنا ہاتھ ضائع کر آیا تھا۔ ہاتھ سے محرومی نے اسے ایک لمحے کے لیے اداس کردیا۔

جیمی نے اس کی اداسی محسوس کرلی اور اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔

"شیفر! تمہارے کارنامے نے اتحادیوں میں تہلکہ مچادیا ہے۔ ان کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔ وہ بھوکے کتوں کی طرح بستی بستی گلی گلی دشمنوں کا کھوج لگاتے پھر رہے ہیں اور نہتے شہریوں پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔"

"جیمی! میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔" "میں اپنے چیف کو رپورٹ دینا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، تم ابھی سفر کرنے کے قابل نہیں ہو۔ دوسرے یہ کہ تم یہاں سے تنہا نہیں جاؤ گے، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میں تمہارے بغیر کس طرح رہ سکتی ہوں۔" جیمی یہ کہتے ہوئے شرما سی گئی۔

شیفر چونک اٹھا۔ اس نے حیا بار جیمی کی طرف دیکھا اور اسے اپنے سینے سے لگا کر سرگوشی کی۔ "جیمی، میری کائنات!" شیفر کی حالت سنبھلی تو اس نے علاقے سے نکلنے کا پروگرام بنانا شروع کردیا۔ اس بار اسے اپنے ذرائع پر انحصار کرنا تھا کیونکہ اس کی واپسی غیر متوقع تھی۔ اس کے محکمے نے تو اس کی موت کی تصدیق کردی ہو گی کیونکہ مہم کی کامیابی اس کی موت سے مشروط تھی۔

ہیون نے جیمی کو اس کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی۔ جیمی کی وجہ سے اسے زیادہ احتیاط برتنی پڑی اور خصوصی انتظامات کرنا پڑے۔ اس کا بس چلتا تو وہ کسی طرح اُڑ کر اپنے چیف کے سامنے جا پہنچتا۔ جہاں اسے اس کے عظیم کارنامے پر شاندار انعام ملتا۔ اس نے یقیناً ایک ایسا کارنامہ انجام دیا تھا کہ اس کے سینے پر تمغا لگایا جاتا، اس نے بارہا اپنے سینے پر ملک کے اعلیٰ ترین تمغوں میں سے ایک تمغا جھلملاتا محسوس کیا۔ تصور میں کئی بار ہٹلر بذاتِ خود اسے مبارک باد دیتا رہا اور وہ جلد از جلد اپنی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل کے خواب سجائے جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

ہیون نے اسے واپسی کا نسبتاً محفوظ راستہ سمجھایا۔ اب اس کے ساتھ جیمی کا مستقبل بھی وابستہ تھا۔ ہیون کی خواہش تھی کہ وہ دونوں خیریت سے جرمنی پہنچ جائیں۔ اس لیے اس نے انہیں اس جنگل تک چھوڑنے کا فیصلہ کیا جسے عبور کرکے وہ جرمن کے زیرِ تسلط علاقے تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتے تھے۔ اس نے شیفر کی خواہش کے مطابق اسلحہ وغیرہ کا بھی بندوبست کردیا تھا۔

جیمی کے حسین اور نازک وجود نے اسے زندگی سے پیار کرنا سکھادیا تھا۔ اب وہ زندہ رہنا چاہتا تھا کیونکہ اسے جیمی کا قرب میسر تھا۔ ہیون اسے مناسب مقام تک چھوڑ کر نیک خواہشات کے ساتھ واپس ہوگیا۔

سفر کا آخری مرحلہ اسے اپنی صلاحیت اور ذہانت سے طے کرنا تھا۔ مسلسل سفر نے اسے بے حد تھکا دیا تھا۔ اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ جیمی نے درختوں سے گھری ایک مناسب جگہ تلاش کی اور اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ بڑی محبت سے بولا۔ ”ہاں جان! اب ہم آرام ہی کریں گے جان! تم میرے لیے بلاوجہ اتنی پریشانیاں اٹھارہی ہو۔“

”شیفر! ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں یہ سب اپنی مرضی سے کررہی ہوں۔“ جیمی نے ایک ادا سے کہا اور اسے سہارا دے کر نیم دراز کردیا اور ہولے ہولے اس کا سر دبانے لگی۔

”جاناں!“ شیفر کی خواب آلود آواز ابھری۔

”ہاں کہو۔“ جیمی نے اس کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ وہ وقت کتنا عجیب ہوگا جب میں اپنے چیف کے سامنے زندہ موجود ہوں گا اور وہ حیرت زدہ ہوکر میری رُوداد سن رہا ہوگا۔ جانتی ہو پھر کیا ہوگا؟“ اس نے جیمی سے سوال کیا۔

”نہیں۔“ جیمی نے جواب دیا۔

”جب میں وہاں پہنچوں گا تو ایک تہلکہ مچ جائے گا۔ سب لوگ مجھے اپنے گھیرے میں لے لیں گے۔ میں بڑے فخر سے اپنا کارنامہ سناؤں گا۔ مجھے یقین ہے میرا کارنامہ سن کر وہ مجھے اپنے کاندھوں پر اٹھالیں گے۔ پھر میرا چیف فوری طور پر میرے کارنامے سے ہائی کمان کو آگاہ کرے گا۔ اس کے بعد، ہاں اس کے بعد...... یقیناً مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ مجھے برلن بھیجا جائے گا اور...... اور پھر یقیناً عظیم فیوہرر، عظیم جرمن کا عظیم رہنما مجھ سے ہاتھ ملائے گا۔ مجھے مبارکباد دے گا اور میرے سینے پر خود اپنے ہاتھوں سے تمغا سجادے گا۔“ شیفر یہ کہتے کہتے خوابوں کی دنیا میں کھوگیا۔ اس نے آنکھیں موندلی تھیں۔

جیمی نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”اچھا ڈیئر! اب آرام کرو۔ سورج غروب ہوتے ہی ہمیں اپنا سفر شروع کرنا ہے۔“ شیفر نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ خواب میں ہٹلر سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ سورج کی چمکدار کرنوں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ پرندوں نے اپنے رین بسیروں کا رخ کرنا شروع کردیا۔ شب بیداری کے عادی جانور اپنا راگ الاپنے لگے تھے۔ فضا ملی جلی آوازوں کے شور سے گونج رہی تھی۔ جیمی کے اعصاب اسے کسی ممکنہ خطرے کا احساس دلا رہے تھے۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہ جس جگہ موجود تھے وہ عام رہ گزر سے یقیناً ہٹ کر تھی لیکن وہاں بھی دونوں کی بیک وقت موجودگی مناسب نہ تھی۔

اس نے شیفر کا کندھا ہلا کر اسے بیدار کرنا چاہا مگر وہ کروٹ بدل کر رہ گیا۔ اب اس کے پاس موجودہ صورتِ حال کا یہی حل رہ گیا تھا کہ وہ تھکے ہوئے شیفر کو سونے دے اور کہیں قریب رہ کر اس کی حفاظت کرے۔ اس نے قریب ہی ایک درخت کو بھانپ لیا۔ وہ اس پر چڑھنے لگی۔ ایک رائفل اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔

تھوڑی سی مشکل کے بعد وہ درخت پر چڑھنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہاں سے وہ شیفر کے ساتھ ساتھ قریبی پگڈنڈی پر بھی نگاہ رکھ سکتی تھی۔

سورج غروب ہوتے ہی پرندوں کی چہکار معدوم ہوگئی۔ اِدھر اُدھر سے جھینگروں کے جھائیں جھائیں بولنے کی آواز بلند ہورہی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے سوچا کہ شیفر کو سوتے ہوئے کافی دیر ہوگئی۔ اب اسے جگا کر آگے بڑھنا چاہیے۔

ابھی وہ پیڑ سے اترنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ کسی جانور نے کرخت آواز میں شور مچایا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس وقت قریب سے کچھ لوگوں کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ اس نے سانس روک کر اس طرف دیکھا۔ رائفل اس کے شانے سے ہاتھوں میں آگئی۔ آنے والے اتحادی فوج کے سپاہی تھے جو شاید معمول کے مطابق گشت پر نکلے

تھے۔ ان کے ہاتھوں میں طاقتور ٹارچیں تھیں جن کی روشنی جیمی کے درخت کے نیچے سے گزر کر ایک جگہ رک گئی۔ جیمی نے دیکھا کہ وہ سپاہی کچھ نشانات کو دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ وہ نشانات ایک خاص سمت کی نشاندہی کررہے تھے۔ سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو آنے کا اشارہ کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف بڑھا جہاں شیفر محوِ خواب تھا۔

”اسے گھیر لو۔“ جیمی نے کسی کی کرخت آواز سنی۔ ایک ٹارچ کی روشنی بدستور شیفر پر پڑ رہی تھی۔

”کیا خیال ہے؟“ ایک سپاہی نے دوسرے سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہیں اس کا قصہ پاک کردو۔“ جواب ملا۔ اسی لمحے شیفر نے کروٹ بدلی۔

ایک سپاہی نے رائفل تان لی اور شیفر کے سر کا نشانہ لینے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر جیمی کے اعصاب تن گئے۔ اس کے سامنے اس کا محبوب، اس کا دلبر موت سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا۔ کیا وہ اپنے محبوب کو مرنے دے۔ اس نے تیزی سے سوچا اگر وہ شیفر کو بچانے کی کوشش کرتی تو باقی فوجی اس کی طرف متوجہ ہوجاتے اور پھر اس کا بچنا محال ہوتا۔ فوجی نے شست باندھ کر جیسے ہی ٹریگر دبانا چاہا جیمی نے رائفل سیدھی کی اور سپاہی کے گولی چلانے سے پہلے فائر کردیا۔ جیمی کی چلائی ہوئی گولی فوجی کے سر میں لگی اور وہ تیورا کر گر پڑا۔ باقی فوجیوں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پوزیشن لیتے ہوئے اس طرف دیکھا جدھر سے فائر ہوا تھا اور یکے بعد دیگرے کئی رائفلیں بیک وقت گرجیں۔ درخت جیمی کا دریدہ جسم نہ سنبھال سکا۔

پے درپے دھماکوں نے شیفر کو بیدار کردیا۔ اس نے گھبرا کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ جیمی کی چیخ نے اسے اپنے حواسوں میں لوٹا دیا تھا۔ اس نے سامنے پڑی رائفل اٹھائی اور کچھ فاصلے پر موجود سپاہی پر گولی چلادی۔ ایک انسانی چیخ اور بلند ہوئی۔ باقی دونوں فوجیوں نے جان بچانے کے لیے ایک طرف زقند لگائی۔ اسی وقت شیفر نے درختوں کے پیچھے چھپ کر ایک فائر داغ دیا اور تیزی سے بھاگنے لگا۔

وہ اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جُل دیتا اور ان کی برسائی ہوئی گولیوں سے بچتا اندر ہی اندر دوڑتا رہا۔ اسے صرف سمت کا اندازہ تھا۔ اجنبی راستے کی دشواریاں اور غلط

راستے کے انتخاب نے اسے بہت سے نئے زخم بخش دیے۔ بھاگتے بھاگتے اس کا سانس اکھڑنے لگا مگر زندگی کی آرزو اسے دوڑنے پر مجبور کرتی رہی۔ وہ آنکھوں کے سامنے رقص کرتے اندھیرے اور رنگ برنگے دائروں کو نظرانداز کرکے آگے بڑھتا رہا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں اور اکھڑے ہوئے درختوں کی شاخوں سے الجھتا رہا پھر اسے محسوس ہوا جیسے درختوں کا علاقہ ختم ہورہا ہے۔ فضا اب پہلے کے مقابلے میں روشن روشن سی ہوگئی تھی۔ اس کا تعاقب ختم ہوچکا تھا مگر وہ پھر بھی بھاگتا رہا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے اپنے قدموں کے نیچے پکی سڑک محسوس کی۔ وہ چند لمحے سانس لینے کے لیے رکا۔ اسی لمحے ایک گاڑی تیزی سے اس طرف آئی۔ اس کی زد سے بچنے کے لیے اس نے قدم بڑھانا چاہے مگر جیسے اس کے پاؤں بے جان ہوگئے تھے۔ وہ اپنی قوت کھوچکا تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگائے مگر پھر بھی وہ زد میں آئے بغیر نہ رہ سکا اور گاڑی کے ساتھ دور تک گھسٹتا چلا گیا۔

☆☆☆

”شیفر! تم...... تم...... زندہ ہو؟“ ملٹری انٹیلی جنس کے چیف برنارڈ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”یس سر! میں نے وہ عمارت تباہ کردی۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے اپنی مرضی سے پروگرام میں کچھ تبدیلی کردی تھی لیکن سر! میں کامیاب رہا ہوں...... یہ دیکھیے...... میں نے۔“

”ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔“ چیف برنارڈ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کاٹی پھر اس کا دوسرا ہاتھ میز کے نیچے رینگ گیا۔ اس کا ہاتھ باہر آیا ہی تھا کہ کمرے میں پانچ مسلح فوجی داخل ہوئے۔ چیف برنارڈ نے انہیں مخاطب کیا۔ ”اسے گرفتار کرلو۔“ چیف برنارڈ کی انگلی شیفر کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

”سر...... سر...... آپ کو یقیناً...... یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے...... شاید آپ تک اس عمارت کے تباہ ہونے کی خبر نہیں پہنچی...... شاید......“

”لے جاؤ اِسے......“ چیف برنارڈ دہاڑا اور مسلح فوجیوں نے شیفر کو نرغے میں لے لیا۔

☆☆☆

درِ زنداں کھلا اور شیفر کے تاریک چہرے پر روشنی عود کر آئی۔ رات بھر وہ ذہنی عذاب میں مبتلا رہا تھا اور اب شاید اسے رِہا کیا جارہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید عمارت تباہ ہونے کی تصدیق ہوچکی ہے۔ لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ اسے رِہا نہیں کیا جارہا تھا بلکہ فوجی اسے اپنے نرغے میں لیے کسی سمت بڑھ رہے تھے۔

”تت...... تم لوگ...... مجھے کہاں لے جارہے ہو؟“ شیفر نے ہکلاتے ہوئے فوجیوں سے سوال کیا۔

شیفر کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ کچھ راہ داریاں عبور کرکے فوجی اسے لیے ایک میدان میں پہنچ گئے۔ شیفر اس میدان کو پہچانتا تھا۔ یہاں فوجی نشانے بازی کی مشق کرتے تھے۔ میدان کے درمیان ایک آہنی کھمبا تھا۔ شیفر کو اس کھمبے سے باندھ کر فوجی رخصت ہوگئے۔ چند ہی لمحے بعد شیفر نے بھاری قدموں کی آوازیں سنیں۔ شیفر کے چہرے سے شدید الجھن اور ہراس مترشح تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دور سے ایک فوجی دستہ مارچ کرتا ہوا آرہا تھا اور اس کے ساتھ چیف برنارڈ بھی تھا۔ مسلح فوجی دستہ کچھ فاصلے پر رک گیا مگر چیف برنارڈ، شیفر کی طرف بڑھا اور پھر اس کے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”شیفر! ہمیں اس عمارت کی تباہی کا علم دوسرے دن ہی ہوگیا تھا۔ کل جب تم اس موت کے مشن سے زندہ بچ کر آئے اور مجھ سے ملے تو میں نے تمہاری آمد سے ہائی کمان کو مطلع کیا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مجھے رات ہی کو ہائی کمان سے احکامات موصول ہوگئے تھے تمہیں موت کے مشن پر بھیجا گیا تھا جس میں تمہیں اپنی جان دینی تھی۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ تم نے حکم عدولی کی۔ اس حکم عدولی کے سبب عظیم فیوہرر نے حکم دیا ہے کہ تمہیں فوری طور پر گولی ماردی جائے۔“ یہ کہتے ہی چیف برنارڈ تیزی سے پیچھے ہٹا اور اس نے جیب سے رومال نکالا' فائرنگ اسکواڈ نے رائفلیں سیدھی کرلیں۔ پھر چیف برنارڈ کا ہاتھ بلند ہوا اور رومال لہرایا۔ فضا پے در پے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ شیفر کا سر ڈھلک کر سینے پر آرہا تھا اور اس کے جوان سینے پر یکے بعد دیگرے تمغے سجتے جارہے تھے۔ پہلا تمغا دوسرا تمغا...... تیسرا تمغا اور چوتھا تمغا...... مگر شیفر نے تو پہلے ہی تمغے سے مطمئن ہوکر اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔ جیسے اس کا خواب پورا ہوگیا ہو......

فلمی الف لیلہ

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب ' صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پروازمیں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر وبلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے' اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اورمیل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامود شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں درداستاں سرگزشت

قسط نمبر: 228

دنیا میں کروڑوں بلکہ اربوں لوگ ایسے ہیں جنہیں کوئی جانتا پہچانتا نہیں تو پھر انہیں یاد رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کہ ان اربوں انسانوں میں بھی کسی حوالے سے اپنا نام اور مقام بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور دنیا انہیں یاد رکھتی ہے۔ مگر ان میں بھی بہت سے لوگ ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں اور اکثر کے ساتھ وہی معاملہ ہوتا ہے جو شاعر نے کہا ہے کہ
نہیں آتی جو اُن کی یاد تو برسوں نہیں آتی

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اسی طرح گلوکار سلیم رضا (اب مرحوم ہو چکے ہیں) چند دن سے یاد آرہے ہیں اور مسلسل یاد آرہے ہیں۔ سلیم رضا نے اس قدر میٹھی آواز پائی تھی کہ جب گاتے تھے تو محسوس ہوتا تھا جیسے کانوں میں شہد ٹپک رہا ہے۔ سُریلے بھی تھے۔ اگرچہ انہوں نے بھی احمد رشدی کی طرح موسیقی کی باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل نہیں کی تھی لیکن کلاسیکی موسیقی سے ناواقفیت کے باوجود غزلیں، گیت اور ہلکے پھلکے رومانی گانے بہت اچھا گاتے تھے۔ ان کے مقبول گانوں کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن ہمارے ملک میں غیروں کو ہر معاملے میں ترجیح دی جاتی ہے۔ ریڈیو پاکستان اور ٹی وی چینلز کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ پاکستانی گلوکاروں کے نغمے اور ان کے بارے میں پروگرام پیش کرتے رہیں تاکہ ہماری نئی نسلیں بھی اپنے پرانے گلوکاروں کے بارے میں جانیں اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرسکیں۔ پاکستانی نجی ٹی وی چینلز تو جیسے بھارتی گانوں، فن کاروں اور ان کے بارے میں ہم پاکستانیوں کو معلومات فراہم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بھارتی فن کاروں کی سالگرہ اور برسی کے موقع پر پاکستانیوں کو خبر دینا ان کے فرائض میں شامل ہوگیا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی عام گانے والے بھی بھارتی گانے بار بار ہمیں سنانے کی قسم کھا بیٹھے ہیں۔ ذرا ذہن پر زور ڈالیے اور یاد کیجیے کہ دوسرے پاکستانی گلوکاروں کو تو چھوڑیے نورجہاں اور مہدی حسن جیسے مایہ ناز فن کاروں کے گانے سننے کو کان ترس گئے ہیں۔ ہمارے ٹی وی پروگراموں کو دیکھ کر اور سن کر تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان میں کبھی کوئی قابلِ ذکر گلوکار تھا ہی نہیں حالانکہ ہندوستانی فلموں میں پاکستانی فلموں کے 80 فیصد نغمات چرا کر یا تو معمولی سی ترمیم کے ساتھ پیش کیے جاچکے ہیں یا پھر جوں کے توں پیش کردیے جاتے ہیں۔ خدا جانے اس حساس اور غیور قوم میں یہ بے حسی اور بے غیرتی کیوں پیدا ہوگئی ہے کہ مختلف شعبوں میں جن پاکستانیوں کو مثال کے طور پر یاد کیا جاتا ہے ہم ان کی قدر کرنے کی بجائے انہیں بدنام اور ذلیل کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

بہرحال اس دل جلانے والی بحث کو چھوڑ کر مطلب کی بات کرتے ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب۔ اس وقت گلوکار سلیم رضا کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جو کئی دن سے نہ جانے کیوں یاد آرہے ہیں اور ان کے گائے ہوئے سُریلے اور میٹھے نغموں کی آوازیں کانوں میں گونج رہی ہیں۔

ہم جب فلمی دنیا سے وابستہ نہیں ہوئے تھے اس وقت بھی آفاق میں فلمی صفحہ ترتیب دینے کی وجہ سے فلمی صنعت اور فلم والوں سے باخبر رہتے تھے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ہر وقت کھوج میں لگے رہتے تھے کہ کون کیا کر رہا ہے اور کون سے نئے چہرے فلمی دنیا میں آرہے ہیں۔ اب بھی یہی عادت سی ہے۔ نومبر میں ان کی برسی منائی جائے گی۔ وقت بھی کیسے پر لگا کر اُڑتا ہے۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے جب وہ فلمی دنیا میں آئے اور اپنے نغمات کا جادو جگایا کرتے تھے۔ پھر ایک دن سنا کہ وہ ملک سے باہر کینیڈا چلے گئے ہیں۔ اس وقت تک ان کے نغمات سنائی دیتے تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر سلیم رضا کی آواز رہتی تھی۔ پھر وہ بھی غائب ہوگئی۔

سلیم رضا اردو فلموں کے زوال کے باعث پاکستان سے نہیں گئے تھے۔ دراصل فلمی دنیا نے انہیں فراموش کردیا تھا۔ فلمیں بن رہی تھیں لیکن سلیم رضا بے کار بیٹھے تھے۔ اس وقت ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہیں پاکستان سے بہت محبت تھی۔ پاکستانی کھانوں کے وہ دلدادہ تھے۔ لاہور ان کے خوابوں کا شہر تھا۔ پاکستان کی فلمی صنعت سے وہ والہانہ پیار کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مجبور ہوکر یہ سب کچھ چھوڑ کر ایک اجنبی دیس چلے گئے اور پھر وہیں کی مٹی میں دفن ہوگئے۔

سلیم رضا مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آگئے اور لاہور میں آباد ہوگئے۔

یہ ایک ناقابلِ فہم بات ہے کہ کرسچن ہونے کی وجہ سے انہیں مشرقی پنجاب میں کوئی خطرہ نہیں تھا پھر بھی انہوں نے پاکستان آنے کو ترجیح دی۔ ان کا مختصر خاندان 1947ء میں ہی پاکستان آگیا تھا۔ ان کے ہمراہ ان کی والدہ، تین بہنیں اور دو بھائی تھے۔ والد کا انتقال ہوچکا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ان کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے ایک بھائی کینیڈا چلے گئے تھے۔ سلیم رضا اور ان کے ایک بھائی لاہور ہی میں رہے۔ وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن حالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر انہیں بھی بالآخر لاہور چھوڑنا پڑا۔ کینیڈا میں سنا ہے کہ انہوں نے ایک میوزک اکیڈمی بھی قائم کرلی تھی کیونکہ اس کے سوا وہ کوئی کام نہیں جانتے تھے۔

گلوکار سلیم رضا

سلیم رضا کو بچپن ہی سے گانے کا شوق تھا۔ ہمیں یاد ہے اور اس کا تذکرہ بھی پہلے کرچکے ہیں کہ جب ہم میکلوڈ روڈ پر اپنے اخبار کے دفتر جاتے تھے تو راستے میں ایک دو منزلہ عمارت میں مسعود اشعر، قمر زیدی اور خلیل احمد بھی رہتے تھے۔ ان تینوں سے ہماری بہت دوستی تھی۔ ان کے ساتھ ایک اور دلچسپ نوجوان بھی رہتے تھے جن کا پورا نام یاد نہیں رہا۔ ہم لوگ انہیں اللہ خان کہا کرتے تھے۔ اس عمارت کی سیڑھیوں کے نزدیک پہلی منزل میں ایک لانڈری اور چند دکانیں تھیں۔ سلیم رضا اکثر لانڈری کی دکان میں سیڑھیوں کے پاس ہارمونیم سنبھالے گاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کی آواز کی کشش ہمیں کچھ دیر سیڑھیوں کے پاس رکنے کے لیے مجبور کردیتی تھی۔

خلیل احمد اس وقت تک موسیقار نہیں بنے تھے۔ شوقیہ گلوکاری کرتے تھے۔ انہیں ایک مرتبہ میڈم نورجہاں کے ساتھ ایک دوگانہ ریکارڈ کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ یہ قمر زیدی کی کوششوں سے ممکن ہوا تھا۔ اس زمانے میں فلم "گلنار" بن رہی تھی۔ قمر زیدی سید شوکت حسین رضوی کے اسسٹنٹ تھے۔ گلنار کے سیٹ پر بھی ان کا آنا جانا تھا۔ اسٹوڈیو میں ہر شخص ان سے اور وہ ہر شخص سے واقف تھے۔ قمر زیدی گول مٹول چھوٹے قد کے تھے۔ ہر وقت ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی کرتے تھے۔ وہ اداکاروں کی نقلیں اتارنے کے ماہر تھے۔ ہم لوگ انہیں چائے کا لالچ دے کر ان سے نقلیں اور لطیفے سنا کرتے تھے۔ اور تو اور گلنار کے مصنف اور ہدایت کار امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی (جو اس فلم میں تاج صاحب کی فرمائش پہ اداکاری بھی کر رہے تھے) اداکارہ ببو بیگم قمر زیدی کے بہت دلدادہ تھے اور ان سے اداکاروں اور دوسرے فلمی لوگوں کی نقلیں سنا کرتے تھے۔ جس سیٹ پر شوکت تھانوی اور ببو بیگم جیسے ہنس مکھ اور ہنسانے والے موجود ہوں وہاں کسی اور کی دال کہاں گل سکتی تھی مگر قمر زیدی کی دال خوب گلتی تھی۔

دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تذکرہ تھا سلیم رضا کا۔ اس وقت ہمیں ان کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن ان کی آواز نے ہمیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ خلیل احمد سے ہم نے کہا کہ بھائی یہ سیڑھیوں کے پاس بیٹھے جو صاحب گانا گاتے نظر آتے ہیں یہ کون ہیں۔ جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ نزدیک ہی کہیں رہتے ہیں۔ ان کو گانا سنانے کا اور لانڈری والے کو گانا سننے کا شوق ہے۔ دونوں اپنا شوق پورا کرلیتے ہیں لیکن اس لڑکے کی آواز بہت اچھی ہے۔

سلیم رضا نے باقاعدہ گانے کا آغاز ریڈیو سے کیا تھا۔ ان کی آواز فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو بھی پسند آگئی اور انہیں ایک فلم میں گلوکاری کا موقع ملا تو جیسے کامیابیوں کا دروازہ کھل گیا۔ اپنی آواز کی انفرادیت کی وجہ سے سلیم رضا نے جلد ہی فلمی صنعت میں اپنا مقام پیدا کرلیا حالانکہ اس وقت پاکستانی فلموں میں گلوکاروں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ کیسے کیسے گلوکار اس زمانے میں اپنی آوازوں کا جادو جگا رہے تھے۔ یہ پاکستانی فلمی صنعت کا شہرۂ آفاق دور تھا۔ مہدی حسن، مجیب عالم، مسعود رانا، احمد رشدی، عنایت حسین بھٹی، علی بخش ظہور، شرافت علی، ایس بی جان، ڈھاکا کے بشیر احمد، یہ لوگ فلمی صنعت پر چھائے ہوئے تھے۔ ان قد آور اور مقبول گلوکاروں کے سامنے کسی کا چراغ جلنا مشکل تھا لیکن سلیم رضا نے اس کے باوجود فلمی گلوکاروں کی فہرست میں اپنا نام پیدا کرلیا۔۔۔ آپ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر آواز مختلف تھی۔ ہر ایک کا انداز جدا تھا۔ ہدایت کاروں کے لیے یہ آسانی تھی کہ ہر اداکار اور ہر فلم کے تقاضے کے مطابق وہ گلوکار تلاش کرلیتے تھے۔ جیسے احمد رشدی وحید مراد کے لیے۔ مہدی حسن محمد علی کے لیے مخصوص تھے۔ انہوں نے دوسرے گلوکاروں کے گانے بھی گائے لیکن یہ آوازیں عموماً ان کے لیے بہت موزوں تھیں۔ ندیم کے لیے بشیر احمد نے پہلی فلم میں گانے گائے تھے۔ اس کے بعد مجیب عالم نے ان کے لیے بہت خوبصورت گانے

گائے۔ ان گلوکاروں کے ہوتے ہوئے ایک نئے گلوکار کا کامیابی حاصل کرنا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ سلیم رضا اگرچہ پنجاب میں پیدا ہوئے اور پنجابی ان کی مادری زبان تھی لیکن اردو کا لب ولہجہ ایسا تھا کہ دلی والے جس پر رشک کریں۔ سلیم رضا آئے اور چھا گئے۔ ان کی آواز کا طوطی بولتا تھا۔ وہ غزلیں اور گیت یکساں خوبصورتی سے گاتے تھے جس کی وجہ سے انہیں ملک گیر شہرت حاصل ہوگئی۔

تنویر نقوی کا لکھا ہوا گانا

''جانِ بہاراں، رشکِ چمن'' تو انہوں نے ایسا گایا تھا کہ گانے کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔ قوالیاں اور نعتیں بھی وہ یکساں مہارت سے گاتے تھے۔ ان کے گائے تقریباً تمام گانے بہت مقبول ہوئے۔

چند گانے ملاحظہ کیجئے اور یاد کیجئے کہ کیا آپ نے سنے ہیں اور کیا آپ انہیں بھولے ہیں؟

1۔ آؤ بچو سیر کرائیں تم کو پاکستان کی
2۔ جان کہہ کر جو بلایا تو برا مان گئے
3۔ حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں
4۔ پاکستان زندہ، پاکستان زندہ باد
5۔ بے درد زمانے والوں نے کب درد کسی کا جانا ہے
6۔ چھپ رہا ہے بدلیوں میں چاند کیوں
7۔ نہ آنے آج بھی تم کیا یہ بے رخی کم ہے
8۔ اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بیقرار کیوں،
جس نے بھلا دیا تجھے اس کا ہے انتظار کیوں
9۔ تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیوں معلوم
10۔ گھڑی گھڑی یوں کھڑی کھڑی کیا سوچ رہی ہے تو
11۔ بھول جاؤ گے تم کر کے وعدہ صنم
12۔ جھنگ کے دامن چلی ہو تن کے
13۔ میرے دل کی انجمن میں ترے دم سے روشنی ہے

ان کے علاوہ بھی ان کے بے شمار نغمات نے مقبولیت حاصل کی تھی۔ کسی دوسرے گلوکار کو اس نئے گلوکار کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ فلمیں بہت زیادہ تعداد میں بنائی جا رہی تھیں اور کسی نئے گلوکار کی آمد سے کوئی دوسرا گلوکار متاثر نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حسد کا جذبہ کسی میں نہ تھا اور باہمی تعلقات اور دوستی کے رشتے قائم تھے۔

سلیم رضا کے گانے کا انداز بہت فطری تھا۔ وہ الفاظ کو توڑ موڑ کر اپنی طرف سے طرز میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اس زمانے کی تقریباً سبھی گلوکاراؤں کے ساتھ گانے گائے جن میں میڈم نور جہاں، نسیم بیگم، مالا، ناہید نیازی، کوثر پروین، آئرین پروین، زبیدہ خانم شامل ہیں۔ ان کے گائے ہوئے گانے درپن، سنتوش کمار، علاؤ الدین، طالش، سدھیر، وحید مراد وغیرہ پر فلمائے گئے۔ ان کے گانے کا انداز ایسا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ اداکار خود گا رہے ہیں۔

انہوں نے تقریباً دو سو فلموں میں گانے گائے اور انہیں کئی نگار ایوارڈز بھی حاصل ہوئے۔

وہ ایک محبِ وطن پاکستانی تھے لیکن جب فلم سازوں نے یکایک انہیں فراموش کرنا شروع کر دیا تو آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ کینیڈا میں ان کے بھائی نے کینیڈا آنے کی دعوت دی تو وہ انکار نہ کر سکے۔ 1975 میں وہ چشم نم پاکستان چھوڑ کر کینیڈا چلے گئے لیکن لوگ بتاتے تھے کہ وہ پاکستان، لاہور اور یہاں کے ماحول کو یاد کر کے رو دیا کرتے تھے۔ لاہور اور پاکستان سے انہیں دلی محبت تھی مگر خواہش کے بغیر انہیں یہ سب چھوڑ کر پردیس جانا پڑا۔

کینیڈا میں انہوں نے میوزک اکیڈمی قائم کی تھی جہاں شوقین لڑکے ان سے موسیقی اور گلوکاری سیکھنے آتے تھے۔ گزارہ بہت اچھی طرح ہو رہا تھا لیکن لاہور کی کسک دل سے نکل نہ سکی۔

ذہنی پریشانیوں نے انہیں بیمار کر دیا۔ ایک بار ان کے بھتیجے کینیڈا پہنچ گئے اور انہیں فون کر کے بتایا کہ میں ائرپورٹ پر ہوں آپ آ کر مجھے لے جایئے۔

جواب میں انہوں نے کہا کہ میں بہت بیمار ہوں اس لیے نہیں آ سکتا۔ تم اس پتے پر خود ہی ٹیکسی لے کر آ جاؤ۔ دراصل سلیم رضا کے گردوں نے جواب دے دیا تھا۔ وہ بیماری کی وجہ سے کام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ڈیلے سس کرانے کے لیے اسپتال جانا پڑتا تھا۔ بھتیجا ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ وہ بھی اس کے گلے مل کر بہت روئے۔ لاہور اور لاہور والوں کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ انہیں غم تھا کہ اب وہ دوبارہ لاہور کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

بھتیجے نے واپس آتے ہوئے ان سے آٹوگراف لیے اور درخواست کی کہ اس پر کچھ لکھ بھی دیں۔ انہوں نے کہا ''میں تمہیں اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ لکھ کر دے رہا ہوں۔'' اور آٹوگراف بک پر دستخط کے ساتھ یہ شعر لکھ دیا۔

موت ایک لفظ ہے بے معنی سا
جس کو مارا حیات نے مارا

آخر کار حیات نے انہیں بھی مار دیا۔ پاکستان واپسی کی حسرت لیے ہوئے 31 نومبر 1984ء کو وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔

انہوں نے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔ بیٹا زیرِ تعلیم تھا اور وہاں کے دستور کے مطابق جاب بھی کرتا تھا۔ ان کی بیوی نے سوشل ورک میں ایم اے کیا تھا اور کسی ادارے میں کام کرتی تھیں۔ عزت سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ پاکستان سے کوئی فن کار کینیڈا جاتا تھا تو وہ سلیم رضا کا ہی مہمان ہوتا تھا۔ یہ سب تصاویر انہوں نے اکٹھی کر کے رکھی تھیں۔ خود بھی بار بار دیکھتے تھے اور دوسرے آنے والے مہمانوں کو بھی دکھا کر پرانے دن یاد کر کے رو پڑتے تھے۔

اب سلیم رضا کا نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ نہ ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہم لوگوں نے اس ملک سے محبت کرنے والے کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔

سلیم رضا سے ہماری ملاقات رہی تھی مگر جب بھی ملتے تھے بہت احترام اور عزت کرتے تھے۔

ہماری ایک فلم ''کنیز'' میں ان کا گایا ہوا ایک گانا بھی شامل تھا جو محمد علی وحید مراد اور زیبا پر فلمایا گیا تھا۔ اس کے بول تھے۔

دونوں طرف ہے آج برابر ٹھنی ہوئی
اور مجھ غریب جان کے اوپر بنی ہوئی
انقلابات ہیں زمانے کے۔

☆☆☆

1857ء کی جنگِ آزادی ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کی انگریزی راج سے آزادی حاصل کرنے کی آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر بغاوت کی کوئی تحریک نہ اٹھی اور انگریزوں نے ہندوستان کو تاج برطانیہ کا باقاعدہ حصہ اور نوآبادی بنالیا۔ انگریز مورخ اس کو غدر کہتے ہیں اور انہوں نے حکومت کے اولین دور میں ہی ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ 1857 میں جو کچھ ہوا وہ آزادی کی تحریک نہیں چند لوگوں کی سازشوں کے نتیجے میں ایک بغاوت تھی جسے بہت جلد دبا دیا گیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آزادی کی ناکام کوشش کو بغاوت اور کامیاب کوشش کو غدر کا نام دیا جاتا ہے۔ انگریز دراصل مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے کیونکہ جب انگریز تجارتی مراعات مانگنے کے لیے ہندوستان آئے تو یہاں مغلوں کی شاندار سلطنت قائم تھی۔ اس سے پہلے بھی مسلمان ہی ہندوستان پر حکومت کرتے رہے تھے۔ ہندو تو سالہا سال سے محکومی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور آزادی یا حکومت کرنے کا خیال تک بھول گئے تھے۔ اس لیے انگریز کو سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں سے تھا جو ایک خوددار، بہادر اور حکمرانی کرنے کی عادی قوم تھی۔ انگریز بخوبی جانتے تھے کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے حکمرانی کا خناس نکالنا ضروری ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ 1857 کی جنگِ آزادی میں بھی مسلمان ہی پیش پیش تھے۔

یہ بھی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں نے اس بغاوت کو دبانے کے لیے بھی ہندوستانی فوج ہی کا سہارا لیا ورنہ جتنی کم تعداد میں انگریز ہندوستان میں موجود تھے ہندوستانی اگر چاہتے تو انہیں چٹکی سے مسل کر ختم کر سکتے تھے۔ ہم تاریخ دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ قتلِ عام اور تباہی بھی مسلمانوں ہی کی ہوئی۔ انگریز مسلمانوں کو اس طرح کچلنا چاہتے تھے کہ یہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہیں۔

ہندوستان میں اقتدار سنبھالتے ہی انگریزوں نے ایک منصوبے کے تحت ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بے اعتباری کے بیج اس طرح بوئے کہ یہ کبھی ایک دوسرے کے نزدیک نہ آسکیں بلکہ ان کی باہمی نفرت اور دشمنی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ انگریزوں نے دوسری طرف ہندوؤں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی کہ یہ ملک دراصل تمہارا ہے۔ اس پر حکمرانی کرنے کا حق بھی تم ہی کو حاصل ہے۔ مسلمان تو غیر ملکی حملہ آور ہیں جنہوں نے تمہیں زبردستی اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اس طرح (Divid and Rule) کی حکمتِ عملی پر عمل کر کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے میں کچھ خواتین بھی شامل تھیں جن کے نام آج بھی تاریخ کی کتابوں میں جگمگا رہے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ ہم خصوصاً نئی نسل ان کو بھول گئی ہے بلکہ ان کے ناموں تک سے ناواقف ہے۔ ضروری ہے کہ موقع بموقع ان کی یادیں بھی تازہ کی جائیں اور انہیں نئی نسلوں سے متعارف کرایا جائے۔

انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھانے اور انہیں ہندوستان سے نکالنے کی کوشش اور جدوجہد کرنے والی خواتین میں عام طور پر دو نام لیے جاتے ہیں۔ ان میں ایک

”جھانسی کی رانی“ کا ہے۔ اس حوصلہ مند اور بہادر خاتون نے باقاعدہ علم بغاوت بلند کیا لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ ”جھانسی کی رانی“ کے نام سے ہندوستان میں ایک فلم بھی بن چکی ہے جس کے فلم ساز ہدایت کار سہراب مودی تھے۔ جھانسی کی رانی کا مرکزی کردار اداکارہ مہتاب نے ادا کیا تھا۔ یہ فلم بہت عظیم الشان پیمانے پر بنائی گئی تھی۔ جنگ و جدل کے مناظر، اس دور کے شاندار لباس، ہزاروں مسلح فوجی سپاہی اور اس زمانے میں استعمال ہونے والا اسلحہ استعمال کیا گیا تھا جس پر سہراب مودی نے پانی کی طرح روپیا بہایا تھا مگر بدقسمتی سے یہ فلم نہ صرف فلاپ ہوگئی بلکہ سہراب مودی کو قرضوں میں گرفتار بھی کرگئی۔ سہراب مودی نے مہتاب سے شادی کرلی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شادی انہیں راس نہ آئی اور وہ مالی طور پر کھڑے نہ ہو سکے۔ اس کے بعد وہ کوئی بڑی فلم نہ بنا سکے جبکہ رفتہ رفتہ فلم سازی سے ہی قطع تعلق کرلیا۔

اس جنگِ آزادی کے سلسلے میں دوسرا نام اودھ کی جلیل القدر ”بیگم حضرت محل“ کا تھا۔ ان دونوں خواتین نے عورت ہونے کے باعث انتہائی جرأت مندانہ عسکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اگر قسمت یاوری کرتی اور خود ان کے ہم وطن بھی ان کی اس جنگ میں شامل ہوجاتے تو شاید آج برصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔ ان دونوں خواتین کے علاوہ بے شمار لوگوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ ان میں سے کچھ شہید ہوگئے اور جنگ کے بعد کچھ کو پھانسی دے دی گئی۔ جن کا جرم ثابت نہ ہو سکا انہیں کالے پانی بھیج دیا گیا۔ اس جزیرے کو انگریزوں نے ایک کھلے جیل خانے میں تبدیل کردیا تھا اور جسے ایک بار کالے پانی کی سزا ہوجاتی تھی وہ پھر وہاں سے واپس نہ آتا تھا۔ کہتے ہیں کہ قدآور گھنے درختوں کے سائے میں دوسرے درخت صرف پودے ہی رہ جاتے ہیں' بڑھ نہیں سکتے۔ درحقیقت اس جنگ میں مردوں کے علاوہ کان پور، لکھنؤ، دہلی اور دوسرے شہروں کی خواتین نے بھی حصہ لیا تھا۔ بلکہ طوائفیں بھی اس میں پیش پیش تھیں۔ اس زمانے کی طوائفیں جسم فروشی نہیں کرتی تھیں، گلوکاری اور رقص کرتی تھیں۔

خالد بہزاد ہاشمی نے اس معاملے میں کافی تحقیق کی ہے۔ انہیں تاریخ و تحقیق سے بہت لگاؤ ہے اس لیے خبروں کے خزانے تلاش کرلاتے ہیں۔ اب ذرا عزیزن بائی کا تذکرہ سنیے۔

”عزیزن بائی کان پور کی ایک طوائف تھیں۔ اپنے حسن و جمال اور قیامت خیز رقص و نغمے کی وجہ سے وہ کان پور کی بجلی کے نام سے مشہور تھیں۔ لیکن وہ وطن کی محبت سے سرشار تھیں۔ انہوں نے ایک خواتین بریگیڈ قائم کی تھی۔ اس بریگیڈ میں شامل خواتین موقع پا کر انگریز فوجیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناتی تھیں۔ ان کی ایک ساتھی خاتون درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب کوئی انگریز نظر آتا تو اس کو گولی کا نشانہ بنا دیتی تھیں۔

عزیزن بائی کان پور کی مشہور مغنیہ سعید حسن بانو گوہر (حمیدہ بائی) کی بیٹی تھیں۔ عزیزن کی دادی ہندو تھیں لیکن اسلام قبول کرلیا تو ان کی بیٹی اور نواسی بھی مسلمان ہوگئیں۔ عزیزن کی پیدائش کان پور کے محلے لورکی عانی میں ہوئی تھی جو طوائفوں کا محلّہ تھا۔ اس زمانے کی مہذب اور اخلاق و آداب سے واقف ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی۔ عزیزن کو بھی تمام آداب سکھائے گئے۔ جب وہ جوان ہوئیں تو ایک قیامت تھیں۔ ان کا حسن و جمال دیکھنے کے قابل تھا جس کی وجہ سے ان کی بہت شہرت تھی۔ عزیزن نے بالا خانے پر بیٹھنا شروع کیا تو سارے شہر میں دھوم مچ گئی اور ان کے حسن و جمال کا دور دور تک چرچا ہوگیا۔

عزیزن بائی کی آواز جادو جگاتی تھی اور رقص کرتے ہوئے وہ بجلی کی طرح کوندتی تھیں۔ ان کا بالا خانہ شہر کے باذوق رئیسوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان میں ایک شاندار فوجی نوجوان شمس الدین بھی تھے۔ وہ کان پور کے باغی سپاہیوں کے کمانڈر تھے۔ عزیزن بائی شمس الدین کی محبت میں گرفتار ہوگئیں۔ شمس الدین کے دل میں بھی ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں خاندانی طوائفیں جسم فروشی نہیں کرتی تھیں۔ گھروں کا ماحول انتہائی مہذب اور ادب آداب کا ہوتا تھا۔ شرفا کے بچے آدابِ محفل، گفتگو اور تہذیب سیکھنے کے لیے ان کے گھروں میں جایا کرتے تھے۔ انقلابی رہنما رام چندر راؤ عرف تانتیا ناناصاحب کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کردیا۔ عزیزن بائی بھی اس تحریک میں شریک ہوگئیں۔ ایک انگریز مورخ نے عزیزن بائی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اسلحہ باندھے گھوڑے پر سوار شہر کا چکر لگاتی رہتی تھی۔ بے حال اور زخمی سپاہیوں میں طبی امداد اور دودھ، مٹھائی اور پھل تقسیم کرتی رہتی تھیں۔ وہ زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی بھی کرتی تھیں۔

راج کپور فیملی

25 جون 1857ء میں جب جنگِ آزادی کا اعلان ہوا تو کان پور میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔ انگریز عورتوں کو تحفظ کے لیے ایک جگہ اکٹھا کردیا گیا جسے ”بی بی گھر“ کہا جاتا تھا۔ باغیوں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس گھر میں پوشیدہ ہونے والی عورتوں اور بچوں کو ہلاک کردیا۔ اس جرم میں عزیزن بائی کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان کو انگریز کمانڈر جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کیا گیا۔ جنرل عزیزن بائی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا اور اس کی بہادری سے متاثر تھا۔

عزیزن بائی کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر کہا کہ اگر وہ جنگ میں شریک ہونے کا اقرار کرلے تو اس کو معاف کردیا جائے گا۔ بہت اصرار کے باوجود عزیزن بائی نے صاف انکار کردیا۔ بالآخر اس جرم میں اس کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ اس طرح عین جوانی میں ایک حسین و جمیل خاتون جنگِ آزادی کی آگ کا ایندھن بن گئی۔

عزیزن بائی کا نام گمنام رہنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انگریز مورخین نے اس کو ڈیڑھ سو بے گناہ عورتوں اور بچوں کا قاتل ٹھہرایا۔

ہندوستان میں تاریخ پہلے ہندوؤں ہی نے لکھی تھی اس لیے انہوں نے عزیزن کو مسلمان کی حیثیت سے اہمیت نہیں دی۔ پھر وہ بھی نہیں بھولے تھے کہ عزیزن بائی کی دادی نے ہندو مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا تھا۔ مسلمان مورخین نے جب تاریخ لکھی تو عزیزن بائی کو طوائف کے پیشے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قابلِ ذکر نہ سمجھا اور یہ بھول گئے کہ اس دور کی طوائفیں انتہائی مہذب، تعلیم یافتہ اور آدابِ محفل سے واقف ہوتی تھیں اور جسم فروشی نہیں کرتی تھیں۔ ان کے گھروں کے مہذب اور صاف ستھرے ماحول کی وجہ سے ہی شہر کے امراء، رئیس اور شرفا اپنے بچوں کو ان کے گھروں میں تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ عزیزن بائی کو تاریخ میں اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا۔ خالد بہزاد ہاشمی نے تحقیق کے بعد اس شخصیت کا کھوج نکالا اور ان کی کہانی کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

☆☆☆

خوشونت سنگھ جیسے انسان دنیا میں یا کم از کم برصغیر میں بہت کم اور نایاب ہوتے ہیں۔ خوشونت سنگھ عمر کی سنچری مکمل نہ کرسکے اور 99 پر آؤٹ ہو کر کریز سے رخصت ہوگئے لیکن ـــــ عمر کے 99 سال میں انہوں نے ہمہ جہتی اور ہمہ گیری کا ایسا مظاہرہ کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اکیلے شخص نے کتنی زندگیاں بسر کی ہیں اور ان کی زندگی کا ہر پہلو قابلِ تعریف اور قابلِ تحسین ہے۔

خوشونت سنگھ یوں تو سکھ تھے لیکن سیکولر ذہنیت کے مالک تھے۔ اس کے باوجود وہ انسانی ہمدردی یا سکھوں پر مظالم کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ انہوں نے اپنی ایک کتاب میں یہ واقعہ لکھا ہے۔

ریل کے سفر کے دوران میں ایک ہندو نے ان سے پوچھا" آخر آپ سکھ ان واقعات کو بھول کیوں نہیں جاتے جو عرصہ دراز پہلے رونما ہوئے تھے۔خوشونت سنگھ نے جواب دیا جب ہندوستانی برٹش راج کی غلامی کو نہیں بھول سکتے، گاندھی کی ہتیا کو نہیں بھول سکتے' ہندوستانیوں پر کیے جانے والے انگریزوں کے مظالم کو نہیں بھول سکتے۔یہاں تک کہ مذہبی تہواروں دیوالی اور دسہرہ کو نہیں بھول سکتے، اسی طرح سکھ ان پر کیے جانے والے ظلم اور ناانصافی کو نہیں بھول سکتے۔"

خوشونت سنگھ ایک انتہائی ذہین بلکہ نابغہ انسان تھے۔ وہ نڈر تھے۔کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔دل کی بات قلم کی زبان پر ضرور لاتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ ہندوستان چلے گئے تھے لیکن اپنی جائے پیدائش ہڈالی کو کبھی نہیں بھولے۔انہوں نے دو وصیتیں کی تھیں۔ایک یہ کہ انہیں جلایا نہ جائے دفن کیا جائے۔ دوسری یہ کہ انہیں ان کے آبائی گاؤں ہڈالی میں دفن کیا جائے۔ان کی پہلی وصیت تو پوری کردی گئی لیکن انہیں ہندوستان میں دفن کیا گیا۔ان کے لواحقین کا مصمم ارادہ ہے کہ وہ ان کی قبر کی مٹی ہڈالی میں لاکر دفن کریں گے۔

خوشونت سنگھ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحبِ مطالعہ تھے۔انہوں نے زندگی کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا اور مختلف قسم کے تجربات سے دوچار ہوئے تھے۔انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی تھی پھر قانون پڑھنے کے لیے لنکنز ان لندن اور Inner Temple میں تعلیم مکمل کی۔کئی برس وہ لاہور ہائیکورٹ میں وکالت کرتے رہے۔ 1947ء میں وہ بھارتی وزارت سے وابستہ ہوگئے۔کینیڈا اور لندن میں سفارتی ذمے داریاں ادا کیں۔یونیسکو میں ہندوستان کے نمائندے مقرر ہوئے۔وہ چاہتے تو ساری زندگی وزارت خارجہ میں گزار دیتے۔وزیر اور سفیر بنتے۔مگر ان کے اندر ایک صحافی اور تخلیق کار کی روح ہمیشہ انہیں بے چین کرتی رہی۔انہوں نے سوچا کہ میں وزارت خارجہ میں کام کرنے کے لیے نہیں کسی اور کام کے لیے پیدا ہوا ہوں۔

سول سروس چھوڑ کر 1951ء میں وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے جہاں انہیں صحافت سے واسطہ پڑا۔ ریڈیو سے وہ بمبئی کے مشہور انگریزی جریدے "السٹرڈ ویکلی" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور دس سال تک اداریے اور کالم لکھتے رہے جو سارے ملک میں ذوق شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ان کے طرزِ تحریر میں کاٹ، طنز اور سچائی تھی۔ان کے کالم آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔اسی دوران میں انہوں نے تخلیقی کام کا آغاز کیا۔ ان کے ناول جو فسادات کے بارے میں غیرجانبداری سے لکھے گئے ہیں اس نے ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ مغربی ممالک کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ انگریزی میں لکھتے تھے اور بہت خوبصورت انگریزی لکھتے تھے۔ انہوں نے افسانے اور ناول بھی لکھے جن میں "اے ٹرین ٹو پاکستان" دونوں ملکوں میں بے حد مقبول ہوا۔۔۔ اس ناول میں انہوں نے فسادات کے دوران میں رونما ہونے والے واقعات سعادت حسن منٹو کی طرح بالکل غیرجانبداری سے لکھے اور سکھوں کے طرزِ عمل کو بھی نہیں بخشا۔انہوں نے دو جلدوں میں سکھوں کی تاریخ لکھی۔ان کا طرزِ تحریر اور طرزِ فکر قابلِ ستائش تھا۔1950ء سے 2014ء تک ان کا قلم مختلف موضوعات کے بارے میں رواں رہا۔ان کا آخری کالم انتقال سے تین دن قبل شائع ہوا تھا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر عملی اور بے چین فطرت کے مالک تھے۔وہ پارلیمنٹ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔1984ء میں امرتسر کے گولڈن ٹمپل پر بھارتی فوج نے حملہ کیا جس کو وہ کبھی نہیں بھولے۔جب انہیں حکومت نے اعلیٰ ترین اعزاز پدم بھوشن عطا کیا تو انہوں نے اس کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ جس حکومت نے بے گناہ سکھوں کا خون بہایا ہے وہ اس سے کوئی ایوارڈ نہیں لیں گے۔

خوشونت سنگھ لطیفہ گو اور ہنس مکھ تھے۔وہ ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، اس کے مالک معروف صنعت کار برلا تھے۔خوشونت سنگھ اپنے کالموں میں طنزیہ انداز میں انہیں "ان داتا" لکھا کرتے تھے۔

ایک بار برلا نے ان سے دریافت کیا۔"سردار صاحب، آپ ریٹائر کب ہوں گے۔"

انہوں نے جواب دیا۔"میں شمشان گھاٹ پہنچنے سے پہلے ریٹائر نہیں ہوں گا۔"

اور ایسا ہی ہوا یہ اور بات ہے کہ ان کی نعش کو جلانے کی بجائے دفن کیا گیا۔

خوشونت سنگھ دوسروں ہی کے بارے میں نہیں بلکہ خود اپنے بارے میں بھی سچ لکھنے سے باز نہیں آتے تھے۔انہوں نے اپنی رنگین زندگی کے بارے میں بھی سب کچھ لکھ دیا ہے۔

ان کی تحریروں میں شوخی اور طنز تھا۔لیکن انہوں نے تصوف اور زندگی اور موت کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔

کسی نے لکھا ہے کہ 70 سال کی عمر کے بعد بھی وہ موت سے خائف نہ تھے۔وہ موت کو ایک حیرت انگیز واقعہ سمجھتے تھے لیکن یہ معلوم کرنے کی فکر میں رہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔

ان کا ایک پُرلطف واقعہ مشہور ہے کہ بھارت میں ایک نئے فرقے کے مذہبی رہنما رجنیش سے پوچھا کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے۔

رجنیش جی نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ نیک کام کرنے والوں کو ہر آسائش ملے گی اور گناہ کرنے والوں کا حشر بہت برا ہوگا۔اس بارے میں کئی واقعات بھی انہوں نے تفصیل سے سنائے۔

خوشونت سنگھ خاموشی سے سنتے رہے پھر بولے"تم تو مرنے کے بعد سزاؤں کا نقشہ ایسے کھینچ رہے ہو جیسے خود وہاں سے ہوکر آئے ہو؟"

خوشونت سنگھ کی سبھی عزت کرتے تھے اور انہیں احترام دیتے تھے۔ان کی ایک کتاب سابق بھارتی صدر ابوالکلام نے مانگی تو انہوں نے کہا"خود آکر لے جاؤ۔"

بھارتی صدر کسی پروٹوکول کے بغیر ان کے فلیٹ پر گئے خوشونت سنگھ اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ صدر کے احترام میں کھڑے بھی نہیں ہوئے۔کمرے میں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔کوئی آرائشی سامان نہ تھا۔دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر انہوں نے اپنی کتاب صدر کو پیش کی۔انہوں نے کہا۔"اس پر آٹوگراف بھی کردیجیے۔"

خوشونت سنگھ مسکرائے۔"شکر ہے کسی نے تو مجھ سے آٹوگراف مانگے۔" اور کتاب پر آٹوگراف دے کر انہیں پیش کردی۔

ایک مصنف نے درست لکھا ہے کہ ایسے لوگ انتقال کرکے دنیا سے منتقل ہوجاتے ہیں مگر اپنی یادوں اور کاموں کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

زندگی کے آخری سالوں میں ان کی تحریروں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ مرنے کے لیے پابہ رکاب بیٹھے ہیں۔ انہوں نے موت کے بارے میں لکھا تھا۔"موت کے بعد اچھی زندگی چاہتے ہو تو حق داروں کو ان کا حق دے دو۔دنیا کی چیزوں سے محبت نہ کرو کہ جلد ہی تم ان سے محروم

خوشونت سنگھ

ہوجاؤ گے۔اپنا سارا بوجھ اتار دو۔ کچھ بھی چھپا کر نہ کرو۔ اپنے ہاتھ خالی رکھو کیونکہ تمہیں دنیا سے خالی ہاتھ ہی جانا ہے۔یہ کروگے تو موت سے تم ڈرنا چھوڑ دو گے۔"

صحافی حامد میر نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار جب خوشونت سنگھ لاہور آئے تو وہ ان سے ملنے گئے اور اپنا تعارف کراتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔ سردار جی' میں بھی راوین (گورنمنٹ کالج کا تعلیم یافتہ) ہوں۔خوشونت سنگھ مسکرائے اور نرمی سے کہا۔"گورنمنٹ کالج سے تعلیم حاصل کرنا خاص بات نہیں ہے بات یہ ہے کہ تمہارے کاموں کی وجہ سے گورنمنٹ کالج کا نام ہو۔تب تم راوین ہونے پر فخر کرسکتے ہو۔"

نئے صحافیوں سے وہ بہت شفقت سے پیش آتے تھے اور انہیں نصیحتیں بھی کرتے تھے۔

خوشونت سنگھ کی بے خوفی اور صحافیانہ دیانت داری کا یہ عالم تھا کہ وہ بھارت کے مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں اکثر آواز اٹھاتے رہتے تھے۔انہوں نے بڑی غیرجانبداری سے بھارت میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے فسادات کے متعلق لکھا لیکن ان کی شخصیت اتنی بھاری بھرکم تھی اور ان کے قلم میں اتنی طاقت تھی کہ بھارت میں کسی کو ان کی تحریروں پر اعتراض کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ان کا ناول "اے ٹرین ٹو پاکستان" ان کی غیرجانبداری اور جرأتِ اظہار اس ناول میں جابجا نظر آتی ہے۔انہوں نے اس ناول میں سکھوں کے مظالم کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔اسی

لیے انہیں بھارت میں ''پاکستانی'' کہا جاتا ہے۔ افسوس کہ اب بھارت میں یہ واحد پاکستانی بھی نہ رہا۔ وہ پاکستان میں بھی پسند کیے جاتے تھے۔ وہ جتنی بار بھی پاکستان آئے انہیں بہت عزت ملی۔ احترام کیا گیا اور ان کے بارے میں محبت کا اظہار کیا گیا۔

ایک بار جب وہ پاکستان آئے (یہاں ان کے بہت سے معزز اور دیرینہ دوست تھے) ایک بہت اچھے انٹرویو کے سلسلے میں ان سے سوال کیا گیا کہ بھارت کشمیر پر تصفیہ کرکے پاکستان کو کیوں نہیں دیتا؟

جواب میں انہوں نے حسب معمول صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر ایسا ہوا اور کشمیر پاکستان کے حوالے کرنا پڑا تو بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی زندگی عذاب ہوجائے گی۔''

پاکستان میں قیامِ پاکستان سے قبل کے ان کے دوستوں میں منظور قادر بہت قریبی دوست تھے۔ اپنی اور منظور قادر کی تصویر انہوں نے اپنے گھر میں آویزاں کررکھی تھی۔

وہ بھارتی حکومت کے طرزِ عمل سے ہمیشہ نالاں رہے اور اس کے فیصلوں پر تنقید کرتے رہے۔ گولڈن ٹمپل پر بھارتی فوج کشی سے پہلے ان کے اندرا گاندھی سے اچھے تعلقات تھے لیکن اس سانحے کے بعد انہوں نے اندرا گاندھی پر شدید نکتہ چینی کی اور بطور احتجاج ''پدم بھوشن'' کا اعلیٰ اعزاز وصول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ سانحہ وہ زندگی بھر فراموش نہیں کرسکے اور بھارتی حکمرانوں سے ہمیشہ اظہارِ نفرت کرتے رہے۔ ان کا کالم سارے ملک میں بہت شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ان کے دوست منظور قادر کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنے کالم میں لکھا:

میرا عزیز ترین دوست بسترِ مرگ پر تھا مگر میں اس سے ملنے نہ جاسکا۔ ان کی بیوی اور بچے مجھ سے ڈیڑھ گھنٹے کے فضائی فاصلے پر تھے۔ میں ان کی تیمارداری اور ہمت افزائی کے لیے وہاں موجود نہ تھا۔ میں فرطِ غم سے نہ فون پر بات کرسکا نہ خط لکھ سکا۔ وہ پاکستانی ہیں اور میں ہندوستانی۔ ہم کس قسم کے ہمسائے ہیں؟ ہم اپنے آپ کو مہذب کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

ان کے سو کالموں کے مجموعے شائع ہوکر بے حد مقبول ہوئے۔ انہوں نے کہانیاں اور ناول بھی لکھے۔ ان کے ناول ''دہلی'' اور ''کمپنی آف ویمن'' بہت مقبول ہوئے اور ان کا شمار ادبی شہکار میں کیا گیا۔ وہ دوسروں کی طرح کوئی عیب یا کمزوری بھی نہیں چھپاتے تھے جس کی وجہ سے انہیں ''ڈرٹی اولڈ مین'' بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی نسل اور اعتماد کا صحافی اب برصغیر میں کوئی نہیں رہا۔ نوے سال کی عمر میں بھی وہ شگفتہ ناول لکھ رہے تھے۔ ان کا آخری ناول ''سن سیٹ کلب'' 2010ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 95 سال تھی۔ اس سے ان کے تخلیقی شوق ذوق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ہر موضوع پر ناول لکھے۔ جن شخصیات کو انہوں نے اپنے ناولوں کا حصہ بنایا ان میں جواہر لعل نہرو، سنجے گاندھی، امریتا شیر گل، مدر ٹریسا، فیض احمد فیض اور پھولن دیوی شامل ہیں۔

پنڈت نہرو کے بارے میں انہوں نے لکھا۔

''ایک انسان کی حیثیت سے نہرو میں انسانی خرابیاں بھی ہیں وہ خود پسند اور خود غرض تھے، کیبنٹ مشن کا مشورہ تھا کہ ہندوستان متحدہ ملک کے حوالے کیا جائے۔ نہرو نے اس تجویز کی مخالفت اس لیے کی تھی کہ اس طرح تو مسٹر جناح کسی بھی روز ہندوستان کے وزیراعظم بن سکتے ہیں۔

پنڈت نہرو کی زندگی کے تاریک پہلو بھی تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ ہندوستان کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کو کنٹرول کرنا چاہیے۔ انہیں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی پروا بھی نہیں تھی۔ انہوں نے اگر مسلمانوں کو ان کے حقوق دے دیے ہوتے تو شاید پاکستان نہ بنتا اور سارے ملک کے مسلمان قیامِ پاکستان کے خواہش مند نہ ہوتے۔ وہ پاکستان سے اچھے تعلقات قائم کرنے میں ناکام رہے۔ جموں اور کشمیر کا مسئلہ پیدا کرنے کے ذمے دار بھی نہرو تھے۔ وہ عزیز داری اور طرفداری کی کمزوریوں سے بھی عاری نہ تھے۔''

ایک اور کتاب ''ہندوستان کا خاتمہ'' میں انہوں نے بڑی جرأت مندی سے ہندوؤں کے متعصب رویّے کی مذمت کی۔ انہوں نے لکھا: ''ہندوؤں کو یقین ہے کہ باہر سے آنے والوں نے ان پر حکومت کی۔ وہ اب بھی نہیں بھولے کہ مسلمان حکمرانوں نے ملک پر صدیوں تک حکومت کی۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے مندر مسمار کردیے۔ یہ درست نہیں ہے کیونکہ بہت سے ہندو حکمرانوں نے بدھ اور جین مذہب اختیار کرنے کے بعد ہندوؤں پر اس سے بھی زیادہ مظالم کیے۔ خود ہندو بادشاہوں نے بدھوں اور جین مذہب ماننے والوں کی عبادت گاہیں تباہ و برباد کردی تھیں۔ خوشونت سنگھ کو انگریزی

زبان پر دسترس حاصل تھی۔ وہ بہت خوبصورت انگریزی لکھتے تھے۔ ان کا اندازِ تحریر منفرد تھا۔ انہوں نے پنجابی اردو الفاظ اپنی انگریزی تحریروں میں شامل کرکے ان میں مزید شگفتگی پیدا کردی تھی۔ وہ مذہبی انتہا پسندوں کا مذاق اُڑاتے تھے جو مذہب کی آڑ میں جرائم کرتے ہیں۔ وہ خود سکھ ہوتے ہوئے بھی ''خالصتان'' کے مخالف تھے۔

جنس کے بارے میں سعادت حسن منٹو اور خوشونت سنگھ دونوں نے لکھا ہے۔ منٹو جنس کو نفسیاتی رنگ میں پیش کرتے تھے لیکن خوشونت سنگھ قارئین کو چونکا دینے کے مقصد سے لکھتے تھے۔

ایک پاکستانی ان سے ملاقات کرنے گئے تو دیکھا کہ ان کے کمرے میں کلمہ طیبہ بھی ایک چوکھٹے میں لکھا ہوا ہے۔ ان کے گھر میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو غیر مسلموں کے گھروں میں دیکھنے میں نہیں آتیں۔

خوشونت سنگھ ایک عہد کی نشانی تھی جو کہ اب معدوم ہوگئی ہے۔ انہوں نے ایک صدی میں بے شمار انقلابات، تبدیلیاں، نئی ایجادات اور انسانوں کے بدلے ہوئے رویے دیکھے تھے۔ ان کے سامنے ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرکے آزاد ملک بنا۔ انہوں نے مذہبی انتہا پسندی اور نفرت کا تماشا بھی دیکھا۔ ان کی تحریروں میں کئی تہذیبوں کا مشاہدہ اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن 99 سال کی عمر میں بھی ان کا دماغی توازن، سوچنے اور لکھنے کی طاقت میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ وفات سے پہلے انہوں نے ایک کالم میں لکھا تھا ''میں ایسے شخص کی حیثیت سے یاد رکھا جانا پسند کروں گا جو لوگوں کو ہنساتا اور خوش کرتا تھا۔''

چند سال پہلے انہوں نے منٹو کی طرح اپنے کتبے کی عبارت بھی لکھی تھی۔ ''یہاں وہ شخص لیٹا ہے جس نے انسان کو بخشا نہ بھگوان کو اس کی موت پر آنسو نہ بہائیں۔ وہ ایک آزاد شخص تھا۔ گندی باتیں لکھنے کو تفریح خیال کرتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ مرگیا۔''

خوشونت سنگھ میں مزاح کی حس بہت زیادہ تھی۔ ان کے کالموں میں لطیفے، طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں ضرور شامل ہوتی تھیں اسی لیے ان کے لکھے ہوئے کالم نوجوانوں اور بوڑھوں میں یکساں مقبول تھے۔ لوگ بہت شوق سے انہیں پڑھا کرتے تھے۔

یہ لطیفے اور نظمیں ان کا کالم پڑھنے والے انہیں بھیجتے تھے جن میں سے اچھے اچھے لطیفے اور نظمیں منتخب کرکے وہ اپنے کالموں کی زینت بنایا کرتے تھے۔ مرتے مرتے بھی وہ لطیفہ گوئی سے باز نہیں آئے۔ اس آخری کالم میں ان کا لطیفہ پیش ہے۔ ''ایک صاحب نے شادی کا دفتر کھولا اور اخبار میں اشتہار شائع کرایا کہ اگر لڑکی کو خود رشتہ تلاش کرنا ہو تو وہ ٹیلی فون پر ایک دبائے۔ اگر ماں باپ کو رضا مند کرنا ہو تو فون پر دو دبائیں۔ اگر شادی پر رضا مند ہوجائے تو تین دبائے۔ دیگر معلومات حاصل کرنے کے لیے چار دباؤ۔ ایک سکھ نے یہ اشتہار پڑھا اور چار دبا دیا۔ پوچھا گیا۔ ''آپ کو کیا معلومات حاصل کرنی ہیں۔''

بنتا سنگھ نے کہا ''میں شادی شدہ ہوں مگر ایک اور شادی کرنا چاہتا ہوں کیا کروں؟''

جواب ملا۔ ''اپنی بیوی کا گلا دباؤ۔''

اس بات سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ خوشونت سنگھ خود بھی سکھوں کے لطیفے سناتے اور لکھا کرتے تھے۔

ایک اور لطیفہ ملاحظہ فرمائیں۔ ''کسی بینک نے ایک برانچ منیجر کے لیے اشتہار دیا۔ شرط یہ تھی کہ امیدوار کو برانچ کا تجربہ ہونا چاہیے۔

بنتا سنگھ کا ایک دوست اس کے گھر گیا تو دیکھا کہ بنتا سنگھ ایک درخت پر شاخ سے لٹکا ہوا ہے۔

دوست نے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کررہے ہو؟''

بنتا سنگھ نے کہا ''برانچ کا تجربہ کررہا ہوں۔ کل درخواست بھی دے دوں گا۔''

وہ اپنے کالموں میں سکھوں کے ہی نہیں دوسری قوموں کے لطیفے بھی لکھتے تھے۔

''نیویارک میں ایک ہندو کی کار کا حادثہ ہوگیا اور وہ بہت زخمی ہوگیا۔ ایک امریکی اسے اپنی کار میں ڈال کر اسپتال لے جانے لگا۔ ہندو بہت مذہبی تھا۔ کار میں بے ہوشی کے عالم میں وہ ''ہری اوم ہری اوم'' بڑبڑا رہا تھا۔ امریکی اس کو اسپتال لے جانے کی بجائے اس کے گھر لے گیا۔

ہندو کی بیوی شوہر کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئی اور امریکی سے کہا ''ارے یہ تم نے کیا کیا۔ اسے اسپتال لے جانا چاہیے تھا۔''

امریکی نے کہا ''میں کیا کرتا۔ بس اس نے رٹ لگا رکھی تھی کہ Hurry Home اس لیے میں اس کی خواہش کے مطابق اسے گھر لے آیا۔''

خوشونت سنگھ کے کالموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے

تھے جن میں اس قسم کے لطیفے اکٹھے کردیے گئے تھے۔ یہ کتابیں بے حد مقبول ہوئیں۔ آج بھی لوگ انہیں خرید کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

وہ اپنے کالموں میں ایسی باتیں بھی لکھ جاتا تھا جو بہت سے لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں مگر خوشونت سے اس کا قلم کون چھین سکتا تھا۔ وہ سنجیدہ اور بہت اہم مسائل کے بارے میں بھی لکھتا تھا اور بہت خوبصورتی سے لکھتا تھا۔ اس نے بے شمار کالم، افسانے اور ناول بے حد سنجیدہ، سنگین اور سلگتے ہوئے موضوعات پر بھی لکھے ہیں۔ اس کی آپ بیتیاں بہت دلچسپ ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ان میں اپنے بارے میں ایسے واقعات بھی لکھ ڈالتا تھا جن پر دوسروں کو اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ ایک آپ بیتی میں اس نے لکھا کہ میری بیوی کے کسی اور کے ساتھ بھی تعلقات تھے مگر میں جانتے بوجھتے چپ رہتا تھا۔ اپنی ماں کو بھی اس نے نہیں بخشا۔ لکھا کہ میرے باپ کا انتقال ہوا تو میرا خیال تھا کہ میری ماں کو بہت سخت صدمہ ہوگا لیکن جب گھر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری ماں بہت خوش تھی۔ اتنا خوش میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ایسی باتیں کوئی اور نہیں لکھ سکتا تھا مگر وہ خوشونت تھا۔ زبان اور قلم پر جو بات آجاتی تھی۔ وہ بے تکلف لکھ دیتا تھا۔ اس کی ایسی تحریروں کی وجہ سے لوگ اس کو سنکی، لفنگا اور ڈرٹی اولڈ مین کہا کرتے تھے۔ ایسے القاب سن کر وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ اس سے اس کی بے خوفی اور سچائی کا انداز ہوسکتا ہے۔

خوشونت سنگھ پاکستان میں بھی بہت مقبول تھا۔ ایک اس وجہ سے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مظالم کی مذمت کرتا تھا اور ان پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ پاکستان سے اس کا بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت کرتا تھا۔ کشمیر کے بارے میں وہ کھلم کھلا پاکستان کے موقف کی حمایت کرتا تھا۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں اور کشمیریوں کے خلاف شدید تعصب دیکھ کر اس نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اگر اب کشمیر کو پاکستان میں شامل کیا گیا تو ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی عذاب ہوجائے گی اور بہت خون خرابا ہوگا۔

خوشونت سنگھ کی اس بات پر پاکستانی اس سے ناراض ہوگئے لیکن خوشونت سنگھ نے اپنی دانست میں سچ ہی کہا تھا کیونکہ وہ لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔

وہ عام طور پر 95 سال کی عمر میں بھی چاق چوبند تھا۔ شاید ہی کبھی کسی شدید بیماری میں مبتلا ہوا ہو لیکن اس کی چھٹی حس نے شاید اس کو بتادیا تھا کہ اب وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے گا۔ اس کا وقت آگیا ہے۔ ایک سال پہلے اس نے اپنے کالم میں اس کا اظہار بھی کردیا جس میں لکھا تھا کہ میں اب 98 سال کا ہوگیا ہوں۔ شاید اب میں نہ لکھ سکوں گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ لکھتا رہا۔ کالم بھی اور کتابیں بھی۔

اس کی آخری کتاب کچھ عرصے قبل ہی شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب تو انگریزی میں لکھی گئی ہے لیکن اس کا نام اس نے اردو میں "خوشونت نامہ" لکھا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب میری زندگی کے تجربات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا انتساب اس نے بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کے نام کیا ہے۔ من موہن سنگھ کی بیگم یہ کتاب لینے کے لیے بذاتِ خود خشونت سنگھ کے گھر گئی تھیں۔ یہ کتاب دراصل اس کی آپ بیتی ہے جس میں اس نے حسبِ معمول اپنے بارے میں سب کچھ لکھ دیا۔ اس کتاب میں اس نے بڑھاپے میں پیدا ہونے والی باتوں کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب میں اس کی طبعی شوخی اور لطیفہ بازی بھی نظر آتی ہے۔

صدر ضیا الحق کے عہد میں وہ پاکستان آیا...تو صدر سے ملنے اور انٹرویو لینے کا بھی ارادہ کیا لیکن صدر کی مصروفیات کی وجہ سے ملاقات نہ ہوسکی، دوسری بار یہاں آیا...تو صدر ضیا الحق سے ملاقات ہوگئی۔ واپس جاکر اس نے صدر ضیا الحق سے جو باتیں ہوئیں اس بارے میں تو کچھ نہیں لکھا مگر ضیا الحق مرحوم کا اخلاق اور سادگی اسے بہت پسند آئی۔

صدر ضیا الحق کی دو باتوں پر تو وہ ان کا عاشق ہوگیا۔ ایک تو یہ کہ رخصت کے وقت صدر خود اس کو چھوڑنے باہر تک آئے اور خدا حافظ کہتے ہوئے کار کا دروازہ کھولا۔ اس سے زیادہ حیرت اس کو ہوٹل جاکر ہوئی۔ اس کے کمرے میں اس کی پسندیدہ شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں حالانکہ ضیا الحق شراب کے سخت مخالف تھے۔ ان کی میزبانی کی یہ ادا بھی خوشونت سنگھ کو بہت اچھی لگی کیونکہ پاکستان میں شراب پر سخت پابندی تھی۔

انہوں نے آخری دنوں میں اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ میں نے زندگی میں کچھ لوگوں کو ناراض تو کیا ہے لیکن جنہیں خوش کیا ہے ان کی تعداد بہت زیاد ہے۔ یہ انوکھا شخص اپنی زندگی کی سنچری مکمل نہ کرسکا۔ خوشونت سنگھ نے وصیت کی تھی کہ انہیں جلانے کی بجائے دفن کیا جائے اور دفن بھی پاکستان میں اس کے آبائی گاؤں ہڈالی میں کیا جائے کیونکہ وہ پیدائشی پاکستانی ہیں۔ ان کی آخری خواہش اس طرح پوری کی گئی کہ دفن تو انہیں ہندوستان میں کیا گیا لیکن ان کی قبر کی مٹی پاکستان کے گاؤں ہڈالی میں دفنائی جائے گی۔ ہڈالی ضلع خوشاب کا ایک گاؤں ہے۔ خوشونت سنگھ کے خمیر میں پاکستان کے لوگوں سے بے حد گہری اور محبت بھری تھی۔ منظور قادر، فیض احمد فیض بھی ان کے گہرے دوستوں میں شامل تھے۔ جب وہ ان کی وفات کے بعد پاکستان آئے تو کہا کرتے تھے کہ اس پاکستان کا خیال رکھا کرو۔ یہاں ہمارے دوستوں کی قبریں ہیں۔ اسے قبرستان نہ بناؤ۔"

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد جب ہندوستان نے 90 ہزار پاکستانیوں کو قید کیا تو انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور ان کو رہا کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا۔ خوشونت کی ایک خوبی یہ تھی کہ انہوں نے علامہ اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ اپنے کالموں اور کتابوں میں اقبال کے کلام کو پھیلاتے رہتے تھے۔

ایک اور خاص بات یہ ہے کہ جب سلمان رشدی نے کتاب شیطانی آیات لکھی تو خوشونت سنگھ نے اس کی بھارت درآمد کرنے کے خلاف بہت شور مچایا۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے امریکی ناشر نے اس کتاب کا مسودہ خوشونت سنگھ کو مشورے کے لیے بھیجا تو خوشونت سنگھ نے مشورہ دیا کہ اس کتاب کو شائع نہ کرنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔

لیکن اسلام دشمن ناشر نے یہ کتاب شائع کردی تو خوشونت سنگھ نے لندن کے معروف اخبار ٹیلی گراف میں ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے لکھا کہ سلمان رشدی ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ضرور ہوا تھا لیکن وہ اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا خوشونت سنگھ نے اپنے کالم میں رسول اکرم ﷺ کی شان میں بہت لکھا اور مسلمانوں اور ان کے نبیؐ کے بارے میں مخالفت کا اظہار کرنے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب پڑھیں تاکہ وہ ان کے بارے میں جان سکیں۔

خوشونت سنگھ واقعی ایک بے مثال اور اپنی قسم کے واحد انسان تھے۔ اتنا سچا، اتنا نڈر، اتنا منہ پھٹ، صاف گو اور سچائی کا اظہار کرنے والا، انسانوں سے ہمدردی اور ان کا احترام کرنے والا، شاید کوئی دوسرا خوشونت سنگھ اب کبھی پیدا نہ ہوگا۔ وہ تو اپنی زندگی میں بھی لاجواب رہا۔ اس کے دنیا سے جانے کے بعد اس کا جواب کہاں سے مل سکے گا؟ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں ملے گا۔ مگر خدا کی قدرت سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔

☆☆☆

پشاور کے فنکاروں کے بارے میں پہلے بھی بتایا جاچکا ہے لیکن کچھ کسر رہ گئی جسے پورا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پچھلے دنوں محمد ابراہیم ضیاء کی ایک کتاب پشاور کے فن کاروں کے بارے میں نظر سے گزری جس میں کئی قابلِ ذکر باتیں ایسی ہیں جن میں آپ کو سب کو شریک کرنا ضروری ہے۔

اس کتاب میں جس کا نام "پشاور کے فنکار تھیٹر اور فلموں میں" ہے، محمد ابراہیم ضیا کی کافی تحقیق نظر آتی ہے۔ اس میں پچاس کے قریب فن کاروں کا تذکرہ ہے جن میں وہ اسٹار بھی شامل ہیں جو بالی وڈ میں کام کررہے ہیں یا کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک کارآمد اور معلوماتی تحقیقی تصنیف ہے۔ ان میں ایسے فنکار شامل ہیں جو پشاور اور اس کے نواحی علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ چند ایسے فن کار جنہوں نے بھارتی فلموں میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کی جو دوسروں میں بہت کم بلکہ برائے نام لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ ایسے فن کار آج بھی بالی ووڈ کی فلموں میں چوٹی کے فنکار تصور کیے جاتے ہیں۔

پشاور میں سب سے پہلا تھیٹر 1915ء میں قائم ہوا تھا جو اس علاقے کے لیے ایک عجوبہ تھا۔ اس تھیٹر میں بہت سے کامیاب اردو ڈرامے بھی پیش کیے گئے تھے۔ اس وقت قمر سرحدی، قاضی رفیق، ہربنس لال، عبدالستار، حبیب سرحدی، ایم اسلم، مس مبارک، زہرہ مادھوی، ماسٹر فضل الٰہی، مس الماس، بہادر علی اور عندلیب درانی مقبول فن کار تھے۔ انہیں دیکھنے والے بہت پسند کرتے تھے۔

تھیٹر کی یہ مقبولیت دیکھ کر بیسویں صدی کے آغاز میں پشاور میں ایک اور تھیٹر قائم ہوگیا۔ یہ پشاور میں باجوری گیٹ کے باہر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس تھیٹر میں 1942ء تک اسٹیج پلے پیش کیے جاتے رہے۔ یہاں جن ڈراموں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ان میں لیلیٰ مجنوں اور دھرتی ماں دو ایسے ڈرامے تھے جو کافی عرصے تک لوگوں کو یاد رہے۔

پرتھوی راج کپور کے نام سے جاری ہونے والا ٹکٹ

ماسٹر خدا بخش نے ان ڈراموں میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ 1913 میں جب ہندوستان میں فیچر فلموں کا آغاز ہوا تو سارے ملک میں اس کا چرچا ہو گیا۔ یہ فلم ''راجا ہریش چندر'' تھی جو بمبئی میں بنائی گئی تھی۔ یہ ہندوستانیوں کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ شوقین لوگ پشاور سے یہ فلم دیکھنے کے لیے ان شہروں میں جایا کرتے تھے۔

یہ ایک خاموش فلم تھی۔ اس کے بعد خاموش فلموں کا دور جاری رہا۔ اس کے بعد جب ساری دنیا نے بولتی فلمیں بنانی شروع کر دیں تو ہندوستان میں بھی بولتی فلموں کا آغاز ہوا۔ عالم آرا پہلی فلم تھی جو ہندوستان میں بنائی گئی تھی۔ یہ فلم 1931 میں بنی تھی۔ اس فلم کے ریلیز ہوتے ہی سارے ملک میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ لوگ جوق در جوق یہ فلم دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ ایک زمانہ تھا جب خاموش فلمیں دیکھتے ہوئے تماشائی شور مچاتے تھے اور باتیں کرتے رہتے تھے لیکن جب بولتی فلموں کا زمانہ آیا تو سنیما میں بالکل خاموشی چھائی رہتی تھی۔ پشاور کے پٹھان بھی آپس میں بات چیت چھوڑ کر فلم میں کھو جاتے اور اگر کوئی بولتا تھا تو جھگڑا ہو جاتا تھا۔

اس زمانے میں فلموں کا مرکز بمبئی تھا۔ فلموں میں کام کرنے کے شوقین نوجوانوں نے فلموں میں قسمت آزمانے کے لیے بمبئی کا رخ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ روشن مستقبل کے لیے یہی واحد طریقہ ہے۔ پشاور سے جو نوجوان اداکاری کے شوق میں بمبئی گئے ان میں پرتھوی راج کپور، وزیر محمد خان وغیرہ..... شامل تھے۔ وزیر محمد خان نے تو ''عالم آرا'' میں ایک گانا بھی گایا تھا۔

پشاور میں سب سے پہلے جو فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی وہ امپیریل تھیٹر میں پیش کی گئی کیونکہ پشاور میں کوئی

سنیما گھر نہیں تھا۔ یہ تھیٹر قصہ خوانی میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مشہور و معروف اداکارہ مدھوبالا کا اصل نام ممتاز تھا۔ ضلع صوابی کے یوسف زئی قبیلے سے ان کا تعلق تھا۔ مدھوبالا بہت روانی سے پشتو بولتی تھیں۔ وہ بچپن میں ہی اپنے والد کے ہمراہ بمبئی چلی گئی تھیں۔ ان کے والد عطا اللہ خان نے انہیں بچپن ہی میں اداکارہ بنا دیا تھا۔ مدھوبالا نے جب فلم ''بسنت'' میں کام کیا تھا اس وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی۔ فلم ''بسنت'' بہت زیادہ کامیاب ہوئی تھی۔

اپنے وقت کے سپر اسٹار امجد خان کا تعلق بھی پشاور ہی سے تھا۔ دادا اور دادی 1965 تک پشاور میں رہے تھے بعد میں امجد خان نے انہیں بھی بمبئی بلا لیا تھا۔ بالی وڈ کے ایک اور سپر اسٹار شاہ رخ خان کا تعلق بھی پشاور ہی سے ہے مگر ان کے والد قیام پاکستان سے قبل ہی دہلی چلے گئے تھے لیکن شاہ رخ خان کے والد کا گھر آج بھی پشاور میں موجود ہے۔ شاہ رخ خان ایک بار یادیں تازہ کرنے کے لیے پشاور آئے بھی تھے۔ شاہ رخ کے والد تو دہلی چلے گئے تھے مگر ان کے بھائی پشاور ہی میں رہتے رہے۔ شاہ رخ خان اپنے بچپن میں کئی بار پشاور آئے تھے۔ ان دنوں وہ دہلی کے ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔

پشاور کے معروف ترین اداکار دلیپ کمار (یوسف خان) کہے جا سکتے ہیں۔ انہیں ہندوستان کا عظیم ترین اداکار تسلیم کیا گیا ہے اور اپنی طویل عمر اور بیماری کے باوجود بالی وڈ میں انہیں بے حد احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پرتھوی راج بمبئی کیا گئے کہ ان کے سب سے بڑے بیٹے راج کپور بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے فلموں میں معاون کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ اس کے بعد اداکاری شروع کر دی۔ انہیں ہندوستان کا عظیم شو مین کہا جا سکتا

حدیقہ کیانی

ہے۔ انہوں نے اداکاری سے زیادہ ہدایت کار اور فلم ساز کی حیثیت سے نام پیدا کیا اور پشاور کا نام بھی روشن کیا۔ راج کپور اور دلیپ کمار کے والدین قریبی دوست تھے۔ یہ دونوں اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے بھی رہے ہیں اور مختلف قسم کے اسکینڈلز کے برعکس آخر وقت تک ان کے تعلقات ہمیشہ بہت اچھے رہے ہیں۔ ان دونوں کے خاندانوں نے پشاور کے دورے بھی کیے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھی پشاور نامی گرامی اور ممتاز فن کار فراہم کرتا رہا۔ خصوصاً خیبر پختون خواہ کے اداکاروں نے بہت کامیابی اور مقبولیت حاصل کی۔ اس اعتبار سے یہ سنگلاخ علاقہ بہت مردم خیز ہے جس نے پاکستان کی فلمی صنعت کو بھی کئی ممتاز اور نامور اداکار فراہم کیے ہیں۔ ان میں محمد قوی خان، رنگیلا، بدر منیر، آصف خان، ثریا خان، یاسمین خان، عجب گل اور ارباز خان بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی پشاور اور خیبر پختونخواہ نے بہت سے فن کار، مصنف اور ہدایت کاروں کا تحفہ پیش کیا جن میں ضیا سرحدی، خیام سرحدی بہت نمایاں نام ہیں۔ ان فن کاروں اور اداکاروں کے بارے میں اس کتاب میں معلومات نہیں ہیں لیکن ان کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں۔

☆☆☆

پاکستان کو اللہ نے خوبصورت ترین مناظر، برف پوش پہاڑ، رنگ برنگے پھول، دلکش جھیلیں، سرسبز وادیوں سے اچھلتے ہوئے چشمے، سفید پانی سے بھرپور... پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشار، صحرا، دریا غرضیکہ دنیا کی ہر نعمت عطا فرمائی ہے۔ ہر موسم میں روح افزا اور لذیذ پھلوں سے شہروں میں ان کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ صحت بخش خشک میوہ جابجا نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو کسی نعمت سے محروم نہیں رکھا۔ انسانوں کو دیکھیے تو محنت کرنے والے جفاکش، کسانوں کو دیکھیے تو شب و روز محنت کرنے کے باوجود منافع سے محروم رہنے کے باوجود زمین کا سینہ چیر کر فصلیں اگاتے ہیں۔ نوجوان ایسے ذہین کہ دنیا بھر میں جہاں جا کر آباد ہوتے ہیں اس ملک کے لیے ایک قیمتی اثاثہ بن جاتے ہیں۔ مناسب تعلیم دی جائے تو ذہانت میں ترقی یافتہ ملکوں کے طلبا بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کھیلوں کے میدانوں میں انہوں نے بے حد رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ اگر سازشوں اور حکومت کی بے حسی کا شکار نہ ہوتے تو پاکستان دنیا میں ہاکی کا چیمپئن تھا۔ کرکٹ میں ایسے ہنرمند کھلاڑی یہاں پیدا ہوئے جن کی کھیلتے ہوئے ویڈیوز بنا کر یورپی ممالک میں نوجوان کھلاڑیوں کو دکھائی جاتی ہیں۔ فنونِ لطیفہ میں ان کا جواب نہیں ہے۔ اس سرزمین نے کیسے کیسے موسیقار، گلوکار، گانے والے پیدا کیے جو ہمسایہ ملک کے فنکاروں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ کسی بھی فن میں پاکستانیوں نے اپنا لوہا منوا کر ہی چھوڑا۔ ان پڑھ نوجوان دنیا بھر کی جدید ترین ایجادات کی خرابیاں پل بھر میں دور کر دیتے ہیں۔ قیمتی سے قیمتی نئی موٹر کاروں کی خرابیوں کو بلا جھجک دور کر دیتے ہیں۔ لاکھوں کی کار مالک مرمت کے لیے آنکھیں بند کر کے موٹر مکینک کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ پہلی بار اس کے پرزوں کو کھول کر کار کی مرمت کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر طرح کی بہترین نعمتوں سے نوازا ہے لیکن نہ ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں نہ ہی ان نعمتوں کی قدر کر کے انہیں بہترین انداز میں استعمال کرتے ہیں۔

چھوڑیے اس لمبی چوڑی تمہید کو، آمدم برسرِ مطلب۔

اس وقت تذکرہ گلوکارہ حدیقہ کیانی کا کرنا مقصود ہے۔ ہمارے ملک میں پوپ سنگرز کا رواج بہت دیر سے ہوا جو ابتدائی زمانے میں بالکل پسند نہیں کیا گیا تھا۔ لمبے لمبے بالوں والے بے ہنگم لباس پہنے ہوئے جو نوجوان گٹار ہاتھ میں لیے گاتے بجاتے نظر آتے تھے لوگ اس کو موسیقی کی بجائے مذاق کہا کرتے تھے حالانکہ مغربی ملکوں میں اس موسیقی کو بہت قدر سے دیکھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ دوسری مغربی چیزوں کی طرح ہم پوپ میوزک کے بھی دلدادہ ہوگئے۔ ان میں بھی سنگرز کی دو قسمیں تھیں۔ ایک دو جو سُریلے تھے اور اچھے گیت گاتے تھے، دوسرے وہ جو بے سُری آوازوں میں گاتے اور اچھلتے کودتے تھے۔ بہرحال پوپ میوزک ہمارے ملک میں بھی مقبول ہوگیا۔ کئی گلوکاروں نے اس موسیقی کے حوالے سے بہت نام پیدا کیا لیکن اس وقت تک کوئی خاتون گلوکارہ منظرِ عام پر نہیں آئی تھی حالانکہ پوپ میوزک کو پاکستان میں مقبولیت حاصل ہوئے سولہ سترہ سال گزر چکے تھے۔

نازیہ حسن

پھر اچانک ایک سُریلی اور معصوم آواز گونجی۔ یہ نازیہ حسن کی آواز تھی۔ نازیہ نے نوعمری اور تعلیم کا زمانہ انگلستان میں گزارا تھا۔ انہیں بچپن ہی سے گلوکاری کا شوق تھا۔

پی ٹی وی سے ان دنوں موسیقی کی تربیت کا ایک پروگرام ہوا کرتا تھا۔ پہلے سہیل رعنا، پھر مصلح الدین اور اس کے بعد موسیقار خلیل احمد اس پروگرام کو پیش کیا کرتے تھے۔ اس پروگرام میں بچے حصہ لیا کرتے تھے اور گانا سیکھنے کی تربیت حاصل کرتے تھے، اس پروگرام سے چند سالوں کے اندر ایسے ایسے گلوکار اور گلوکارائیں سامنے آئیں جنہوں نے گلوکاری میں بہت نام پیدا کیا۔ حدیقہ کیانی جن دنوں موسیقار سہیل رعنا کے پروگرام میں شریک ہوتیں اس وقت وہ بہت نوعمر بچی تھیں لیکن موسیقار خلیل احمد کے پروگراموں میں وہ سمجھدار ہو چکی تھیں اور کافی حد تک گلوکاری سیکھ چکی تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ خلیل احمد کی شاگردی اختیار کی تھی۔ خلیل احمد خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ہمارے وہ اس وقت دوست بنے تھے جب وہ فلمی دنیا سے بالکل ناواقف تھے اور ایک کمپنی میں ملازم تھے۔ ہم نے انہیں پہلی بار 1950 میں پرانے الحمرا میں ہونے والے ایک موسیقی

کے پروگرام میں دیکھا تھا۔ وہ اسٹیج پر گانے کے لیے آئے تو ان کی سُریلی آواز نے جادو جگا دیا۔ ایسی میٹھی اور سُریلی آواز تھی جو دوسروں سے مختلف تھی۔ ہم اس وقت صحافی تھے۔ پروگرام کے ختم ہونے پر ان سے ملے۔ ان کی تعریف کی اور ان کے بارے میں اخبار میں بھی لکھا۔ اس دن کے بعد سے ان سے جو دوستی ہوئی وہ مختلف مرحلوں سے گزرتی رہی اور ان کی وفات تک قائم رہی۔ خلیل کو ہمیشہ ناقدری کا شکوہ رہا۔ واقعی فلمی دنیا نے ان کی قدر نہیں کی۔ وہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے اکثر علاقوں کے لوک گیت انہیں یاد تھے مگر بددلی نے انہیں اتنا مایوس کر دیا تھا کہ موسیقی سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا تھا۔ ہندوستانی فلم کا جب کوئی اچھا نغمہ سننے میں آتا تو وہ بتاتے کہ یہ کس راگ یا لوک گیت سے لیا گیا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ بمل رائے نے جب اپنی ایک فلم میں سلیل چوہدری کو موسیقار منتخب کیا اور ان کے گیت بہت مقبول ہوئے تو ہم نے ایک دن خلیل سے کہا تھا کہ دیکھو نئے موسیقار نے کتنی اچھی دھنیں بنائی ہیں۔ وہ بیزاری سے منہ بنا کر بولے۔ اس میں سلیل چوہدری کا کیا کمال ہے۔ یہ تو فلاں بنگالی لوک گیت ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے اصلی لوک گیت سنا دیا۔

ہم نے کہا" بھائی تمہارے دماغ میں اتنے بہت سے لوک گیت بھرے ہوئے ہیں تو تم انہیں کیوں باہر نہیں نکالتے ؟"

بیزاری سے بولے" یہاں کون قدر کرتا اور اس کا صلہ دیتا، بس ٹھیک ہے۔ جیسا چل رہا ہے وہی بہتر ہے۔"

حالات کی بے قدری نے خلیل احمد کو قنوطی اور شکست خوردہ ذہنیت کا مالک بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے فلموں کے لیے لاجواب اور ناقابلِ فراموش فلمی گانے بنائے جنہوں نے سارے ملک میں ہلچل مچا دی۔ جب ان کا تذکرہ نکلا تو بہت سی بھولی ہوئی کہانیاں یاد آگئیں۔

جب حدیقہ کیانی نے بچوں کے پروگرام میں گانے کا آغاز کیا تو ان کی بہن بھی ان کے ساتھ گایا کرتی تھیں۔ دونوں بہنوں کا نام گونجنے لگا۔ مگر حدیقہ کی بہن نے اچانک گانا چھوڑ دیا۔ حدیقہ نے کلاسکی موسیقی سیکھی تھی مگر انہوں نے ہلکے پھلکے گیتوں اور پوپ میوزک کی طرف اپنی توجہ اور صلاحیتیں موڑ دیں۔ ان کا انداز منفرد تھا۔ گانوں کے بول بھی بامعنی اور خوبصورت ہوتے تھے۔ وہ گلوکاری کے میدان میں آگے بڑھتی رہیں۔

جدن بائی اور نرگس

ان کے گانے اور البم سامنے آئے تو سننے والوں کو حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ نئی اور میٹھی آواز کہاں سے آئی۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ یہ آواز پی ٹی وی کے موسیقی کے پروگرام میں سالہاسال سے سننے والوں کے کانوں میں مٹھاس گھول رہی ہے۔ ان کا پہلا گانا جس نے دلوں کو چھو لیا تھا۔ "دوپٹا میرا ململ کا" اور "بوہے باریاں" وہ نغمے تھے کہ نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ بیرونی ملک کے دوروں میں بھی فرمائش کر کے سنے جاتے تھے۔

☆☆☆

جدن بائی بھی ایک عظیم شخصیت اور بہت بڑی فنکارہ تھیں۔ زمانہ انہیں اداکارہ نرگس کی والدہ کی حیثیت سے جانتا ہے لیکن ان کی وجہ شہرت اداکارہ نرگس کی والدہ کی حیثیت ہی سے نہیں تھی نرگس کی پیدائش سے پہلے ہی وہ برصغیر میں ایک اداکارہ، گلوکارہ اور ہدایت کارہ کی حیثیت سے بہت نام پیدا کر چکی تھیں۔ انہیں گائیکی کے علاوہ علم و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ مطالعے کی بہت شوقین تھیں، شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی دلدادہ تھیں اور ان کے گھر کے دروازے اہلِ فن کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ بمبئی میں ان کے فلیٹ میں بڑی بڑی فلمی شخصیات کے علاوہ شاعروں، ادیبوں اور مفکرین کا بھی روز کا آنا جانا تھا اور ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں ان کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے گھر پر کسی

بڑے شاعر، ادیب یا فنکار کو مدعو کرنا باعثِ اعزاز تھا۔ فلمی دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں ان کے سامنے مودب بیٹھتی تھیں اور بہت سوچ سمجھ کر زبان سے الفاظ ادا کرتی تھیں کیونکہ جدن بائی انہیں غلط بات پر فوراً ٹوک دیتی تھیں۔ بڑے شاعروں اور ادیبوں کی وہ بہت قدرداں تھیں۔ خود بھی شعر کہتی تھیں لیکن کوئی شاعر ان سے کلام سنانے کی فرمائش کرتا تو انکسار کا اظہار کر کے کہتیں۔ ”آپ جیسے شاعر کے سامنے شعر سنانا سورج کو چراغ دکھانا ہوگا۔ بھلا کہاں میں ایک تُک بند اور کہاں آپ جیسا عظیم شاعر۔“ کسی نے سچ کہا ہے کہ گزشتہ سالوں میں متعدد شعبوں میں بہت نادر شخصیات پیدا ہوئیں لیکن اب الٹا پہیہ گھومنے لگا ہے۔ اوسط درجے کی شخصیت بھی خال خال ڈھونڈے سے ہی ملتی ہے۔ وہ شعر و نغمہ سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی ہستی تھی جس کو قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔

وہ ایک گائیکہ اور رقاصہ کے علاوہ بہت اچھی اداکارہ بھی تھیں۔ محبوب خان کی فلم ”مدر انڈیا“ میں بھی انہوں نے اداکاری کی تھی۔ 1935 میں فلم تلاشِ حق کی موسیقی بھی انہوں نے ترتیب دی تھی۔ شعر و شاعری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جس زمانے میں ہندوستان میں ریاستیں اور رجواڑے ہوا کرتے تھے ان دنوں جدن بائی کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ ہر ریاست میں ان کی مانگ تھی۔ وہ خوش جمال، خوش آواز، خوش ادا، خوش اخلاق اور تہذیب و تمدن کا منہ بولتا نمونہ تھیں۔ پچھلی صدی کے نصف تک اس زمانے میں اور بھی نامی گرامی طوائفیں منظرِ عام پر آئیں مگر جدن بائی اپنی جگہ قائم رہیں۔ آغا شورش کاشمیری نے بھی اپنی تاریخی کتاب ”اس بازار میں“ بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جدن بائی کی آواز میں جادو تھا۔ اس زمانے میں گوہر بائی نے بھی بہت نام پیدا کیا لیکن وہ ایک بے مثال رقاصہ تھیں۔ پھر زہرہ اور مشتری کا نام ہوا۔ اس زمانے میں بڑی بڑی نامی گرامی طوائفیں ہندوستانیوں کے دلوں پر راج کر رہی تھیں مگر جدن بائی کا نام سرِفہرست تھا۔ گوہر بائی کو مور پنکھی ناچ میں کمال حاصل تھا۔

معروف باغی شاعر احسان دانش کو بھی جدن بائی کی محفل میں شریک ہونے اور ان کی میزبانی کا لطف لینے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے بھی اپنی آپ بیتی میں جدن بائی کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا یہ تجزیہ خود ان کی زبانی سنیے، لکھتے ہیں ”بمبئی کی مشہور آرٹسٹ جدن بائی نے شعرا کو اپنے فلیٹ پر مدعو کیا تھا۔ وہ میرے کلام سے بہت متاثر تھیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے میری نظموں سے بہت اشعار سنائے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ فلمی دنیا کی معروف عورت ان کی نظموں اور غزلوں میں دلچسپی رکھتی ہو گی۔ ان کے حافظے میں ہر وہ شعر رہ جاتا تھا جو انہیں پسند آتا تھا یہ ان کے ذوقِ لطیف کا ثبوت تھا۔ صرف میرے ہی نہیں اس دور کے تمام مشہور شعرا کے ہزاروں اشعار انہیں ازبر تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مختصر گفتگو میں محسوس کیا کہ جہاں وہ فلمی دنیا میں اپنی مثال آپ تھیں وہیں وہ دوستوں کی بہترین مشیر بھی تھیں۔ ان کو معاملات کی گتھیوں کو سلجھانے میں کمال حاصل تھا۔ میری موجودگی میں ہی دو مشہور شعرا میں کسی شعر کے بارے میں اختلاف پیدا ہوگیا اور باتوں باتوں میں معاملہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا لیکن جدن بائی نے نہایت خوش اسلوبی سے معاملے کو سلجھا کر دونوں شعرا کے مابین تلخی دور کرادی اور ماحول ایک بار پھر خوشگوار ہوگیا۔

سعادت حسن منٹو سالہا سال بمبئی کی فلمی دنیا سے متعلق رہے۔ وہ منہ پھٹ اور صاف گو انسان تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان سے ادا کر دیتے تھے۔ انہوں نے بے شمار شخصیات کے خاکے لکھے ہیں اور ان کا خوب پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ اپنے معروف خاکوں کے مجموعے ”گنجے فرشتے“ میں انہوں نے جدن بائی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ ”مرحومہ کو اردو ادب سے بہت شغف تھا۔ منٹو کی تحریریں وہ بہت شوق سے پڑھتی تھیں اور پسند کرتی تھیں۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی سے ہٹ کر جدن بائی بڑے رکھ رکھاؤ اور تہذیب کی پابندی کرنے والی خاتون تھیں۔“

منٹو صاحب نے ان کی روایتی تہذیبی اقدار کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ واقعہ لکھا ہے۔ ”منٹو کی بیگم اور دو سالیوں کو نرگس نے اپنے گھر مدعو کیا تو جدن بائی نے اپنے شوہر موہن بابو اور اپنے دو جوان بیٹوں کو منع کر دیا کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ گھر میں داخل نہ ہوں۔ نرگس کی سہیلیاں آرہی ہیں۔ اس روز مرد نوکروں کو بھی لڑکیوں کے کمرے میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ ان مہمانوں کو جہاں بٹھایا گیا وہاں کسی مرد کا سایہ تک نہ پڑا۔ جدن بائی تھوڑی دیر رسمی طور پر مہمانوں کے پاس بیٹھیں اور پھر اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ ان کی معصوم باتوں میں حائل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔

یہ ان کے رکھ رکھاؤ اور پرانی تہذیب کو تازہ رکھنے کی بہترین مثال ہے اور وہ بھی منٹو جیسے صاف گو شخص کی زبانی۔

جدن بائی کی نجی زندگی بھی ایک نرالے ڈھنگ کی تھی۔ جدن بائی نے ایک ہندو موہن بابو سے محبت کی شادی کی تھی۔ موہن بابو بہت بڑے رئیس زادے تھے اور گانا سننے کے شوقین۔ وہ جدن بائی کے کوٹھے پر باقاعدگی سے آتے اور دولت لٹاتے تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ موہن بابو ایک وجیہہ اور خوبصورت انسان تھے۔ تعلیم یافتہ اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر جدن بائی کے گانوں اور زلف کے ایسے اسیر ہوئے کہ ساری دنیا کو بھلا بیٹھے اور ان سے شادی کی درخواست کردی۔

جدن بابو نے یہ شرط رکھی کہ وہ پہلے مسلمان ہوں اس کے بعد شادی ہو سکتی ہے۔ موہن بابو نے بلا جھجک یہ شرط منظور کر لی اور اسلام قبول کرلیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دین و مذہب کی کتنی پابند تھیں، افسوس کہ ان کی بیٹی یہ رسم نہ نبھا سکی۔ اس نے اپنی زندگی ایک ہندو راج کپور کو سونپ دی۔ نرگس نے تو راج کپور سے شادی کرنے کے لیے بہت زور دیا اور بہت انتظار کیا۔ راج کپور بھی دس سال تک ٹال مٹول کرتا رہا اور نرگس کے ساتھ رہنے کے علاوہ اسے صرف اپنی فلموں میں کام کرنے تک محدود کرلیا۔ جدن بائی کو یہ تعلق شروع دن سے ہی پسند نہ تھا۔ جب انہوں نے بیٹی کو راج کپور کی طرف مائل پایا تو بہت سمجھایا۔ راج کپور کو وہ پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کو خود غرض اور مفاد پرست انسان خیال کرتی تھیں۔ مگر نرگس کے سر پر تو راج کپور کی چکنی چپڑی باتوں کا بھوت سوار تھا۔ اس بات پر ماں بیٹی کے مابین تلخی اور کشیدگی بھی پیدا ہوگئی تھی۔

جدن بائی سمجھاتی تھیں کہ بے بی سائے کے پیچھے نہ بھاگو۔ یہ نہ تمہارا ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ مگر بے بی کی آنکھوں پر تو پٹی بندھ گئی تھی۔ پھر بھی جدن بائی کی زندگی میں نرگس نے کافی احتیاط برتی لیکن ان کی آنکھ بند ہوتے ہی مکمل آزاد اور خود مختار ہوگئی۔ موہن بابو کی بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں تو جدن بائی خود کو دنیا میں تنہا تصور کرنے لگیں۔ کچھ ہی عرصے بعد جدن بائی بھی اپنے دل کی بے شمار حسرتیں لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ انہوں نے خاص طور پر وصیت کی تھی کہ انہیں دفن کیا جائے اور تمام اسلامی رسوم ادا کی جائیں۔ ان کی وصیت کے مطابق ایک سچے مسلمان کی طرح ان کی تجہیز و تکفین کی گئی۔

نرگس کی کہانی جدن بائی سے مختلف ہے۔ دونوں کی سوچ اور عقائد میں بھی فرق تھا۔ شاید قدرت نے نرگس کی قسمت میں ہی ایسا لکھ دیا تھا۔ پہلے وہ ایک ہندو راج کپور کی زندگی میں دس سال تک شامل رہیں۔ وہاں سے ٹھکرائے جانے کے بعد انہیں اپنی مرحوم والدہ کی باتیں یاد آئیں۔

ایک اتفاقی حادثے نے انہیں ایک بار پھر ایک ہندو سنیل دت کی بیگم بنا ہی دیا۔ اپنی ماں کے برعکس انہوں نے سنیل دت سے شادی کرنے سے پہلے انہیں مسلمان بھی نہیں کیا۔ سنیل دت ایک اچھے ہمدرد اور مخلص شوہر ثابت ہوئے لیکن آخر تک ہندو ہی رہے۔ نرگس نے بھی زندگی سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کے نام ہندوانہ رکھے تھے۔ گھر میں اسلامی رسم و رواج یا نماز روزے کا دستور بھی نہ تھا۔ اسی لیے ان کی اولاد ہندو ہی رہی۔

پھر نرگس بیمار ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ انہیں کینسر ہوگیا ہے۔ سنیل دت نے ان کی بہت دیکھ بھال اور خدمت کی۔ علاج کے لیے امریکا بھی لے گئے لیکن زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کہتے ہیں کہ شادی کے بعد وہ ہندو مذہب پر تھیں لیکن مرتے وقت انہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں ہندو مذہب کے مطابق جلایا نہ جائے بلکہ موہن بابو اور جدن بائی کی قبروں کے ساتھ دفن کیا جائے۔ سنیل دت نے ان کی یہ آخری خواہش پوری کردی۔ وہ بمبئی کے ایک قبرستان میں اپنے ماں باپ کے پہلو میں سو رہی ہیں۔

احسان دانش کے مطابق جدن بائی کو نام و نمود کی خواہش نہ تھی۔ وہ روشنی کا ایک مینار تھی۔ ایک طوائف سے وہ ایک قابلِ احترام ہستی بن گئی تھی۔ اس کی سبھی عزت کرتے تھے اور اس کی سخت باتیں بھی سن کر برداشت کر لیتے تھے۔ بمبئی کا کون سا ادیب و شاعر، ہدایت کار، نغمہ نگار نہ تھا جو جدن بائی کی محفلوں میں شرکت کا متمنی نہ تھا۔ ہدایت کار محبوب تک اس کا احترام کرتے تھے اور اگر وہ کوئی مشورہ دیتی یا سخت سست کہتی تھی تو اس کا قطعی برا نہیں مانتے تھے۔ جدن بائی کی محفل میں ترقی پسند اور روایتی شاعر و ادیب شامل ہوا کرتے تھے لیکن میزبان کی طرف سے انہیں سیاسی بحثوں میں الجھنے کی اجازت نہ تھی۔ ادب و شاعری، پرانے لوگوں کے قصے اور کارنامے اور مہذب ہنسی مذاق ہی ان محفلوں کی جان ہوتے تھے۔ اب وہ لوگ، وہ تہذیب، رکھ رکھاؤ اور محفلیں کہاں۔

☆☆☆

ناصرہ احمد صاحبہ سے معذرت کر چکا ہوں۔ ان کا یہ خط کاغذات میں غلط جگہ رکھ دیا گیا تھا۔ کل نظر پڑی تو آج فلمی الف لیلہ میں شامل کرلیا ہے۔ خوشی ہے کہ یہ کالم پڑھ کر آپ کو پاکستانی فلموں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

جہاں تک جیتندر اور وحید مراد کے موازنے کا تعلق ہے تو میری دانست میں ہمیشہ سے وحید مراد جیتندر سے زیادہ خوبرو اور دلکش تھے۔ ان کے چہرے پر ایک بھولپن بھی تھا جس سے جیتندر محروم رہے۔ وحید مراد بہتر اداکار تھے۔ ان کے رقص میں بے ساختگی اور سادگی تھی۔ یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کسی فلم میں ڈانس کر رہے ہیں۔

وحید مراد ہر اعتبار سے خوش نصیب تھے۔ دولت مند باپ کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے تھے۔ کالج کے زمانے میں بھی بہت مقبول تھے مگر ان چیزوں نے ان کا دماغ خراب نہیں کیا تھا۔ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی جیسے رہے، سادہ مزاج، غرور انہوں نے کبھی نہیں کیا۔ ان کی ہٹ دھرمی اور ضد کو لوگ غرور سمجھ لیتے تھے۔ ہدایت کار کے کام میں قطعی دخل نہیں دیتے تھے۔ بعد میں وہ ہدایت کار بھی بن گئے تھے مگر ان کی فلم ''ہیرو'' ان کی وفات کے بعد مکمل ہوئی۔ غالباً اقبال یوسف نے بقیہ کام پورا کیا تھا۔

وحید مراد میں بہت سی خوبیوں کے علاوہ بہت بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ کسی کے مشورے یا سمجھانے کا اثر نہیں لیتے تھے۔ ان کے والدین، قریبی دوستوں، پرستاروں، نقادوں نے بہت سمجھایا مگر غالباً وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ محمد علی، ندیم اور دوسرے ہیروز کے مقابلے میں ان کی مقبولیت بہت کم ہو گئی تھی۔ جو فلم اسٹار عرصہ دراز تک لوگوں کی آنکھوں کا تارا بنا رہے، عدم مقبولیت اور ناکامی کو مشکل سے قبول کرتا ہے۔ اور انہوں نے تو سراسر قبول ہی نہیں کیا۔ جب محفل میں فلموں کی پرستار لڑکیاں ان کے ہوتے ہوئے دوسرے اداکاروں کے آٹوگراف لینے ٹوٹ پڑتی تھیں تو سوچیے کہ ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ ان کے دماغ میں یہ بات مکمل طور پر بیٹھ چکی تھی کہ وہ آج بھی مقبول ہیں۔ دیبا بیگم کے کہنے پر میں نے ان کے لیے خاص طور پر ایک اسکرپٹ لکھا تھا۔ ان کا کردار انوکھا لیکن مرکزی تھا یعنی ہیرو نہیں تھے۔ مقبولیت اور مانگ نہ ہونے کے باوجود ان کی ضد تھی کہ انہیں دوسرے اسٹار کے برابر معاوضہ دیا جائے۔ یہ ممکن نہ تھا کیونکہ فلم ساز اس کے پیچھے بھاگتے ہیں جس کی مانگ ہو۔

یہ ''حادثہ'' محض وحید مراد تک ہی نہیں ہوا تھا۔ پاکستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں عروج و زوال کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جو حقیقت پسند ہوتا ہے وہ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے، جو برداشت.... کرتا وہ کامیاب اور مطمئن رہتا۔ ورنہ وقت کی گرد میں گم ہو جاتا ہے۔

ان کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا، اعلیٰ سوشل حلقوں میں بھی مقبول تھے۔ تعلیم یافتہ اور ذہین تھے۔ کوئی اور کام کر سکتے تھے یا پھر فلموں میں معاون اداکار کے طور پر کام کر سکتے تھے۔ اسلم پرویز، علاؤ الدین اور شاہد کی مثالیں تو سب جانتے ہیں کہ انہوں نے بڑی سہولت سے معاون کردار قبول کر لیے تھے۔ رنگیلا کی مثال دیکھیے جو دیکھتے دیکھتے عرش سے فرش پر آ گیا تھا لیکن ہمت نہ ہاری اور صرف کامیڈی رول کر کے بہت دولت اور شہرت کمائی۔

آپ نے جو گانا لکھا ہے وہ فلم ''سہیلی'' کا ہے۔ یہ فلم ایس ایم یوسف نے پاکستان آ کر بنائی تھی۔ اے حمید نے دھن بنائی تھی اور نسیم بیگم نے گایا تھا۔ ہندوستان میں 90 فیصد پاکستانی فلمی گانے ہو بہو یا معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیے جا چکے ہیں۔ 60 فیصد سے زائد پاکستانی فلموں کی معمولی سی رد و بدل کے ساتھ یا ہو بہو نقل کی گئی ہے مگر نہ فلم ساز تسلیم کرتے ہیں اور نہ عام شائقینِ فلم۔ میری اپنی لکھی ہوئی کوئی نصف درجن فلموں کو ہو بہو بنایا جا چکا ہے۔ گانے بھی نقل کیے گئے ہیں۔ فلم مہربانی، میں تو ملبوسات اور سیٹ بھی ویسے ہی تھے۔ میری فلم سزا، کا گانا۔

جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

جوں کا توں بنا کر پیش کر دیا۔

فلم بندگی، کے ہدایت کار فرید احمد ہی تھے۔ جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں۔ وہ ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کے صاحب زادے تھے۔ ''بندگی'' کا اسکرپٹ میں نے لکھا تھا۔ یہ پہلی فلم تھی جس کی شوٹنگ کے لیے کوئی سیٹ نہیں لگایا گیا تھا۔ تمام تر شوٹنگ اصلی لوکیشنز پر کی گئی تھی۔ آپ نے بیک وقت بے شمار سوالات دریافت کر لیے ہیں۔ بہر حال مختصراً ان کے جواب دے رہا ہوں۔

(جاری ہے)

جون

منظر امام

تپتی دوپہر، امبیا کے بور اور کوئل کی کوک کا لطف لینے والا مہینا۔ ٹھنڈے شربت اور ٹھنڈی چھاؤں پر شکر ادا کرنے والا مہینا۔ اس گرم مہینے میں کب کیا ہوا اس پر ایک مختصر مگر جامع تحریر۔

اہلِ دانش کی خدمت میں ایک تحفہ خاص

1 جون

پہلی جون 1962 کو سوویت یونین کی طرف سے فیض احمد فیض کو لینن پرائز سے نوازا گیا۔ شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں یا کسی بھی عام شخص کے لیے فیض صاحب محتاجِ تعارف تو نہیں ہیں۔ پھر بھی اگر ان کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

فیض صاحب بلاشبہ غالب اور اقبال کے بعد اردو کے سب سے عظیم شاعر ہیں۔ آپ 1915ء میں سیال

کوٹ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں علامہ اقبال بھی پیدا ہوئے تھے۔

آپ نے ابتدائی مذہبی تعلیم مولوی محمد ابراہیم منیر سیالکوٹی سے حاصل کی۔ 1921ء میں آپ نے اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ آپ نے میٹرک اور ایف اے وہیں سے کیا تھا۔

آپ کے اساتذہ میں مولوی شمس الحق بھی تھے جن سے آپ نے عربی اور فارسی سیکھی۔ مولوی صاحب علامہ اقبال کے بھی استاد رہ چکے تھے۔

سیالکوٹ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ مزید تعلیم کے لیے لاہور آگئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ پھر اورینٹل کالج سے 1932 میں انگلش میں ایم اے اس کے بعد عربی میں ایم اے کیا۔ 1930 میں ایک جرمن خاتون ایلس سے شادی ہوگئی۔

1941 میں آپ نے ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھانا شروع کیا۔ 1942 میں فوج میں کیپٹن کی حیثیت سے شامل ہوگئے۔

1943 میں میجر ہوئے۔ 1944ء میں لیفٹیننٹ کرنل تک جا پہنچے۔

1959ء میں پاکستان آرٹس کونسل کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔

1962 تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔

1964 میں لندن سے واپسی پر سرعبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

پڑھنے والوں کو اس سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ فیض صاحب نے کیسی مصروف اور شاندار زندگی گزاری تھی۔

آپ کے ساتھ ایک سانحہ یہ ہوا کہ 9 مارچ 1951 کو راولپنڈی سازش کیس میں معاونت کے الزام میں حکومتِ وقت نے آپ کو گرفتار کرلیا تھا۔

انہوں نے چار سال سرگودھا، ساہیوال اور کراچی کی جیلوں میں گزارے۔ 12 اپریل 1955 کو رہا کردیا گیا۔

زنداں نامہ کی بیشتر نظمیں اس زمانے میں تخلیق ہوئی تھیں۔ ان کو ہر وقت اور ہر دور میں سراہا گیا۔ آپ نے بے شمار اعزازات حاصل کیے۔

1953 میں نگار ایوارڈ، HRC ایوارڈ، 1990 میں نشانِ امتیاز۔ 1963 میں لینن ایوارڈ۔ اس کے علاوہ اے وی سینا پرائز، (یہ ایوارڈ ہر دو سال کے بعد یونیسکو کی طرف سے دیا جاتا ہے)

فیض صاحب کا انتقال 20 نومبر 1984ء کو لاہور میں ہوا تھا۔ آپ کی معروف کتابیں: نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہِ سنگ، سرِ وادیِ سینا، شامِ شہرِ یاراں وغیرہ۔

نمونہ کلام۔

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے
کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

....

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

......☆......☆......

دل میں اب یوں تیرے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
اِک اِک کرکے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

......☆......☆......

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
تھک کر یوں ہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

2 جون

دو جون بہ مطابق تین شعبان، سن چار ہجری آپؓ کی پیدائش کی تاریخ ہے آپ کا نام حسینؓ اور ابو عبداللہ کنیت تھی۔ پیغمبر خدا کے چھوٹے نواسے تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔

آپ کے بارے میں آنحضرتؐ نے فرمایا تھا۔

"حسین منی وانا من الحسین" (میں حسین سے ہوں اور حسین مجھ سے ہیں)

آپ نے نبیؐ کی گود میں پرورش پائی۔ آپ کی شہادت کربلا کے میدان میں 10 محرم 60 ہجری بہ مطابق 10 اکتوبر 680 عیسوی کو ہوئی۔

آپ کا مزار مبارک عراق کے شہر کربلا معلی میں ہے۔

دو جون 1896 میں ریڈیو پیٹنٹ کروایا گیا تھا اس مشہور ایجاد کے حوالے سے اگر تھوڑی سی تفصیل فراہم کردی جائے تو زیادہ دلچسپی کا سبب بن جائے گا۔

اس ایجاد پر بہت سے لوگ کام کرتے رہے ہیں۔ 1820 میں ہانس کرسٹین ارسٹیڈ نے بجلی اور مقناطیسیت کے درمیان رابطہ پیدا کرکے آواز کو پہنچانے کی کوشش کی۔ پھر مائیکل فراڈے، اس کے بعد جوزف ہنری نے اس فیلڈ میں کام کیا۔ 1895 میں ٹیسلا نے اس خیال پر کامیاب تجربہ کیا لیکن کچھ خامیاں باقی رہ گئی تھیں۔ بالآخر 1896 میں مارکونی نے ریڈیو کی ایجاد کو تکمیل تک پہنچایا۔

برصغیر میں ریڈیو کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ آئیں ہم برصغیر میں ریڈیو کو تاریخ کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔

مارچ 1926 میں انڈین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن ایک نجی کمپنی کی شکل میں قائم ہوئی۔ 23 جولائی 1927 کو اس کمپنی نے بمبئی میں اپنا اسٹیشن قائم کیا۔ 1928 میں لاہور میں ایک چھوٹا ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن قائم ہوا۔ اپریل 1930 میں انڈین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ کا نام دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا گیا۔ 1933 میں اس ادارے پر انڈین وائرلیس ٹیلی گرافی ایکٹ لاگو کردیا گیا۔ جنوری 1935 میں صوبہ سرحد کی حکومت نے پشاور میں 250 کلوواٹ کا اسٹیشن قائم کیا۔ جنوری 1936 میں دہلی میں باقاعدہ ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا۔ 9 جولائی 1936 اسٹیشن ڈائریکٹر دہلی اے ایس بخاری کو ڈپٹی کنٹرولر براڈ کاسٹنگ کی حیثیت سے مقرر کردیا گیا۔ 8 جون 1936 انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ کا نام تبدیل کرکے آل انڈیا ریڈیو رکھ دیا گیا۔ دسمبر 1937 لاہور میں اسٹیشن کا آغاز ہوا مارچ 1939 پشاور مرکز ریلے اسٹیشن میں تبدیل ہوا۔ 1939 میں مرکزی طور پر دہلی سے تمام زبانوں میں خبروں کا آغاز ہوا۔ اسی سال ڈھاکا میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا۔ 12 نومبر 1939۔ بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے عید کے دن قائداعظم کا پہلا ریڈیو خطاب نشر ہوا۔ 24 اکتوبر 1941 اطلاعات و نشریات کا محکمہ قائم ہوا۔ 16 جولائی 1942 پشاور ریڈیو اسٹیشن کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ فروری 1943 کنٹرولر براڈ کاسٹنگ کا نام بدل کر ڈائریکٹر جنرل رکھ دیا گیا۔ 3 جون 1947 قائداعظم نے آل انڈیا ریڈیو سے اپنے تاریخی خطاب میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک خودمختار مملکت پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا اعلان کیا۔ 14 اگست 1947ء پاکستان کے باقاعدہ وجود میں آنے کا اعلان ریڈیو ہی سے کیا گیا۔

3 جون 1965۔ خلا میں انسان کی پہلی چہل قدمی خلا میں چہل قدمی کرنے اور جانے والا پہلا انسان روسی ہوا باز یوری گگارین تھا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے پائلٹ تھا۔ یوری ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین نے بڑی مشکلوں سے اسے تعلیم دلوائی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب اس نے پہلی بار ہوائی جہاز دیکھا تو اسی وقت ارادہ کرلیا تھا کہ اسے خلا باز بننا ہے۔ اس کے اساتذہ کا کہنا تھا کہ یوری قدرتی ہوا باز تھا۔ پھر وہ اپنی محنت سے پائلٹ بن گیا۔ اس نے اپنی مہارت کا ثبوت دیا کہ اسے خلا میں جانے والے پہلے انسان کے طور پر منتخب کرلیا گیا۔ یوری نے 1961 میں خلا میں جاکر زمین کے گرد چکر لگایا تھا۔ اس کے بعد ہی امریکا اور روس کے درمیان خلائی دوڑ کا آغاز ہوا تھا۔

1961 میں خلا میں جانے کے بعد اس نے 1967 میں پھر جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔ یوری نے لڑاکا

طیاروں کی آزمائش پر بھی مامور تھا۔ ایسی ہی ایک آزمائشی پرواز کے دوران اس کا طیارہ حادثے کا شکار ہوگیا اور یوری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس وقت وہ صرف 34 برس کا تھا۔

وہ 1934 میں پیدا ہوا اور 1968 میں انتقال کرگیا۔

4 جون کو یوور کرافٹ پیٹنٹ کرایا گیا۔ یہ ایک مشہور ایجاد ہے لیکن بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ ہوتا کیا ہے۔

یورو کرافٹ اسے منڈلاتا ہوا جہاز بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا جہاز ہے جسے کسی بھی ہموار سطح پر سفر کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

یوور کرافٹ دراصل وہ کشتی ہے جو پانی سے نکل کر براہِ راست خشکی پر بھی چل سکتی ہے۔ ایک یوور کرافٹ کی رفتار ایک سو بیس میل فی گھنٹا تک ہوتی ہے۔ جو کسی بھی بحری جہاز کی رفتار سے زیادہ ہے۔ یوور کرافٹ طوفانی موسم میں اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ ہم اسے پُرسکون پانیوں کی سواری کہہ سکتے ہیں۔

5 جون 1819 کو جان آڈم پیدا ہوا۔ اس نے اپنے ساتھی کے ہمراہ تحقیق کی اور نیپچون Naptune کا پتا چلایا۔ یہ حجم میں یورینس سے چھوٹا لیکن اس سے زیادہ کثیف ہے۔ اس سے حرارت کا اخراج یورینس سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن مشتری اور زحل کی نسبت اس کی حرارت کا اخراج کہیں کم ہے۔ نیپچون کے تیرہ چاند ہیں۔

ان میں سب سے بڑا چاند ٹرائیٹن ہے۔ جوارضیاتی طور پر فعال ہے۔ نیپچون پر سامنے کے حصے میں نائٹروجن گیسز پائے جاتے ہیں۔ ٹرائٹین نظام شمسی میں واحد بڑا چاند ہے جو اپنے سیارے کے گرد گھڑی وار (کلاک وائز) گردش کرتا ہے۔ اور اس وجہ سے ماہرینِ فلکیات کا یہ خیال ہے کہ نیپچون کا یہ چاند نظام شمسی کی ابتدا ہے نیپچون کے گرد گردش نہیں کررہا بلکہ یہ ایک سیارہ ہے جو کہ نیپچون کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی گرفتِ ثقل میں آگیا ہے۔ نیپچون کے مدار میں کچھ دوسرے چھوٹے سیارے بھی گردش کررہے ہیں جن کو Trojans کہا جاتا ہے۔

1933 کے 6 جون کو نیوجرسی میں پہلا ڈرائیوان سینما قائم ہوا تھا۔ یہ آئیڈیا رچرڈ ہرلنگ لینڈ کے ذہن میں آیا تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو اپنی ماں کے ساتھ فلم دیکھنے جایا کرتا۔ اس کی ماں اسے سینما کی نشست پر بڑی مشکلوں سے بٹھائے رکھتی۔ کیونکہ وہ شریر قسم کا تھا۔ اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ تم میرے لیے ایسا سینما بنادو جو گاڑی کے اگلے شیشے پہ ہو اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا فلم دیکھتا رہوں۔ اور یہی وہ بنیادی خیال تھا جس نے ڈرائیوان سینما کو جنم دیا۔

7 جون 1953 میں بوسٹن سے پہلی رنگین نشریات کا آغاز ہوا

پہلا رنگین پروگرام Tournament of Roses پیش کیا گیا۔ پھر 1960 رنگین ٹی وی کا رواج عام ہوگیا۔ جاپان میں رنگین نشریات کو NHK اور NTV نے ستمبر 1960 میں متعارف کروایا۔ فلپائن میں 1966۔ تائیوان میں 1969۔ آسٹریلیا میں 1967۔ تھائی لینڈ میں 1969۔ ہانگ کانگ میں 1970۔ چین میں 1971۔ نارتھ کوریا میں 1974۔ سنگاپور میں 1974۔ پاکستان میں 1976 (جزوی طور پر) مکمل رنگین نشریات کا آغاز پاکستان میں 1982 سے ہوا۔

1843 کے 7 جون کو امریکی ماہرِ تعلیم سوزن الزبتھ کی پیدائش ہوئی۔ انہوں نے کنڈر گارڈن یعنی بچوں کا باغ کی بنیاد رکھی... یہ سسٹم بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرنے کا سسٹم ہے۔ اس میں بچے مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ جیسے موسیقی، کھیل، کہانیاں، کارٹونز وغیرہ، اس طرح وہ آیندہ اسکول کے ماحول سے گھبراتے نہیں ہیں۔ یہ سسٹم 1837 میں پہلی بار جرمن کے فرابیل نے متعارف کروایا تھا جو 1843 میں امریکا پہنچا اور اب پوری دنیا اس سسٹم سے واقف ہے۔

8 جون 1625 میں فرانسیسی آسٹرولوجر کاسینی کی پیدائش ہوئی اس نے SATURN زحل دریافت کیا۔ یہ ہمارے سورج سے چھٹے نمبر پر جبکہ ہمارے نظامِ شمسی کا دوسرا بڑا سیارہ ہے۔

اس کا نام Saturn ایک یونانی دیوتا کے نام پر رکھا گیا ہے۔ زحل کا مدار زمین کے مدار کی نسبت نو گنا زیادہ بڑا ہے۔

کمیت میں یہ سیارہ زمین سے 95 گنا بڑا ہے۔ اس لیے بے پناہ کشش ثقل کا حامل ہے۔ خیال ہے کہ اس سیارے میں لوہا، نمک، سلی کون اور آکسیجن کے مرکبات پائے جاتے ہیں۔

اس کے گرد موٹی تہ ہے جو برفانی ذرات سے بنی ہے۔

8 جون 1916 کو اس برطانوی بایولوجسٹ فرینسس

نیرو سائنٹسٹ کی پیدائش ہوئی جس نے انسانی جسم میں DNA کا سراغ لگایا۔

DNA دراصل De-oxy -Ribo- Nucleic Acid کا مخفف ہے۔ اوراس نام کے اجزا کے معنی کچھ یوں ہیں

De کم ہوجانا۔ نکل جانا۔

oxy آکسیجن

Ribo ایک قسم کی شکر کا نام

Nucleic مرکزی خلیہ

Acid ترشہ، تیزابی خصوصیت رکھنے والا۔

جس طرح کمپیوٹر کے براؤزر پر نظر آنے والے صفحے کے پیچھے HTML کے رموز (کوڈز) کارفرما ہوتے ہیں۔ اسی طرح زمین پر حرکت کرتی ہوئی زندگی کے پیچھے DNA کے رموز ہوتے ہیں۔ یعنی کسی جاندار کی ظاہری شکل وصورت اور رویت (طرزِ ظاہری) دراصل اس کے خلیات میں موجود پوشیدہ جینیک کوڈ سے بنتا ہے۔

11 جون 1867 کو چارلس فیری کی پیدائش ہوئی اس نے اوزون لہر کی دریافت کی۔

اوزون زمین سے بہت اوپر خلا میں ایک ایسی سطح ہے جو سورج کی ضرر رساں ریڈی ایشن کو روک دیا کرتی ہے۔ اس کا سراغ 1913 میں فرانسیسی سائنس دان چارلس فیری نے لگایا تھا۔ بعد میں مائکروبایولوجسٹ جی ایم بی ڈوکسن نے اس میدان میں بہت کام کیا۔

اس نے ایک ایسا آلہ بنایا جس کی مدد سے زمین پر رہ کر اوزون کی سطح کو جانچا جاسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اوزون کی رکاوٹ نہ ہوتو الٹراوائلٹ شعاعیں پوری زمین کو جلا کر رکھ دیں۔

15 جون کو حیدرآباد جیل میں پنڈی سازش کیس کی سماعت شروع ہوئی۔

پاکستان کی تاریخ کا یہ ایک بڑا واقعہ ہے جس میں بہت بڑے بڑے نام ملوث تھے۔ عام طور پر اس سازش کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے پس منظر سے کم لوگ واقف ہوں گے۔

پاکستان کی بری فوج کے چیف آف جنرل اسٹاف میجر جنرل محمد اکبر خان (نشان امتیاز) کی رہائش گاہ پر 23 فروری 1951 کو ایک اجلاس منعقد ہوا۔ بظاہر کشمیر پر بھارتی قبضہ اور جنگ بندی اس اجلاس کا موضوعِ بحث بنا رہا۔ مگر اس کے برعکس لاہور سے وزیراعظم لیاقت علی خان نے 9 مارچ 1951 کو اس بارے میں جو بیان جاری کیا اس سے واضح ہوتا تھا کہ یہ اجتماع حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے تھا۔ حکومت کو اس سازش کا علم ہوگیا ہے۔ چنانچہ 9 مارچ کو سازش کے سرغنہ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا .... ان میں میجر جنرل اکبر خان، بریگیڈیئر ایم اے لطیف خان، بریگیڈیئر کمانڈر کوئٹہ کرنل محمد صدیق، کیپٹن نیاز محمد ارباب کے علاوہ فیض احمد فیض، سجاد ظہیر جنرل سیکریٹری پاکستان کمیونسٹ پارٹی، بیگم نسیم اکبر خان وغیرہ تھے۔ اس کیس میں بہت سوں کو سزائیں ہوئی تھیں۔

سپرمین

ایک فرضی، خیالی کردار جو بہت بہادر اور بہت رحم دل ہے۔ جو ہمیشہ اپنی بے پناہ طاقت اور تیز رفتاری سے ملک اور قوم کے کام آیا کرتا ہے۔ یہ کردار امریکا کی شناخت بن گیا ہے۔ پہلی بار یہ کردار ڈی سی کامک کی کتابوں میں سامنے آیا تھا۔ اس کو تخلیق کرنے والا رائٹر جیری سیگل تھا۔ جس کی رہائش اوہیو (امریکا) میں تھی۔ اس نے اپنا یہ آئیڈیا 1938 میں ڈی سی کامک کو فروخت کردیا تھا۔ اس کے بعد اس کردار پر ریڈیو پروگرام بنائے گئے۔ پھر ٹی وی، فلم اور یہ کردار پوری دنیا میں مشہور ہوتا چلا گیا۔ اب پوری دنیا اس کردار کو جانتی ہے۔

1902 کے سولہ جون کو باربرا پیدا ہوئی اس نے 1983 میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

17 جون 1832 کو ولیم کروکس پیدا ہوا۔ اس نے کروکس ٹیوب ایجاد کی۔

20 جون 1840 میں سموئیل مورس نے ٹیلکس گرافی سگنلز رجسٹر کرایا جو اس کے نام پر مورس کوڈ کہلاتا ہے۔

24 جون 1731 کو فرانسیسی صنعت کار E.I.BUPONT پیدا ہوا۔ اس نے دنیا کی پہلی فیکٹری قائم کی جہاں بندوق کی گولیاں تیار کی جاتی تھیں۔

26 جون 1498 کو پہلا ٹوتھ برش تیار ہوکر بازار میں آیا۔

27 جون 1929 میں پہلا رنگین ٹی وی نیویارک میں ڈسپلے ہوا۔

30 جون 1965 میں پاک وہند کے درمیان رن کچھ کا معاہدہ ہوا۔

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب وروز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے توشۂ خاص

چندہ جمع کرنے کی مہم کے دوران اندازہ ہوا کہ مصیبت زدہ لوگوں کے لیے ہمدردی کا جو جذبہ ایک عام امریکی شہری میں تھا اس کا ثانی شاید دنیا میں کہیں اور نہ مل سکے۔ چاہے وہ مصیبت زدہ غیر ہی کیوں نہ ہو۔ اس معاملے میں ایک امریکی شہری اور امریکی حکومت میں بہت فرق ہے۔ امریکی حکومت ساری دنیا میں تباہی پھیلاتی ہے مگر... امریکی شہری دوسروں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

ایمز ایک چھوٹا سا امریکی شہر ہے۔ اس وقت ایمز کی آبادی تقریباً پچاس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ جس میں سے بیس ہزار کے قریب لوگ یونیورسٹی ٹاؤن میں رہتے تھے اور بقایا ڈاؤن ٹاؤن میں۔ ہمارے ساتھیوں نے چندہ صرف یونیورسٹی ٹاؤن میں جمع کیا تھا۔ مگر اس چھوٹی سی آبادی نے

کوئی ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ کا چندہ دیا اور بے شمار کپڑے، ان کپڑوں میں زیادہ تر تقریباً نئے تھے اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ اچھے خاصے قیمتی۔ ہم لوگوں نے ان کپڑوں کو چھانٹنے کے بعد ان کو تھیلوں میں بھر بھر کے پاکستانی سفارتخانے بھجوادیا۔

جس دوران مشرقی پاکستان کا سیلاب آیا.... اسی دوران کوارٹر کی پڑھائی ختم ہوچکی تھی۔ اگلا ہفتہ امتحان کا ہفتہ تھا۔ امتحان ختم ہونے کے بعد ایک ہفتے کی چھٹی تھی۔ اس کا بہترین استعمال یہ ہوسکتا تھا کہ امریکا گھوما جائے۔ میں نے ضروری بندوبست کیا اور نیش ول کے لیے روانہ ہوگیا۔

امریکا میں سفر کے لیے تین ذرائع موجود ہیں۔ ہوائی سفر، ٹرین کا سفر اور سڑک کا سفر۔ طالبعلمی کے دوران ہوائی سفر صرف خیالوں میں کیا جاسکتا ہے کہ ایک طالب علم کی جیب عام طور سے خالی رہتی ہے۔ امریکا میں ٹرینیں زیادہ تر بطور مال گاڑی کے استعمال ہوتی ہیں۔ مسافر ٹرین میں بہت کم لوگ سفر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں پر تقریباً ہر کسی کے پاس گاڑی ہوتی ہے۔ پیٹرول اس زمانہ میں بہت سستا تھا یعنی 27 سینٹ فی امریکی گیلن۔ امریکی گیلن کی مقدار امپیریل گلین سے کچھ کم ہوتی ہے۔ پاکستان میں امپیریل گیلن کا رواج ہے۔ پرانی گاڑیاں اتنی سستی ہیں کہ بہت سے طالب علم بھی اپنی ذاتی پرانی گاڑی خرید کر اپنے تشنہ ارمان پورے کرسکتے تھے۔ میرے دوست اسلم کے پاس بھی ایک عدد پرانی گاڑی تھی۔ گاڑی کیا تھی ہوائی جہاز تھا۔

آیوا۔ یونیورسٹی میں اسلم سے میری ملاقات غیر ملکی طالب علموں کے ایک اجتماع کے دوران ہوئی تھی۔ اسلم میرے کراچی کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ وہ یونیورسٹی میں فلسفہ میں ایم اے کر رہے تھے۔ جب غیر ملکی طلبہ کا اجتماع ختم ہوچکا تو میں اور اسلم ایک ساتھ کمرا اجتماع سے باہر نکلے۔ باہر آکر اسلم نے پوچھا "ٹرک اسٹاپ چلوگے؟"

"یہ ٹرک اسٹاپ کیا بلا ہے؟" میں نے جواباً پوچھا۔

"یہ ٹرکوں کا اڈا ہے جہاں پر تھکے ہوئے ٹرک ڈرائیور تازہ دم ہونے کے لیے رکتے ہیں۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہیں اور گپیں ہانکتے ہیں۔ میں وہاں کافی پینے جاتا ہوں چلو چلتے ہیں تفریح رہے گی۔"

میں تیار ہوگیا۔ اسلم نے پارکنگ لاٹ کا رخ کیا۔ پارکنگ لاٹ پہنچ کر اسلم نے جہاز نما گاڑی کی طرف اشارہ کیا، کہنے لگے "تم اس طرف والا دروازہ کھول کر بیٹھ جاؤ۔"

"یہ تمہاری گاڑی ہے؟" میں نے پوچھا۔ جواب اثبات میں ملا۔ یہ ایک سات آٹھ سال پرانی بیوک گاڑی تھی جو اسلم نے تین سو ڈالر میں خریدی تھی۔ یہاں گاڑی کے بغیر کام نہیں چلتا، اسلم نے بتایا۔ میں نے دو سال بغیر گاڑی کے گزارے، آخر تھک ہار کر یہ گاڑی خرید لی۔

"میں نے ابھی دو ہفتہ بھی نہیں گزارے تھے۔ میں گاڑی صرف خوابوں میں ہی خرید سکتا تھا۔ باتیں کرتے کرتے ہم ٹرک اسٹاپ پہنچ چکے تھے۔ وہاں کے پارکنگ لاٹ میں درجن سے زیادہ ٹرک پارک تھے۔

اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ چند لوگ کاؤنٹر کے سامنے اونچے اسٹولوں پر بیٹھے .... ہیں اور باقی ماندہ لوگ چھوٹی چکور میزوں کے اطراف بچھی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ سب کے آگے کافی کی بڑے سائز کی پیالیاں رکھی ہوئی ہیں۔

فضا میں کافی کی سگندھ تھی اور سگریٹ کے مرغولے لہرا رہے تھے۔ ہم لوگ بھی ایک میز کے سامنے کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی ہم نے کرسیوں پر ٹیک لگائی ایک لڑکی گرما گرم کافی کا جگ لے کر آگئی اور ہمارے آگے رکھی ہوئی پیالیوں میں کافی انڈیل دی۔ ابھی ہم لوگوں نے آدھی کپ کافی پی ہوگی کہ وہی لڑکی دوبارہ نمودار ہوئی اور پیالی کو کافی سے لبالب بھر دیا۔ اسلم نے بتایا کہ یہ یہاں کا دستور ہے جیسے ہی تمہاری پیالی میں کافی کی مقدار آدھی یا اس سے کچھ کم ہوگی تو یہ لڑکی تمہاری پیالی کو دوبارہ لبالب بھرتی رہے گی۔ حتیٰ کہ تم اس کو مزید کافی دینے سے روک نہ دو۔ مزے کی بات یہ ہے کہ قیمت صرف ایک پیالی کی ہی لی جائے گی۔ اور وہ بھی بہت مناسب یعنی صرف ایک کوارٹر یعنی 25 سینٹ۔ ہم لوگوں نے کافی ختم کی اور یونیورسٹی کا رخ کیا۔

اب یہ اسلم کا اور میرا معمول بن چکا تھا کہ ہر تیسرے چوتھے روز ہم ٹرک اسٹاپ کا رخ کرتے اور کافی کی پیالیوں سے سیراب ہوتے۔ ایک رات ہم لوگ کافی کی چسکیاں لے رہے تھے کہ اسلم نے پوچھا۔ "امتحان کے بعد میں چند دنوں کے لیے شکاگو جارہا ہوں۔ چلوگے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اپنی بہن سے ملنے نیش ول جانا چاہ رہا ہوں۔"

"کیسے جاؤ گے؟"

"گرے ہاؤنڈ سے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم رائیڈ کیوں نہیں لے لیتے؟" اسلم نے سوال کیا۔

"یہ رائیڈ کیا بلا ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔ اسلم نے تفصیل بتائی۔

"بہت سے ایسے لڑکے لڑکیاں جن کے پاس اپنی گاڑی ہے وہ چھٹیاں گزارنے اپنے گھروں کو اپنی گاڑیوں سے جاتے ہیں۔ خرچہ بچانے کے لیے وہ دوسرے طلبا کو اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ سب پیٹرول کا خرچہ آپس میں بانٹ لیتے ہیں اس طرح یہ سفر ان کو بہت سستا پڑتا ہے۔"

میں نے رائیڈ کا بندوبست کرلیا۔ مجھے اپنے ہم جماعت گریگوری کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ وہ جیکسن جارہا تھا۔ پہلے وہ مجھے نیش ول چھوڑے گا پھر اپنے گھر جائے گا۔ شرط یہ تھی کہ آخری پرچہ دینے کے بعد جمعہ کی شام کو ہی روانہ ہونا تھا۔

نیش ول ریاست ٹینیسی کا دارالخلافہ ہے۔ اس شہر کا نام امریکا کی انقلابی جنگ کے ہیرو فرینسس نیش کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ جنگ 1775ء سے لے کر 1783 تک لڑی گئی۔ شروع میں تیرہ امریکی کالونیوں اور برطانیہ کے درمیان جاری رہی پھر بعد میں اس میں فرانس، اسپین، نیدرلینڈ وغیرہ شامل ہوگئے۔ فتح امریکی کالونیوں کی ہوئی اور امریکا کو ایک آزاد مملکت تسلیم کرلیا گیا۔

نیش ول دریائے کمبرلینڈ پر واقع ہے۔ 1779 میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ ایمز سے نیش ول جانے کے لیے ہم کو ریاست الی نوی اور ریاست مزوری کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ریاست ٹینیسی میں داخل ہونا تھا۔

ایمز سے نکلتے نکلتے اندھیرا ہوچلا تھا۔ بارہ چودہ گھنٹے کا سفر طے کرنا تھا۔ گریگوری نے مجھے خبردار کیا۔ "راستے میں مجھ سے باتیں کرتے رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے نیند کا جھونکا آجائے۔"

یہ نئی شرط تھی جو معاہدے میں شامل نہ تھی۔ لیکن بہرحال مجھے جان عزیز تھی، نہ تو میں خود سویا اور نہ ہی گریگوری کو جھپکی لینے دی گو کہ اس نے دو تین دفعہ مجھے جھکائی دے کر اپنی آنکھیں موند لیں اور اسٹیئرنگ وہیل کو آزاد چھوڑ دیا۔ گاڑی سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ راستے میں ریاست مزوری کا شہر سینٹ لوئی پڑتا ہے۔ یہاں پر ایک ٹرک اسٹاپ پر رک کر ہم لوگوں نے منہ ہاتھ دھو کر نیند کو بھگانے کی کوشش کی۔ مقدور بھر کافی نوشِ جاں کی اور منزل کی طرف دوبارہ چل پڑے۔ نیش ول پہنچے تو صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

نیش ول میں میری منزلِ مقصود وین ڈربلٹ یونیورسٹی تھی کہ یہاں پر میری بہن اور بہنوئی زیرِ تعلیم تھے۔ میں ان ہی سے ملنے کے لیے نیش ول آیا تھا۔

وین ڈربلٹ ایک پرائیوٹ یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کا نام کورنیلیس وین ڈربلٹ کے نام پر رکھا گیا ہے کہ ان صاحب نے اس یونیورسٹی کے قیام کے لیے ابتدائی ایک ملین دس لاکھ ڈالرز فراہم کیے تھے۔ یونیورسٹی میں دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ ایک میڈیکل سینٹر اور ایک آبزرویٹری بنائی گئی تھی مگر جب یہ آبزرویٹری یونیورسٹی کی ضروریات کے لیے کم پڑنے لگی تو اس کو دوسری جگہ منتقل کرکے اس کا نام ڈائر آبزرویٹری رکھ دیا گیا۔

یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد ہم ڈھونڈتے ڈھانڈتے ان اپارٹمنٹ کے احاطہ میں پہنچ گئے جہاں بہن بہنوئی قیام پذیر تھے۔ گریگوری جلد از جلد مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ جتنی جلدی ہوسکے اپنے گھر پہنچ کر بستر پر گر سکے۔ وہ پچھلے بارہ گھنٹے سے زیادہ گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بیتابی سے ہاتھ ملایا اور یہ جا وہ جا۔

گھر والوں سے الگ رہنے کے بعد بہن بہنوئی بڑی نعمت معلوم ہوئے۔ لیکن نیند کی محبت ان کی محبت پر بازی لے گئی۔ ساری رات کا جاگنا اور اس سے بڑھ کر یہ دھڑکا کہ ڈرائیور کہیں گاڑی چلاتے چلاتے سو نہ جائے اور مجھے نیش ول کا نظارہ عالم بالا سے کرنا پڑے۔ بہن نے ناشتا تیار کیا۔ میں نے ناشتا ختم کرتے ہی خوابگاہ کا رخ کیا اور لمبی تان کر سوگیا۔

قلب کے حتی لکھتا ہے:
"سرتال کی موسیقی" اس شعبۂ علم میں عربوں کا عظیم ترین کارنامہ ہے لیکن ایک اسی کارنامے پر کچھ موقوف نہیں۔ عربوں نے مغربی یورپ کو دو ایسے ساز دیے جن سے فن موسیقی کے فروغ میں سب زیادہ مدد ملی۔ ایک کا نام عود تھا۔ اسے اندلسی زبان میں لاڈ کہتے ہیں اور دوسرے کا نام رباب تھا جسے اندلسی زبان میں ریبل کہتے ہیں۔"
اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

امریکا میں ایک رواج تھا (ہوسکتا ہے کہ اب بھی ہو) کہ جو نئے غیر ملکی طلبہ وہاں پڑھنے جاتے تھے ان کو یونیورسٹی کی طرف سے کسی ایک خاندان سے بطور ہوسٹ فیملی متعارف کروادیا جاتا تھا تاکہ ان کو ایک غیر ملک میں اتنی غیریت محسوس نہ ہو اور وہ سہولت کے ساتھ امریکی طور طریقوں کو جان جائیں۔ میری بہن کی بھی ایک ایسی ہی ہوسٹ فیملی تھی۔ میرے نیش ول پہنچنے سے پہلے ہی میری بہن نے اپنے کڈبرادر یعنی چھوٹے بھائی کا ذکر (کہ جو کڈ برادر ان سے صرف ڈیڑھ سال چھوٹا تھا) کچھ اس انداز سے کیا تھا کہ جب ان خاتونِ خانہ کی دعوت پر ہم لوگ ان سے ملاقات کرنے ایک ریسٹورنٹ میں گئے تو وہ احتیاطاً اپنے ساتھ دودھ کی بوتل اور چھالیوں کا پیکٹ لے آئی تھیں کہ شاید دورانِ ملاقات ان کی ضرورت پڑ جائے۔

خاتونِ خانہ نے ہاتھ ملا کر مجھے خوش آمدید کہا اور باتوں میں مشغول ہوگئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے کہنے لگیں۔

''تم کو امریکا آئے ہوئے ابھی تین مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں اور ابھی سے اتنی اچھی انگریزی بول رہے ہو؟''

میں نے جواباً پوچھا۔ ''آپ نے انگلستان کا نام سنا ہے؟''

کہنے لگیں۔ ''صرف نام ہی نہیں سنا ہے۔ میں تو وہاں جا بھی چکی ہوں۔ مجھے لندن شہر تو بہت ہی پسند آیا۔''

''اگر آپ وہاں جا چکی ہیں تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ انگلستان کے لوگ انگریزی زبان بولتے ہیں۔''

''ہاں بولتے تو ہیں مگر ان کا لہجہ ہمارے لہجے سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔ میری تو سمجھ میں بھی مشکل سے آتا ہے مثال کے طور پر وہ ایڈوکیشن کو ایجوکیشن بولتے ہیں اور کوکنی ایکسنٹ تو بہت ہی واہیات ہے۔'' انہوں نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ انگلستان کے لوگ تجارت کے بہانے ہندوستان آئے اور اپنی چالوں سے اور ہندوستان کے راجا، مہاراجا اور نوابوں کے اختلافات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے حاکم بن گئے اور دو سو سال تک ہم پر حکومت کرتے رہے اور وقتِ رخصت اپنی انگریزی زبان ہم کو بطور سوغات دے گئے۔''

میں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''اب ہماری قوم کا حال یہ ہے کہ ہم دو تین منٹ بھی انگریزی زبان کے الفاظ ملائے بغیر اپنی قومی زبان ''اردو'' میں بات نہیں کرسکتے۔''

''ہاؤ سیڈ...!'' انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

یہ چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو حالت یہ ہے کہ گھروں میں کام کرنے والے ملازم، خانساماں، سبزی فروش، دودھ والے وغیرہ بھی انگریزی الفاظ کی ملاوٹ کے بغیر بات نہیں کرسکتے۔ اب وہ بھی ٹینشن میں رہتے ہیں۔ لفظ پریشانی کو وہ بھول چکے ہیں اور OK تو گھر کی لونڈی ہے۔

اب ہم ''اردو'' نہیں ''انگریزدو'' بولتے ہیں۔ ''انڈے ابل رہے ہیں۔'' کہنے والے کم ہوتے جارہے ہیں، اب نئی پود کہنا شروع کرے گی کہ ''دی انڈاز آر ابلنگ۔'' خدا اردو کے حال پر رحم فرمائے۔ آمین!

نیش ول میں میرا قیام بدھ کے روز تک تھا۔ یہ چند دن پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ بدھ کے دن صبح صبح گریگوری مجھے لینے پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں ایمز کے لیے روانہ ہوگئے۔ شکر ہے کہ واپسی کا یہ سفر دن کے وقت طے کرنا تھا۔ میں آرام سے گاڑی میں سوسکتا تھا بغیر اس دھڑک کے کہ غنودگی کے عالم میں کہیں عالمِ بالا ہی نہ پہنچ جاؤں۔

جمعرات اور جمعہ کورس کے انتخاب اور فیس جمع کروانے میں گزر گئے۔ پیر سے میرے دوسرے کوارٹر کو شروع ہونا تھا۔ اس کوارٹر میں مجھے کسی کورس کو آڈٹ نہیں کرنا تھا۔ کوارٹر شروع ہونے کے چند ہی دن کے اندر مجھے اطلاع ملی کہ میرے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ میری عمر ستائیس سال تھی۔ میں انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تقریباً چار سال نوکری بھی کرچکا تھا لیکن پھر بھی باپ کے پیسے پر پڑھائی کررہا تھا۔ امریکا میں انڈر گریجویٹ طلبا تک خود پیسے کماتے تھے اور خود اپنی یونیورسٹی کی پڑھائی کا خرچہ برداشت کرتے تھے۔ میرے لیے کوئی جواز نہیں تھا کہ میں باپ کے پیسے پر عیش کروں۔

میں نے کینیڈا کا امیگریشن ویزا حاصل کیا اور امریکا کو خیرباد کہا۔ دست خود دہان خود۔ اب میں اپنا خرچہ خود اٹھاؤں گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے پیسے بھی خود ہی پس انداز کروں گا۔ میں عمر کے اس دور میں تھا کہ جس عمر میں اولاد ماں باپ کے لیے عصا بن رہی ہوتی ہے نہ کہ مالی بوجھ۔

☆☆☆

کینیڈا کے لیے میں نے امیگریشن ویزا کی درخواست پاکستان میں ہی واقع کینیڈا کے سفارتخانہ میں اس وقت داخل کردی تھی جس وقت مجھے PIA میں کام کرتے ہوئے کوئی تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سفارتخانے سے انٹرویو کا بلاوا موصول ہوا تو میں نے راولپنڈی جا کر انٹرویو بھی دے دیا تھا اس وقت تک کینیڈا کا سفارتخانہ راولپنڈی میں ہی تھا۔ ابھی اسلام آباد منتقل نہیں ہوا تھا۔

انٹرویو کے تین ہفتے بعد سفارتخانے سے میڈیکل کروانے کے کاغذات وصول ہوئے۔ میں نے یہ کارروائی بھی مکمل کرلی۔ مزید چند دن بعد میرا امیگریشن ویزا تیار تھا اب میں کسی بھی وقت کینیڈا جاسکتا تھا لیکن مجھے کینیڈا جانے میں تامل تھا۔

پاکستان میرا ملک ہے، کراچی میرا شہر۔ کچھ عرصہ کے لیے تو پاکستان سے باہر جایا جاسکتا ہے لیکن ترکِ وطن کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ خاص طور سے کراچی چھوڑنا۔ کراچی کے ساتھ کچھ بھی ہوجائے، اس کے حالات کیسے ہی ناگفتہ بہ کیوں نہ ہوں، اس سے میرے بچپن کی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔

یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو
بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی
مگر مجھ کو لوٹا دو وہ بچپن کی یادیں
وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی

شاید آج کے بچوں بلکہ آج کے نوجوانوں تک میں اس شعر کے پس منظر کا تخیل نہ ہو۔ مگر میرا سارا بچپن اس شعر میں سمویا ہوا ہے۔

ہم لوگ ہجرت کرکے نئے نئے کراچی آئے تھے۔ پیرالٰہی بخش (PIB) کالونی میں بمشکل سر چھپانے کی جگہ ملی تھی۔ دو کمروں کے ایک کوارٹر میں بہت سے بچے رہتے تھے۔ جب بھی بارش ہوتی تو گلیوں میں پانی جمع ہوجایا کرتا۔ کبھی ٹخنوں تک تو کبھی گھٹنوں تک۔

سارے بچے بارش میں بھیگتے، اسی مٹیالے پانی میں کھیلتے اور بارش کے تھمنے پر کاغذ کی کشتیاں بنا کر مقابلہ کرتے کہ کس کی کشتی پانی میں دیر تک تیرتی ہے۔ ان حسین

یادوں کوکون بھلاسکتا ہے۔ پھر بھی میں نے کینیڈا امیگریشن کی درخواست دے دی تھی۔

یہ بات میری نادان سمجھ سے باہر تھی مگر رب جلیل کی مصلحتوں سے باہر نہ تھی۔ جب میں آیوا اسٹیٹ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا، اسی دوران میرے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا اور میں نے یہ طے کیا کہ اب باپ کے پیسے پر تعلیم حاصل کرنے کی بجائے اپنی آیندہ تعلیم کا بوجھ خود برداشت کروں گا۔ اس وقت اپنے رب کی مصلحت میری سمجھ میں آئی۔

اپنی تعلیم کا بوجھ خود برداشت کرنے کا راستہ کینیڈا سے ہوکر جاتا تھا اور یہ راستہ بغیر امیگریشن ویزا کے طے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اگر میں نے یہ ویزا پہلے ہی حاصل نہ کرلیا ہوتا تو یہ کسی طور ممکن نہ تھا کہ یہ ویزا امریکا میں رہتے ہوئے حاصل کرسکتا۔ اس لیے کہ کینیڈا کا ویزا حاصل کرنے کے قوانین ہی کچھ ایسے ہیں۔ اسی پرانے ویزے کی بنیاد پر میں نے شکاگو میں واقع کینیڈا کے سفارتخانے میں دوبارہ اس کے اجراء کی درخواست بھیج دی۔ سفارتخانے سے انٹرویو کا بلاوا آگیا۔ میں نے یونائیٹڈ ائر لائن کی پرواز پکڑی اور شکاگو کے اوہیر ائرپورٹ پہنچ گیا۔

اوہیر دنیا کا مصروف ترین ائرپورٹ ہے۔ یہاں سے ہر دومنٹ کے وقفہ سے کوئی نہ کوئی پرواز کہیں نہ کہیں کے لیے شروع ہوتی ہے گویا جہازوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اوہیر ائرپورٹ کا نام پہلے شکاگو اینوائے ائرپورٹ ہوا کرتا تھا۔ ستمبر 1949 میں اس کا نام تبدیل کرکے ایڈورڈ اوہیر کے اعزاز میں اوہیر انٹرنیشنل ائرپورٹ رکھ دیا گیا۔

ایڈورڈ اوہیر دوسری جنگِ عظیم کے ہیرو تھے۔ وہ امریکا کی نیوی میں لیفٹیننٹ کمانڈر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا تقابل ہمارے ہیرو ایم، ایم عالم سے کیا جاسکتا ہے کہ اوہیر نے اپنے ائر کرافٹ کیریئر پر حملہ آور ہونے والے نو جاپانی بمبار طیاروں میں سے زیادہ تر کو مار گرایا تھا یا شدید نقصان پہنچایا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان کے اپنے F4F ہوائی جہاز میں محدود سامانِ حرب تھا۔ اس معرکے کو سراہتے ہوئے ایڈورڈ اوہیر کو "میڈل آف آنر" سے نوازا گیا۔ ایڈورڈ اوہیر امریکی نیوی کے پہلے افسر تھے جن کو یہ تمغا دیا گیا۔ نومبر 1943 میں ان کے F6F ہیل کیٹ جہاز کو جاپانیوں نے مار گرایا۔ جس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

شکاگو میں میرا قیام میرے اسکول کے ساتھی حبیب کے ساتھ تھا۔ حبیب شکاگو کے مضافات میں رہتے تھے کہنے کو تو یہ جگہ شکاگو کا حصہ تھی مگر فاصلوں کا یہ عالم تھا کہ ہائی وے پر سفر کرنے کے باوجود گھر پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹے سے اوپر لگ گیا۔ اگلے دن میں ٹرین کے ذریعے شکاگو میں واقع کینیڈا کے سفارتخانے پہنچا اور کونسلر کے دفتر میں داخل ہوا۔ انہوں نے پہلے تو کھڑے ہوکر میرا پُرتپاک استقبال کیا پھر معلوم کیا۔

"جب تم کو پاکستان میں کینیڈا کا امیگریشن ویزا مل چکا تھا تو پھر کینیڈا کیوں نہیں گئے؟"

"جی میرا کینیڈا جانے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ میں M.S کرنے امریکا چلا آیا۔"

"تو اب کینیڈا کیوں جانا چاہتے ہو جب امریکا میں تعلیم حاصل کررہے ہو!"

"جی میرے حالات کچھ بدل چکے ہیں، تعلیمی اخراجات کا مسئلہ ہے۔ میں کینیڈا میں پیسے کما کر اپنی تعلیم مکمل کروں گا۔"

"کیا تعلیم مکمل کرنے کے بعد تم کینیڈا میں رہ جاؤ گے؟"

"فی الحال میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

سوال جواب ختم ہوچکے تھے۔ اب کونسلر کو اپنا فیصلہ سنانا تھا۔ کونسلر نے بجلی گرائی "میں تمہارا ویزا مسترد کرسکتا ہوں" پھر اس کی وجہ بتائی۔ "اس لیے کہ تم کو کینیڈا سے بظاہر کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم کینیڈا کو صرف اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہو۔"

میں تقریباً مایوس ہوچکا تھا کہ امید کی کرن دکھائی دی۔

"لیکن میں تمہارا ویزا مسترد نہیں کروں گا۔ جانتے ہو کیوں؟"

"جی نہیں" میں نے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

کونسلر صاحب مسکرائے۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔

"دو باتوں کی وجہ سے۔" پھر ان وجوہات کی وضاحت فرمائی۔

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تم اپنے کینیڈا کے ویزا کو ایک نیک مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہو۔ یعنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نے مجھے گھمانے کی کوشش نہیں کی، ہر بات سیدھے اور سچے طریقے سے بیان کردی۔" اس کے بعد کھری بات کرنے کی اہمیت بتائی۔ "مجھے ایشیا کے لوگوں سے ایک شکایت ہے، وہ ہمیشہ

احکامِ الٰہی

✧ متقی وہ لوگ ہیں جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے اور غصے کو روکتے ہیں اور لوگوں کے قصوروں سے درگزر کرتے ہیں۔

✧ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انبیا و صلحا جو تم سے پہلے گزرے ہیں ان کے طریقے کھول کھول کر تم سے بیان کرے اور تم کو انہی طریقوں پر چلائے اور تم پر بخشش کی نظر رکھے۔

✧ جو کوئی زور و ظلم سے کسی کا مال خورد برد کرے گا، تو ہم اس کو قیامت کے دن دوزخ کی آگ میں جھونک دیں گے۔

✧ لوگو! تم خدا سے کیوں کر انکار کرسکتے ہو، تم بے جان تھے، تو اس نے تم میں جان ڈالی، پھر وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو دوبارہ زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

✧ اے نبی! تم سے دریافت کرتے ہیں، خدا تعالیٰ کی راہ میں کس قدر خرچ کریں؟ تم ان کو سمجھا دو کہ جتنا تمہاری حاجت سے زائد ہو خرچ کردو۔

بلقیس فرحت......کراچی

تھما پھرا کر بات کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ صاف گوئی سے کام نہیں لیتے بلکہ اس کے برعکس اکثریت کے نزدیک دروغ گوئی ایک آرٹ ہے۔ وہ اس کو Perjuray نہیں سمجھتے۔ میرے نزدیک پرجری نہ صرف ایک قانونی جرم ہے بلکہ ایک گناہ ہے۔" پھر آخری جملہ "تم کو تمہارا ویزا ڈاک سے مل جائے گا۔"

کونسلر کی بات اس وقت مجھے سخت کڑوی لگی۔ لیکن جب میں نے ٹھنڈے دل سے اس کی باتوں پر غور کیا تو مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس کی باتوں میں تعصب نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارا معاشرہ دروغ گوئی کو بالکل برا نہیں سمجھتا اور ہماری عدالتیں اس کے خلاف کوئی خاص قدم نہیں اٹھاتیں۔ اس کے برخلاف مغرب کی دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو صاف گو ہیں۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ مغرب کا معاشرہ برائیوں سے مبرا ہے۔ ان کی اپنی برائیاں ہیں۔

ویزا مجھے ڈاک سے مل چکا تھا۔ میں نے اپنا میڈیکل کروایا۔ امریکن ائر لائنز سے ٹورنٹو کا ٹکٹ خریدا اور ٹورنٹو ائرپورٹ پہنچ گیا۔

رقبہ کے حساب سے کینیڈا روس کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ لیکن اس کی آبادی اپنے پڑوسی ملک امریکا کی کل دس فیصد ہے۔ 1971ء میں امریکا کی آبادی لگ بھگ پچیس کروڑ تھی اور کینیڈا کی صرف ڈھائی کروڑ۔ پاکستان کی آبادی اس وقت تقریباً سات آٹھ کروڑ تھی۔ آج صورتحال یہ ہے کہ پاکستان کی آبادی اٹھارہ کروڑ کو چھو رہی ہے جبکہ کینیڈا کی آبادی لگ بھگ سوا تین کروڑ ہے۔ 1971 کے مقابلے میں ہماری آبادی دوگنی سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے۔ پاکستان کا نمبر ایک مسئلہ شاید دہشت گردی نہیں ہے بلکہ وہ پیار اور محبت ہے جو آبادی کے بڑھانے میں معاون ہوتا ہے۔ ہماری آبادی ہر پچیس سال کے بعد دوگنی ہوجاتی ہے۔ اگر یہ صورتحال اسی طرح سے رہی تو اگلے پچاس سال بعد پاکستان کی آبادی اٹھارہ کروڑ سے بڑھ کر بہتر کروڑ ہوجائے گی۔ کیا یہ ممکن ہے!!! کیونکہ اس وقت کی آبادی کو سمونے کے لیے چار کراچی، چار لاہور، چار پشاور درکار ہوں گے۔

مملکتِ کینیڈا 3 علاقہ جات یوکون، نیوناوٹ، نارتھ ویسٹ اور دس صوبوں پر مشتمل ہے۔ Territories کینیڈا کے شمال میں ہیں جہاں ہر وقت برف جمی رہتی ہے اور وہاں پر صرف اسکیمو رہتے ہیں۔ کینیڈا کی بقایا آبادی جنوب کے صوبوں میں رہتی ہے۔ ان صوبوں میں نو صوبے وہ ہیں جہاں انگریزی بولی جاتی۔ کیوبیک کینیڈا کا وہ واحد صوبہ ہے جہاں فرانسیسی بولی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے کینیڈا کی دو قومی زبانیں ہیں، انگریزی اور فرانسیسی۔

صوبہ اونٹیاریو کینیڈا کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ ٹورنٹو اس صوبے کا سب سے بڑا شہر ہے اور دارالخلافہ بھی۔ کینیڈا کی کل آبادی کے دس سے بارہ فیصد لوگ ٹورنٹو شہر اور اس کے مضافات میں رہتے ہیں۔

ٹورنٹو ائرپورٹ پر امیگریشن کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں باہر آگیا۔ میرا خیال تھا کہ امیگریشن

ہال کے باہر اٹر کینیڈا کے شعبۂ انجینئرنگ کے سربراہ مع اپنے تمام عملہ کے پھولوں کے ہار لیے میرا انتظار کررہے ہوں گے اور میں جیسے ہی باہر نکلوں گا مجھے کاندھوں پر بیٹھا کر ہینگر لے جائیں گے اور مجھ سے درخواست کریں گے کہ میں اٹر کینیڈا کے شعبۂ انجینئرنگ میں شمولیت اختیار کرلوں۔ یہ خیال خام نکلا وہاں کوئی موجود نہ تھا سوائے محبوب کے جو مجھے لینے آئے تھے۔ خیال ہوا کہ شاید اٹر کینیڈا کو میری آمد کی اطلاع نہ ملی ہو ورنہ وہ اس سنہری موقع کو اس طرح ضائع نہ کرتے۔

''لاتی ہے ایسے موڑ پر قسمت کبھی کبھی''

میں نے دو دن انتظار کیا کہ شاید اٹر کینیڈا والے مجھے ٹیلی فون کرکے اپنی کوتاہی کی معافی مانگیں۔ مگر جب دو دن بعد بھی ان کا ٹیلی فون نہیں آیا تو گمان گزرا کہ شاید اٹر کینیڈا والوں کے پاس میرا ٹیلی فون نمبر نہ ہو۔ ان کو ایک موقع اور دینا چاہیے۔ مناسب تو نہیں مگر میں خود چل کے اٹر کینیڈا کے دفتر جاؤں گا۔

اٹر کینیڈا کے دفتر پہنچ کر میں نے کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو اپنا نام بتایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری آمد کی خوشخبری پورے اسٹاف کو سنائے گی اور وہ سب میرے گرد جمع ہوکر مجھے باجماعت خوش آمدید کہیں گے۔ میرا اندازہ ایک دفعہ پھر غلط ثابت ہوا۔ وہ لڑکی اسی پُرسکون انداز سے کھڑی رہی اور الٹا مجھ سے میری آمد کا مقصد پوچھنے لگی۔ ''میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں۔''

جواب میں میں نے اس کو بتایا کہ میں اٹر کینیڈا کو موقع دینا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے انجینئرنگ کے عملے میں شامل کرکے میری خدمات سے مستفیض ہو۔ اس نادان نے اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار کردیا۔ ''کینیڈا کی معیشت آج کل مشکل دور سے گزر رہی ہے۔ فی الحال ہمارے پاس آپ کے لیے کوئی نوکری نہیں ہے۔'' اس بات کو آج چالیس سال سے اوپر ہوچکے ہیں۔ کینیڈا کی معیشت ابھی تک اس ''مشکل دور'' سے نکلنے میں ناکام ہے۔

میں نے اس لڑکی سے فرمائش کی کہ وہ اپنے سپروائزر کو میری آمد کی اطلاع دے، وہ یقیناً میری خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے مضطرب ہوں گے۔ سپروائزر صاحب نے کاؤنٹر پر آکر مجھ سے بڑے پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملایا اور کینیڈا کی معیشت کی زبوں حالی پر گرفتہ ہوتے ہوئے اپنے انتہائی صدمہ کا اظہار کیا کہ وہ میری خدمات سے استفادہ حاصل نہیں کرسکتے۔ میں نے اپنی سی کوشش کرلی تھی۔ اگر خود اٹر کینیڈا کو ہی اپنے زیاں کا احساس نہیں تھا تو میں ان کی اس نادانی پر افسوس کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ اب میری خدمات کینیڈا کی دوسری کسی کمپنی کے لیے دستیاب تھیں۔ اس کے لیے مجھے اخبار میں شائع ہونے والے نوکری کے اشتہارات کا سہارا لینا ہوگا۔

''آج کا اخبار آگیا؟'' میں نے محبوب سے پوچھا۔

''یہاں گھر پر اخبار نہیں آتا۔ اگر آپ کو اخبار خریدنا ہے تو سامنے سڑک کے فٹ پاتھ پر اخبار کا ڈبا ہے۔ وہاں سے آپ اخبار خرید سکتے ہیں۔''

میں اخبار خریدنے باہر سڑک پر نکل آیا۔ اخبار ایک بڑے سے چوکور ڈبا میں رکھے ہوئے تھے۔ ڈبا کے سیدھے ہاتھ والی طرف پر ایک چھوٹا سا ڈبا لگا ہوا تھا جس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اخبار کی قیمت کے برابر پیسے اس چھوٹے ڈبے میں ڈال دیے اور ایک اخبار نکال لیا۔

دل ہی دل میں میں نے اس قوم کی تعریف کی کہ ان کے دلوں میں ایمانداری کا جذبہ کس قدر راسخ ہے۔ اگلے دو سال میں کینیڈا میں ویزا پر داخل ہونے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوچکا تھا جس کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ ایمانداری کا یہ جذبہ معدوم ہوتا چلا گیا۔ اخبار کے ساتھ ساتھ لوگ چھوٹے ڈبے میں سے پیسے بھی نکال کر لے جانے لگے۔ اس چوری کے ازالے کے لیے کھلے ڈبے کی جگہ بند ڈبے رکھے جانے لگے۔ اب وینڈنگ مشین میں سکے ڈال کر اخبار نکالنا پڑتا ہے۔ مگر لوگوں نے اس کا بھی توڑ نکال لیا ہے۔ اب وہ ایک اخبار کی قیمت ڈال کر دو، تین اخبار نکال لیتے ہیں۔

گھر آکر اخبار کا وہ صفحہ کھولا جس میں نوکریوں کے اشتہار تھے۔ پانچ، چھ مناسب نوکریاں تھیں۔ میں نے ان نوکریوں کے لیے درخواستیں روانہ کردیں۔ ایک جگہ سے انٹرویو کے بلاوے کے لیے فون آگیا۔ اگلے دن میں انٹرویو دینے چلا گیا۔

ریسپشن پر کھڑی صاحبزادی پہلے تو مسکرائیں پھر پوچھا۔ ''میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟''

جی میں آیا کہ کہہ دوں ''آپ مجھے نوکری دے سکتی ہیں۔'' پھر خیال بدل دیا۔

''مجھے مسٹر پال جینگو نے انٹرویو کے لیے فون کیا تھا۔''

انہوں نے کسی کا ٹیلی فون ملایا۔ ''پال، یور گائے از ہیئر۔''

اچھے خاصے آدمی کو انہوں نے ''گائے'' بنا دیا تھا۔ چند منٹ بعد پال ریسپشن میں نمودار ہوئے اور اس گرمجوشی سے ہاتھ ملایا کہ مجھے یقین ہوگیا کہ بغیر انٹرویو کے ہی مجھے ڈگری دے دیں گے۔ پال نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

''کافی؟'' پال نے پوچھا۔

''شکریہ۔'' میں نے انکار کردیا کہ مجھے بغیر دودھ اور بغیر شکر کی کافی پینے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ کینیڈا میں لوگ کافی بغیر شکر والی پیتے ہیں۔ چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پال نے پوچھا۔ ''تم کو کینیڈا آئے ہوئے کتنا عرصہ گزرا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''تین ہفتے۔''

پال نے دوسرا سوال کیا۔ ''تمہارا کینیڈا میں کام کرنے کا کتنا تجربہ ہے؟''

میرا خیال تھا کہ اس سے زیادہ احمقانہ سوال نہیں ہوسکتا کہ ایک نووارد سے پوچھا جائے کہ اس کے پاس کینیڈا میں کام کرنے کا کتنا تجربہ ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سوال شاید اتنا احمقانہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ تقریباً ہر انٹرویو میں مجھ سے یہ سوال کیا گیا۔ لگتا تھا کہ ''کینیڈا میں کام کرنے کا تجربہ'' کوئی ایسی شے ہے جو بازار سے خریدی جاسکتی ہے۔

پال نے آخری سوال پوچھا۔ ''تمہارے پاس PE ہے؟''

میں نے سوال کیا ''یہ PE کیا ہوتی ہے؟''

جواب ملا ''پروفیشنل انجینئر۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ پال نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اسی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ ''سوری بائی بائی۔''

میرا کینیڈا کا پہلا انٹرویو اختتام کو پہنچ چکا تھا۔

اب مجھے فکر ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ یہ PE کہاں سے مل سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کسی سبزی فروش کے یہاں مل جائے۔ معلوم ہوا کہ سبزی فروش کے پاس باقی تمام سبزیاں ترکاریاں تو ہیں لیکن PE نام کی کوئی سبزی اس کے پاس موجود نہیں تھی۔ چلو کہیں اور معلوم کرتے ہیں۔

PE کے اس راز سربستہ کا عقدہ محبوب کے ایک انجینئر دوست نے کھولا۔ ''کینیڈا کے ہر صوبے میں پاکستان کی انجینئرنگ کونسل کی طرح کا ایک ادارہ ہوتا ہے جو PE دیتا ہے۔ اگر کسی کے پاس کینیڈا، امریکا یا یورپ کی انجینئرنگ کی ڈگری ہو تو صرف ایک درخواست دینے کی ضرورت ہوتی اور PE مل جاتی ہے۔ اگر کسی دوسرے ملک کی ڈگری ہو تو چند ایک پرچے دینے کے بعد PE ملتی ہے۔ آپ کے پاس پاکستان کی ڈگری ہے آپ کو چار مضامین کا امتحان دینا ہوگا۔ ہاں اگر آپ یہاں سے MS کرلیں تو پھر آپ کو PE کی رکنیت گھر بیٹھے مل سکتی ہے۔''

MS کرنا میرے لیے زیادہ پُرکشش تھا۔ اس لیے کہ پاکستان سے باہر دھکے کھانے کا گوہر مقصود بھی یہی تھا۔ لیکن اس کے لیے پیسے ضروری تھے جس کے لیے نوکری ضروری تھی۔ کئی جگہ درخواستیں دیں۔ چند انٹرویو بھی ہوئے مگر ہر جگہ وہی بے تکا سوال کہ کینیڈا میں کام کرنے کا کتنا تجربہ ہے۔ جبکہ ان کو معلوم تھا کہ مجھے کینیڈا آئے ہوئے ایک دو مہینے ہوئے تھے۔

تلاش بسیار کے بعد ایک مکینک کی نوکری ملی۔ PIA میں اپنے ہاتھ سے جہازوں پر کام کرنے کا تجربہ کام آیا ورنہ اگر کسی جگہ بحیثیت ایکزیکٹو انجینئر کام کیا ہوتا تو یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔

کمپنی کا نام ورکو انڈسٹری تھا۔ ان کا کام بڑے بڑے انٹرکام سسٹم بنانا تھا۔ پچاس سے لے کر دو سو تک۔ انجینئرنگ کا کام فریڈ الگارڈ کے ذمے تھا۔ مارکٹنگ مسٹر ہربرٹ کے ذمے تھی۔ ہربرٹ کا تعلق جرمنی سے تھا مگر اب وہ کینیڈا کے شہری تھے۔ مجھے فریڈ کے ساتھ کام کرنا تھا۔ ان کا تعلق سویڈن سے تھا مگر اب وہ بھی ہربرٹ کی طرح کینیڈا کے شہری تھے۔ ہربرٹ انٹرکام کے آرڈر لے کر آتے۔ فریڈ اس آرڈر کی انجینئرنگ ڈرائنگ وغیرہ بناتے۔ میرا کام دوسرے مکینک کے ساتھ مل کر انجینئرنگ ڈرائنگ کے مطابق انٹرکام کی اسمبلنگ کرنا تھا۔

اسی دوران میرے والدین حج کرنے چلے گئے۔ ان کو حج کے لیے جو زرمبادلہ ملا تھا اس کو انہوں نے بہت احتیاط سے خرچ کیا اور جو کچھ زرمبادلہ ان کے پاس بچ گیا وہ انہوں نے مجھے ٹورنٹو بھیج دیا۔ میری تنخواہ اس وقت ایک سو ڈالر فی ہفتہ تھی، مہینے کے تقریباً سوا چار سو ڈالر بن جاتے تھے جس میں روزمرہ کا خرچ بھی تھا اور پڑھائی کے لیے پیسے بھی جمع کرنا تھے۔ ماں باپ کو میرے حالات کا اندازہ تھا۔ انہوں نے خود تکلیف اٹھائی اور قیمتی زرمبادلہ مجھے بھیج دیا۔ میں ایک بار پھر باپ کے پیسے پر عیش کررہا تھا۔

ان دنوں پاکستان میں زرمبادلہ کے لین دین پر سخت

پابندیاں تھیں۔ غیر قانونی لین دین پر کڑی سزائیں تھیں۔ جیل تک ہو سکتی تھی۔ خود میرے ساتھ ایک واقعہ ہو چکا تھا۔

ایک شام میں باہر جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلا تو دیکھا کہ سامنے شرافت صاحب کھڑے ہیں۔ مجھے کچھ مسرت اور کچھ حیرت ہوئی۔ شرافت صاحب سے میری ملاقات 65 کی جنگ کے دوران ہوئی تھی۔ وہ فیروز آباد تھانے کے انچارج تھے اور میں بحیثیت والنٹیئر ان کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ یہ محلے والوں کی اسکیم تھی کہ لڑائی کے دوران اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ ہر طرف مکمل تاریکی ہو کسی جگہ کسی بھی قسم کی روشنی قطعی طور پر نہ ہو، اس طرح بمباری کا خطرہ بڑھ سکتا تھا۔

میرے پاس اسکوٹر ہوا کرتا تھا۔ ایک سپاہی میرے ساتھ کر دیا جاتا اور ہم لوگ رات بھر گشت کرتے رہتے کہ اگر کہیں کوئی روشنی جل رہی ہے تو اس کو بند کیا جائے۔ صبح ہم اپنے اپنے گھروں کو جاتے۔ اس کے بعد سے میری شرافت صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت ان کو اپنے گھر پر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ہم گھر کے اندر آ گئے۔

''زہے نصیب شرافت صاحب۔ آپ نے کیسے میرے گھر کو رونق بخشی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے کوئی رونق نہیں بخشی۔ ایک ناخوشگوار فرض ادا کرنے آیا ہوں۔''

''خیریت تو ہے؟'' میں نے فکر مند ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کیسا ناخوشگوار فرض؟''

جواب میں شرافت صاحب نے کہا۔ ''میں تو خیریت سے ہوں مگر تم خیریت سے نہیں ہو۔ ناخوشگوار فرض یہ ہے کہ میرے پاس تمہارا وارنٹ گرفتاری ہے۔''

''کیسا وارنٹ گرفتاری؟'' میں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے زرمبادلہ کا غیر قانونی کاروبار کیا ہے۔ اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے ہتھکڑی لگا کر لے جاتا مگر مجھے تمہاری جنگ کے دوران کی خدمات یاد ہیں اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔ کل صبح تھانے رپورٹ کرنا۔ اگر صبح صبح نہیں پہنچے تو تمہاری خیریت نہیں۔''

''مگر شرافت صاحب......'' میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ شرافت صاحب باہر نکل چکے تھے۔

رات بھر پریشانی رہی۔ اگلی صبح میں سویرے سویرے تھانے پہنچ گیا۔ شرافت صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ ان کے دفتر کے باہر جو سپاہی ڈیوٹی دے رہا تھا اس نے مجھے پہچان لیا۔ جنگ کے دنوں بلیک آؤٹ کے دوران وہ میرے ساتھ میرے اسکوٹر پر کئی دفعہ محلے کے راؤنڈ پر جاتا تھا۔ ہماری اچھی گپ شپ تھی۔ اس نے مجھے عزت کے ساتھ شرافت صاحب کے دفتر میں بیٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد شرافت صاحب آ گئے۔

''چائے پیو گے؟'' انہوں نے پوچھا۔ چائے اس وقت میرے ذہن سے کوسوں دور تھی۔

''جی نہیں شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ میرا جرم کیا ہے؟''

''تفصیل تو مجھے نہیں معلوم۔'' شرافت صاحب نے جواب دیا۔ ''مجھے تمہیں گرفتار کر کے اسٹیٹ بینک کو مطلع کر دینا ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ گرفتار کرنے سے پہلے تفصیل معلوم کر لوں۔ مجھے تمہارے اوپر رحم آ رہا ہے مگر مجھے اپنا فرض بہر حال پورا کرنا ہے۔''

اتنے میں کہیں سے کال آ گئی شرافت صاحب کو اپنی موبائل میں بیٹھ کر موقع واردات پر جانا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ سارا دن میں ان کے ساتھ موبائل میں گھومتا رہا۔ دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے شرافت صاحب کے ذمے ٹھہری۔ اسی دوران ان کو میرے جرم کی تفصیل موصول ہو گئی۔ ''تم نے امریکا میں غیر قانونی اکاؤنٹ کھول کر اس میں ڈالر جمع کروائے ہیں۔'' اب بات میری سمجھ میں آ گئی۔

میرا کینیڈا کے لیے امیگریشن ویزا اسی وقت جاری ہو چکا تھا جب میں ... پاکستان میں ہی تھا۔ لیکن چونکہ میرا ترک وطن کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں کینیڈا جانے کے بجائے مزید تعلیم حاصل کرنے اسٹوڈنٹ ویزا پر امریکا چلا گیا تھا۔

جب کینیڈا کے امیگریشن ویزا کی کارروائی مکمل ہو گئی تو ویزا جاری کرنے سے پہلے کینیڈا کے سفارتخانے نے ایک مزید شرط لگا دی۔ ان کے خط کا متن کچھ اس طرح سے تھا۔ ''اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ آپ کے پاس کینیڈا پہنچنے پر ابتدائی ایام کے خرچ کے لیے معقول رقم موجود ہے آپ کو کینیڈا یا امریکا کے کسی بینک میں کھاتا کھول کر اس میں پانچ سو ڈالر جمع کروا کر بینک کا اسٹیٹمنٹ ہمارے پاس بھیجنا ہوگا۔ یہ شرط ہم نے پاکستان کے اسٹیٹ بینک سے منظوری کے بعد لگائی ہے۔ اسٹیٹ بینک ہمیں اس کی باقاعدہ اجازت دے چکا ہے۔ آپ کا اکاؤنٹ قانونی تسلیم کیا جائے گا۔''

میرے اس اکاؤنٹ کا اسٹیٹمنٹ پوسٹ آفس سے سنسر ہو کر اسٹیٹ بینک بھیج دیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہوا تھا۔

اسٹیٹ بینک کے گورنر سعید مینائی صاحب میرے کزن تھے۔ ان کو سارا ماجرا سنایا۔ وہ کہنے لگے ''یہ سچ ہے کہ کینیڈا کے سفارتخانہ کو ہم نے یہ سہولت دے رکھی ہے۔ یہ سہولت بالکل قانونی ہے۔ تھانہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صبح میرے دفتر آ جانا۔''

اگلی صبح جب میں ان کے دفتر پہنچا تو انہوں نے مجھے زرمبادلہ کے انچارج کے حوالے کیا اس مختصر سے جملے کے ساتھ ''ذرا دیکھو انہوں نے کیا حماقت کی ہے۔''

وہ صاحب مجھے مع میری حماقت کے اپنے ساتھ اپنے دفتر لے گئے۔ معاملہ سیدھا سادا نکلا۔

جب بھی ایسی صورت حال کا سامنا ہوتا تھا تو اسٹیٹ بینک متعلقہ شخص کو بذریعہ رجسٹری ایک خط بھیجتا تھا کہ آپ بتائیں کہ آپ نے زرمبادلہ کا اکاؤنٹ کیسے کھولا اور اس اکاؤنٹ میں لین دین کیسے کی۔ اگر جواب تسلی بخش ہو تو معاملہ ختم۔ ورنہ وارنٹ گرفتاری۔ میری خرابی قسمت یہ تھی کہ مجھے اسٹیٹ بینک کا بھیجا ہوا رجسٹرڈ خط موصول نہیں ہوا تھا۔ اگر موصول ہوا ہوتا تو ڈاکخانہ کے پاس اس کی وصولی کی رسید ہوتی جو وہ اسٹیٹ بینک کو ارسال کرتا۔ اس طرح میں جیل جاتے جاتے بال بال بچ گیا۔

جیل سے تو بچ گئے۔ لیکن خواری کا طوق گلے میں رہا۔ کینیڈا پہنچ کر زرمبادلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ورکو میں نوکری کا سلسلہ جاری تھا۔ مزید چند مہینے بیت گئے۔ اب M.S C کے داخلہ کی فکر تھی۔ میں نے کئی یونیورسٹیوں کے کورس دیکھے۔ انگلستان میں برمنگھم یونیورسٹی کا انجینئرنگ پروڈکشن اور مینجمنٹ کا کورس پسند آیا کہ پاکستان میں اس کی کھپت تھی۔ داخلہ کی درخواست بھیج دی۔ داخلہ مل گیا۔ کلاسیں شروع ہونے میں چند مہینے باقی تھے۔

اس دوران فریڈ نے نیا گھر خریدا۔ پارٹی دی۔ ہم سب مدعو تھے۔ ہمارے یہاں دستور ہے کہ جب نیا گھر بنے تو اس کو آباد کرنے سے پہلے محفل میلاد برپا ہوتی ہے کہ رب کا شکر ادا ہو رحمتوں کا نزول ہو۔ مگر کینیڈا میں معاملہ جدا تھا۔

ہر آنے والا مہمان ایک ایک شراب کی بوتل اپنے ساتھ لایا تھا۔ میرے علاوہ کہ مجھے اس روایت کا علم نہ تھا۔

روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ جوڑے ایک دوسرے کو گلے سے لگائے رقص کرنے میں مشغول تھے۔ موسیقی اپنے عروج پر تھی۔ نئی طرح کے لاؤڈ اسپیکر آئے تھے جن کا نام ما ئحٹہ بلاسٹر تھا۔ ان کی آواز اتنی تیز تھی کہ دماغ واقعی پھٹا جا رہا تھا۔ ہر طرف شراب اور سگریٹ کی بو تھی۔ سگریٹ کے دھویں کے مرغولے فضا کو کثیف بنا رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پھر بھی لوگ باتیں کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس ماحول میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ سانس لینا مشکل تھا۔ میں تازہ ہوا کے لیے باہر آ گیا۔ باہر کچھ اور لوگ بھی موجود تھے کہ وہ سب بھی تازہ ہوا کے طالب تھے۔

لان کی منڈیر پر انجیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ورکو میں بطور سیکریٹری کام کر رہی تھی۔ جھینپو قسم کی لڑکی تھی۔ لمبی اسکرٹ اور ڈھیلا بلاؤز اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ بال عام طور سے بکھرے ہوئے رہتے۔ آنکھوں پر بڑے فریم کی عینک۔ لیکن آج کی انجیلی چیز ہی کچھ اور دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے پارٹی ڈریس پہن رکھا تھا جو اس وضع کا تھا جیسے بیلیرنا پہنتی ہیں۔ کولہوں سے تھوڑا سا نیچے، بال بہترین انداز میں بنے ہوئے۔ میک اپ میں کوئی کمی نہیں۔ پوری طرح کیل کانٹے سے لیس۔ تیر بغیر کمان کے ہی چل رہے تھے۔ انجیلی نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کے پاس جا کر منڈیر پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''انجیلی'' میں نے اس کو مخاطب کیا۔ ''آج تو تم پہچانی نہیں جا رہی ہو۔ آخر تم دفتر میں اتنے برے حلیہ میں کیوں رہتی ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔

پیر کے دن دفتر میں پھر وہی جھینپو انجیلی موجود تھی۔ میں سوچتا رہ گیا کہ یہ تتلی پھر سے کیٹرپلر کیسے بن گئی۔

فریڈ کی پارٹی کو ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک آرڈر ملا تھا جس کو مکمل کر کے مونٹریال بھیجنا تھا۔ میں نے وہ آرڈر پورا کیا۔ ٹرک پر لدوایا اور مونٹریال روانہ کر دیا۔ اگلے دن فریڈ ورکشاپ آ کر میرے پاس کھڑا ہو گیا اور درشتی سے سوال کیا ''تم نے مونٹریال والے آرڈر کے ساتھ بلک نہیں بھیجا؟''

میں نے دیکھا تو بلک دراز میں پڑا مسکرا رہا تھا۔

''سوری فریڈ'' میں نے فریڈ سے اپنی کوتاہی کی معافی

مانگی۔ ”میں وہ پلگ آرڈر کے ساتھ رکھنا بھول گیا۔ وہ میری دراز میں ہی رہ گیا۔“

فریڈ بہت دھیمی طبیعت کا اور بردبار آدمی تھا۔ اس نے میری مزید سرزنش نہیں کی صرف اتنا کہا۔ ”تم کو معلوم ہے کہ ہمارے بنائے ہوئے ”انٹر کام“ اس پلگ کے بغیر کام نہیں کرسکتے؟“

”ہاں مجھے معلوم ہے“ میں نے جواب دیا۔

فرید نے کہا۔ ”وہ تو خیر گزری کہ ان کا ایک آدمی فالتو ایمپلیفائر لینے کے لیے کل صبح آئے گا۔ تم ایک ایمپلیفائر اور پلگ، ان دونوں چیزوں کو پیک کرکے تیار کرلو۔ کل صبح اس کے حوالے کردینا۔“ ان ہدایات کے بعد وہ واپس اپنے دفتر جانے کے لیے بڑھا پھر کچھ سوچ کر واپس مڑا اور مجھے مزید ہدایت دی۔ ”اور ہاں اس دفعہ ذرا احتیاط سے کام لینا۔ یہ آرڈر ہربرٹ نے بڑی محنت کے بعد حاصل کیا ہے۔ وہ کافی حصے میں تھا۔ جرمن خون ہے۔“

”ضرور۔“ میں نے جواب دیا اور اپنا دوسرا کام ختم کرنے کے بعد شام گھر جانے سے پہلے میں نے مطلوبہ چیزیں پیک کرکے تیار کرلیں۔ اگلی صبح ان کا آدمی آیا۔ میں نے پیک کیا ہوا ڈبا اس کے حوالہ کردیا۔ وہ ائیرپورٹ روانہ ہوگیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ورکشاپ آکر اپنی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد جیسے ہی میں نے دوسرا کام کرنے کے لیے اپنی دراز کو کھولا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ پلگ میری دراز میں بیٹھا مجھے آنکھ مار کر قہقہہ لگا رہا تھا۔ انسانی نفسیات ہے کہ جب انسان کسی چیز کو اپنے آپ پر حد سے زیادہ سوار کرلے اور اس کے بارے میں پیرانویا ہوجائے تو وہ جس چیز سے یا جس کام سے بچنا چاہتا ہے بالکل وہی کام کر بیٹھتا ہے۔ میں پیرانویا (Paranoia) کا شکار ہوچکا تھا۔ میں نے پلگ کو اپنے ہاتھ میں پکڑا اور بھاگتے ہوئے فریڈ کے دفتر کا رخ کیا۔ وہ ڈرائنگ بورڈ پر جھکا ہوا نئے آرڈر کی ڈرائنگ تیار کر رہا تھا۔

”فریڈ!!“ میں نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے اس کو مخاطب کیا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے بدستور ڈرائنگ بورڈ پر جھکے ہوئے پوچھا۔

”یہ پلگ“ میں نے کہنا شروع کیا۔ لفظ ”پلگ“ سن کر وہ چونکا اور سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ پلگ کی طرف اشارہ کرکے میں نے اپنا جملہ جاری رکھا۔ ”میں اس پلگ کو پھر سے آرڈر کے ساتھ رکھنا بھول گیا۔“

فریڈ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر اس کا دھیما مزاج میرے کام آیا۔ اس نے میرا گلا دبانے کا ارادہ ترک کردیا۔

آج کا زمانہ نہیں تھا کہ موبائل فون پر بات کرکے ان کے آدمی کو واپس بلاتے اور پلگ اس کو تھما دیتے۔ ابھی موبائل فون کے ایجاد ہونے میں پچیس تیس سال کا وقفہ درکار تھا۔ فریڈ نے پلگ ایک دوسرے مکینک کے حوالے کیا اور اس کو ائیرپورٹ دوڑایا کہ اس آدمی کے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے یہ پلگ اس کے حوالے کردے۔

فریڈ تو نرم مزاج آدمی تھا مگر ہربرٹ کو اس آرڈر کو حاصل کرنے کے لیے معمول سے بہت زیادہ دوڑ بھاگ کرنا پڑی تھی۔ اگر وہ آدمی جہاز پر سوار ہوگیا اور پلگ اس کو نہ ملا تو ہماری کمپنی کو بڑے نقصان کا سامنا تھا۔ ہربرٹ نے فریڈ کی طرف دیکھا اور گویا ہوا۔

”ہم نے حسن کی لازوال صلاحیتوں سے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے۔“

فریڈ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ہربرٹ نے اپنا جملہ آگے بڑھایا۔ ”کیا یہ خود غرضی اور زیادتی نہیں ہے کہ پورے کینیڈا میں صرف ایک ہماری ہی کمپنی حسن کی ان صلاحیتوں سے مستفید ہو؟“

فریڈ نے اس دفعہ بھی اقرار میں سر ہلایا۔ پھر ان دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ کینیڈا کی دوسری کمپنیوں کے ساتھ مزید خود غرضی نہ برتی جائے۔ ان کو مزید انتظار نہ کروایا جائے۔ انہوں نے مجھے دو ہفتے کا نوٹس دے دیا کہ اس کے بغیر وہ مجھے برطرف نہیں کرسکتے تھے۔

میرا کیا!! خود اپنا ہی نقصان کر رہے تھے۔ ان کو میری صلاحیتوں کا حامل دوسرا مکینک صرف قسمت کی مہربانی سے ہی مل سکتا تھا۔

ورکشاپ واپس آکر میں نے سب کو ہربرٹ اور فریڈ کی نادانی کی اطلاع دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتادیا کہ اگر وہ دونوں خود اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے پر مصر ہیں تو میں ان کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔ سب نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے ان لوگوں کو یہ بھی بتادیا کہ ذاتی طور پر مجھے ان دونوں کی نادانی سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ اگلے دو مہینے بعد میں برمنگھم جا رہا ہوں۔

”کیا تم کو برمنگھم، الاباد میں نوکری مل گئی ہے۔“ میرے ساتھی مکینک پال نے پوچھا۔ پھر اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ ”مگر وہ تو امریکا میں ہے۔“

مجھے پال سے وضاحت کرنا پڑی۔

”برمنگھم الاباد نہیں بلکہ برطانیہ کے شہر برمنگھم میں جہاں مجھے یونیورسٹی آف برمنگھم میں داخلہ مل گیا ہے۔ میں وہاں جاکر انجینئرنگ میں ایم ایس سی کی پڑھائی کروں گا۔“

اب کے نادانی مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔ یہ بات میں نے کیتھ کی موجودگی میں کہہ دی تھی۔ کیتھ برطانوی نژاد کینیڈین تھے جن کی دو اہم خصوصیات تھیں اور دونوں خطرناک۔

ایک خصوصیت تو بالکل امام نذیر جیسی تھی۔ انہوں نے کہیں سے لفظ منطق پڑھ لیا تھا۔ نتیجتاً وہ ہر منطقی بات کو غیر منطقی اور ہر غیر منطقی بات کو منطقی قرار دینے میں ملکہ رکھتے تھے اور ان کا حرف، حرف آخر ہوتا تھا۔ بالکل امام نذیر کی طرح۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی منطق سے کئی دفعہ یہ ثابت کرچکے تھے کہ آج بھی برطانوی راج میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔ اس لیے نہیں ڈوبتا کہ ملکہ ایلزبتھ، ملکہ برطانیہ ہونے کے ساتھ ساتھ کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی بھی ملکہ ہیں۔ یہ تین براعظم ملکہ کے قبضے میں ہیں۔ رہے ایشیا اور افریقا تو ان کی تو ویسے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے کہ یہ دونوں براعظم مذکورہ بالا تین براعظموں کے بیچ میں آکر سب ایک ہوجاتے ہیں۔ اسی سلسلے کو وہ یوں آگے بڑھاتے تھے کہ برطانوی نژاد کینیڈین ہونے کے ناتے وہ کینیڈا میں ملکہ برطانیہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قطع نظر اس حقیقت کے کہ کینیڈا کے وفاق میں برطانوی حکومت کی نمائندگی گورنر جنرل اور اس کے ہر صوبہ میں ملکہ کی نمائندگی گورنر کرتے ہیں۔ کیتھ کا کم سے کم مطالبہ یہ تھا کہ اگر پورے کینیڈا میں نہیں تو کم از کم ٹورنٹو میں ملکہ برطانیہ کی نمائندگی کرنا ان کا منطقی حق بنتا ہے۔ وہ اس بات کے بھی سختی سے قائل تھے کہ دنیا میں سب سے اعلیٰ قسم کے انسان صرف برطانیہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ گورے ہوں۔ انسان نہ ہوئے گھوڑے ہوگئے کہ اعلیٰ نسل کے ہوں۔ کیتھ اس بات کو بھول چکے تھے ہٹلر کا بھی جرمنی کی آرین نسل کے بارے میں بالکل یہی خیال تھا۔

میری بات سن کر کیتھ چونک پڑے، پوچھنے لگے۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوچکا تھا۔ میں نے جواب دیا ”کہیں نہیں۔“

کہنے لگے ”چھپاؤ نہیں۔ میں نے خود تمہارے منہ سے ابھی برمنگھم اور ایم ایس سی کے الفاظ سنے تھے۔ اڑنے کی کوشش مت کرو۔ صاف صاف بتاؤ کہاں جا رہے ہو؟“

میرے پاس اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیتھ گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر سر اٹھایا اور کہنے لگے۔ ”میں نے بہت غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو آدمی ایک ہی پلگ کو دو دفعہ رکھنا بھول گیا ہو باوجود یاددہانی کے اور اس پاداش میں نوکری سے نکال دیا گیا ہو۔ منطقی طور پر اس کا ذہن ایم ایس سی کی پڑھائی کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ اور وہ بھی برطانیہ میں؟ ناممکن!!“ یہ ان کا حرف آخر تھا۔ میں کسی قسم کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اپنے کام میں مصروف ہوگیا اور سوچنے لگا کہ پڑھائی کے لیے پیسے تو میرے پاس جمع ہوچکے ہیں لیکن اگر دو مہینے اور کہیں کام مل جائے تو سہولت ہوجائے گی۔ میں انہی سوچوں میں غرق تھا کہ گھر جانے کا وقت ہوگیا۔

ورکو کے نوٹس کے دو ہفتے ختم ہوچکے تھے۔ میں فریڈ سے رخصت ہونے اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ ”فریڈ میں تم کو بائی بائی کہنے اور تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ تم نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا۔“

”میں نے سنا ہے کہ تم مزید پڑھائی کے لیے برطانیہ جا رہے ہو۔ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم پاکستان سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرچکے ہو۔ کیوں نہیں بتایا؟“

”اس لیے کہ یہ ڈگری میرے آڑے آرہی تھی۔ مجھے بحیثیت انجینئر اس لیے نوکری نہیں مل رہی تھی کہ میرے پاس PE کا رجسٹریشن نہیں تھا اور مکینک کی نوکری زیادہ پڑھائی، اوور کوالیفکیشن کی وجہ سے نہیں مل رہی تھی۔“

فریڈ نے تفصیل سننے کے بعد پوچھا ”تمہاری کلاسیں کب شروع ہوں گی؟“

”تقریباً دو 2 مہینے بعد۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر تم چاہو تو تم یہ دو مہینے ورکو میں کام کرسکتے ہو۔ میں اپنا نوٹس واپس لے لوں گا۔“

”شکریہ، مگر میں ورکو میں مزید نوکری نہیں کرسکتا۔“

”کیوں؟“ فریڈ نے مختصر سا سوال کیا۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھری ”اس کیوں کے جواب میں، میں کچھ سوال پوچھ سکتا ہوں؟“

CN ٹاور ٹورنٹو

ٹورنٹو شہر کا CN ٹاور ایک خاص مقصد کے تحت بنایا گیا تھا۔ 1960 کی دہائی میں ٹورنٹو شہر میں تعمیرات کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا تھا۔ ڈاون ٹاؤن میں بے شمار اور اونچی اونچی عمارتیں تعمیر کی جاچکی تھیں۔ ان عمارتوں کی اونچائی میں ٹورنٹو میں نصب مواصلاتی اینٹینا بونے بن چکے تھے۔ ہر طرف سے ان عمارتوں کی زد میں اس طرح سے آچکے تھے کہ TV اور ریڈیو کے سگنل بری طرح سے متاثر ہورہے تھے۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ یہ اینٹینا زیادہ سے زیادہ بلندی پر نصب کیے جائیں۔ اتنی زیادہ بلندی پر کہ آنے والے بیسیوں برسوں میں بننے والی عمارتوں کی اونچائی ان اینٹینا کی کارکردگی کو متاثر نہ کرسکے۔ CN ٹاور 1815 فٹ اونچا ہے اور بننے کے بعد (اور کئی دہائیوں تک) دنیا کا بلند ترین فری اسٹینڈنگ اسٹرکچر تھا۔ اس پر لگائے گئے اینٹینا کے استعمال سے مواصلاتی نظام کا مسئلہ حل ہوچکا ہے۔ آج 30 سے زیادہ TV چینل، FM ریڈیو اور سیل فون CN ٹاور کے اینٹینا کو اپنی نشریات کی ترسیل کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن اس اینٹینا کے نصب کرنے کے دوران CN ٹاور ایک خطرناک اور مہلک حادثہ سے بال بال بچا تھا۔

''پوچھو۔'' فریڈ نے پھر مختصر جواب دیا۔

''کیا تم کو میرے کام میں کبھی کوئی فنی خرابی یا کوتاہی دکھائی دی؟''

''نہیں۔''

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تمہارے ایمپلی فائر کے سرکٹ میں جو خرابی تھی اس کو میں نے دور کیا۔ یہ کام ایک مکینک کا نہیں بلکہ ایک انجینئر کا تھا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ تم ہی نے یہ کام کیا تھا۔'' فریڈ نے اقرار کیا۔

''تو پھر تم نے ہربرٹ کے کہنے میں آکر میری نوکری صرف اس لیے ختم کی کہ میں دو دفعہ بھول کا شکار ہوگیا تھا جبکہ میرے کام میں کوئی کمی نہیں تھی۔ بھول ایک بشری کمزوری ہے جو کسی سے بھی سرزد ہوسکتی تھی۔ بشمول تمہارے اور ہربرٹ کے۔ میری عزتِ نفس مجروح ہوئی ہے۔ میں ورکو میں مزید کام نہیں کرسکتا۔ تمہاری آفر کا شکریہ۔''

''تمہاری مرضی۔'' فریڈ نے شانے اچکائے ''لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے دوسری نوکری کا بندوبست کرسکتا ہوں۔ نیلسن انڈسٹریز کو عارضی طور پر کوالٹی کنٹرول انسپکٹر کی ضرورت ہے۔''

''اس احسان کے لیے میں تمہارا شکرگزار بھی ہوں گا اور تمہارے پلگ کا مسئلہ بھی حل کردوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ کیسے؟''

''یہ پلگ ہمیشہ ایمپلی فائر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ خود اکیلا کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ اگر تم ہر ایمپلی فائر کے ساتھ اس کا پلگ لگا کر اس کو ٹیپ کردو تو جب بھی کوئی ایمپلی فائر اٹھایا جائے گا پلگ ہمیشہ اس کے ساتھ جڑا ہوگا۔ تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔''

''یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟'' فریڈ نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ اس پلگ کی وجہ سے تم کو کبھی خفت نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ تم مسئلے کا حل نہیں ڈھونڈ رہے تھے تم کو صرف خطاکار کی تلاش تھی۔ بائی بائی۔''

''بائی بائی! برطانیہ سے واپس آکر مجھ سے ملنا مت بھولنا۔''

میں نے اگلے چھ ہفتے نیلسن انڈسٹریز میں گزارے پھر عازمِ انگلستان ہوا۔

☆☆☆

آپ کو لندن کا ٹکٹ یکطرفہ چاہیے یا واپسی کا ٹکٹ بھی چاہیے۔ ٹورنٹو کے ٹریول ایجنٹ نے مجھ سے دریافت کیا۔

''دونوں کی قیمتوں میں کتنا فرق ہے؟'' میں نے معلوم کرنا چاہا۔

''یکطرفہ ٹکٹ تین سو ڈالر کا ملے گا جبکہ واپسی کے ٹکٹ کی قیمت چار سو ڈالر ہے لیکن اس کی مدت استعمال تین مہینے ہے۔ آپ کو تین مہینے کے اندر اندر ٹورونٹو واپس آنا پڑے گا۔''

''میں تین مہینے میں تو واپس نہیں آسکتا کیا آپ کے پاس ڈسکاؤنٹ والے ٹکٹ نہیں ہیں؟''

ٹاور کی سیمنٹ کی بھرائی کا کام 1975 میں مکمل ہوچکا تھا۔ اب اس پر براڈکاسٹنگ اینٹینا لگایا جانا تھا لیکن اینٹینا نصب کرنے سے پہلے ٹاور پر سے اس کرین کا اتارنا ضروری تھا جو اس کی تعمیر کے لیے پچھلے تین سال سے بھی زیادہ عرصہ استعمال ہوتی رہی تھی۔ اس کرین کے اتارنے کے بعد ہی یہاں پر اینٹینا لگایا جاسکتا تھا۔ اس اینٹینا کے 44 ٹکڑے تھے جن میں سے سب سے زیادہ بھاری ٹکڑے کا وزن 8 ٹن تھا۔ یہ کام ہیلی کاپٹر کے ذریعے کیا جانا تھا۔

ہیلی کاپٹر کرین کے ساتھ ربط کرچکا تھا کہ اچانک کرین ٹرمڑ کر ٹاور کے ساتھ اٹک گئی۔ اس موقع پر ہیلی کاپٹر کو کرین سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ کرین کا آپریٹر کرین کے اندر موجود تھا۔ ہیلی کاپٹر میں کل 50 منٹ کا ایندھن تھا۔ وہاں کام کرنے والوں نے بڑی محنت کے بعد کرین کے بولٹ کاٹ کر کرین کو آزاد کیا۔ ہیلی کاپٹر جب کرین کو لے کر زمین پر آیا ہے تو اس میں صرف 14 منٹ کا ایندھن باقی بچا تھا۔ ہیلی کاپٹر اور کرین ایک مہلک حادثے سے بال بال بچ گئے تھے۔

CN ٹاور میں ایک گھومنے والا ریسٹورنٹ اور دیگر تفریحی لوازمات کا بندوبست بھی ہے۔ ہر سال دنیا بھر سے ہزاروں سیاح CN ٹاور کی اونچائی سے دن میں اور رات میں ٹورنٹو شہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جواب ملا ''ہیں تو صحیح مگر یہ صرف سینئر سٹیزن کے لیے ہیں۔ یہ پینسٹھ سال یا اس سے زیادہ عمر والے شہریوں کو ہی مل سکتے ہیں۔''

میں نے اس سے معلوم کرنا چاہا کہ کیا اس کے پاس کوئی ایسی ترکیب ہے کہ جس کے ذریعے میں اگلے دس دن میں چھبیس سال کا فاصلہ طے کرسکوں کیونکہ میں نے ہمیشہ لوگوں کو کہتے سنا تھا ''وقت کا کیا ہے۔ چٹکی بجاتے ہی گزر جاتا ہے۔'' لیکن اس ٹریول ایجنٹ کے پاس ایسی کوئی جادوئی چٹکی موجود نہ تھی۔

میں ٹریول ایجنٹ سے مخاطب ہوا ''میں دراصل انگلستان پڑھائی کے لیے جارہا ہوں۔ کیا آپ کے پاس طالبعلموں کے لیے کوئی ایسا ڈسکاؤنٹ والا ٹکٹ مل سکتا ہے جس کی مدتِ استعمال ایک سال سے زیادہ ہو؟''

''مل تو سکتا ہے۔'' اس نے جواب دیا ''مگر اس میں دو باتوں کی قید ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ ٹکٹ لندن کے لیے نہیں بلکہ پیرس یا برسلز کے لیے مل سکتا ہے۔ پیرس کا ٹکٹ تین سو ڈالر کا اور برسلز کا دو سو ڈالر کا۔ دوسری قید یہ ہے کہ اس کی مدتِ استعمال 365 دن ہے یعنی مکمل ایک سال۔ اس سے ایک دن بھی زیادہ ہوا تو یہ ٹکٹ ناکارہ ہوجائے گا۔''

''برسلز والا ٹکٹ میرے لیے مناسب رہے گا۔'' میں نے اس کو بتایا پھر پوچھا۔ ''برسلز سے لندن واپسی کا ٹکٹ کتنے کا ہوگا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''اگر آپ کا بجٹ کم ہے تو یہ ٹکٹ آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ برسلز سے لندن اور واپسی کا سفر ریل سے طے کریں۔''

''مگر ریل کیسے جائے گی' بیچ میں تو رودبار انگلستان ہے۔''

''اس کے لیے آپ کو فیری استعمال کرنا پڑے گا۔'' پھر اس نے تفصیل بتائی۔ ''آپ کو برسلز سے بذریعہ ٹرین بیلجیم کے ساحلی شہر اوسٹنڈ جانا پڑے گا۔ وہاں سے آپ کو انگلستان کے ساحلی شہر ڈوور جانا ہوگا جس کے لیے آپ کو اوسٹنڈ سے فیری مل جائے گی۔ پھر ڈوور سے آپ بذریعہ ٹرین لندن جاسکتے ہیں۔''

''اتنا الجھا ہوا سفر۔'' میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''آپ کے بجٹ میں آپ کو اس سے زیادہ مناسب سفر نہیں مل سکتا۔''

''مگر میں برسلز سے لندن تک کا ریل اور فیری کا ٹکٹ کہاں سے خرید سکتا ہوں؟''

''وہ سب آپ کو یہیں سے مل جائے گا۔''

''میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ اس کو تھما دیا۔ اس نے میرا ٹکٹ بنا دیا۔ میں نے ٹکٹ پر نظر ڈالی۔ ''ارے'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ ٹکٹ تو مونٹریال کا ہے۔''

''جی ہاں۔'' ٹریول ایجنٹ نے اقرار کیا پھر تفصیل بتائی۔ ''آپ کی فلائٹ پہلے ٹورنٹو سے مونٹریال جائے گی۔ وہاں آپ کو دوسرا جہاز بدلنا ہوگا جو آپ کو برسلز لے جائے گا۔''

''اور کوئی سرپرائز!'' میں نے اس سے پوچھا۔ ایک

لندن شہر جانے کے لیے آدھی دنیا کا چکر!!

☆☆☆

میں ٹورنٹو سے مونٹریال پہنچ کر مونٹریال ائرپورٹ کے ڈپارچر لاؤنج میں برسلز جانے والی پرواز کی روانگی کے اعلان کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا۔ ''توجہ فرمایئے......'' میں جہاز کی جانب چل پڑا۔ جہاز فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ سورج ڈھل رہا تھا۔

پی آئی اے میں تقریباً چار سال دن رات ہوائی جہازوں پر گزارنے کے بعد، یہ پچھلے ڈیڑھ سال میں میرا پہلا ہوائی سفر تھا۔ میں گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں کھو گیا۔ ائرہوسٹس کی آواز نے میرے خیالوں کے تسلسل کو توڑا۔ ''آپ چائے پئیں گے یا کولڈ ڈرنک؟''

''کولڈ ڈرنک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سیون اپ لیموں کی قاش کے ساتھ۔'' اس کے بعد کھانا پروسا گیا۔ کھانے کے بعد لائٹیں بجھادی گئیں۔ زیادہ تر مسافروں نے کمبل تانے اور خوابوں میں کھو گئے۔ میں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

اناؤنسمنٹ سے میری آنکھ کھلی۔ ''اپنی سیٹوں کی پشت کو سیدھا کرلیں۔ کھانے کی ٹرے بند کردیں اور سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔ ہم تھوڑی دیر میں برسلز کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔''

بہت دفعہ کا سنا سنایا اناؤنسمنٹ ایک دفعہ پھر سننا پڑا۔ اگر یہ PIA کا جہاز ہوتا تو اس میں ''انشاء اللہ'' ضرور شامل ہوتا۔

مونٹریال سے برسلز کا سفر تقریباً ساڑھے سات گھنٹے کا ہے۔ مونٹریال میں تو ابھی آدھی رات ہوگی مگر بیلجیم کا وقت مشرقی کینیڈا سے چھ گھنٹے آگے ہونے کی وجہ سے برسلز میں صبح ہو چکی تھی۔ کینیڈا اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس کے مشرقی حصے میں اور مغربی حصے میں تین گھنٹے کا فرق ہے۔ جب مشرقی کینیڈا میں صبح کے نو بجے ہوں تو مغربی کینیڈا میں صبح کے صرف چھ بجے ہوتے ہیں۔ لیکن اب ہم کینیڈا کی فضاؤں کو پیچھے چھوڑ کر برسلز پہنچ چکے تھے جہاں سورج کا راج شروع ہو چکا تھا۔

کسٹم اور امیگریشن سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ہوٹل بک کرانے کی فکر ہوئی۔ شہر میں ہوٹل بک کروانے کی سہولت ائرپورٹ پر ہی موجود تھی۔ وہاں سے ہوٹل کی بکنگ کروانے کے بعد شہر کا رخ کیا۔ ہوٹل میں شہر گھومنے کے متعلق معلومات کیں تو وہاں کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے نے سامنے ٹریول ایجنسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ وہاں چلے جائیں ان کے پاس مائیکرو بسیں ہیں جو سیاحوں کو شہر کی سیر کروانے لے جاتی ہیں۔ شہر گھومنے کا یہ سب سے آسان اور اچھا طریقہ ہے۔''

میں ٹریول ایجنسی کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ اگلی بس آدھے گھنٹے بعد جانے والی تھی۔ میں نے اس کا ٹکٹ خرید لیا۔

دوسرے یورپی شہروں کے مقابلے میں برسلز نسبتاً چھوٹا ہے۔ وہاں خاص دیکھنے کی چیز ایٹومیم ہے جو 1958 میں عالمی میلہ کے انعقاد کے سلسلے میں بنایا گیا تھا۔ یہ تقریباً ساڑھے تین سو فٹ اونچا ہے۔ اس میں نو بڑے بڑے سیارے بنائے گئے ہیں جن کو ٹیوب سے جوڑا گیا ہے جن میں آنے جانے کے لیے اسکیلیٹر لگے ہیں۔ سیاروں میں اسٹال وغیرہ لگائے گئے تھے۔ ایک سیارے میں ایک ہوٹل بھی کھول دیا گیا تھا۔ سب سے اونچے سیارے سے جو تقریباً تین سو فٹ کی اونچائی پر ہے برسلز شہر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ ہم دن کے وقت وہاں گئے تھے۔ رات کا منظر پُرکشش ہوتا ہے۔ ہر طرف روشنیاں نظر آتی ہیں۔

آج کا سارا دن تو برسلز میں نکل گیا۔ کل صبح لندن کا سفر شروع ہوگا۔ پہلے ٹرین پھر فیری پھر ٹرین۔

صبح سویرے ناشتا ختم کرنے کے بعد میں نے اسٹیشن کی راہ لی۔ سفر کے پہلے مرحلے میں برسلز سے اوسٹنڈ جانا تھا۔ ٹرین جدید طرز کی نہایت آرام دہ اور سبک رفتار تھی۔ ایک سو بارہ کلومیٹر کا فاصلہ ایک گھنٹا دس منٹ میں طے ہوا۔

دوسرا مرحلہ فیری کے سفر کا تھا۔ فیری کا سفر میں اس سے پہلے ڈھاکا میں کر چکا تھا ورنہ فیری کو بھی زندگی میں پہلی دفعہ دیکھی گئی چیزوں کے کھاتے میں ڈالنا پڑتا۔ فیری اچھی خاصی بڑی تھی جس کے نچلے ڈیک میں چالیس سے زیادہ گاڑیاں پارک کی ہوئی تھیں۔ فیری کا ڈوور تک کا سفر تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔

فیری پانی پر چل رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ماحول کو خوشگوار بنارہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ نیند کے جھونکے بھی آرہے تھے لیکن یہ موقع سونے کا نہ تھا۔ میں اوپر جاکر ڈیک پر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ فضا میں آبی پرندے دکھائی دیے۔ ڈوور قریب آچکا تھا۔ میرے برابر ڈیک پر ایک ''گورا صاحب'' کھڑے ہوئے پائپ پی رہے تھے۔ ان سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے شکایت کی کہ ہر چیز کا معیار گرتا جارہا ہے۔ ان کے پائپ کی تمباکو جو کسی زمانے میں بہت اعلیٰ معیار کی ہوا کرتی تھی اب گھاس سے مقابلہ کرتی ہے۔ شکایتوں کا دور ختم ہوا تو مجھ سے پوچھنے لگے۔ ''تم کہاں جارہے ہو؟''

میں نے عرض کیا۔ ''برمنگھم!''

پوچھنے لگے ''کیا تم وہیں رہتے ہو؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی نہیں۔ پہلی دفعہ جارہا ہوں۔ وہاں، M.S کرنے کا ارادہ ہے۔''

کہنے لگے ''برمنگھم اچھی یونیورسٹی ہے مگر ریڈ برک، آکسفورڈ یا کیمبرج کیوں نہیں گئے۔'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی انہوں نے میرے آکسفورڈ یا کیمبرج نہ جانے کی کوتاہی کو معاف کردیا اور پوچھنے لگے ''تم اس سے پہلے ڈوور آئے ہو۔''

''جی نہیں، پہلی دفعہ آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اسٹوڈنٹ ٹکٹ کے جرمانہ میں۔''

انہوں نے میری اس کوتاہی کو بھی معاف کردیا، اپنے اور ڈوور کے بارے میں معلومات مہیا فرمائیں۔

''میرا نام پیٹر ہے میں کاروبار کے سلسلے میں تقریباً ہر ہفتے ڈوور اور اوسٹنڈ کے درمیان سفر کرتا ہوں۔'' اس کے بعد کچھ معلومات ڈوور کے متعلق فراہم کی، تمہارا امیگریشن اور کسٹم ڈوور میں ہی ہوگا۔ جب تم کسٹم سے فارغ ہو کر ہال سے باہر آؤ گے تو تم کو لندن جانے والی ٹرین تیار ملے گی، اس میں سوار ہو کر لندن کے لیے روانہ ہو جانا۔ اب میں نیچے جارہا ہوں اپنا سامان لینے۔ بائی بائی۔''

''بائی بائی۔'' میں بھی اپنا سوٹ کیس لینے کے لیے نیچے چلا گیا۔

ڈوور آچکا تھا۔ پہلے گاڑیاں ایک کے بعد ایک باہر نکالی گئیں پھر پیدل مسافر نکلے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پاکستان دولت مشترکہ سے الگ ہو چکا تھا۔ یہ جدائی عارضی تھی صرف چند ایک سال کے لیے مگر اس علیحدگی کا میری امیگریشن کی کارروائی پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔ میں چند منٹ میں امیگریشن سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کسٹم کا مرحلہ تھا جو میرے لیے اتنا سہل ثابت نہ ہوا۔

میں نے دیکھا کہ جتنے بھی مسافر امیگریشن سے فارغ ہو چکے تھے، وہ سب کے سب ہال سے باہر ٹرین کی طرف جارہے ہیں۔ کسی ایک نے بھی کسٹم کے کاؤنٹر کا رخ نہیں کیا۔ میں نے بھی ان کی تقلید کی اور کسٹم کو نظرانداز کرکے ہال سے باہر جانے لگا۔ مگر میں غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ یہ سہولت میرے لیے نہ تھی۔ میری جلد گوری رنگت والی نہیں تھی۔ میں کسٹم کے شکنجہ میں آگیا۔ مسئلہ تو کوئی نہیں ہوا لیکن خیال ہوا کہ غلطی ہوگئی۔ اگر ٹورنٹو سے چلنے سے دو تین دن پہلے ایمکس رنگت گورا کرنے والی کریم استعمال کرلیتا تو اس وقت یہ خفت نہ اٹھانی پڑتی۔ ان دنوں PTV پر ایمکس کریم کا اشتہار زوروں پر چلتا تھا۔ ہر وہ سانولی یا کالی لڑکی جس کی رنگت شادی میں رکاوٹ بن رہی ہو صرف چند دن ایمکس کریم استعمال کرنے کے بعد پیا من بھا جاتی۔ جلد کی رنگت کے اس امتیازی سلوک کا تجربہ مجھے انگلستان میں بارہا ہوا۔

کسٹم ہال سے نکل کر ٹرین کی طرف جاتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ہر سمت میں مجھے ہر آدمی بونا اور کوتاہ قد دکھائی دیا کہ اس ساری بھیڑ میں ایک میں ہی وہ واحد شخص تھا کہ جس کو برطانیہ کے شعبۂ کسٹم نے تفتیش کا حقدار گردانا۔

کوئی تو بات تھی ہم کو ملا جو رتبہ دار
وگرنہ شہر میں کچھ کم نہیں تھے سودائی

ٹرین کے نزدیک پہنچ کر میں پیٹر کو تلاش کرنا چاہتا تھا تاکہ اس سے لندن کے متعلق معلومات حاصل کرسکوں۔ فیری سے اترنے کی جلدی میں، میں اس سے یہ معلومات حاصل نہ کرسکا تھا۔ آخرکار پیٹر مجھے ایک ڈبے میں بیٹھا دکھائی دیا۔ میں اس کے برابر جاکر بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ ''پیٹر، مجھے تم سے کچھ معلومات چاہئیں۔''

''کیسی معلومات؟'' پیٹر نے پوچھا۔

''لندن شہر کے بارے میں عام معلومات مگر خاص طور سے ہوٹلوں کے بارے میں۔''

پیٹر نے معلومات فراہم کیں۔ ''تم لندن پہنچ کر وکٹوریہ اسٹیشن پر اترو گے۔ یہ ٹرین وکٹوریہ اسٹیشن ہی جاتی ہے۔ اسٹیشن پر اترنے کے بعد تم عقب میں چلے جانا وہاں پر بیڈ اینڈ بریک فاسٹ والے کئی ہوٹل مل جائیں گے جو طالب علموں کے لیے مناسب ہوں گے۔ عام ہوٹل بہت مہنگا پڑے گا۔ یہ ہوٹل بیڈ اینڈ بریک فاسٹ اس لیے کہلاتے ہیں کہ ان کے کرائے میں ناشتا بھی شامل ہوتا ہے۔'' پھر پیٹر

نے خبردار کیا۔ "ہاں مگر کمرا لینے سے پہلے اس کمرے کو ایک بار دیکھ ضرور لینا اس لیے کہ وکٹوریہ اسٹیشن کے آس پاس کی عمارتیں باوا آدم کے زمانے کی بنی ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض عمارتوں میں سیلن اتنی ہوتی ہے کہ ٹھہرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ اگلے دن تم برمنگھم چلے جانا مگر اس کا خیال رکھنا کہ برمنگھم کی ٹرین وکٹوریہ اسٹیشن سے نہیں ملے گی۔ اس کے لیے ایوسٹن جانا پڑے گا۔ وہاں بس سے یا ٹیوب سے جاسکتے ہو۔

وکٹوریہ اسٹیشن آچکا تھا۔ ہم دونوں نے رخصتی کا مصافحہ کیا اور اپنے اپنے راستے پر چل پڑے۔

پیٹر نے وکٹوریہ اسٹیشن کے بارے میں جو معلومات بہم پہنچائی تھیں ان میں شاید کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہو مگر ڈوور والی معلومات آج اکتالیس سال گزرنے کے بعد یکسر بدل چکی ہیں۔

ڈوور کے لیے میرا سفر اوسٹنڈ کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا۔ اوسٹنڈ کا پہلا ریلوے اسٹیشن 1838 میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں پر اب ایک سپر مارکیٹ ہے۔ اوسٹنڈ کا ریلوے اسٹیشن 1913 میں بیلجیم کے بادشاہ البرٹ اول کے دور حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ اسٹیشن ریل اور فیری، دونوں کے سفر کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں سے بیلجیم کی ایک کمپنی ڈوور کے لیے فیری چلایا کرتی تھی جو ڈوور کے ویسٹرن ڈاکس جایا کرتی تھی۔ ویسٹرن ڈاکس اسٹیشن اب بند ہوچکا ہے۔ اب وکٹوریہ اسٹیشن جانے والوں کو فیری سے اتر کر سیدھا ٹرین میں سوار ہونے کی سہولت میسر نہیں ہے۔ اب ان کو بس کے ذریعے ڈوور شہر کے ریلوے اسٹیشن پر جانا پڑتا ہے جہاں سے وکٹوریہ اسٹیشن کی ٹرین ملتی ہے۔ مگر 1972 میں یہ سہولت موجود تھی جس کی بدولت میں فیری سے اتر کر سیدھا ٹرین میں بیٹھ کر وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔

وکٹوریہ اسٹیشن کے عقب میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں پر تو ہر پانچویں چھٹی عمارت پر بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کا بورڈ آویزاں ہے۔ میں ایک عمارت کے اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر پر ادھیڑ عمر کے میاں بیوی بیٹھے ہوئے میرے ہی منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایک دم کھڑے ہوگئے۔ میاں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ بیوی ہم دونوں کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہیں۔ پھر میاں مجھ سے اردو میں مخاطب ہوئے۔ "آپ ہندوستان سے آئے کیا؟"

یہ جملہ اور ان صاحب کے بولنے کا انداز اور لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ ان کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ میں نے ان سے جواباً پوچھا" آپ حیدرآباد سے آئے ہیں کیا۔"

ان کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ شرماتے ہوئے بولے۔ "جی ہو۔"

یہ جواب ساری دنیا میں سوائے کسی حیدرآبادی کے اور کوئی نہیں دے سکتا۔ اس "جی ہو" سے متعلق بڑے بڑے قصے مشہور ہیں۔ اسی طرح کا ایک سنا سنایا قصہ ہے کہ ایک دفعہ ایک صاحب حیدرآباد گئے۔ ان کو "چارمینار" جانا تھا جو اس شہر کا ایک معروف مقام ہے۔ انہوں نے ایک راہگیر سے پوچھا" کیا یہ سڑک چارمینار جائے گی؟" اس نے جواب دیا "جی ہو" اور آگے بڑھ گیا۔

ان صاحب کو "جی ہو" کے معنی نہیں معلوم تھے۔ انہوں نے دوسرے سے "چارمینار" کا راستہ معلوم کیا اس نے بھی جی ہو کہا۔ انہوں نے کئی لوگوں سے اپنا سوال دہرایا، ہر ایک نے وہی جواب دیا "جی ہو" اور آگے بڑھ گیا۔

وہ صاحب حیران پریشان کھڑے رہ گئے۔ پھر ان کو امید کی کرن نظر آئی۔ سامنے سے ایک صاحب آرہے تھے۔ سوٹ پہنے اور ٹائی لگائے۔ خاصے پڑھے لکھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان صاحب نے آنے والے کو روکا اور اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ "جناب میں چارمینار جانا چاہتا ہوں مگر میں جس کسی سے بھی پوچھتا ہوں کہ کیا یہ سڑک چارمینار جائے گی؟ تو ہر کوئی جواب دیتا ہے "جی ہو" اور آگے چلا جاتا ہے یہ "جی ہو" کیا چیز ہے؟"

انہوں نے ان صاحب کو بتایا" جناب جو لوگ حیدرآباد میں زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں وہ لوگ "جی ہاں" کی بجائے "جی ہو" کہتے ہیں۔"

یہ جواب پانے کے بعد اپنے حیدرآبادی کرم فرما سے پوچھا" آپ تو پڑھے لکھے ہیں ناں" تو حیدرآبادی صاحب نے جواب دیا۔ "جی ہو" اور آگے بڑھ گئے۔

ہوٹل کے مالک کے "جی ہو" کہنے سے مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ بھی کافی پڑھے لکھے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میری پیدائش کا شہر بھی حیدرآباد دکن ہے۔ اس اطلاع کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کمرے کا کرایہ جو پہلے ہی مناسب تھا۔ انہوں نے اس کو مزید ایک پاؤنڈ کم کردیا۔ میں ان سے پوچھنا بھول گیا کہ وہ حیدرآباد میں کس محلّے میں رہتے تھے۔

جاری ہے

بھوک

محمد ایاز راہی

بھوک کی کئی اقسام ہیں۔ پیٹ کی بھوک انسان کو بھکاری بناتی ہے تو نفس کی بھوک راہ سے بھٹکاتی ہے۔ مانسہرہ کے اس نوجوان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا مگر اس کے اندر کا انسان زندہ تھا اسی لیے وہ پشیمانی کی آگ میں جل مرا۔

نوعمر اور نوخیز شیرگل نیم پاگل ہوچکا تھا۔ روح اور مادّہ کی خوں ریز کشمکش میں وہ بری طرح پس رہا تھا۔ ایک حادثاتی واقعہ نے اسے زیروزبر کرڈالا تھا۔ واقعہ اگر رنگین تھا تو اس کے لیے اتنا ہی سنگین بھی ثابت ہورہا تھا۔ اصل وجہ اس کی نوعمری تھی، جب جسم کے اندر اندھے منہ زور جذبے سرکش گھوڑوں کی مانند پھریریاں لے رہے ہوتے ہیں، خواہشات کی بڑھتی ہوئی تیز بھوک یعنی خواہشات کی بھوک کا ناگ سب سے اوپر سر اٹھائے پھنکار رہا ہوتا ہے اور اس کا

کوئی توڑ یا متبادل نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ بھوک مٹانے کے لیے حلال خوراک میسر ہو۔ دینِ فطرت اسلام میں اسی لیے نکاح کو آسان ترین بنانے کی پُرزور تاکید ہے لیکن بدقسمتی سے ہوتا اس کے الٹ ہے کہ بری طرح بڑبڑاتے اور جھاگ اگلتے فطری خواہشات کے اونٹ کو کمزور عقیدے اور بے تکی روحانیت کی کچی نکیل ڈالی جاتی ہے۔ سو وہی بات کہ بندر کے ہاتھ میں چھری یا استرا دینا۔ نیکی و پاکبازی کے نام پہ فطری جذبوں کو کچلنا، قتل کرنا خودلذتی اور غشیات کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر جدید دور کی مادر پدر آزاد تہذیبی یلغار نے تو برائیوں کو وبائی امراض کی طرح پھیلا دیا ہے جس کی لپیٹ میں کیا مرد کیا عورت سبھی جکڑے ہوئے ہیں۔ خصوصاً نوخیز طبقہ نئی تہذیب کے لیے تر نوالہ تو ہے ہی۔

یہی وجہ ہے کہ گاؤں کا سیدھا سادا نوعمر شیر گل جب اکیسویں صدی کی جدید تہذیب سے ٹکرایا تو بری طرح توڑ پھوڑ کی زد میں آ گیا۔ گو کہ یہ ٹکراؤ ان جانے میں اس کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ توقع کے بالکل برعکس حادثہ تھا مگر اب تو اس کی جان پہ بن آئی تھی۔ کچی بنیادوں پہ کھڑا روحانی ذہن و دل شدید جھٹکوں کا شکار تھا۔ تنگ بندھی کمزور کھوکھلی روحانیت آج کی جدید ٹھوس مادّی دنیا کے آگے ریت کی دیوار ثابت ہو رہی تھی۔

بالآخر ہونا بھی یہی تھا کہ گزشتہ کئی صدیوں سے مادّی چاہت بجلی کی سی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے جبکہ روحانیت کا عمل ٹھٹھر سکڑ کر برف میں تبدیل ہو چکا ہے۔ روحانی دنیا کو کوئی گلیلیو، نیوٹن، گراہم بیل، آئن اسٹائن اور جان بیرڈ میسر نہیں۔ جابر بن حیان، ابن الہیثم، بوعلی سینا اور عمر خیام کی جلائی ہوئی عقل و حکمت کی شمع بجھ چکی ہے یا بجھادی گئی ہے۔ چنانچہ روحانیت محض عبادات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے تخلیقِ آدم کی اصل غرض و غایت یعنی دردِ دل اور تسخیرِ کائنات طاقِ نسیاں بن چکی ہے محض عبادت کے زور پر فرشتہ بننا ہر خاص و عام کا وتیرہ بن چکا ہے جبکہ فرشتے تو خود انسانیت کے اعلیٰ مقام کو حسرت سے تکتے اور پانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ خیر کا ایک ہی رنگ تو فرشتوں کے لیے ہے۔ انسان تو مختلف رنگوں کی آمیزش کا نمونہ ہے اب شیر گل ہی کی مثال لے لیں۔

شیر گل نے جدید دنیا سے دور کوسوں دور ایک گم نام دیہات میں آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف غربت اور منہ زور مذہب کا راج تھا۔ وہاں اپنی مرضی کا دین تو فرض تھا ہی مگر ساتھ ہی غربت کو بھی سنتِ پیغمبری کا مقدس لبادہ اوڑھا کر نعمت کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس طرح شیر گل نے بھی ترقی پسند سوچ اور عمل کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ شیر گل کا باپ مسجد کا روایتی کٹھ ملا تھا کیونکہ اس نے کسی مدرسے سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر گاؤں کے تقریباً ان پڑھ اور لاعلم لوگوں پہ اس کا خوف واحترام مسلط تھا۔ دکاندار، مزدور، محنت کش اور کسان سبھی اس کی گرفت میں تھے۔ گاؤں کا خان بھی اپنے منافقانہ تضاد اور ذاتی مفاد کے لیے مُلّا کی پشت پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ وہی اسے بڑھاوا دیتا تھا۔ دونوں بھیڑیے گاؤں کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ الغرض گرگ میر سگ وزیر، جیسی صورتِ حال ہے۔

شیر گل کا معصوم اور کورا کچا شعور بےدار ہوا تو خود میں عالم کُل باپ اسے اچکن کے لیے تیار تھا تا کہ اسے اپنا نائب بنا کر گاؤں میں پھیلی اپنی حکومت کو استحکام دے سکے۔ شیر گل کی سیدھی سادی ان پڑھ ماں ایک شوہر پرست بیوی تھی۔ کٹھ ملا خاوند کے اندھے رعب اور خوف نے اسے کٹھ پتلی بنا رکھا تھا۔ اس کی اپنی کوئی خواہش کوئی سوچ نہ تھی۔ اس پر مثال صادق آتی تھی۔ شادی سے پہلے بابل کے کھونٹے کی گئیا اور شادی کے بعد اللہ میاں کی گائے۔ مجازی خدا کی کنیز بلکہ لونڈی، گھر سے باہر شیر گل کو مسجد ہی کی راہ دکھائی گئی۔ مُلا اور اللہ کے گھر کی فضا تقریباً ایک جیسی ہی تھی لیکن مسجد میں پڑھنے کے واسطے آنے والے دیگر..... بچوں کو شیر گل نے دلچسپی سے دیکھا تو اسے بڑا اچھا لگا۔ پہلے تو بچے اس سے کھنچے کھنچے سے رہے مگر آہستہ آہستہ اس سے گھل مل گئے۔ بچپن عربی حروف والفاظ اور لب ولہجے کی چھاؤں میں گزرا کچھ اس طور کہ روزمرہ کی پشتو بولی ٹھولی میں حرف۔ ک۔ کا وجود دو نقطی۔ ق، میں گم اور ضم ہو کے رہ گیا۔ یہ تجوید و مخرج کی مسلسل مشق کا نتیجہ تھا۔ بچوں کو مٹی اور پانی سے لگاؤ تو ہوتا ہی ہے لیکن حافظ کو پانی کچھ زیادہ ہی بھاتا تھا۔ پانی کا نرم اور پاکیزہ لمس اسے عجیب سی سرخوشی عطا کرتا۔ ماں اگر بنگ ہوتی تو خوشی کا اظہار بھی کرتی ”زما۔ دے۔ او۔ بو۔ مئے“ (میری پانی کی مچھلی) کا جملہ حافظ کی پہچان بن گیا جس سے ممتا کی چاشنی ٹپک رہی ہوتی۔

بچپن نے لڑکپن کے خال وخد اپنائے تو حفظِ قرآن کا آغاز ہوا۔ قدرت نے اسے مضبوط قوتِ حافظہ سے نوازا تھا۔ مخصوص ماحول اور تربیت کے زیرِ اثر وہ تیزی سے قرآن پاک کو ذہن و دل میں اتارنے لگا لیکن قرآن کی روح کو

سمجھانے کا گزر تک نہیں تھا یہاں۔ دانائے راز علامہ اقبال نے اسی لیے قرآن کو سب سے زیادہ مظلوم قرار دیا ہے۔ اسی دوران ایک روز حافظ اپنے ہم جولیوں کے ہمراہ گاؤں سے باہر ندی کی طرف جا نکلا تو بچپن کی دیکھی ہوئی ندی اسے کچھ اور طرح کی لگی۔ وہ لمحہ کچھ ایسا تھا کہ ندی نے اسے سوچا اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ آئینے کی مانند صاف و شفاف پانی جس میں ہر چیز دھلی دھلائی اور ان چھوئی لگ رہی تھی۔ ندی کی سبک روانی۔ ہلکی اور مدھر گنگناہٹ۔ لہروں کا اتار چڑھاؤ۔ پتھروں میں کہیں کہیں بنتے چھوٹے چھوٹے بھنور۔ چھوٹی بڑی مچھلیاں اور دیگر جانور۔ رنگ برنگے مختلف حجم، وزن اور شکل کے پتھر۔ سنگ ریزے۔ پتھروں کے اوپر نیچے سے لہکتا گزرتا پانی۔ مخملیں کائی۔ ندی کنارے کھڑے جھکے درختوں کا عکس۔ درختوں کے نیچے بچھا سبزۂ بےگانہ۔ ندی پر اڑتے آبی پرندوں کے چہچہے۔ قلابازیاں اور سطحِ آب پر سورج کی مچلتی کرنوں کا رقص۔ تازہ ہوا کھلی فضا۔

ندی کیا تھی حیرتوں اور مسرتوں کا اک جہاں تھی۔ شیر گل نے ڈرتے جھجکتے ندی میں قدم رکھا تو پانی نے اس کے پاؤں چھو کر پہ خیر راغلے (خوش آمدید) کہا۔ دوستوں نے ہمت بندھائی۔ ساتھ دیا تو رفتہ رفتہ شیر گل خود کو ندی سے ہم کنار کرتا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ماں کے سینے سے لگ گیا ہو۔

ندی سے عشق کا پہلا سبق یوں رگ و پے میں اترا کہ چھٹی کا لفظ ہی زندگی سے خارج ہو گیا۔ پانی میں ہاتھ پاؤں چلاتے ندی اسے ماں کی گود کی طرح لگتی جہاں وہ بچپن میں کھیلتا مچلتا رہا تھا۔ اب اس کا زیادہ تر فارغ وقت ندی کی گود میں ہی ہمکتے تھرکتے گزرتا دیگر لڑکے تو کبھی کبھار ہی ندی کا رخ کرتے مگر شیر گل کی واحد تفریح اور دلچسپیوں کا مرکز اب ندی ہی تھی۔ یوں تیراکی کے اسرار و رموز اس پہ کھلتے جا رہے تھے۔ ندی اس کے جسم کو خوبصورتی اور چمک بخشتی رہی۔

گھر میں باپ کی کچھ روایتی اسلامی کتب اسے اردو سے بھی آشنا کرتی رہیں۔ کچھ عرصہ بعد جب ان کتابوں نے اسے بتایا کہ تیراکی سنت نبویؐ ہے تو ندی سے اس کا عشق اور خلوص درجۂ کمال کو پہنچ گیا۔ حفظِ قرآن اور تیراکی دونوں سلسلے پیہم چلتے رہے۔ سورج اور مہ و انجم تماشائی بنے رہے۔ قدرت شب و روز کے اوراق پلٹتی رہی۔ دن، ہفتوں مہینوں اور برسوں کے سانچے میں ڈھلتے رہے۔ گاؤں میں شیر گل کی قرآن خوانی نیکی پارسائی اور تیراکی کے چرچے ہوتے رہے۔ مذہبی رنگ مضبوطی سے جمتا چلا گیا۔

نوجوانی نے شیر گل کا ہاتھ تھاما تو فطرت نے اس کے ذہن، نگاہ اور جسم میں رنگ بھرنے شروع کر دیے لیکن وہ اس خوش گوار تبدیلی کو سمجھ نہیں پا رہا تھا اکثر گھبرا اٹھتا اور الجھن کا شکار ہو جاتا۔ گاؤں کی کسی الہڑ دوشیزہ پر نگاہ پڑتی تو جسم و جاں میں برق سی کوندا اٹھتی مگر پھر گناہ اور گنہگار ہونے کے شدید احساس سے مرجھا جاتی۔ حافظِ قرآن ہونے کے ناتے وہ اٹھتی لپکتی نگاہوں کا گلا گھونٹ کر انہیں زمین میں گاڑ دیتا۔ ایسا کئی بار ہوتا اور وہ ہر بار نزع کی سی کیفیت سے گزرتا۔ اکلوتا ہونے کی بنا پر گھر میں اچھی خوراک کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نوجوان جسم کی فالتو یا فاضل قوت کا علاج واخراج ندی میں تیراکی کی تفریح تو تھی لیکن اٹھتی جوانی کے جنسی عفریت کا وہ کیا کرتا جو اسے خلجان وانتشار میں ڈالے ہوئے تھا۔ کیسے اس کی بھوک کو سمجھتا مٹاتا اور اسے قابو کرتا۔ اس آگ کو بجھنا، بجھانا اس کے بس سے باہر تھا۔ گاؤں میں جنس شجرِ ممنوعہ اور اس کا ذکر عام گناہ کبیرہ تھا اور پھر شیر گل تو تھا بھی نیک اور اچھائی کا نمونہ۔ چنانچہ اس کی بےبسی اور حالت قابلِ رحم تھی۔ اس نے بالی عمریا کی آخری سیڑھی پھلانگی تو وہ مکمل حافظ قرآن اور مشاق تیراک بن چکا تھا۔

لمبا ہوا قد۔ گورا رنگ۔ مضبوط ہاتھ پاؤں۔ اعضا کا تناسب اور چمک جو اسے مسلسل تیراکی نے عطا کی تھی۔ سو وہ بھی حسین یونانی دیوتا کی طرح لگتا تھا مگر جسم کے اندر برسوں سے ناآسودہ جذبہ آتش فشاں بن چکا تھا۔ یہ جوالا مکھی کسی بھی وقت پھٹ پڑنے کے لیے ہلکے سے اشارے کی منتظر تھی۔ ادھر جھوٹے فخر وغرور میں مبتلا کور نظر باپ ساون کا اندھا بنا بیٹھا تھا۔ اسے اپنے جھمیلوں سے ہی فرصت نہ تھی۔ محض عبادت کے بل پر فرشتہ بننے کی خواہش اسے گھیرے ہوئے تھی۔ جدید دنیا اور اس کے تقاضوں کا دشمن باپ نئے نویلے اور نوخیز بیٹے کو بھی دقیانوسی ذہن و نگاہ سے دیکھا پرکھتا۔ تیسری دنیا خصوصاً جاہل دیہاتی علاقوں میں ماں تو شاید جوان ہوتی بیٹی کی سہیلی بن سکتی ہو لیکن باپ کی جوان بیٹے سے دوستی ناممکن سی بات ہے کہ صدیوں کی سماجی جکڑ بندی کو توڑنا کارے دارد ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شیر گل کو اس کا حافظِ قرآن ہونا بڑی حد تک تنہا کر گیا تھا۔ بے تکلف دوست نہ محرم راز ہمدرد کہ جس کے آگے دل کا غبار نکال سکتا۔ الٹی سیدھی اوٹ پٹانگ اول فول بک سکتا جو اس عمر کا تقاضا ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ یکسر تہی دامن تھا۔ لہٰذا اس کی جھنجھلاہٹ بڑھتی تو اسے ہر چیز سے نفرت ہو جاتی مگر بہ ظاہر خوش اخلاق رہنا اس کی مجبوری ہوتی۔ عجیب سی بھوک اسے پیچیدہ رویوں کی طرف دھکیلتی اور سوتے میں عجیب و غریب قسم کے خوابوں سے دوچار کرتی۔ زندگی معما بن کے رہ گئی تھی۔

اس کے بچپن کا ایک دوست گاؤں سے کوسوں دور شہر میں ملازم تھا۔ ایک بہت بڑے جدید ہوٹل میں وہ برتن دھونے کا کام کرتا تھا۔ اس بار وہ چھٹی پر گاؤں آیا تو اس نے شیر گل کو شہر جانے کی صلاح دی۔ سیر و تفریح کے علاوہ نوکری دلانے کا بھی وعدہ کیا۔ باپ اس کی نوکری کے حق میں نہیں تھا کہ وہ اکلوتے بیٹے کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا البتہ چند دنوں کے لیے اس کو شہر جانے کی اجازت دے دی۔

ایک روز منہ اندھیرے شیر گل اپنے دوست کے ساتھ گاؤں سے نکلا۔ علاقے کی واحد سڑک بھی گاؤں سے دو کوس دور تھی۔ وہ اکیسویں صدی کے جدید ترین شہر میں پہنچا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور پھر اعلیٰ درجے کا ہوٹل اسے حیرت کی تصویر بنا گیا۔ یہ ہوٹل انتہائی اونچے طبقے اور غیر ملکی لوگوں کی آماج گاہ تھا۔ ہوٹل کا ایک بڑا عہدیدار اس کے دوست پر خاصا مہربان تھا۔ شیر گل کا دوست ڈیوٹی کے علاوہ بھی بڑے صاحب کے ذاتی کام اور خدمت کرتا رہتا تھا اس نے بڑے صاحب سے شیر گل کا ذکر کیا کہ جناب اس دفعہ میرے ساتھ گاؤں سے میرا لنگوٹیا یار بھی آیا ہے جو حافظ قرآن اور بڑا اچھا تیراک ہے اس پر بڑے صاحب نے اس کو بلوایا۔ اسے حفظ قرآن کی مبارکباد اور حوصلہ دیا کہ آپ کے لیے کچھ سوچتے کرتے ہیں۔

اب ہوا کچھ یوں کہ ہوٹل کے سوئمنگ پول (نہانے کا تالاب) کا ایک نگران تیراک اچانک بیمار ہو کر گھر چلا گیا۔ بڑے صاحب نے اپنے خصوصی اختیار سے اس کو عارضی طور پر نگران تیراک کے طور پر کھڑا کر دیا۔ تالاب پر دو تین تیراک مختلف اوقات میں ڈیوٹی دیتے تھے۔ باقی دو پرانے تیراکوں کو تاکید کر دی گئی کہ وہ ڈیوٹی کے بعد بھی وقتاً فوقتاً نئے تیراک کو دیکھ جایا کریں۔

شیر گل کو شام کی ڈیوٹی دی گئی۔ اسے تیراکی کا چست لباس پہنا دیا گیا۔ یہاں وہ شدید حیرت سے دوچار ہوا جب اس نے پہلی بار غیر ملکی خواتین کو تیراکی کرتے دیکھا۔ اسے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ الرٹ کھڑا رہے تا کہ کوئی ہنگامی یا حادثاتی صورتِ حال پیش نہ آ جائے۔

ولیم اور لزا برطانیہ سے آئے تھے۔ دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ نوخیز لزا حسب معمول نہانے کے لیے بے باکی سے چلتی ہوئی آئی اور پانی میں کود گئی۔ شیر گل ساکت رو کے جیسے کوئی انوکھا خواب دیکھ رہا تھا۔ تک تک دیدم دم نہ کشیدم۔ شفاف پانی میں لزا کا تڑپتا مچلتا چاندی سا جسم تجلیاں بکھیر رہا تھا۔

خاصی دیر بعد پانی میں شرابور وہ جل پری تالاب سے باہر نکلی تو بھیگا بدن قیامت ڈھا رہا تھا شیر گل بھونچکا رہ گیا۔ اندر کا ناگ بھیگی ہوئی البیلی ناگن کو دیکھ کے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ دل و نگاہ پہ اختیار اب کہاں۔ پارسائی کا چراغ تیز و تند ہواؤں کی زد میں تھا۔ حشر بہ داماں لزا کی نظر شیر گل پر پڑی تو وہ ٹھٹک گئی۔ دیگر تیراکوں کے برعکس یہ نوخیز و نوعمر تیراک اسے اچھا لگا اس نے دلچسپی سے نظر بھر کے شیر گل کو دیکھا تو اس کا گھبرایا ہوا گورا چہرہ من کو بھا گیا۔ لزا ایک ادائے دلبرانہ سے واپس چل دی۔ شیر گل کی نگاہیں اس سے چپکی رہیں بلکہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی مگر اس کا دشمن ایمان سراپا دل و نگاہ میں کھب گیا۔

شیر گل کا وجود کھوکھلا اور روح خالی ہو گئی۔ لزا پہلی نگاہ اور ایک ہی حملے میں سب کچھ لوٹ گئی تھی۔ وہ خود سے بے گانہ ہو چکا تھا۔ چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا اسے اجنبی سا لگ رہا تھا۔ دوسرے دن لزا پھر اسی بے باکی اور چیختے پکارتے بدن کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تو شیر گل کا وجود لرز کے رہ گیا۔ لزا نے گھائل ہوتے شیر گل پر ایک بار پھر نگاہ کی تیج بازی کی اور دوڑتے ہوئے حوض پر پہنچی، کمان کی صورت دہری ہوئی، بازو پھیلائے زقند بھری اور لہرا کے پانی میں کود پڑی۔ پانی میں اس کا وجود گوہر شب تاب کی مانند دمک رہا تھا۔ وہ دیر تک تال کو روشنی اور رنگینی بخشتی رہی۔ آخر وہ جل پری کے روپ میں ڈھلی باہر نکلی۔ بے چارے شیر گل کو میٹھی نگاہوں کا چارا ڈالا اور ہوش و خرد لوٹ کے چلتی بنی۔ شیر گل اب صرف اور صرف خواہش کا پتلا ہی بن کے رہ گیا تھا۔ اس کا دوست اس میں تبدیلی کو دیکھ تو رہا تھا لیکن وہ اسے پہلی بار جدید شہر اور اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں آنے رہنے کا اثر جان

رہا تھا۔ شیر گل کی شرافت اور کردار کی ظاہری پختگی پر اس کا یقین تھا۔ اس کی اندرونی کشمکش کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا پھر بھی وہ گاہے بگاہے شیر گل کو احتیاط اور دھیان کی تاکید کرتا رہتا۔ ایک تو حافظِ قرآن ہونے کی وجہ سے وہ دوست شیر گل سے بے تکلف نہیں تھا نہ ہی شیر گل اسے محرم راز بنا سکتا تھا دوسرے دوست اپنی محنت مشقت اور بڑے صاحب کی خدمت کے جنجال میں الجھا پھنسا رہتا۔

تیسرے دن لزا اپنے بے باک حسن جہاں سوز کے ساتھ نمودار ہوئی تو اس نے شیر گل پر بھرپور مسکراہٹ کا جال بھی پھینکا اور اسے سوچا اپنا بنا کے چھوڑ دیا۔

دن گزرتے رہے گاؤں کا سیدھا سادہ شیر گل تہ و بالا ہوتا رہا۔ گاؤں میں تو کوئی کنیا کسی کے آگے منہ ہاتھ بھی کھل کے نہیں دھوتی تھی یہاں تالاب میں لزا کا دمکتا وجود شیر گل کو پاگل کر چکا تھا۔ ادھر مادر پدر آزاد تہذیب میں پلی بڑھی لزا کے لیے صنف مخالف سے اختلاط اور میل جول کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ کسی موقع کی منتظر تھی۔ سحر زدہ اور کشتۂ حسن شیر گل اس کا معمول بن چکا تھا۔ گھاگ لزا اسے پوری طرح باندھ چکی تھی۔ اناڑی شیر گل تر نوالہ بن چکا تھا۔ اس روز وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ ولیم کسی دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ لزا نہانے کے لیے آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بیگ بھی تھا۔ اس نے بیگ شیر گل کے قریب رکھا۔ اس کے بدن سے اٹھتی تیز خوشبو شیر گل کو بے خود کر گئی لزا نے مسکرا کر اسے دیکھا اور دوڑ کر تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ تالاب کے اردگرد کوئی نہیں تھا۔ اچانک لزا بری طرح چیخنے چلانے لگی۔ شیر گل تیزی سے کنارے پر پہنچا تو لزا نے فوراً اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے اختیار پانی میں کود پڑا۔ لزا منصوبے کے مطابق ناٹک رچا رہی تھی وہ اس کے قریب پہنچا تو لزا نے اپنا سارا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ جسم اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ شیر گل اسے خود پہ لادے کنارے کی طرف بڑھا۔ لزا کا بھیگا ہوا ریشمی بدن بار بار پھسل پڑتا۔ وہ ہر بار اسے کھینچ کر قابو میں لاتا۔ کھلاڑی لزا مکمل طور پر تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی غافل بنی رہی۔ شیر گل لزا کو سمیٹے جکڑے پانی سے باہر نکلا تو لزا نے تھوڑا سا لڑکھڑانے اور پھر سنبھلنے کی اداکاری کی۔ آخر شیر گل کو بیگ اٹھانے اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کسی تنویمی معمول کی مانند بیگ اٹھائے لزا کے پیچھے ہو لیا۔

دونوں لزا کے کمرے میں داخل ہوئے۔ خودکار دروازہ بند ہوا تو لزا اس پر جھپٹی۔ شیر گل کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

کافی دیر بعد وہ کمرے سے نکلا۔ پہلے تو اس نے خالی ذہن و نظر سے اردگرد دیکھا پھر پشیمانی نے اسے گھیر لیا۔ رات گئے وہ اپنی چارپائی پر لیٹا تو پشیمانی اور گناہ کا احساس شدید ہو چکا تھا۔ اس کا دوست آیا تو شیر گل کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس کے چہرے پر گہری ندامت اور آنکھوں میں خوف بھرا ہوا تھا۔ دوست کا اصرار حد سے بڑھا تو شیر گل کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ بار بار پوچھنے پر بھی وہ گم صم رہا۔ اس کی سسکیاں بلند ہوئیں تو دوست تھک ہار کے چپ ہو رہا کہ ہو نہ ہو اسے گھر اور گاؤں کی یاد رلا رہی ہے۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا لاڈلا تھا۔ بالآخر اگلے دن دوپہر کو دوست نے اپنے شہر جانے والی گاڑی پر اسے سوار کرا دیا۔

رات گئے شیر گل گھر پہنچا تو اس کی مجہول حالت کو ماں نے سفر کی تکان جانا، یہ بھی کہ اکلوتا لاڈلا بیٹا خاصے دن گھر سے باہر رہا ہے۔ جانے کیسے وقت گزارا ہوگا میرے لال نے۔ شکر ہے پردیس سے صحیح سلامت واپس گھر آ گیا میرا بچہ۔ باپ کو تو بالکل ہی پروا نہیں تھی۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ گناہ کے شدید احساس سے پشیمان لٹا پٹا وہ نماز جمعہ کے لیے مسجد پہنچا تو اس کا باپ منبر پر تقریر کر رہا تھا۔ اتفاقاً ذکر بھی زنا اور اس کی کڑی سزا کا ہو رہا تھا!

کچھ دیر بعد اچانک شیر گل ہڑبڑا کر اٹھا تیزی سے باہر کا رخ کیا اور دونوں ہتھیلیاں کانوں پر رکھ کے غیر ارادی طور پر سڑک کی جانب دوڑ پڑا۔ اسی وقت ایک شہر سے دوسرے شہر مال لے جانے والا بڑا سا ٹرک تیزی سے گزر رہا تھا۔ شیر گل نے خود کو روکنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ اسی رفتار سے دوڑتا ہوا ٹرک کے آگے آ گیا۔ اب پتا نہیں وہ باپ کی تقریر کے ٹرانس میں آ گیا تھا یا اتفاقی حادثہ تھا، خدا عالم غیب ہے۔

سنہرے اقوال

- ہماری آنکھیں آئینے ہیں۔
- عشق میں شرک نہیں ہوتا کیوں کہ عشق صرف ایک سے ہوتا ہے۔
- تمام بے وقوفیاں عقلمندی سمجھ کر کی جاتی ہیں۔
- خواہشیں اور تشنگی عام طور پر ساتھ چلتی ہیں۔
- ہر چھوڑ کر جانے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا اور اسی طرح ہر ساتھ رہنے والا شخص آپ کا اپنا نہیں ہوتا۔

سراب

راوی : شہبازملک
تحریر: کاشف زبیر

قسط:86

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو،مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب.....ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنا

کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوالیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ..... بکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیرلیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروکی نے ہم دونوں کو پکڑلیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑلیں۔ صابر تو پکڑ میں آگیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر ناصرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر وتھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی ہم نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کرلے جارہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کرکے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوالیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی۔ تو بانو رہا ہوجائے گی۔ میں نے رامن پر حملہ کردیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ منشی دل آگیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پستول نکل کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام اور... کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شملہ پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرا دلوادیا۔ میں راج کنور کو یرغمال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کررہا تھا۔ اسپتال جہاں کنور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آ لگی اور رامن کی آواز ابھری۔ "ہلنا مت شہباز۔" میں نے اسے گھونسے مار کر بے ہوش کیا اور عقبی گلی سے نکل آیا، ہوٹل پہنچ کر اسکائپ کے ذریعہ تمام دوستوں اور اپنے گھر والوں سے بات کی۔ میں نے پلان بنایا تھا کہ کنور کو اغوا کرکے ہیلی کاپٹر کے ذریعہ بارڈر کراس کرلوں گا۔ اسے اغوا کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا ڈاکٹر امرت سنگھ سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سرجیکل نائف تھی۔ اس نے چونک کر پوچھا آپ یہاں کیا کررہے ہیں۔ اسے میں نے قابو کرلیا۔ اس نے بتایا کہ رامن راج کنور کو نکال لے گیا ہے۔ میں نے فوراً پلان بنایا کہ ہیلی کاپٹر سے راج کنور کا پیچھا کروں گا اور اسے اغوا کرکے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کنور کو لے کر سرحد پار کرگیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ سنگاری جب ہیلی کاپٹر واپس لارہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہوگیا۔ دھماکے سے ہیلی کاپٹر پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے، میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہوکر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیرلیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرایہ پر لے کر تیزی سے سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکابندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس چمکی بیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بیتو کے شانے پہ لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کردیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا سیتا کا شوہر ارون اسے حراساں کررہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیرلیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات

کی اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے" ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ ہمیں ایک دوسری نوکرانی دی گئی۔ ہم حملے کی ریہرسل بھی کررہے تھے کہ خبر آئی کہ فوراً کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔ ہم فتح خان کے ساتھ ایک دوسری جگہ منتقل ہوگئے۔ وہاں سے ٹہلنے کے لیے نکلا اور ایک پہاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کرنے لگا تبھی کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا۔ ہوش آیا تو میں کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ رامن سامنے تھا۔ وہ تفتیش کررہا تھا کہ کنور پیلس پر حملہ ہوا اور دھماکے سے میرے ہوش حواس گم ہوگئے۔

(اب آگے پڑھیں)

دھماکے نے میرے حواس مختل کردیے تھے اور اس کے زور نے مجھے کرسی سمیت اکھاڑ پھینکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا جسم کئی حصوں میں بٹ گیا ہے۔ نائیک بہت قوت سے مجھ سے ٹکرایا تھا۔ اسے کمرے کا فولادی دروازہ لگا تھا۔ اس کا پتا نہیں کیا حال ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لیے مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ یہ وقت کتنی دیر تک رہا میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میں چونکا تو باہر سے بے پناہ فائرنگ کے ساتھ انسانوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ اس عمارت کی روشنی بند ہوگئی تھی لیکن باہر لگنے والی آگ کے شعلوں کا انعکاس اندر تک آ رہا تھا۔ میں پہلو کے بل اس طرح گرا ہوا تھا کہ کرسی میری پشت پر تھی۔ میں نے حرکت کرنا چاہی تو مجھے پتا چلا کہ میرے ہاتھ آزاد ہوگئے تھے۔ ٹوٹنے اور گرنے کے دوران کرسی کا کلپ کھولنے والا میکنزم کام کرچکا تھا اور میرے ہاتھ آزاد تھے۔ البتہ میرے پاؤں بدستور کرسی کے کلپس میں قید تھے۔

میں اندازہ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس دھماکے نے مجھے کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ میں درد اور ہاتھوں سے ٹٹول کر اپنا جسم چیک کررہا تھا۔ کئی جگہوں پر زخم تھے، مجھے خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی تھی۔ مگر درد اتنا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ درست انداز میں کام کررہے تھے اس لیے میں نے مزید معائنے کا کام ملتوی کیا اور خود کو آزاد کرانے کی کوشش شروع کردی۔ پیروں کے کڑے کسی قدر موٹے حلقے والے تھے اور اسی لحاظ سے مضبوط تھے۔ کرنل نے شاید دو بجتے ہی حملے کا آغاز کردیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری غیر موجودگی میں کنور پیلس پر ہیلی کاپٹر سے اترنے والی ٹیم کی قیادت کون کرتا؟ کڑوں کو اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش ناکام رہی تھی۔ وہ بہت مضبوطی سے اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ اس لیے اب میں کرسی کے عقبی حصے کو ٹٹول رہا تھا۔ ان کڑوں کو کھولنے والا میکنزم کرسی کی پشت پر ہی تھا۔ مگر یہ بہت مشکل کام تھا۔

دھماکے نے صرف دروازہ نہیں اکھاڑا تھا بلکہ کمرے کو بھی تہ وبالا کردیا تھا۔ اگر دیواریں اور چھت بہت مضبوط نہ ہوتیں تو یہ گر جاتیں مگر اب بھی ان سے پلاسٹر کے ٹکڑے ٹوٹ کر گررہے تھے۔ اندر گرد اور دھویں نے ماحول دھندلا دیا تھا۔ اس کے پار روشنی جیسے لہرا رہی تھی۔ دھواں زیادہ نہیں تھا مگر گرد کے ساتھ مل کر سانس لینے میں مشکل پیدا کر رہا تھا۔ میرا گلا پہلے ہی خشک ہو رہا تھا۔ جسم موڑ کر میں کرسی کی پشت ٹٹول رہا تھا۔ میری انگلیوں نے ایک ابھری ہوئی چیز کو چھوا۔ میں نے اسے اوپر کھسکانے کی کوشش کی مگر وہ جام ہو رہی تھی۔ شاید یہی پاؤں کے کڑے کھولنے والا کھٹکا تھا۔ اس کی پوزیشن بھی ایسی تھی کہ میں اسے بہ مشکل دو انگلیوں سے اوپر کی طرف کھینچ سکتا تھا اس سے زیادہ زور لگانا ممکن نہیں تھا۔ اگر یہ ذرا اوپر ہوتا تو میں انگوٹھے سے زور لگا کر اسے کھینچ لیتا۔ میں نے کوشش کرکے دیکھ لی مگر دو انگلیوں سے زیادہ رسائی نہیں تھی۔ پھر میں نے آس پاس ٹٹولا کہ کوئی چیز مل جائے جس سے میں کھٹکا کھسکا سکوں۔

دھماکے سے پہلے روشنی بند ہوگئی تھی۔ یقیناً کنور پیلس کو فراہم کی جانے والی پاور لائن اڑادی گئی تھی۔ پھر بیک اپ نے کام شروع کیا تھا اور جب میزائل آکر اس عمارت سے ٹکرایا تو اس نے بجلی کا نظام تباہ کردیا تھا۔ اب یہاں پھر اندھیرا تھا مگر اچانک ہی دوبارہ روشنی ہوگئی۔ شاید عمارت کے بیک اپ نے کام شروع کردیا تھا۔ مگر یہ روشنی زیادہ نہیں تھی اور کمرے کے کونے میں لٹک جانے والا بلب ٹمٹما رہا تھا۔ بہر حال یہ روشنی بھی غنیمت تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا تو مجھے ایک زنبور نما آلہ دکھائی دیا۔ یہ شاید دانت یا ناخن اکھاڑنے کے کام آتا تھا۔ مگر وہ کچھ دور پڑا تھا۔ میں نے اسے حاصل کرنے کے لیے کرسی آگے کھسکائی اور دوسری بار وزنی کرسی کھسکانے پر وہ زنبور نما آلہ میرے ہاتھ میں آگیا تب میں نے نائیک کو فرش پر اپنے ہی خون میں غلطاں پڑے دیکھا تھا۔ اس کا ایک بازو تقریباً کٹ گیا تھا اور جبڑا ٹوٹ جانے سے منہ ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ مرگیا تھا یا ابھی زندہ تھا۔

میں نے آلہ پیچھے لے جا کر اس سے کھٹکا کھسکانے کی کوشش شروع کی۔ اگر کھٹکا ٹھیک ہوتا تو وہ بہت آسانی سے کھسک جاتا مگر کرسی گرنے اور اسٹرکچر بگڑنے سے کھٹکا سخت ہو گیا تھا۔ وہ کھسک کر نہیں دے رہا تھا۔ میں نے آلہ اس پر مارا اور چند نستعلیق گالیاں بھی دیں مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کرسی خود فرش سے آزاد ہو گئی تھی لیکن مجھے قید رکھا ہوا تھا۔ میں نے آلے سے کڑا کاٹنے کی کوشش بھی کی۔ مگر وہ اس کام کے لیے موزوں نہیں تھا۔ عجیب سچویشن تھی۔ میں ایک بہت بڑے دھماکے میں بچ گیا تھا جب کہ میرے دشمن اس کا شکار ہو گئے تھے، کم سے کم ایک تو میرے سامنے پڑا ہوا تھا مگر ساتھ ہی میں قید سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ میری پوزیشن بھی ایسی تھی کہ میں خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ میری نظر ایک طرف موجود اپنے ہتھیاروں پر گئی تھی۔ دھماکے نے انہیں بھی میز سے منتشر کر دیا تھا اور خیریت رہی کہ ان میں سے کوئی گرنیڈ یا اسموک بم نہیں پھٹا تھا ورنہ میرا بچنا محال تھا۔

مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اس طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ یہ خاصا مشکل کام تھا کیونکہ درمیان میں دروازہ پڑا ہوا تھا۔ اس سے گزر کر جانا تھا۔ کرسی کم سے کم ایک من وزنی تھی کیونکہ یہ ٹھوس فولاد کی بنی تھی۔ ایک من وزن سرکانا بھی آسان نہیں تھا مگر جب انسان کی جان پر بنی ہوتی ہے تو وہ سب کر لیتا ہے۔ ایک پہاڑ سر پر اٹھا کر دوسرا پہاڑ بھی سر کر لیتا ہے یہ تو ایک من وزنی کرسی تھی۔ کسی نہ کسی طرح میں نے ہتھیاروں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ میں نے پستول اٹھایا اسے چیک کیا۔ پھر اسے عقب میں لا کر نال کھٹکے پر رکھی اور آگے جھکتے ہوئے گولی چلا دی۔ گولی نہ جانے کہاں گئی۔ ایک دھماکا ہوا مگر کڑے بدستور بند رہے۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ کھٹکا ٹیڑھا ہو گیا تھا اور اپنی جگہ سے کسی قدر سرک بھی گیا تھا۔ میں دوسرا فائر کرنے والا تھا کہ باہر سے کسی نے چلا کر کہا۔

''اندر فائر ہوا ہے۔''

''تو جا کر دیکھ۔'' کسی اور نے اسے حکم دیا۔

خطرہ قریب آ رہا تھا کیونکہ بولنے والے مقامی لہجے میں بات کر رہے تھے اور وہ یقیناً کرنل یا فتح خان کے آدمی نہیں تھے۔ جب تک میں آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا باہر چیخ و پکار اور فائرنگ کا شور جاری تھا۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ میزائل مین اپنا کام کر رہے تھے۔ شکر ہے اس عمارت پر دوسرا میزائل فائر نہیں ہوا تھا ورنہ اس بار یہ ... جاتی۔ کبھی شور کم ہو جاتا اور کبھی بڑھ جاتا تھا۔ ... جانے والی فائرنگ کی آواز یہاں تک نہیں آ رہی تھی ... کنور پیلس کے گارڈز جو جواب دے رہے تھے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہاں بھی کچھ لوگ ... اندر سے فائر کی آواز پر چونک گئے تھے۔ اس سے پہلے ... نمودار ہوتا میرا آزاد ہونا ضروری تھا۔ میں نے پھر کھٹکے ... نال رکھی اور فائر کر دیا۔ اس بار بھی کڑا نہیں کھلا تھا ... کڑے کی شان میں کچھ گستاخیاں کیں۔

اسی لمحے دروازے کی طرف ایک سایہ نمودار ہوا ... نے خودکار رائفل اٹھا رکھی تھی۔ میں نے کسی قدر ... کر پستول کا رخ دروازے کی طرف کیا اور جیسے ہی ... سامنے آیا میں نے فائر کیا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا مگر فوراً ... کا رائفل والا ہاتھ آگے آیا۔ میں نے تیزی سے گھومتے ہوئے کرسی کی پشت اس کی طرف کر دی۔ اس کے ... میں ہی میں کسی قدر بچ سکتا تھا۔ اس نے برسٹ مارا اور ... سر ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے گول مول ہو گیا۔ گولیاں کر... سے لگیں اور کچھ اس سے بچ کر گزر گئیں۔ مجھے جھٹکا لگا ... گولی کا نہیں تھا بلکہ کڑے کھل جانے سے میرے پاؤں آزاد ہو گئے تھے۔ دشمن کی طرف سے چلائی جانے والی کسی گولی نے کام کر دیا تھا۔ میرے پاؤں پھنسے تھے اس لیے اچانک آزاد ہونے سے جھٹکا لگا تھا۔ میں آگے سرکا اور دوسرے برسٹ سے بچ گیا۔ کرسی کو آڑ بناتے ہوئے میں ... دروازے کی طرف پستول کا رخ کر کے پورا میگزین خالی کر دیا۔ اس بار وہ نشانہ بنا کیونکہ اس نے چیخ کر گالی دی ... پیچھے ہٹ گیا تھا۔

میں نے رائفل اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک طرف آگ بھڑک رہی تھی اور اس طرف عمارت تباہ ہونے سے کھلا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ فائر کرنے والا دوسری طرف سے آیا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو جھانک کر دیکھا تو مجھے راہداری کے سرے پر دو افراد دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک زخمی تھا اس نے اپنا بازو تھام رکھا تھا۔ میں نے رائفل کا رخ ان کی طرف کیا مگر اسی لمحے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ آگے جا چکے تھے۔ یہاں دھواں زیادہ تھا۔ میں واپس آیا اور جلدی سے بلٹ پروف ... اور اس پر جیکٹ پہنی، بم لگائے اور پھر منہ پر گیس ماسک ... لیا۔ یہاں اثر نہیں تھا مگر باہر یقیناً گیس کا اثر موجود ...

... مٹی مٹی ہو رہی تھی مگر کسی چیز کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ اضافی میگزین کا بکٹ شانے سے لٹکایا اور باہر کی طرف بڑھا تھا کہ کراہ سنائی دی۔ میں نے چونک کر نائیک کی طرف دیکھا۔ وہ زندہ تھا اور ہوش میں آ گیا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے آزاد و مسلح دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت آ گئی تھی۔ چند منٹ پہلے وہ آزاد تھا اور لاف گزاف کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا نہیں تھا کہ وقت اتنی تیزی سے پلٹ جائے گا۔ اب میں آزاد تھا اور وہ قریب المرگ تھا۔ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

''تم بچ گئے.....افسوس...... میں نے سوچا تھا کہ تمہارے گندے خون سے ہاتھ رنگنے سے بچ گیا مگر ایسا لگ رہا ہے تمہاری موت میرے ہاتھوں ہی لکھی ہے۔ بولو کیسے مرنا پسند کرو گے، گولی سے، خنجر سے یا میں یہ گرنیڈ پن نکال کر تمہارے گندے منہ میں ٹھونس دوں۔''

اس نے بولنے کی کوشش کی مگر ٹوٹے جبڑے نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا وہ گڑگڑا کر رہ گیا۔ میں نے جھک کر کہا۔ ''تم بول نہیں سکتے اس لیے یہ بھی نہیں بتا سکو گے کہ کس طرح مرنا چاہتے ہو لیکن میں نے تمہارے لیے ایک اچھا طریقہ سوچا ہے۔''

بجلی کا تار جو کرسی سے لگا ہوا تھا۔ کرسی اکھڑنے سے وہ بھی الگ ہو گیا تھا۔ مگر وہ دیوار میں موجود سوئچ اور ریگولیٹر سے منسلک تھا۔ میں نے تار اٹھایا اور اس کا ننگا سرا نائیک کے منہ میں ڈال دیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ اپنا کھلا منہ ہی بند کر سکتا۔ تار حلق کے اندر تک اتار کر میں ریگولیٹر اور سوئچ تک گیا۔ نائیک کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اگر وہ کوئی التجا کرنا چاہتا تھا تو کر نہیں سکتا تھا اور اگر کر سکتا تو میں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے ریگولیٹر کو فل پر کیا اور نائیک کی طرف دیکھا۔ ''مزے کرو۔'' میں نے کہتے ہوئے سوئچ آن کر دیا۔ نائیک کا جسم یک دم اینٹھا اور پھر تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جس سے کچھ دیر پہلے وہ گند اگل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور یک دم ان کے ڈیلے سفید ہو گئے۔ میں نے منہ پھیر لیا اور باہر کی طرف بڑھا۔

اب مجھے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنا تھا۔ میرے پاس ریڈیو نہیں تھا کیونکہ وہ فتح خان نے لیا نہیں تھا۔ مجھے خود جا کر ان سے ملنا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر کیا ہوا تھا۔

اب شور کم رہ گیا تھا مگر فائرنگ کی آواز بتا رہی تھی کہ مزاحمت جاری ہے۔ میں محتاط قدموں سے راہداری میں آیا۔ میں قید خانے کی عمارت کے پچھلے حصے میں تھا اور اس کا سامنے والا حصہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ میں اسی وجہ سے بچا تھا۔ اس طرف کمروں میں جو لوگ قید تھے ان کے بچنے کا امکان کم تھا کیونکہ عمارت کا یہ حصہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ وہ بہ ظاہر عام سے نظر آنے والے میزائل کس قدر خطرناک ہتھیار ہیں۔ صرف ایک میزائل نے کنکریٹ اور فولاد سے بنی اس عمارت کا یہ حال کر دیا تھا۔ راہداری میں بھی جا بہ جا ملبا بکھرا ہوا تھا۔ میں زخمی تھا مگر کوئی زخم ایسا نہیں تھا جو مجھے ناکارہ کر دیتا۔ ہڈی پسلی سب محفوظ تھیں۔ اگر نائیک سامنے نہ ہوتا تو فولادی دروازہ ٹوٹ کر مجھے لگتا اور اس کی جگہ میرا حشر کر دیتا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے جیکٹ ٹٹولی اور اس میں وہ مخصوص سیٹی موجود پا کر اطمینان محسوس کیا جس کی آواز دوسروں کو سگنل دیتی کہ میں کہاں ہوں۔

عمارت کا داخلی حصہ تباہ ہوا تھا اور یہ قید خانہ تھا اس لیے اس میں دوسرے راستے کی موجودگی بھی مشکل تھی۔ اگر واقعی ایک ہی راستہ تھا تو وہ بند ہو گیا تھا اور مجھے باہر جانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا تھا۔ راہداری آگے جا کر بائیں طرف مڑ رہی تھی اور مجھ پر حملہ کرنے والا وہیں کہیں دوسرے آدمی سمیت غائب ہوا تھا۔ میں دبے قدموں وہاں تک آیا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ اس طرف راہداری مڑی تھی اور سامنے دیوار تھی۔ سامنے ہی نہیں دائیں بائیں بھی دیوار تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ اسی طرف گئے تھے۔ اس وقت یہاں خاصا دھواں تھا اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ وہ اچانک ہی کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مگر وہ تھے راہداری کے آخری سرے پر۔

میری جیکٹ میں ایک چھوٹی ٹارچ تھی۔ میں نے اسے آن کیا اور اچھی طرح معائنہ کیا مگر وہاں سوائے سپاٹ دیواروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس راہداری میں دونوں طرف پانچ پانچ کمرے تھے۔ جس طرف میزائل لگا تھا وہ داخلی حصہ تھا۔ وہ اس طرف کے پانچ کمروں سمیت تباہ ہو گیا تھا۔ جب کہ دوسری طرف کے دو کمرے تباہ ہوئے تھے مگر جس میں، میں تھا اور اس سے آگے کے دو کمرے سلامت رہے تھے۔ میرے کمرے کا بھی دروازہ اکھڑا تھا۔ اگلے دونوں کمرے خالی تھے۔ وہ دھماکے سے دور

ہونے کی وجہ سے محفوظ رہے تھے۔ میں نے آگے والے کے تباہ شدہ کمروں کے دروازے کھولنے کی کوشش کی مگر جو تین دروازے صحیح سلامت تھے ان کے فریم ٹیڑھے ہونے اور آگے ملبا گرنے سے وہ پھنس کر رہ گئے تھے۔ یہاں کی روشنیاں بھی گل تھیں شاید بجلی کی تاریں متاثر ہوئی تھیں۔ میں پہلے مکمل طور پر قید تھا۔ پھر لوگوں کی قید سے آزاد ہوا تو کرسی نے جکڑے رکھا تھا اور اب کرسی سے آزاد ہوا تھا تو اس قید خانے سے نکلنے کی کوئی راہ سجائی نہیں دے رہی تھی۔

حملہ شروع ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا مگر ابھی تک اندر کی مزاحمت ختم نہیں ہوئی تھی۔ باہر سے فائرنگ کی آوازیں رہ رہ کر ابھر رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ مزاحمت توقع سے زیادہ شدید تھی۔ شروع میں میزائل فائر ہوئے تھے، میں نے ہوش و حواس میں دو دھماکے سنے تھے۔ باقی یقیناً بے ہوشی کے دوران ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد گیس اور دھوئیں کے گولے پھینکے گئے ہوں گے۔ مگر یہاں ان کا اثر نہیں آیا تھا اس کے باوجود میں نے گیس ماسک پہن کر رکھا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گیس کس نوعیت کی تھی اور میں بے خبری میں اس کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ احتیاط بہتر تھی بہ نسبت اس کے کہ میں اپنے لوگوں کی طرف سے پھینکی جانے والی گیس کا نشانہ بن جاؤں۔ اس لیے گیس ماسک مستقل منہ پر لگایا ہوا تھا۔

جو دو کمرے خالی تھے میں نے ان کا جائزہ نہیں لیا تھا اس لیے باہر نکلنے میں ناکامی کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں بھی دیکھ لوں ہو سکتا ہے مجھے کوئی راستہ مل جائے۔ میں نے ایک کمرے میں جھانکا جو مکمل طور پر خالی تھا۔ البتہ دوسرے کمرے میں مجھے ایک کام کی چیز نظر آ گئی۔ یہ منرل واٹر کی بوتل جو نصف پانی سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر سونگھا، پھر ذرا سا پانی زبان پر لے کر چکھا، مجھے لگا کہ پانی ٹھیک تھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ شاید یہ کسی نے پی کر یہاں رکھی تھی اور اٹھانا بھول گیا تھا۔ اصل میں یہ میرے لیے تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر چند گھونٹ پیے اور ڈھکن لگا کر بوتل ساتھ رکھ لی۔ ان چند گھونٹ سے میری پیاس بجھی نہیں تھی لیکن قابو میں آ گئی تھی۔

میرے پاس سیٹی تھی مگر اسے بجانے کا مطلب تھا کہ دوستوں کے ساتھ دشمن بھی ہوشیار ہو جاتے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ پہلے کون مجھ تک آتا۔ جب تک مجھے یقین نہ ہوتا کہ کرنل کے آدمی اندر آ چکے ہیں اور ان کی پوزیشن مستحکم ہے تب تک میں سیٹی بجانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں اپنے قید خانے میں آیا۔ پہلے میں نے کرنٹ آف کیا اور تار کھینچ کر نائیک کے منہ سے کھینچ لی۔ اس کے پاس سے جلنے جیسی بو آ رہی تھی۔ میں نے سانس روکتے ہوئے اس کی کلائی سے گھڑی اتار لی۔ اس پر کچھ خون لگا تھا جو اسی کے لباس سے رگڑ کر صاف کیا۔ گھڑی چل رہی تھی اور اس کے مطابق دو بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے گھڑی کلائی پر باندھ لی اور باہر آیا تھا کہ میرے کانوں نے فائرنگ کے پس منظر میں ایک آواز اور سنی۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ میرا دل دھڑکا میری پارٹی آ گئی تھی۔ وہ کنور پیلس کی مرکزی عمارت پر حملہ کرنے والے تھے اور میں یہاں قید تھا۔ اگرچہ ہیلی کاپٹر خاصی تاخیر سے آیا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق ہیلی کاپٹر حملے کے پندرہ سے بیس منٹ بعد آ جاتا لیکن بنیادی شرط حالات قابو میں ہونے کی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ حالات قابو پانے میں خاصی دیر لگی اور دوسرا مطلب تھا کہ حالات قابو میں آ چکے تھے تبھی ہیلی کاپٹر آیا تھا۔

میں داخلی حصے کی طرف آیا مگر یہاں آگ کی تپش بہت زیادہ تھی۔ اگر اس عمارت کی تعمیر میں لکڑی یا آگ پکڑنے والی چیزوں کا زیادہ استعمال ہوتا تو آگ یقیناً پوری عمارت تک پھیل چکی ہوتی۔ پھر بھی اگلے حصے میں لگی آگ کم ہونے کے باوجود اتنی شدید تھی کہ وہاں سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں مجھے انسانی گوشت کے جلنے کی تیز بو محسوس ہوئی۔ اس حصے میں کچھ افراد تھے جو حملے کا نشانہ بنے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ جیسے ہی رامن باہر نکلا تھا میزائل آ کر عمارت سے ٹکرایا تھا یقیناً اسے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تو وہ کہاں تھا؟ کیا وہ مارا گیا تھا لیکن بچ گیا تھا تو اسے یہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس صورت میں وہ کہاں گیا جب کہ یہاں سے نکلنے کی بہ ظاہر کوئی جگہ نہیں تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے غصے میں نائیک کو مار کر جلد بازی کا ثبوت دیا تھا۔ اس سے پہلے میں بہت کم جذباتی ہوا اور کسی کو یوں مار دیا مگر نائیک نے اپنی موت پر خود سائن کیے تھے۔ اس نے سادی کے بارے میں ناقابل برداشت بکواس کی تھی۔ مجھے اپنے اقدام پر کوئی افسوس نہیں تھا اگر وہ دس بار زندہ ہوتا تو میں اسے دس بار یونہی مارتا۔

میں دوبارہ راہداری کے سرے کی طرف آیا اور اس بار تقریباً چوکور خانے نما حصے کا جائزہ لیا۔ اس کی یہاں کوئی تک نہیں بن رہی تھی۔ اس میں نہ تو سامان رکھا تھا اور نہ ہی عمارت کا متناسب حصہ لگ رہا تھا۔ میں نے اب کے جھک کر فرش کا معائنہ کیا۔ یہاں بھی گرد آ گئی تھی اسے ہاتھ سے صاف کیا اور ٹارچ سے روشنی ڈال کر دیکھتا رہا مگر مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ فرش کے بعد میں نے سامنے والی دیوار کا معائنہ کیا مگر یہاں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مجھے ایک خیال آیا اور میں انویسٹی گیشن سیل میں آیا۔ یہاں آلات تشدد میں ایک ہتھوڑے نما آلہ بھی تھا جس سے شاید ہڈیاں توڑی جاتی ہوں گی۔ وہ لے کر میں راہداری میں آیا اور وہاں فرش اور دیواریں بجا کر دیکھنے لگا۔ جب میں نے سامنے والی دیوار بجائی تو مجھے ایسا لگا جیسے یہ اتنی موٹی نہ ہو جتنی کے دوسری دیواریں تھیں۔ یہ ذرا کھوکھلے پن کا تاثر دے رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ٹارچ کی روشنی میں اسے چیک کیا اور اس بار دیوار کی جڑوں کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ ان میں خلا تھا۔ یہ بہت باریک لائن تھی کیونکہ دیواریں اس طرح آپس میں نہیں جڑی تھیں جیسے عام طور سے دیواروں کا پلاسٹر جوڑ کر خلا بالکل ختم کر دیا جاتا ہے۔

یہاں دیوار میں چاروں طرف بہت باریک خلا تھا جو سیاہ لکیر کی صورت میں تھا۔ میں اب دیوار پر ہاتھ پھیر کر دیکھ رہا تھا۔ سامنے والی دیوار مکمل ہموار تھی۔ میں نے عجلت کے بجائے اسے بہت آرام سے چیک کیا تھا۔ اس میں شاید پندرہ بیس منٹ کا وقت لگا تھا مگر میں نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں شبہ ہوتا وہاں دبا کر دیکھتا تھا۔ پھر میں نے دائیں دیوار کو اسی طرح چیک کرنا شروع کیا۔ باہر سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں اب بہت کم رہ گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا بیشتر مزاحمت کرنے والے مارے گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب سیٹی کا استعمال کیا جا سکتا تھا اگر کرنل اور اس کے آدمی اندر آ گئے تھے تو وہ میری مدد کر سکتے تھے اور مجھے یہاں سے نکال سکتے تھے۔ پتا نہیں باہر کیا ہو رہا تھا؟ ہیلی کاپٹر کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنا کام کر کے واپس چلا گیا تھا۔

میں سیٹی سے کام لینے کا سوچ رہا تھا کہ میرا ہاتھ دیوار کے نچلے حصے میں کسی ابھری چیز سے ٹکرایا، میں نے روشنی ڈال کر دیکھا۔ یہ دیوار کا ہم رنگ ٹکڑا تھا اور اتنی مہارت سے رنگ کیا گیا تھا کہ دیکھنے میں مشکل سے ہی پتا چل رہا تھا۔ میں نے اسے دبایا تو یہ کسی بٹن کی طرح دبا اور چھوڑنے پر دوبارہ ابھر گیا۔ اس کا انداز ڈوئل بٹن جیسا تھا جو آن اور آف دونوں کا کام کرتا ہے۔ ایک بار دبانے پر کچھ نہیں ہوا تھا میں نے اسے دوبارہ دبایا۔ اس بار بھی کچھ نہیں ہوا۔ پھر میں نے اسے لگاتار دو بار دبایا۔ چند لمحے انتظار کیا اور اس بار بھی مایوسی ہوئی تھی۔ میں نے جھک کر اس کا معائنہ کیا۔ یہ دیوار کا کوئی خراب حصہ نہیں تھا یہ جس طرح دب رہا اور دوبارہ ابھر رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا اسے خاص طور سے بنایا گیا تھا۔ اگلی بار میں نے سیکنڈ کا حساب ذہن میں رکھتے ہوئے اسے وقفے وقفے سے تین بار دبایا اور اس بار مجھے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ سامنے والی دیوار ایک ہلکی سی سنسناتی آواز کے ساتھ پیچھے کی طرف اٹھنے لگی۔ اس کے نچلے حصے سے پہلے ہلکی سی روشنی اور پھر سیڑھیاں نمودار ہونے لگیں۔

یہ وہ خفیہ راستہ تھا جسے میں تقریباً آدھے گھنٹے سے تلاش کر رہا تھا۔ گھڑی کے مطابق رات کے تین بج رہے تھے۔ حملہ شروع ہوئے ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔ دیوار اٹھ کر اوپر ہو گئی تھی۔ میں نے رائفل سامنے کی اور دبے قدموں سر جھکا کر سیڑھیوں تک آیا۔ سیڑھیاں نیچے ایک سرنگ تک جا رہی تھیں۔ اس پتلی سی سرنگ کے دونوں طرف صرف دیوار تھی۔ اس سے آگے کیا تھا یہ جاننے کے لیے نیچے جانا ضروری تھا۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا اور نیچے اترنے لگا تھا کہ مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے اسی ابھار کو تین بار دبایا تو خفیہ راستہ بند ہونے لگا اور کچھ دیر بعد وہاں صرف دیوار تھی۔

میں عمارت کے باہر والے حصے میں ممکنہ حد تک واپس آیا۔ جہاں آگ کی تپش قابل برداشت تھی اور میں نے ایک گہری سانس لے کر منہ سے گیس ماسک اتار کر سیٹی منہ میں دبائی اور پوری قوت سے بجائی۔ اس مشکل سے دو انچ کی سیٹی سے ایسی سمع خراش اور چبھتی ہوئی آواز برآمد ہوئی کہ مجھے کانوں پر ہاتھ رکھنے پڑے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوا میں نے سیٹی بجائی اور پھر گیس ماسک منہ پر لے کر اپنی سانس بحال کی اور اسی طرح دو بار اور سیٹی بجائی۔ مجھے یقین تھا اگر کنور پیلس میں کرنل اور اس کے آدمی داخل ہو چکے تھے تو انہوں نے لازمی سیٹی کی آواز سن لی ہوگی۔

میں واپس آیا اور خفیہ راستہ کھولا پھر ہتھوڑی سیڑھیوں پر اس طرح رکھی کہ اگر خفیہ راستہ بند ہونے لگے تو یہ اسے مکمل طور پر بند نہ ہونے دے۔ میں دبے قدموں اتر کر نیچے آیا۔ سیڑھیوں کے آخر میں تقریباً سات فٹ اونچی چھت پر ایک چھوٹا سرخ روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ سرنگ اور

راستہ باقاعدہ کنکریٹ سے تیار کیا گیا تھا۔ نیچے آتے ہی مجھے کوئی دس گز کے بعد سرنگ دائیں بائیں مڑتی دکھائی دی۔ میں نے دیواروں اور چھت کا بہ غور جائزہ لیا اور مجھے کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی جسے کیمرا قرار دیا جا سکتا۔ میں آگے بڑھا تھا کہ عقب سے ہلکی سی ویسی ہی سنسناتی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا رستہ بند ہو رہا تھا۔ دیوار شاید ہائیڈرولک سسٹم سے کھلتی اور بند ہوتی تھی۔ تقریباً چھ بائی ڈھائی فٹ کی اور چھ انچ موٹی اس دیوار کا وزن ایک ٹن تو ہوگا اور اسے صرف ہائیڈرولک سے ہی کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ وہ ہتھوڑی تک پہنچی اور پھر پھنس کر رک گئی۔ ایک دو لمحے کو زور لگایا تو ہتھوڑی بالکل فکس ہوگئی اور اب راستہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ میں مطمئن ہوگیا۔ اب کرنل یا اس کے آدمی عمارت میں آتے تو وہ اس خفیہ راستے کو دیکھ لیتے۔ اگر وہ بلاک ہوگیا تھا تب بھی اسے کھولنا کوئی مشکل نہیں تھا ایک چھوٹا ٹائم بم اسے اڑا دیتا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میں نے فتح خان سے یہ بم نہیں لیے تھے کیونکہ میں ان کا ماہر نہیں تھا۔ مگر میرے پاس ہینڈ گرنیڈ تھا اور میں اس سے یہی کام لے سکتا تھا۔

میں سرنگ کے موڑ تک آیا۔ خود جھانک کر دیکھنے کے بجائے میں نے گھڑی اتار کر اس کا ڈائل کنارے سے نکالا اور دائیں طرف دیکھا۔ مجھے یہاں بھی ویسی ہی ایک لمبی سرنگ دکھائی دی جو آگے جا کر مڑ رہی تھی۔ بائیں طرف سرنگ پھر دو حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کنور پیلس کی مختلف عمارتوں کو ملانے والی خفیہ سرنگوں میں ہوں۔ راج کنور یا منشی دل جی نے ان سرنگوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ راج کنور نے شاید اس لیے نہیں بتایا کہ میں نے اس سے ان سرنگوں کے بارے میں پوچھا نہیں تھا ورنہ وہ دوا کے زیر اثر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ البتہ منشی دل جی نے سرنگوں کے بارے میں نہ بتا کر صریحاً بددیانتی کا ثبوت دیا تھا۔ ورنہ ان سرنگوں سے ہمیں حملے میں بہت مدد مل سکتی تھی۔ اگر ہم کسی طرح ان تک رسائی حاصل کر لیتے تو دوسری عمارتوں تک محفوظ طریقے سے پہنچا جا سکتا تھا۔

منشی دل جی نے آخر ان سرنگوں کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا؟ اس سے اس کا کیا مفاد وابستہ تھا؟ میں سوچ رہا تھا۔ اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں آگے جاؤں اور جاؤں تو کس طرف جاؤں؟ یہ فیصلہ کرنے میں چند سیکنڈ لگے کہ مجھے سرنگ میں ہی آگے جانا تھا مگر کس طرف جانا تھا یہ سوچنے میں کچھ وقت لگا۔ میں نے قید خانے کا نقشہ ذہن میں تازہ کیا۔ یہ کنور پیلس کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بائیں طرف واقع تھا۔ کنوروں کی رہائشی عمارت احاطے کے آخری حصے میں اور کسی قدر دائیں طرف تھی۔ گویا مجھے سرنگ میں دائیں طرف جانا تھا۔ ڈیجیٹل میپ نہ ہونے سے میری بچت بھی ہوئی تھی اور رامن کو شک نہیں ہوا تھا لیکن اس کے نہ ہونے سے مجھے اب دشواری ہو رہی تھی ورنہ اس کی مدد سے میں بہت آسانی سے مرکزی عمارت تک پہنچ سکتا تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے میں نے رائفل کا رخ سامنے کی طرف رکھا اور میری انگلی ٹریگر پر تیار تھی۔ میں بالکل تیار تھا کہ کسی فرد سے سامنا ہوتے ہی اسے شوٹ کر دوں اگر وہ مسلح ہو تو... دوسری صورت میں، میں اسے ہینڈز اپ کرکے اس سے معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ سرنگ آگے مڑ رہی تھی۔ میں تقریباً تیس گز آگے آیا تھا۔ اس پوری سرنگ میں ہر دس گز کے بعد اسی طرح کے سرخ روشنی والے بلب لگے ہوئے تھے اور ان کی روشنی اگرچہ بہت تیز نہیں تھی لیکن وہ سرنگ کو یکساں طور پر روشن کر رہی تھی۔ میں نے مڑنے سے پہلے پھر گھڑی کے شیشے کی مدد لی اور دوسری طرف دیکھا۔ یہاں سرنگ سیدھی چل رہی تھی۔ لیکن جب میں اس سرنگ میں داخل ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ بالکل سیدھی بھی نہیں تھی اس میں دائیں بائیں راستے نکل رہے تھے۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ سرنگ مرکزی عمارت کی طرف ہی بڑھ رہی تھی۔ میں بائیں طرف نکلنے والی سرنگ تک آیا۔ اس میں جھانک کر دیکھا یہ خالی تھی اور آگے جا کر گھوم رہی تھی۔

اسے چھوڑ کر میں آگے آیا اور دائیں طرف نکلنے والی سرنگ میں جھانکا تو کوئی دس گز بعد سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں تک آیا۔ یہاں ویسا ہی خفیہ دروازہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں پیلس کی کسی وسطی عمارت کے نیچے تھا۔ مجھے مرکزی عمارت تک جانا تھا اس لیے میں اس حصے کو نظر انداز کرکے آگے جانے والا تھا کہ وہی سنسناتی آواز آئی اور دیوار اٹھنے لگی تھی۔ میں پلٹ کر واپس بھاگا اور سرنگ میں آکر پوزیشن لے لی۔ دیوار اوپر اٹھتے ہی کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ ہیجانی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”حملہ کرنے والے بہت لوگ ہیں' ہمارے اکثر گارڈز مارے جا چکے ہیں۔ اس جگہ سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ہے۔ ہمیں فوراً نکلنا ہوگا ورنہ یہی جگہ شمشان گھاٹ بن جائے گی۔“

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے رامن کی دہاڑنے کی آواز سنی۔ ”راستہ کس نے کھولا ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ میری توقع کے عین مطابق رامن زندہ تھا اور وہ یقیناً اسی خفیہ راستے سے نکل گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہیجانی لہجے میں بولنے والا اب منمنا رہا تھا۔ ”وہ اندر آنے والے ہیں....“

”کہاں سے۔“ رامن بولا۔ ”جب ہم باہر نہیں جا سکتے تو وہ اندر کیسے آئیں گے۔ تم نے دوسرے لوگوں کے سامنے بلا اجازت دروازہ کھولا ہے۔“ کہتے ہوئے رامن کا لہجہ خوفناک ہوگیا تھا۔

”باس مجھے معاف کردو۔“ دوسرا شخص چلایا مگر فائر کی آواز میں اس کی آواز دب گئی۔

”راستہ بند کر دو۔“ رامن نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب کسی نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو وہ بھی کتے کی موت مرے گا۔“

سنسنانے کی آواز آئی اور دیوار واپس اپنی جگہ فکس ہو گئی۔ میرے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ورنہ میں آنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس واقعے سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے اوپر کی صورت حال کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا۔ میزائل چلانے والوں نے اپنا کام کر لیا تھا اور انہوں نے اس عمارت کے داخلی راستے کو بھی اڑا دیا تھا۔ کرنل کے آدمی اندر داخل ہوگئے تھے اور انہوں نے کنور پیلس میں مضبوط پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ بیشتر گارڈز مارے گئے تھے اور بچنے والے یقیناً مقابلے کے قابل نہیں رہے تھے۔ لیکن مرکزی عمارت میں کیا ہو رہا تھا اس کا کچھ ذکر نہیں تھا۔ شاید رامن خود بھی بے خبر تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جب آمد و رفت کے لیے یہ خفیہ سرنگ موجود تھی تو وہ لوگ عمارتوں میں کیوں محصور تھے۔ یقیناً یہ سرنگ کہیں اور باہر بھی نکلتی ہوگی؟ میں سوچتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں جلد از جلد مرکزی عمارت تک پہنچنا چاہتا تھا۔

زیر زمین ان سرنگوں کا نظام بہت وسیع اور طویل تھا اور اس کی تعمیر میں یقیناً بہت وقت اور بہت بڑی رقم لگی ہو گی۔ لیکن اصل اہمیت اس کی رازداری کی تھی۔ اسے بناتے ہوئے یقیناً پوری رازداری سے کام لیا ہوگا اور صرف مخصوص اشخاص ہی اس کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ لیکن اگر یہ سرنگیں ہنگامی حالات کے لیے بنائی گئی تھیں تو اس وقت ان کا استعمال کیوں نہیں کیا جا رہا تھا؟ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ اپنے اندازے کے مطابق میں تقریباً نصف کلومیٹر آگے نکل آیا تھا۔ سرنگ کئی بار گھومی لیکن مجموعی طور پر اس کا رخ کنور پیلس کی مرکزی عمارت کی طرف ہی تھا۔ اس سفر کے دوران میں پوری طرح چوکنا رہا تھا کیونکہ اس بند سرنگ میں کسی وقت بھی دشمن کا سامنا ہو سکتا تھا اور یہاں بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی جو وار میں پہل کرتا وہی کامیاب رہتا۔

اس لیے جیسے ہی ایک راستے سے دو مسلح افراد برآمد ہوئے میرا چوکنا ہونا کام آیا۔ وہ مسلح تھے اور پیلس کے گارڈز کی وردیوں میں تھے۔ انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا کہ میں نے رائفل کو ہلکی سی جنبش کے ساتھ برسٹ مارا۔ میں نے جان کر ان کے جسم کے نچلے حصوں کا نشانہ لیا تھا۔ مگر ان میں سے ایک کی قضا آئی تھی اس نے نیچے گر کر بچنے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں گولیاں اس کے سینے اور گردن کے پار ہوگئیں۔ دوسرے کا ایک پاؤں نشانہ بنا تھا۔ وہ چیخ کر گرا تھا مگر اس کی چیخ محدود جگہ فائرنگ کے بے پناہ شور میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں رائفل تانے تیز قدموں سے ان کی طرف بڑھا۔ پہلا والا دم توڑ رہا تھا لیکن دوسرا والا اپنی رائفل اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پستول نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ پر گولی ماری۔ اس نے کراہ کر رائفل چھوڑی اور اپنا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے لات مار کر اس کی رائفل دور پھینک دی اور رائفل اس کے سر سے لگاتے ہوئے کہا۔

”اب حرکت مت کرنا۔“

وہ خوف سے ساکت ہوگیا۔ ”کون ہو تم، اوپر والوں کے ساتھی ہو؟“

”ہاں، تم کہاں سے نیچے آئے ہو؟“

وہ صاف اردو بول رہا تھا اور شکل صورت سے بھی شمالی انڈیا کا رہنے والا لگ رہا تھا۔ اس نے ہلنے کی کوشش کی تو میں نے رائفل اس کے سر سے لگائی تو وہ پھر ساکت ہوگیا تھا۔

”مین پیلس سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہمیں نیچے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

”کس نے حکم دیا ہے؟“

”بڑے کنور نے۔“ اس نے جواب دیا۔

میرے اندر خدشات سرسرانے لگے تھے۔ ”بڑا کنور کہاں ہے؟“

”ابھی اوپر ہے لیکن جلد وہ نیچے آئے گا۔“

’’اس کے ساتھ اور کون ہے؟‘‘

’’اس کی بہن اور اس کے خاص محافظ۔‘‘ آدمی نے جواب دیا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے مکمل تعاون کر رہا تھا۔ ’’کچھ اوپر اترنے والوں کو روک رہے ہیں اور کچھ بڑے کنور کے ساتھ ہیں۔‘‘

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جیتو اور اس کے ساتھی استقامت سے نیچے آنے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کے دباؤ کی وجہ سے بڑا کنور نیچے آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے اور پیلس والے ڈیڑھ گھنٹے سے مزاحمت کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے ہمارا پلان تاخیر کا شکار تھا اور اگر ہم ہیلی کاپٹر فضا میں رکھتے تو اب وہ ایندھن کی کمی کی وجہ سے واپس جا چکا ہوتا اور ہماری واپسی کا سفر کٹھائی میں پڑ جاتا۔ میں نے پوچھا۔ ’’وہ نیچے کہاں آئیں گے؟‘‘

’’یہاں ایک سیف ہاؤس ہے۔‘‘ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ’’لیکن اس میں صرف مخصوص لوگ ہی جا سکتے ہیں۔ ہم اس میں نہیں جا سکتے۔‘‘

میرے اندر پھر گھنٹی بجنے لگی۔ بڑا کنور سادی کو لے کر کسی سیف ہاؤس میں جانے کی تیاری کر رہا تھا اور وہ ایک بار اس میں داخل ہو جاتا تو پھر اسے وہاں سے نکالنا شاید ممکن نہ ہوتا۔ ’’یہ سیف ہاؤس کہاں ہے؟‘‘

’’مین پیلس کے عین نیچے، یہی سرنگ اس طرف جاتی ہے۔‘‘

’’آگے اور مسلح افراد ہیں؟‘‘

اس نے سر ہلایا۔ ’’لازمی ہوں گے۔‘‘

’’تمہارا شکریہ۔‘‘ میں نے کہا اور اس کے سر پر رائفل کا دستہ مارا۔ اگرچہ یہ دھات کا نہیں تھا مگر مضبوطی اور سختی میں دھات سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک ہی ضرب میں بے ہوش ہو گیا۔ یہ بات یقینی تھی کہ سرنگ میں فائرنگ کا شور ہر جگہ پہنچا ہوگا۔ مگر فوری طور پر یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ فائرنگ کہاں ہوئی ہے اور مجھے ملنے والی اس مہلت سے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ اب سرنگ سیدھی تھی۔ مگر یہ ایک جگہ پہنچ کر اچانک ہی ڈھلان کی صورت میں نیچے گئی تھی۔ تیزی کی وجہ سے میں رکتے رکتے ہی پھسل کر آگے چلا گیا تھا۔ یہاں سرنگ کا اختتام ایک کسی قدر بڑے اور گول ساخت والے کمرے میں ہو رہا تھا اور اس سے ایک طرف ویسی ہی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں جیسی کہ میں ہر جگہ دیکھتا آیا تھا۔ میں یقیناً مین پیلس کے نیچے پہنچ گیا تھا کیونکہ یہاں سے آگے کوئی سرنگ نہیں جا رہی تھی۔ البتہ ایک طرف بڑا سا فولادی دروازہ لگا ہوا تھا اور اس کی ساخت سیف روم کے دروازے جیسی تھی۔ کیا یہی سیف ہاؤس تھا۔ میں نے پاس جا کر اس کا جائزہ لیا۔ اس پر کہیں کوئی نمبر یا چابی سے کھلنے والا تالا نہیں تھا حتیٰ کہ اس پر کوئی گھمانے یا پکڑنے والا ہینڈل بھی نہیں تھا۔ یہ بے داغ چاندی سے چمکتے رنگ کا سپاٹ دروازہ تھا جس نے تقریباً اس پوری دیوار کو گھیر لیا تھا۔ تقریباً آٹھ فٹ قطر کے اس دھاتی دروازے کی موٹائی نامعلوم تھی کیونکہ وہ دیوار میں فکس تھا۔ لیکن اگر یہ سیف ہاؤس کا دروازہ تھا تو اسے کسی بڑے بنک کے اسٹرانگ روم کے دروازے جتنا موٹا اور مضبوط ہونا چاہیے تھا۔

سیڑھیوں کے اوپر والا دروازہ بند تھا۔ میں دبے قدموں اوپر آیا اور اندر سے اس کا جائزہ لیا کہ یہ کہاں سے کھل سکتا تھا؟ مگر اندر بھی اس کے کھولنے کا میکنزم خفیہ ہی تھا اور اسے تلاش کرنا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا میرے پاس اتنا وقت ہے۔ اگر میرے ساتھی چھت تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے تو جلد وہ نیچے کا رخ کرتے اور بڑا کنور ان سے بچنے کے لیے سادی سمیت سیف ہاؤس میں جانے کے لیے نیچے آتا۔ یعنی یہ راستہ کسی وقت بھی کھل سکتا تھا۔ میں نے سوچا اور ٹرائی کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ دروازہ بہت تیزی سے نہیں کھلتا تھا اگر یہ اچانک بھی کھلنے لگتا تو مجھے اتنی مہلت ضرور ملتی کہ میں نیچے پہنچ کر مورچہ سنبھال لیتا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ ہاتھ پھیر کر وہ مخصوص ابھار تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جسے دبانے سے یہ دروازہ کھلتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں بھی دیوار کی جڑ کے پاس ہوگا مگر دونوں طرف دیواروں پر نیچے بٹن نہیں ملا۔

پھر میں نے درمیان اور اوپر کی دیوار پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد میں نے ہار مان لی۔ شاید اس دروازے کا بٹن کہیں اور تھا۔ یعنی پیچھے سرنگ میں کہیں اور تھا اور ظاہر ہے اتنی وسیع جگہ پر میں تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ میں مایوس ہو کر نیچے اتر آیا۔ زیادہ دیر سیڑھیوں پر رہنے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی عقب سے آتا تو مجھے پتا نہیں چلتا اور وہ آرام سے مجھے ہینڈز اپ کرا لیتا یا شوٹ کر دیتا۔ اب مجھے دو طرف کی نگرانی کرنی تھی۔ سادی کے بارے میں جان لینے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ میں یہاں سے ہٹتا۔ میں ساری عمر بھی اس جگہ اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا جلد یا بدیر بڑا کنور اسے لے کر یہاں کا رخ کرے گا اور میں اسے قابو کر کے سادی کو لے کر نکل سکوں گا یا کم سے کم اس کی کوشش کر سکوں گا۔ کیونکہ اس آدمی نے بتایا تھا کہ بڑے کنور کے ساتھ اس کے خاص محافظ بھی ہوں گے۔ ظاہر ہے وہ مجھے اتنی آسانی سے کامیاب ہونے نہیں دیں گے۔

مجھے خیال آیا کہ میں واپس جا کر کسی عمارت سے باہر نکلوں اور کرنل کے آدمیوں کو اس راستے سے اندر لے آؤں۔ ہم زیادہ ہوں گے تو آسانی سے بڑے کنور کے آدمیوں پر قابو پا لیں گے۔ مگر مجھے اس خوف نے باز رکھا کہ کہیں میں جاؤں اور اس دوران میں بڑا کنور سادی کو لے کر اس سیف ہاؤس میں چلا جائے۔ سیف ہاؤس اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا اسے کسی نہ کسی طرح کھولا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ اس سیف ہاؤس سے کوئی راستہ کنور پیلس سے باہر جاتا ہو اور بڑا کنور سادی کو لے کر اس راستے سے فرار ہو جائے۔ سیف ہاؤس کا دروازہ کھولنے میں کچھ وقت تو لگتا۔ میں قید خانے والی عمارت کا خفیہ دروازہ کھلا چھوڑ کر آیا تھا پھر میں نے سیٹی بجا کر کرنل کے آدمیوں کو خبردار کیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اگر وہ اندر آ چکے تھے اور پوری طرح صورت حال پر قابو پا چکے تھے تو انہیں اب تک یہاں آ جانا چاہیے تھا۔

میرے اندر رہ رہ کر یہ خدشہ سر ابھار رہا تھا کہ باہر کرنل حالات پر پوری طرح قابو نہیں پا سکا تھا اور اس کے آدمی بھی مارے گئے تھے۔ اندر گارڈز تعداد میں کہیں زیادہ تھے۔ وہ تعداد میں حملہ آوروں سے کم سے کم پانچ گنا زیادہ تھے۔ اگر ان کی خاصی تعداد ابتدائی حملے کا شکار ہوئی تھی تب بھی بہت بڑی تعداد مدافعت کے لیے باقی رہی ہوگی۔ فرض کر لیا جائے کہ کرنل کے آدمیوں کا جانی نقصان درجن سے اوپر جاتا ہے تو اس صورت میں افرادی قوت کی کمی اسے دفاعی پوزیشن میں لے آئے گی۔ اس صورت میں سادی کو بذریعہ ہیلی کاپٹر یہاں سے نکالنے کا کام خطرے میں پڑ جاتا۔ کنور پیلس کے گارڈز کے پاس ایسے ہتھیاروں کی موجودگی عین ممکن تھی جس سے ہیلی کاپٹر گرایا جا سکے یا اسے نقصان پہنچا کر پرواز سے روکا جا سکے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اس خدشے میں اضافہ ہو رہا تھا۔

کرنل اور میں نے اپنے طور پر بہت اچھا اور ہر پہلو کا جائزہ لے کر حملے کا پلان بنایا تھا مگر کوئی بھی پلان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے اور تب ہی اس کی خوبیاں اور خامیاں سامنے آتی ہیں۔ ممکن ہے ہم نے کنور پیلس کے حفاظتی انتظامات کا اتنا اچھا اندازہ نہ لگایا ہو جتنا اچھا لگانا چاہیے تھا اور کنور پیلس کے گارڈز ہمارے اندازے سے بڑھ کر مسلح اور چوکس ہوں۔ انہوں نے حالات کو مکمل طور پر اپنے قابو سے نکلنے نہ دیا ہو۔ وہ گیس اور دھوئیں سے نمٹنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔ آج کل سیکیورٹی کے معمولی ماہرین بھی جانتے ہیں کہ کسی محفوظ جگہ کن طریقوں سے حملہ کیا جا سکتا ہے اور ان سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے۔ دور مار ہتھیاروں کو شیلٹر اور بلٹ پروف کی مدد سے بیکار کیا جا سکتا ہے۔ گیس اور دھوئیں سے ماسک کی مدد سے بچا جا سکتا ہے۔ نائٹ ویژن سے اندھیرے میں بھی آنے والے دشمن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے لیے پہلے سے بوبی ٹریپ تیار کیے جا سکتے ہیں۔ جیسے ڈیوڈ شا نے کیے تھے اس نے اسنائپر گن لگائی تھی۔ ایسا ہی کوئی حربہ کنور پیلس میں بھی ہو سکتا تھا جو کرنل اور اس کے آدمیوں کے لیے حیران کن ہو۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے اضطراب میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ کیا اوپر پیلس کے گارڈز نے صورت حال پر قابو پا لیا تھا جس کی وجہ سے اب بڑے کنور کو سیف ہاؤس میں جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ اوپر جا کر بٹن تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس بار بھی ناکام رہا۔ میں لامحدود وقت کے لیے یہاں نہیں رہ سکتا تھا مجھے کچھ اور کرنا تھا۔ اگر میں یہاں سے اوپر نہیں جا سکتا تھا تو مجھے دوسرے طریقے سے اوپر جانا تھا۔ ایک چیز اور قابل غور تھی کہ میں نے یہاں فائرنگ کی لیکن اب تک کسی طرف سے ردعمل سامنے نہیں آیا تھا کیا یہاں صرف یہی دو افراد نیچے تھے۔ انہیں بھی بڑے کنور نے بھیجا تھا۔ یہ سرنگیں بنائی ہی خاص حالات کے لیے گئی تھیں اور آج سے زیادہ خاص حالات اور کیا ہو سکتے تھے مگر انہیں استعمال نہیں کیا جا رہا تھا۔ اس کے بجائے رامن نے اپنے ایک آدمی کو شوٹ کر دیا کہ اس نے خفیہ سرنگ کا راستہ کیوں کھولا تھا۔ گویا کسی کو بھی نیچے آنے کی اجازت نہیں تھی اور شاید کسی بھی عمارت میں موجود فرد کو نیچے آنے کی اجازت نہیں تھی۔

یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں نشان دہی کر رہی تھیں کہ سب ہمارے پلان کے مطابق نہیں ہو رہا ہے اس میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی یا کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی تھی۔ میرا ذہن رہ رہ کر منشی دل جی کی طرف جا رہا تھا۔ ڈیوڈ شا نے اس پر اعتماد

کرلیا کیونکہ وہ اس سے ناواقف تھا دوسرے اس پر اعتماد کرنے سے ڈیوڈ شا کو کوئی بڑا نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن میرے لیے یہ بہت ہی اہم مرحلہ تھا۔ ڈیوڈ شا ناکامی پر مجھ سے معذرت کر لیتا اور مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے کوئی نیا طریقہ اختیار کرتا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی مرشد کا کارڈ تھا۔ مگر میں ناکامی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پونے چار بجے میں نے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں واپس آیا اور اس جگہ پہنچا جہاں دونوں گارڈز پڑے تھے۔ جسے بے ہوش کیا تھا وہ بھی ساکت پڑا تھا۔ میں ان کے خون سے بچتا ہوا آگے آیا۔ میں ذہن میں کنور پیلس کا نقشہ تازہ کر رہا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ذرا آگے جو سرنگیں دائیں بائیں نکل رہی تھیں وہ کن عمارتوں میں جا رہی تھیں۔ رامن جس عمارت میں تھا اس میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بالآخر میں نے قید خانے والی عمارت میں جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ مسئلہ پھر وہی ہوتا کہ میں اندر سے راستہ کیسے کھولتا۔ اگر میں گرنیڈ سے راستہ بناتا تو اندر موجود لوگ ہوشیار ہو جاتے۔ قید خانے والے دروازے کو نہ کھلنے کی صورت میں گرنیڈ سے بھی اڑایا جا سکتا تھا۔ میں سرنگ کے اس حصے تک آیا اور سیڑھیوں کے پاس آکر رکا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہتھوڑی غائب تھی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ کوئی یہاں آیا تھا اور اسی نے ہتھوڑی ہٹا کر راستہ کھولا تھا۔ میں دبے قدموں اوپر آیا۔ وہاں سناٹا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جو بھی تھا یا تھے وہ خاموش تھے۔ میں نے کنارے سے راہداری میں جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھا اور فوراً ہی مجھے انٹروگیشن روم میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ رامن تھا اور جھک کر نائیک کا معائنہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ زیر لب گالیاں دے رہا تھا۔ مگر اس کا ہدف غیر واضح تھا۔ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کیا اور اس کا بولٹ چڑھایا تو اس کی آواز پر وہ ساکت ہو گیا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"شہباز....."

"دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لو اگر نائیک کے پاس نہیں جانا چاہتے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس نے بلا چون و چرا تعمیل کی۔ وہ عقل مند آدمی تھا سمجھ گیا کہ اس وقت وہ بے بس ہے۔ میں اندر آیا۔ یہاں کا بلب اب بھی ٹمٹما رہا تھا۔

"تم نے نائیک کو مار دیا؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہاں، یہ اسی انجام کا مستحق تھا اور اب تم خاموشی سے نل بیٹھ جاؤ۔"

اس بار بھی اس نے تعمیل کی۔ میں نے رائفل شانے سے لٹکا کر پستول نکال کر اس کے سر سے لگایا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس ایک پستول تھا میں نے اسے نکال کر جیکٹ میں رکھ لیا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس سے بیلٹ کے نیام میں لگا ہوا رامپوری خنجر برآمد ہوا تھا۔ میں نے اسے پتلون میں موجود خنجر کی جگہ اڑس لیا۔ پھر میں پیچھے ہٹا۔ "رامن تم جانتے ہو میں نے تمہیں دیکھتے ہی شوٹ کیوں نہیں کیا؟"

"ہاں تم مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتے ہو گے۔"

"تم عقل مند ہو۔" میں نے کہا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں باہر کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ کچھ لوگ اندر گھس آئے ہیں اور ہمارے گارڈز ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ کیا وہ تمہارے آدمی ہیں؟"

"سوال مجھے کرنے ہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں صرف جواب دینے ہیں۔ اس وقت کیا پوزیشن ہے؟"

"ہمارے گارڈز نے کچھ جگہوں پر مورچے بنائے ہیں اور وہ مقابلہ کر رہے ہیں۔"

"مرکزی پیلس کی کیا صورت حال ہے؟"

"اس پر ہیلی کاپٹر سے کچھ لوگ اترے ہیں لیکن وہ دوسری منزل تک ہیں ان کو نیچے آنے سے روکا ہوا ہے۔"

رامن روانی سے اور بغیر اٹکے جواب دے رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ سچ بول رہا تھا ویسے بھی میرا اندازہ یہی تھا۔ اس نے تصدیق کی تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ "رامن یہ تو سامنے کی کنڈیشن ہے میری چھٹی حس کہہ رہی ہے اس کے پس پردہ بھی یہاں کچھ چل رہا ہے اور تم اس میں شامل ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے..... میں بھی تمہاری طرح محصور ہوں۔"

"یہاں عمارتوں میں گارڈز موجود ہیں۔ حملہ آوروں کے خلاف انہیں کیوں استعمال نہیں کیا گیا ہے جب کہ یہ تمہاری ذمے داری بنتی ہے۔"

"تمام عمارتوں کے داخلی راستے میزائلوں سے تباہ کر دیے گئے ہیں جیسے اس عمارت کے ہیں اس وقت باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"جھوٹ مت بولو..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر عمارت کا ایک ہی راستہ ہو..... پھر یہ سرنگیں کہیں نہ کہیں باہر نکلتی ہوں گی۔ ان کو کیوں استعمال نہیں کیا گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔" اس نے بے نیازی دکھانے کی کوشش کی لیکن اس کے لہجے میں تشویش مجھ سے چھپی نہیں رہی تھی۔

"اگر میں نے تمہارے پیروں میں سوراخ کیے تو تم بہت اچھی طرح جان جاؤ گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یہاں اتنے بڑے ہنگامے ہو رہے ہیں اور تم نے ہنگامی حالات کے لیے بنائی جانے والی سرنگ بالکل استعمال نہیں کی ہے۔"

"بڑے کنور کے حکم سے۔"

"تمہیں بڑے کنور کا اتنا خیال ہے اور تم نے اسے ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ میں تمہارے قبضے میں آ گیا ہوں۔"

"وہ الگ بات ہے، میں اپنے طور پر تم سے تفتیش کرنا چاہتا تھا، اس کے بعد تمہیں بڑے کنور کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔" اس نے چالاکی سے کہا۔

"یہاں سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ ہونا چاہیے۔"

"راستہ ہے لیکن ہمیں باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"راستہ کہاں ہے؟"

"اوپر ایک باغ میں نکلتا ہے لیکن وہاں اس وقت کوئی نہیں جا سکتا، وہاں پیلس کے خاص گارڈز موجود ہیں جو براہ راست بڑے کنور سے حکم لیتے ہیں وہ میرے انڈر نہیں ہیں۔"

"رامن تم پھر کچھ چھپا رہے ہو۔" میں نے پستول اس کے سر کی طرف سیدھا کیا۔ "افسوس کہ تم نے اپنی جان کی درست قیمت ادا نہیں کی۔"

"تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے کہا اور ٹریگر دبانا چاہا تھا کہ دروازے پر ایک مسلح شخص نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے ایک طرف چھلانگ لگائی اور اس کا چلایا ہوا برسٹ اس جگہ سے گزرا جہاں ایک لمحے پہلے میں تھا۔ میں پہلو کے بل ملبے پر گرا۔ یہاں پاس ہی کمرے کا فولادی گیٹ اس طرح پڑا تھا کہ اس کا ایک پہلو اٹھا ہونے کی وجہ سے ذرا آڑ بن گئی تھی اور میں بروقت اس آڑ میں سرکا۔ دوسرا برسٹ دروازے پر لگا اور میں نے آڑ سے ہاتھ نکال کر دروازے کی طرف فائرز کیے۔ مسلح شخص جھٹکے سے پیچھے گیا۔ پتا نہیں اسے گولی لگی تھی۔ جب تک میں رائفل شانے سے اتار کر کھڑا ہوتا۔ رامن غائب ہو گیا تھا۔ وہ مکار آدمی اس ذرا سے موقع سے فائدہ اٹھا کر نکل گیا تھا بس ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو میں اس کے شیطانی دماغ میں گولی اتار چکا ہوتا۔ مگر اس کی موت نہیں آئی تھی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک لمحے کو جھانک کر دیکھا اور سر اندر کر لیا۔ راہداری خالی تھی۔ پھر خفیہ دروازہ بند ہونے کی سنسناہٹ سنائی دی۔ لیکن میں نے اندھا دھند باہر آنے سے گریز کیا۔ اس کے بجائے میں نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔

"رامن میں تین تک گنوں گا اور گرنیڈ پھینک دوں گا۔ ایک..... دو..... تین....." تین کہتے ہی میں نے گرنیڈ کے بجائے کنکریٹ کا ایک ٹکڑا اس طرف اچھالا اور کسی نے گھٹی گھٹی سی آواز نکالی۔ میں بال بال بچا تھا۔ رامن اور اس کا ساتھی گھات لگائے بیٹھے تھے اور اگر میں اندھا دھند راہداری میں آتا تو مارا جاتا۔ اس بار میں نے بغیر کسی وارننگ کے گیس گرنیڈ اس طرف اچھال دیا۔ بند جگہ ہونے کی وجہ سے گیس تیزی سے پھیلی تھی۔ کسی کے کھانسنے کی آواز آئی اور میں دبے قدموں آگے بڑھا۔ وہی آدمی چلایا۔

"دروازہ کھولو۔"

ایسا لگ رہا تھا کہ رامن اسے چھوڑ کر نیچے اتر گیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو مسلح آدمی زمین پر پڑا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ گیس نے اس کا دم گھونٹ دیا تھا۔ میں گیس ماسک کی وجہ سے محفوظ تھا۔ میں نے تیزی سے خفیہ دروازہ کھولنے والا بٹن تین بار دبایا مگر دروازہ نہیں کھلا۔ میں نے دو تین بار بٹن دبایا مگر اس بار دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا رامن نے اندر سے کوئی کل چھیڑی تھی اور اس سے دروازہ اب باہر سے نہیں کھل سکتا تھا۔ میں زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکتا تھا ورنہ گیس کی زیادتی سے ماسک کا فلٹر ناکارہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں واپس آیا اور عمارت کے سامنے والے حصے کا جائزہ لیا۔ آگ بجھ گئی تھی مگر وہاں زمین اور گرا ہوا ملبا دہک رہا تھا اس پر سے ہو کر گزرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے سامنے والے کمروں کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے کی دیواریں مکمل طور پر گرنے سے راستہ بن گیا تھا مگر اس کا دروازہ ٹیڑھا ہو کر پھنس گیا تھا اسے کھولے بغیر باہر جانا ممکن

نہیں تھا۔ میں نے ایک گرنیڈ نکالا اور اس کی چابی نکال کر اسے دروازے کے نچلے حصے میں پھنسایا اور تیزی سے انٹروگیشن روم میں آیا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ چند سیکنڈ بعد دھماکا ہوا اور میں نے جھانک کر دیکھا۔ گرد و غبار میں اڑا ہوا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں کمرے کے ملبے سے گزر کر باہر آیا۔ شکر ہے یہاں آگ نہیں لگی تھی ورنہ اس ملبے سے گزرنا بھی ممکن نہ ہوتا۔ میں براہ راست باہر نہیں آیا تھا کیونکہ وہاں کوئی نہیں تھا مگر پیلس میں کہیں مقابلہ جاری تھا اور رہ رہ کر فائرنگ ہو رہی تھی۔ ان سے زیادہ خطرہ ان اسنائپرز سے تھا جو پیلس کے باہر موجود تھے۔ وہ مجھے اکیلا دیکھ کر پیلس کا آدمی سمجھ کر شوٹ کر سکتے تھے۔ اگرچہ میری جیکٹ کے اوپر ہیٹ سنکر لگے تھے جو جسمانی حرارت منتشر کر کے انفراریڈ دوربین سے نظر آتے۔ مگر یہاں جا بہ جا دھواں پھیلا ہوا تھا اور آگ لگی ہوئی تھی اس سے نشانچی دھوکا کھا سکتے تھے۔ جہاں تک عمارتیں نظر آ رہی تھی سب حملے کا نشانہ بنی تھیں۔ جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور یہ سب کی سب پیلس گارڈز کی تھیں۔ میں نے نائٹ ویژن آنکھوں پر پہن لی اس سے منظر زیادہ واضح نظر آنے لگا۔ مگر مجھے نہ تو کرنل کے کسی آدمی کی لاش دکھائی دی تھی اور نہ ہی وہ دو بکتر بند گاڑیاں کہیں نظر آ رہی تھیں جنہیں حملے کے بعد اندر آنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ان میں سے کوئی نظر آیا تو سیٹی سے خبردار کروں گا۔

میں نے ان تین جگہوں کو ذہن میں رکھا جہاں کرنل کے اسنائپرز تھے اور پھر اس کے لحاظ سے حرکت کرنے لگا۔ میں ایک مختلف سطح والے باغ کی دیوار کی آڑ میں آیا۔ یہ دیوار مشکل سے تین فٹ اونچی تھی۔ مگر مجھے کم سے کم دو طرف سے تحفظ دے رہی تھی ایک طرف موجود اسنائپر مجھے کسی قدر دقت سے دیکھ سکتا تھا۔ مگر میں اتنا خطرہ تو مول لے سکتا تھا۔ میں چاروں ہاتھوں پیروں سے دیوار کی آڑ میں چلنے لگا۔ میرا رخ پیلس کے دائیں حصے کی طرف تھا جہاں سے مرکزی پیلس تک جانے والا ڈرائیو وے گزرتا تھا۔ اس ڈرائیو وے کو کم سے کم دو اندرونی گیٹس سے گزرنا پڑتا تھا۔ مگر وہ معمول کی بات تھی اس وقت محافظوں کو گیٹس کا ہوش کہاں ہوگا۔ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں آڑ تین طرف سے میسر تھی۔

میں نے ذرا بلند ہو کر دیکھا۔ تب مجھے پہلی اے پی سی نظر آئی۔ وہ دو عمارتوں کے بیچ میں تھی اور اس کے اندر سے دونوں طرف فائرنگ کی جا رہی تھی۔ عمارتوں کی طرف سے جوابی فائرنگ ہو رہی تھی۔ اندر موجود گارڈز باہر نہیں آ سکتے تھے لیکن وہ کھڑکیوں سے فائرنگ تو کر سکتے تھے۔

میں نے سیٹی نکالی اور بجانے جا رہا تھا کہ کوئی چیز سن سے میرے سر کے پاس سے گزری اور میں بے ساختہ آڑ میں گرا تھا۔ یہ گولی تھی اور یقیناً کسی اسنائپر نے چلائی تھی۔ یہاں تک فائر کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ میرا خدشہ درست نکلا تھا۔ اکیلے آدمی کو دیکھ کر نشانچی غلط فہمی کا شکار ہو سکتے تھے۔ مگر اس کے بعد جو ہوا اس نے میری عقل خبط کر دی تھی۔ میں گر کر ابھی سنبھل رہا تھا کہ میں نے پیلس کے سامنے مخالف سمت پہاڑی سے ایک شعلے کو لپکتے دیکھا۔ وہ میزائل تھا۔ لمحے سے بھی پہلے وہ میرے اوپر سے گزرا اور پھر ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ نشانہ مزاحمت کرنے والی کوئی عمارت بنی ہوگی لیکن جب میں نے جھانک کر دیکھا تو اے پی سی ٹکڑوں میں بٹ گئی اور اس کے باقی ماندہ ڈھانچے سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ اس کے اندر موجود لوگوں کا حال سوچا جا سکتا تھا۔

”میرے خدا!“ میرے منہ سے نکلا۔ ”یہ کس احمق نے کیا ہے؟“

مگر فوراً ہی کنور پیلس کے دائیں طرف ہائی وے والی طرف سے ایک شعلہ اور لپکا اور اس بار اس کا نشانہ کہیں اوپر موجود دوسری اے پی سی بنی تھی۔ میں نے اس کے ٹکڑے ہوا میں بلند ہوتے دیکھے تھے۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیا نشانچی پاگل ہو گئے تھے؟ انہوں نے میزائل مار کر اپنی ہی دونوں بکتر بند گاڑیوں کو اڑا دیا تھا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ کرنل اور اس کے آدمی مارے جا چکے تھے اور ہمارا مشن تقریباً ناکام ہو گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ نشانچی دو دفعہ غلطی کریں۔ انہوں نے جان بوجھ کر یہ کام کیا تھا اور فوراً مجھے خیال آیا کہ مجھ پر گولی غلطی سے نہیں بلکہ جان کر چلائی گئی تھی۔ میری چھٹی حس جس خطرے سے خبردار کر رہی تھی وہ اچانک سامنے آ گیا تھا مگر ابھی پوری طرح کھلا نہیں تھا۔ کرنل کے آدمی بک گئے تھے اور انہوں نے اپنے ہی لوگوں کو نشانہ بنا ڈالا تھا۔ یا پھر دوسرے لوگوں نے ان پر قابو پا لیا تھا اور ان کے ہتھیار ہمارے خلاف استعمال کر رہے تھے۔

مگر یہ دوسرے کون ہو سکتے تھے؟ دونوں اے پی سی کے اڑتے ہی کہیں چھپے پیلس کے گارڈز سامنے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اے پی سی ان کے ساتھیوں نے اڑائی ہے۔ میں نے رائفل سنبھال لی۔ مگر مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اسنائپرز نے ان گارڈز کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ان میں سے چار پانچ گرے تو باقی واپس پناہ کے لیے بھاگے تھے۔ ان کی طرح میں بھی حیران تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ ایسا لگ رہا تھا کہ اسنائپرز سچ مچ پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اے پی سی اڑانے کے بعد کنور پیلس کے گارڈز کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ گڑبڑ میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ سب دیکھنے کے بعد کھلی جگہ پر آنا خودکشی ہوتی۔ میں واپس سرکنے لگا اور دیوار کے نیچے نیچے ہوتا واپس قید خانے کی عمارت کی طرف جانے لگا تھا۔ ابھی میں نصف راستے میں تھا میرے اوپر سے گولی گزر کر دیوار پر لگی۔ اب رکنا حماقت ہوتی۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ اسنائپر مسلسل مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں حرکت کی وجہ سے بچ گیا۔

قید خانے کی عمارت کے ملبے کے پاس آ کر میں نے چھلانگ لگائی اور دوسری طرف آڑ میں گرا تھا۔ اس بار مجھ پر دو طرف سے گولیاں برسائی گئی تھیں۔ بھاگنے کے دوران میں دوسرے اسنائپرز کی نظر میں آ گیا تھا۔ دور بیٹھے اسنائپر کے لیے متحرک ٹارگٹ کو نشانہ بنانا ذرا مشکل ہوتا ہے کیونکہ رائفل کو بہت احتیاط سے اور معمولی سی جنبش دینی پڑتی ہے اور یہ خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میری بچت ہوئی تھی مگر دوسری طرف ملبے پر گرا تو پہلے سے زخمی جسم پر مزید چوٹیں آئی تھیں۔ میں کھڑے ہونے کے بجائے رینگتا ہوا نیم گرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں میں اسنائپرز کی حد سے باہر تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ ٹک کر میں نے پانی کی بوتل منہ سے لگائی اور اس بار ایک ہی سانس میں خالی کر دی۔ جدوجہد سے زیادہ شاک نے میرا گلا خشک کر دیا تھا۔

ہمارا پلان مکمل طور پر ناکام ہو گیا تھا۔ اب مرکزی پیلس کی چھت پر اترنے والے میرے ساتھیوں کی عافیت بھی خطرے میں پڑ گئی۔ ان میں بیتو تھا اور مجھے سب سے زیادہ فکر اسی کی تھی۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ چند لمحے گہرے سانس لے کر میں اپنے حواس بحال کرتا رہا۔ چند منٹ بعد میری سوچ فوکس ہوئی۔ ابتدائی صدمے کے بعد میں خود پر قابو پانے لگا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ جو ہو چکا تھا اس پر دکھی ہونے کے بجائے مجھے مرکزی پیلس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کیونکہ وہاں میرے ساتھی تھے۔ ساوی بڑے کنور کے ساتھ تھی اور اسے خطرہ نہیں تھا لیکن بیتو خطرے میں تھا۔ اگر پیلس کے گارڈز اس پر قابو پا لیتے تو عین ممکن تھا اسے فوری مار دیا جاتا۔ کنوروں کے نزدیک وہ مجرم تھا۔ اسے بچانا میری ذمے داری تھی اور اگر اس کے لیے مجھے خود کو بڑے کنور کے حوالے کرنا پڑتا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔

ایک فیصلہ کر کے میں نے اپنے وسائل کا جائزہ لیا۔ میرے پاس ایک رائفل اور اس کے ساڑھے تین میگزین تھے۔ پستول اور اس کے ایمونیشن کی صورت حال یہی تھی۔ تین ہینڈ اور تین ہی اسموک گرنیڈ تھے ایک ایک میں استعمال کر چکا تھا۔ ایک وائس بم تھا مگر بغیر حفاظتی انتظامات کے میں اسے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ میں خود اس کا شکار ہو جاتا۔ میں اندر آیا۔ راہداری میں داخل ہونے سے پہلے سن گن لی۔ اندر کمرے میں جلنے والا واحد بلب بند ہو چکا تھا لیکن مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں نے نائٹ ویژن آن کر لی اور اب مجھے سب صاف نظر آ رہا تھا۔ گیس کا شکار ہونے والا کونے میں پڑا تھا، پتا نہیں زندہ تھا کہ مر چکا تھا۔ یہ بے ہوش کرنے والی گیس تھی مگر اس کی زیادتی جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں دبے قدموں آگے آیا۔ خفیہ دروازہ بدستور بند تھا۔ میں نے جڑ میں لگے بٹن کو دبایا۔ اس بار بھی دروازہ بند تھا۔ میں نے گہرا سانس لیا اور بے ہوش گارڈ کو کھینچ کر باہر والے کمرے تک لے آیا۔

پھر ایک ہینڈ گرنیڈ خفیہ دروازے کے ساتھ رکھ کر تیزی سے خود بھی باہر آ گیا۔ عمارت مخدوش ہو گئی تھی ممکن تھا کہ کوئی دھماکا اسے سرے سے بٹھا دیتا۔ خاص طور سے جو اسٹرکچر کے ساتھ کیا جاتا۔ جیسے ہی میں نے باہر والے کمرے میں قدم رکھا دھماکا ہوا تھا اور راہداری میں دھواں اور گرد بھر گئی تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا کہ گرد بیٹھ جائے۔ جیسے ہی گرد بیٹھی میں اندر آیا۔ خفیہ دروازے کا ایک حصہ اڑ گیا تھا اور اس میں اتنا خلا پیدا ہو گیا تھا جس میں ایک آدمی جا سکتا تھا۔ میں نے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اس کے بجائے میں نے ایک گیس بم اندر اچھال دیا۔ گیس نکلنے کی سنسناہٹ کے ساتھ ہی کوئی چلایا اور پھر بھاگنے کی آواز آئی۔ میں اندر داخل ہوا۔ یہاں بھی دھواں بھرا ہوا تھا مگر نائٹ ویژن سب صاف دکھا رہی تھی۔ گیس بم سے بہت تیزی سے گیس خارج ہو رہی تھی۔ میں نے نیچے آتے ہی اسے اٹھا کر آگے پھینک دیا۔ ابھی اس سے ایک منٹ تک گیس خارج ہو سکتی تھی۔ بم آگے گرا تو کوئی کھانسا اور گالیاں دیتا ہوا مزید آگے بھاگا تھا۔

نیچے آتے ہی میں نے نائٹ ویژن آف کر دی۔ کیونکہ یہاں بلب روشن تھے۔ گیس بم کی چابی کا ایک حصہ سکے کی طرح گول تھا اور اس کا سائز بھی پچیس پیسے کے سکے سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ میرے پاس تھا میں نے سرنگ کی چھت پر لگا پہلا بلب اتارا۔ یہ کسی قدر گرم تھا مگر ناقابلِ برداشت نہیں تھا۔ یہ سکہ میں نے بلب کے ہولڈر میں لگانے والے حصے پر رکھا اور اسے بلند کرکے ہولڈر میں گھسا دیا۔ ایک جھماکا ہوا اور سرنگ میں جلنے والے تمام بلب بجھ گئے۔ وہاں گھپ اندھیرا ہوگیا مگر نائٹ ویژن آن کرتے ہی یہ اندھیرا اجالے میں بدل گیا۔ میں دبے قدموں مگر تیزی سے آگے بڑھا۔ آگے موجود افراد گیس بم سے اتنے دہشت زدہ ہوئے تھے کہ وہ سرنگ میں خاصے آگے نکل گئے تھے۔ جہاں تک نظر جا رہی تھی مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید روشنی بند ہونے سے وہ اور بھی ڈرے تھے اور واپس کسی عمارت میں گھس گئے تھے۔

میں مرکزی پیلس کی طرف جا رہا تھا۔ تقریباً تین سو گز کے بعد بلب دوبارہ روشن ملے۔ مجھے نائٹ ویژن بند کرنا پڑی تھی۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے میں سکے کی طرح استعمال کر سکتا تھا اس لیے میں نے رائفل کے بٹ سے کام لینا شروع کیا اور راہ میں آنے والے بلب توڑنے لگا۔ جیسے جیسے میں آگے جا رہا تھا سرنگ میں تاریکی چھا رہی تھی۔ البتہ دائیں بائیں نکلنے والی سرنگوں کے بلب نہیں چھیڑے تھے وہ بدستور جل رہے تھے۔ میں صرف مرکزی سرنگ کے بلب توڑ رہا تھا۔ چند منٹ بعد میں مرکزی پیلس کے نیچے والے کمرے میں تھا اور یہاں سیڑھیوں والا دروازہ اب بھی بند تھا۔ میں تقریباً آدھا گھنٹا یہاں سے دور رہا تھا۔ اس دوران میں اگر بڑا کنور سادی سمیت سیف ہاؤس میں جا چکا تھا تو مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔ مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حملہ آور ختم ہو چکے تھے اور جو چھت پر تھے ان پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ میں نے یہاں کے بھی تمام بلب توڑ دیے۔

اس جگہ ہینڈ گرنیڈ کا استعمال خاصا مشکل تھا کیونکہ یہاں سیڑھیاں تھیں اگر میں دروازے کے ساتھ رکھ کر اترتا تو اس میں وقت لگتا اور اگر میں نیچے سے اچھالتا تو وہ سیڑھیوں سے واپس نیچے آ جاتا۔ بالکل درست وقت پر پھینکنے میں خطرہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ میں ہی پھٹ جائے گا۔ یہ دو ہی گرنیڈز تھے یہ کام نہ آتے تو میں کسی صورت دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ گرنیڈ استعمال کرنے سے پہلے ایک بار پھر بٹن تلاش کروں۔ اوپری دیواروں پر دیکھ لیا تھا لیکن نیچے کی دیواروں پر نہیں دیکھا تھا۔ میں ایک دیوار پر ہاتھ پھیرتا ہوا نیچے تک آیا۔ پھر دوسری دیوار چیک کرنے اوپر جا رہا تھا کہ میری نظر سیڑھیوں پر ذرا ایک زیادہ روشن حصے پر گئی۔ یہ نقطے کی صورت میں اوپر سے نیچے پانچویں سیڑھی کی دیوار کے کونے پر روشن تھا اور آس پاس سے الگ نظر آ رہا تھا۔ میں اوپر آیا، اس پر انگلی پھیری اور گہری سانس لی۔ میں جس بٹن کی تلاش میں تھا وہ مل گیا تھا۔ اس دروازے کا بٹن سیڑھیوں پر تھا۔

میں نے اسے تین بار دبایا اور فوراً ہی رائفل سنبھال لی کیونکہ دروازہ اوپر اٹھنا شروع ہوگیا تھا۔ روشنی کی لکیر نمایاں ہوئی جو پھیلتی چلی گئی اور پھر ایک چھوٹا لیکن ویسا ہی روشن خانہ دکھائی دیا جیسا کہ قید خانے میں تھا جہاں سے خفیہ راستہ شروع ہوتا تھا۔ یہ بھی شاید کسی گیلری میں تھا۔ میں چند لمحے انتظار کرتا رہا کہ وہاں کوئی موجود ہو تو ردعمل سامنے آئے مگر نہ تو کوئی ردعمل سامنے آیا اور نہ ہی کوئی آواز آئی تھی۔ میں نائٹ ویژن آف کرکے اوپر آیا اور خانے سے جھانکا مگر خلاف توقع یہ واش روم ثابت ہوا تھا۔ یہ خانہ اس قسم کا تھا جیسے بڑے واش رومز میں الگ سے شاور کی جگہ ہوتی ہے جسے پردے سے باقی واش روم سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں نہ تو شاور تھا اور نہ ہی کوئی پردہ تھا۔ میں باہر آیا اور دروازہ کھلا رہنے دیا کیونکہ مجھے یہاں اس کے بٹن کا علم نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ کچھ دیر بعد خود بند ہو جاتا مگر مجھے اب شاید واپس نہیں جانا تھا اس لیے مجھے پیچھے کے بجائے آگے کی فکر تھی۔

واش روم خاصا بڑا تھا۔ اس میں ایک طرف آئینہ تھا۔ میں نے خود کو دیکھا۔ چہرے پر کئی جگہ خون لگا ہوا تھا۔ لباس گرد آلود اور کہیں کہیں سے خون آلود ہو رہا تھا اور میں کسی ایکشن فلم کا مار دھاڑ کرنے والا ہیرو لگ رہا تھا جس نے دشمنوں کے کشتوں کے پشتے لگائے ہوں اور ساتھ ہی کچھ زخم خود بھی کھائے ہوں۔ میں نے دروازہ کھولے بغیر کان لگا کر باہر کی سن گن لی مگر کوئی آواز نہیں تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ باہر کوئی نہیں تھا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کی لکڑی سے بنے ٹھوس دروازے تھے جن کو چوکھٹ میں پوری طرح فکس کیا گیا تھا اور یہ تقریباً ساؤنڈ پروف تھے۔ اگر اس سے باہر کچھ لوگ موجود تھے اور بات بھی کر رہے تھے تو وہ اندر

نائی نہیں دیتی۔ میں نے اس کا لٹو تھاما اور آہستہ سے گھمایا۔ وہ بے آواز گھوما اور ہلکی سی کلک کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میں نے پٹ ہلکا سا کھول کر باہر دیکھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ایک بہت خوب صورت اور سجا ہوا بیڈ روم تھا۔ یہاں سے اس کا دروازے والا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس بار بہت کان لگا کر سنا اور کمرے میں سناٹا محسوس کرکے میں باہر نکل آیا۔ رائفل شانے سے لٹکالی تھی اور پستول ہاتھ میں رکھا تھا۔ میں نے تیزی سے پستول گھماتے ہوئے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ بڑے سائز کا یہ بیڈ روم جس میں اعلیٰ درجے کا نفیس ترین فرنیچر تھا بالکل خالی تھا۔ بڑی لائٹس آف تھیں لیکن دو چھوٹی لائٹس آن تھیں۔ بہ ظاہر خاموشی تھی لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے اس عمارت میں کہیں ہلچل ہو۔ میں نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ کوئی ارتعاش نہیں تھا شاید یہ میرے احساسات تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے ساتھی اوپر تھے اور وہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہوں گے۔ شاید اسی نے میرے اندر ارتعاش پیدا کیا تھا اور مجھے لگا جیسے سچ مچ کچھ ہو رہا ہو۔ مگر اسی لمحے زمین واضح طور پر ہلی تھی اور پھر ایسا لگا جیسے کہیں کھلے میں دھماکا ہوا اور بند جگہ اس کی دھمک بنا آواز کے آئی ہو۔ دھماکا اسی عمارت میں ہوا تھا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا اور اس کا ہینڈل گھما کر دیکھا وہ کھلا تھا۔ دروازہ ہلکا سا کھول کر میں نے باہر جھانکا تو ایک لمبی راہداری دکھائی دی جس کے آخری حصے میں سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں مگر یہ عام سی سیڑھیاں تھیں جیسے ایمرجنسی کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ کنور پیلس کی شاہانہ سیڑھیاں میں دیکھ چکا تھا جس کی چوڑائی تو دس فٹ تھی اور جن پر بیش قیمت سرخ قالین فکس کیے گئے تھے جس کے ساتھ مہاگنی سے بنی لکڑی کی ریلنگ تھی اور اس پر چاندی جیسی کسی دھات کا سہارا تھا۔ راہداری خالی تھی مگر میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ یہ جگہ انسانوں سے خالی نہیں ہے یہاں دائیں بائیں کے کمروں میں لوگ تھے۔ راہداری بھی عام سی تھی۔ یعنی کارپٹ اور آرائشی سامان سے خالی تھی۔ اس سے لگ رہا تھا کہ پیلس کا کوئی عام حصہ تھا۔ ممکنہ طور پر یہ حصہ ملازموں یا عام قسم کے مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ مگر میں جس کمرے میں تھا یہ عام نہیں تھا۔ اس کا فرنیچر اور دیگر سامان بہت اعلیٰ درجے کا تھا اور پھر یہیں سرنگ میں جانے والا خفیہ راستہ تھا۔

میں باہر آیا اور دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ایک کمرے کے پاس سے گزرتے مجھے اندر سے کم سے کم دو افراد کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ ہیجان زدہ ہو رہے تھے۔ میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے تیزی سے سیڑھیوں تک آ گیا۔ سیڑھیاں بل کھاتی اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو سیڑھیاں خاصی بلندی تک جاتی دکھائی دیں۔ یہ بلندی کم سے کم چالیس پچاس فٹ تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اسی کمرے کا دروازہ کھلتا محسوس ہوا اور میں تیزی سے جھک کر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ جب چھت جتنی بلندی تک پہنچ گیا تو جھانک کر دیکھا۔ دو افراد کمرے سے نکلے تھے اور وہ وردی سے کنور پیلس کے خاص گارڈز دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مسلح تھے اور آپس میں تیز لہجے میں بات کر رہے تھے ان کی زبان غیر مانوس تھی۔ وہ نقوش سے نیپالی گورکھے لگ رہے تھے اور شاید اپنی زبان میں بات کر رہے تھے۔

میں تیار ہوگیا جب انہوں نے سیڑھیوں کا رخ کیا اور میں مزید کچھ اوپر چڑھ گیا۔ میں نے رائفل ہاتھ میں لے لی تھی اور مقابلے کے لیے تیار تھا۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی وہ سیڑھیوں کے نیچے سے گزر کر آگے کہیں چلے گئے۔ میں اتر کر نیچے آیا اور اس راستے پر جھانکا۔ یہاں سیڑھیاں ذرا نیچے اتر کر ایک چھوٹی راہداری میں جا رہی تھیں جو آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ وہاں چہل پہل تھی اور مجھے تین افراد تیزی سے گزرتے دکھائی دیے۔ ان کی توجہ اس طرف نہیں تھی ورنہ وہ شاید مجھے دیکھ لیتے۔ میں واپس آیا اور پھر سیڑھیوں کا جائزہ لیا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ میں کنور پیلس کے کس حصے میں تھا۔ سیڑھی پر مناسب وقفے سے بلب روشن تھے اور وہاں تاریکی نہیں تھی۔ مگر روشنی بہت زیادہ بھی نہیں تھی۔ میں اوپر چڑھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ایک منزل بعد مجھے نکلنے کی کوئی راہ ملے گی۔ مگر سیڑھی تو بس اوپر جا رہی تھی اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

یہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے میں اوپر جاتے ہوئے راستے میں آنے والے بلب توڑتا جا رہا تھا۔ جتنی زیادہ تاریکی ہوتی میرے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ سیڑھی کے آخری حصے میں آکر مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہاں ایک سپاٹ دیوار تھی اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا یہ سیڑھی کسی مقصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ کوئی پاگل ہو گا جو بلاوجہ سیڑھی بنا کر رکھ دے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں

کوئی خفیہ دروازہ تھا جو اوپری فلور پر کہیں کھلتا ہوگا۔ میں دیوار پر ہاتھ پھیر کر اس دروازے کو کھولنے والا بٹن تلاش کرنے لگا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں نے آخری بلب بھی توڑ دیا۔ اب وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے نائٹ ویژن آن کر کے دیوار کا معائنہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ پہلے کی طرح بٹن نمایاں ہو جائے گا۔ کیونکہ بٹن برقی ہوتا ہے اس لیے کرنٹ سے وہ کسی قدر گرم ہو جاتا ہے اور باقی دیوار سے ذرا نمایاں ہو جاتا ہے لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ پوری دیوار ایک جیسے رنگ میں نظر آ رہی تھی۔

میں نے آس پاس کا جائزہ لیا پھر اتر کر سیڑھیوں پر دیکھا۔ پہلے بھی بٹن مجھے سیڑھیوں پر ملا تھا لیکن اس بار سیڑھیوں پر بھی نہیں تھا اس کا بھی امکان تھا کہ بٹن موجود تھا مگر کسی وجہ سے گرم نہیں تھا اس لیے مجھے الگ سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ اوپر کی دس سیڑھیوں کی دیوار چیک کی۔ کہیں کوئی ایسا ابھار نہیں ملا جو دب بھی رہا ہو۔ پھر میں اوپر آیا اور رائفل کے دستے سے دیوار بجا کر چیک کرنے لگا اور چوٹ کی آواز سے مجھے لگا کہ دیوار اتنی موٹی نہیں ہے ۔یقیناً یہاں دروازہ تھا۔ میں مایوس ہو کر پیچھے ہٹا تھا کہ اچانک ہی دیوار بالکل اسی طرح اوپر ہونے لگی جیسے سرنگ کی دیواریں ہوتی تھیں۔ میں پھرتی سے پیچھے ہٹا تھا اور سیڑھیوں سے نیچے آتے ہوئے رائفل کا رخ اوپر کر لیا۔ بہت ہلکی سی روشنی آئی تھی۔ پھر میں نے کسی کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔ ''ادھر کوئی تھا میں نے خود آواز سنی، کوئی دیوار بجا رہا تھا۔''

میں ذرا اوپر آیا اور جھانک کر دیکھا۔ یہ ایک تقریباً تاریک کمرا تھا اور وہاں معمولی روشنی میں کئی افراد نظر آ رہے تھے۔ مگر وہ سامنے نہیں تھے اس لیے نمایاں بھی نہیں تھے۔ میں نے رائفل کی نال آگے کی۔ وہ کئی تھے اور جلد یا بدیر اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے نیچے آتے ۔ یہاں بچنا مشکل تھا اور وہی بچتا جو وار میں پہل کر جاتا۔ میرے پاس موقع تھا میں انہیں بے خبری میں نشانہ بنا سکتا تھا۔ اچانک تھپڑ کی آواز آئی اور کسی نے کہا۔ ''بکواس کرتا ہے خنزیر کا بچہ.... ادھر کون ہے؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں بھگوان کی سوگند۔'' پہلے بولنے والا گھگیایا۔ ''دیکھو یہاں کی روشنیاں بھی بند ہیں ورنہ ان سیڑھیوں پر روشنی ہوتی ہے۔ تم لوگ خود جا کر دیکھ لو۔''

دوسرے شخص کی آواز سن کر میری ٹریگر پر سخت ہوتی انگلی نرم ہوئی تھی مگر ان کے یہاں آنے کا سن کر میں نے دوبارہ انگلی سخت کی اور ٹریگر دبانے والا تھا کہ ایک اور نے کہا۔ ''یہ ٹھیک بولتا.... ادھر کوئی ہے۔''

یک دم میرا پورا وجود ہی نرم پڑ گیا اور میں نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں نے ٹریگر نہیں دبایا ورنہ شاید ہونے والے نقصان کی کبھی تلافی نہیں کر سکتا تھا۔ تیسری آواز بیتو کی تھی۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''یہ میں ہوں، گولی مت چلانا۔''

''شوبی!'' بیتو نے چلا کر کہا اور اس کا ہیولا دروازے کے خلا میں نمودار ہوا۔ میں اٹھ کر اوپر آیا تو وہ مجھ سے چمٹ گیا۔ اس کی محبت کا ہمیشہ سے یہی انداز رہا تھا۔ وہ مجھے ٹٹول رہا تھا۔ ''شوبی آپ ٹھیک ہے نا؟''

''سو فیصد تو نہیں لیکن ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اندر چلو ہم دشمنوں کے عین سر کے اوپر ہیں۔''

بیتو مجھے اندر لایا اور اس نے مذکورہ شخص کو دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ایک طرف دیوار میں لگا خفیہ بٹن تین بار دبایا اور دروازہ بند ہونے لگا۔ وہ پیلس گارڈز کی وردی میں تھا۔ ''یہ کیسے ہاتھ لگا؟''

بیتو نے کہا۔ ''ہم نے یہاں موجود لوگ کا صفایا کر دیا، بس یہ زندہ ہاتھ لگا۔''

اس کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی اس کے ساتھ اچھی خاصی مار پیٹ ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اسے اندر سے لاک کر دو اب یہ سیڑھیوں کی طرف سے نہ کھلے۔''

اس نے اسی بٹن کو لگاتار چار بار دبایا اور بولا۔ ''اب یہ صرف اسی طرف سے کھلے گا سیڑھی کی طرف سے نہیں کھلے گا۔''

وہاں بیتو کے ساتھ فتح خان کے دو آدمی تھے لیکن خود فتح خان اور باقی تین آدمی غائب تھے۔ ''باقی کہاں ہیں؟''

''تین ادھر ایک جگہ مورچہ لگائے ہوئے ہیں۔'' بیتو بولا۔ ''پر فتح خان کا پتا نہیں ہے.... وہ ہمارے ساتھ اترا تھا مگر کچھ دیر بعد غائب ہو گیا۔ ریڈیو پر بھی جواب نہیں دے رہا ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''فتح خان بھی غائب ہے.... تمہیں معلوم ہے کرنل اور اس کے ساتھ اندر آنے والے تمام افراد کا صفایا ہو گیا ہے ان کی بکتر بند گاڑیوں پر باہر سے میزائل فائر ہوئے ہیں۔''

بیتو حیران ہوا تھا۔ ''باہر سے.... کس نے کیا؟''

''میرا خیال ہے ان ہی لوگوں نے جنہیں میزائل فائر کرنے پر لگایا گیا تھا وہ بک گئے ہیں یا مارے گئے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے لوگ آ گئے ہیں۔ مجھ پر فائرنگ کی گئی حالانکہ میں نے جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور میرے سامنے ہی اسنائپرز نے پیلس کے گارڈز کو نشانہ بنایا۔''

بیتو نے تیزی سے صورت حال کو سمجھ لیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''شوبی یہ تو کوئی بڑا سازش ہو رہا ہے کوئی شخص اپنا کھیل کھیل رہا ہے۔''

''مجھے لگ رہا ہے کوئی شخص نہیں کئی افراد اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''نیچے سے شدید مزاحمت کی جا رہی ہے؟''

''ہم دوسری منزل پر بھی نہیں جا سکا ہے۔'' بیتو بولا۔ ''نیچے سے سیڑھی کو اڑا دیا گیا ہے اور ادھر بہت لوگ ہے۔''

''اس خفیہ راستے کا کیسے پتا چلا؟''

''اس کو بجایا تو یہ بولا۔'' بیتو نے قیدی کی طرف اشارہ کیا۔

''خود سے بتایا ہے اس نے؟''

''اتنا شریف نہیں ہے ہم کو خیال آیا کہ ادھر سے نیچے جانے کے واسطے بس ایک سیڑھی ہے۔ ہمیں خیال آیا کہ کوئی خفیہ راستہ ہوگا۔''

''ہیلی کاپٹر کہاں ہے؟''

''وہ چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔'' بیتو نے بتایا۔ ''فتح خان نے اس کے پائلٹ سے کہا تھا کہ جب ریڈیو پر کہے تو ادھر آ ئے۔''

''ریڈیو پر کون کہے گا اور وہ ریڈیو کس کے پاس ہے؟''

''فتح خان بولتا، ریڈیو بھی اسی کے پاس ہے۔''

''اور وہ غائب ہے۔'' میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ یہ تشویش ناک خبر تھی۔ فتح خان کہاں غائب ہو گیا تھا اور اس کا ریڈیو بھی بند تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ لیکن فتح خان کے بارے میں انکوائری کرنے سے پہلے میں نے اس جگہ کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ اوپری فلور بہت بڑا نہیں تھا یہاں چھ کمرے تھے اور درمیان میں گنبد کا بڑا سا ہال تھا۔ سیڑھیاں اس کے وسط سے نیچے جا رہی تھیں جہاں فتح خان کے تین ساتھی مورچہ بند موجود تھے۔ سیڑھیاں درمیان سے یوں تباہ کی گئی تھیں کہ ان کو کسی

صورت بغیر کسی سہارے کے عبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے بیتو سے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے اب تک کیا کیا ہے؟“

”ہم نے گیس والا بم مارا پر ادھر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مورچہ لگانے والا اپنی جگہ ہے۔ یہ دیکھو۔“ بیتو نے پستول سے نیچے کی طرف فائر کیا اور فوراً ہی جوابی برسٹ آیا۔ میں نے بیتو کو پیچھے کھینچ لیا۔

”احتیاط سے برخوردار..... اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”شوبی آپ کہاں تھا.... آپ کے غائب ہونے کے بعد ہم بہت پریشان تھا۔ ہم سوچ رہا تھا کہ حملہ نہ کرے، پر فتح خان اور کرنل نے فیصلہ کیا کہ حملہ وقت پر ہوگا۔“

”انہوں نے ٹھیک فیصلہ کیا۔“ میں نے سر ہلایا اور بیتو کو مختصراً خود پر گزرنے والے احوال سے آگاہ کیا۔ مجھ پر ہونے والے تشدد کا سن کر اسے غصہ آیا تھا اور نائیک کا انجام سن کر اس نے دانت نکالے تھے۔

”بالکل ٹھیک کیا، آپ کے ساتھ ہم ہوتا تو اسے کہیں اور کرنٹ لگاتا۔“

سرنگ اور پیلس کے نیچے موجود سیف ہاؤس کا سن کر وہ فکر مند ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”شوبی کسی طرح بھی ہم کو نیچے جانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ دیدی کو لے کر ادھر چلا جائے۔“

”اب نہیں جائے گا کیونکہ حملہ کرنے والوں میں بس ہم بچے ہیں اور ہم بھی یہاں پھنسے ہوئے ہیں۔“

”شوبی ایک راستہ تو پتا چل گیا ہے نیچے جانے کا۔“ بیتو نے خفیہ راستے کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھے لگ رہا ہے اب اس سے نیچے جانا بھی آسان نہیں ہوگا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ صبح کے ساڑھے چار بجنے والے تھے۔ کچھ دیر میں صبح کی روشنی ہونے لگتی اور ہر گزرتے لمحے یہاں سے نکلنا بھی دشوار لگ رہا تھا، مشن کی کامیابی تو ایک طرف رہی تھی۔ میں نے فتح خان کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ”یہ پانچ اور ہم دو ہیں..... نیچے درجنوں مسلح گورکھے ہیں اور تم جانتے ہو لڑنے مرنے میں یہ کیسے ہوتے ہیں۔“

”تب کیا کرے.... ادھر سے نکل بھی نہیں سکتا ہے۔ ہیلی کاپٹر صرف فتح خان منگوا سکتا ہے اور وہ ہے نہیں۔“

”وہ غائب کیسے ہوا؟“

”ہم کو لگا وہ پہلے نیچے اتر گیا اس کے بعد سیڑھی تباہ ہو گیا۔“ بیتو نے کہا۔ ”وہ ہیلی کاپٹر سے اترتے ہی اندر آ گیا تھا۔“

”اس نے عجلت میں کام کیا۔ میرا خیال ہے یہاں کچھ لوگ گھات لگائے بیٹھے ہوں گے وہی اسے قابو کر کے نیچے لے گئے ہوں گے۔“

”ممکن ہے مار دیا ہو؟“

”اس کا بھی امکان ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا فتح خان نے یہ جذباتی حرکت کیوں کی۔ اسے تم لوگوں کی کمانڈ کرنی چاہیے تھی نہ کہ خود منہ اٹھائے دشمن کے حصار میں گھس جانا چاہیے تھا۔“ کہتے ہوئے میرا لہجہ برہم ہو گیا۔

”ہم کو دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔“ بیتو دبی آواز میں بولا۔

گنبد کے نیچے ہال تھا اور اس کے چاروں طرف چھ کمرے تھے۔ بالکل وسط میں سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ چاروں طرف تقریباً بیس بائیس فٹ کی خالی جگہ تھی جو شاید خاص تقریبات کے لیے استعمال کی جاتی ہوگی۔ یہاں مکمل کارپٹ تھا اور دیوار کے ساتھ اعلیٰ درجے کے صوفے اور دوسری سٹنگ رکھی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی میز بھی تھی جس پر کھانے پینے کا سامان سجایا جاتا ہوگا۔ گنبد کا اوپری حصہ شیشے کا تھا۔ وسط میں ایک بہت بڑا فانوس لٹک رہا تھا۔ یہ بلاشبہ کئی ٹن وزنی فانوس تھا جسے بہت مضبوط فولادی راڈ سے گنبد کی چھت سے باندھا گیا تھا۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر باقی سب کو بھی پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا پھر راڈ کا نشانہ لے کر برسٹ مارا۔ پہلے برسٹ میں راڈ نہیں ٹوٹی تھی۔ دوسرے برسٹ نے اس کی اوپری کڑی کو توڑ دیا اور فانوس سے آوازیں آنے لگیں۔ بیتو نے اضطراب سے کہا۔ ”شوبی یہ کیا کرتا ہے؟“

”دیکھتے رہو۔“ میں نے کہتے ہوئے تیسرا برسٹ مارا اور اس بار راڈ جواب دے گئی۔ ایک مہیب آواز کے ساتھ وزنی فانوس تیزی سے نیچے گیا۔ یہ سیڑھیوں کے عین اوپر تھا اس لیے سیدھا خلا میں گیا۔ زوردار چھناکوں کے ساتھ دھات ٹوٹنے کی خوفناک آوازیں بھی آئیں اور پھر نیچے موجود لوگ چیخنے چلانے لگے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں فانوس کے شیشے ٹوٹ کر ان پر برس رہے تھے اور انہیں زخمی کر رہے تھے۔ اب بیتو سمجھا کہ میں نے کیا کیا تھا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”یہ آپ نے اچھا کیا۔“

فانوس گرا تو میں نے اوپر سے لٹکنے والے بجلی کے تار کو پکڑ کر کھینچا اور اس میں سے تار توڑ کر اس کے دونوں سرے ننگے کیے اور انہیں وہیں موجود ایک ساکٹ میں ڈال کر بٹن آن کیا تو شعلہ لپکا اور اس جگہ کا فیوز اڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی نیچے والی منزل بھی تاریک ہو گئی تھی یعنی دونوں کا فیوز ایک ہی تھا۔ میں نے نائٹ ویژن آن کرتے ہوئے نیچے جھانکا تو مجھے کچھ افراد حرکت کرتے دکھائی دیے۔ وہ زخمی ہوئے تھے اور اب کانچ اور فانوس کے ملبے سے بچنے کے لیے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں چاہتا تو ان کو آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی، ان سب نے بھی نائٹ ویژن آن کر لیے۔ وہ بھی دیکھ رہے تھے اس لیے فتح خان کے ایک ساتھی نے اچانک بچ جانے والوں پر برسٹ مارا۔ ان میں سے دو گرے اور باقی بھاگ گئے تھے اب انہوں نے شیشوں کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ ان کے غائب ہونے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس مشن کا کمانڈر میں ہوں اب تم میں سے کوئی مجھ سے پوچھے بغیر کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ سمجھ گئے؟“

”سمجھ گیا۔“ فائرنگ کرنے والا بولا۔ ”خان صیب کا حکم تھا کہ ادھر سامنے آنے والے ہر بندے کو شوٹ کرنا ہے۔“

”اب ایسا نہیں کرنا۔“ میں نے کہا۔ بچ جانے والا گارڈ ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ میں اس کے پاس آیا۔ ”تم اس عمارت کے خاص گارڈز میں سے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے اقرار کیا۔

”میں جانتا ہوں یہاں تم جیسے پچاس گارڈز ہوتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ان کا سربراہ کون ہے؟“

”اگر جنگ۔“ اس نے جواب دیا۔

”رامن کی کیا حیثیت ہے؟“

”وہ پیلس کے دوسروں حصوں کا نگراں ہے لیکن اس عمارت کے معاملات سے اس کا تعلق نہیں ہے۔“

”باقی سیکیورٹی بھی رامن کے ماتحت ہے؟“

”ہاں باقی پورا پیلس اس کے ماتحت ہے۔“

”جب پیلس پر حملہ ہوا تو تم لوگوں نے کیا کیا اور بڑے کنور کا ردعمل کیا رہا۔“

وہ ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ”بڑے کنور کی طرف سے ہمیں حکم دیا گیا کہ صرف اس عمارت کا دفاع کریں۔ ہمیں باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔“

”بڑا کنور کہاں ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں جانتا، جب اوپر حملہ ہوا تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو آنے والوں کو روکنے کا حکم ملا۔ ہم اوپر آئے پر میرے ساتھی مارے گئے اور میں پکڑا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بڑا کنور کہاں ہے ویسے بھی ہم دوسرے فلور پر رہتے ہیں ہمیں بلاوجہ نیچے جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”تم لوگوں کی رہائش کہاں ہے؟“

”ہمارے گھر پیلس میں ہیں لیکن ڈیوٹی کے وقت ہم اسی عمارت میں رہتے ہیں۔ دو دن کے لیے آٹھ گھنٹے ڈیوٹی اور آٹھ گھنٹے آف ملتا ہے۔ ان دو دنوں میں یہیں رہنا ہوتا ہے۔“

یہ پیلس کا سیکیورٹی سسٹم تھا اور اس کی کوئی وجہ ہو گی۔ ”تمہارے ساتھ کتنے آدمی آئے تھے۔“

”ایک درجن۔“ اس نے جواب دیا۔

”صرف تم بچے ہو، نیچے بھی کم سے کم چار مارے گئے ہیں۔“

”اس سے پہلے ہی چھ سات اور مارے گئے۔“ بیتو نے مداخلت کی۔ ”جب ہم نے نیچے جانے کی کوشش کی اور انہوں نے روکا تھا۔“

مارے جانے والے بیشتر افراد سیڑھیوں کے آس پاس مارے گئے تھے اور ان کی لاشیں نیچے تھیں اور جو اوپر مارے گئے تھے ان کی لاشیں بھی ان لوگوں نے نیچے پھینک دی تھیں۔ اگر بیس کے قریب گارڈز مارے بھی گئے تھے تو نیچے اس سے زیادہ گارڈز موجود تھے۔ ابھی تو اوپر ہونے کی وجہ سے ہم محفوظ تھے لیکن نیچے جانے کی صورت میں ہم براہ راست نشانے پر آجاتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہمیں نیچے نہیں جانا تھا۔ ہمیں نیچے جانا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ہم کس طرح زیادہ سے زیادہ بچ کر یہ کام کر سکتے تھے۔ میں نے ایک بار پھر نیچے دیکھا۔ اب سیڑھیوں اور آس پاس جہاں تک نائٹ ویژن کام کر رہی تھی کوئی زندہ فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ کچھ لاشیں پڑی تھیں جنہیں اٹھایا نہیں گیا تھا۔ آسان طریقہ تو خفیہ راستے کا تھا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس سے جانا آسان نہیں ہوگا۔ میں نے بیتو اور

دوسرے افراد سے کہا۔

”رسی باندھو.... ہم اسی جگہ سے نیچے جائیں گے۔“

”شوبی یہ خطرناک ہوگا وہ لوگ گھات لگا کر بیٹھا ہو گا۔“

”ہم اندھا دھند نہیں جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے حصے کا ریڈیو کہاں ہے؟“

”ہمارے پاس ہے۔“ بیتو نے اپنے بیگ سے چھوٹا سا ریڈیو اور اس کے ایئر فون نکال کر دیئے جو کانوں میں پوری طرح فکس ہو جاتے تھے۔ میں نے اسے کانوں سے لگایا اور ریڈیو اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ فتح خان کے آدمی مختلف جگہوں پر رسیاں باندھ رہے تھے۔ انہوں نے ہیلی کاپٹر سے رسیوں سے اترنے کی تربیت حاصل کی تھی اور یہ کام ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے وائس بم لیا اور ایک رسی سے اسے باندھا۔ اب بیتو سمجھ گیا اس نے دانت نکالے۔ ”یہ اچھا ہے سب بے ہوش ہو جائے گا۔“

”خوش فہم مت ہو ممکن ہے انہوں نے اس کا توڑ بھی رکھا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کوئی اندر کا بھیدی ان لوگوں کے ساتھ مل گیا ہے اس صورت میں وہ ہمارے تمام حربوں سے آگاہ ہوں گے۔“

بیتو نے سر ہلایا۔ فتح خان کے آدمی رسیاں باندھ چکے تھے۔ میں نے سب کو ایک جگہ بلایا اور سرگوشی میں اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ رسی سے بندھا ہوا بم پن نکال کر نیچے پھینکنے پر تقریباً بیس فٹ کی گہرائی تک چلا جاتا۔ رسی اتنی ہی دراز تھی۔ لیکن ہم اس کی حد میں ہوتے۔ یہ تقریباً پانچ سیکنڈ تک ایک سو تیس ڈیسی بیل کی مہیب آواز نکالتا اور جیسے ہی اس کی آواز ختم ہوتی ہم حرکت میں آ جاتے۔ وہ خاموشی سے سن رہے تھے۔ البتہ ایک نے سوال کیا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے؟“ اس نے قیدی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے گولی مار دے۔“

”نہیں یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔“ اس سوال سے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ”بلکہ یہ پہلے جائے گا۔ اگر کوئی نیچے ہوا تو وہ اسے ہی نشانہ بنائے گا اور ہمیں اس کی لوکیشن کا پتا بھی چل جائے گا۔“

یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ مگر اسے نیچے بھیجنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہوش میں ہو اور ائر فون کے بغیر اس کا وائس بم سے بچنا مشکل تھا کیونکہ اس کی حد بیس میٹر تھی۔ میں نے اسے فتح خان کے ایک آدمی کے ہمراہ ایک کمرے میں بھیج دیا جہاں وہ بم کی حد سے باہر ہوتا۔ اسے سمجھا دیا کہ اسے کانوں پہ ہاتھ رکھنے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بم کی پن کھینچی اور اسے نیچے خلا میں اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم دیواروں کی طرف بھاگے اور دونوں ہاتھوں سے کان ڈھانپ لیے تھے۔ اس کے باوجود پانچ سیکنڈ بعد جب بم پھٹا تو ایک باقاعدہ لہر سی ہمارے جسموں سے ٹکرائی اور بے پناہ امنڈتا ہوا شور کانوں سے ٹکرایا۔ اس کی شدت نے ایک لمحے کو بوکھلا دیا تھا۔ یہ کرنٹ کے شاک جیسا تھا۔ میں نے سانس روکی تو یہ قابلِ برداشت ہوا۔ آواز کسی حد تک ناک کے راستے بھی جسم میں داخل ہوتی ہے۔

اسی لیے سانس روکنے سے آواز کی شدت کسی قدر کم ہوئی تھی۔ سانس روکنے کے باوجود یہ پانچ سیکنڈ پانچ منٹ بن کر گزر رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے آواز رک ہی نہیں رہی ہے۔ ایک مسلسل لہر کی طرح چڑھے چلی آ رہی ہے۔ یہ چیختی چنگھارتی آواز جیسے دماغ میں گھس رہی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ جن لوگوں نے اسے براہِ راست سنا ہوگا ان کا کیا حال ہوگا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ کسی قابل نہیں رہے ہوں گے۔ آواز رکی تو بھی کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور میں نے کانوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بیتو کو آواز دی تو مجھے خود اپنی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ پھر میں نے اسے ریڈیو پر پکارا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”ہم ٹھیک ہے شوبی۔“ ایئر فون سے اس کی آواز آئی۔ ”پر یہ آواز خدا کا پناہ....“

”سب ٹھیک ہیں؟“

سب ٹھیک تھے۔ البتہ گورکھے گارڈ کی حالت کسی قدر خراب تھی۔ حالانکہ وہ دور تھا مگر شاید اس نے صحیح سے کانوں کو نہیں ڈھکا تھا۔ سب سے پہلے اسے بھیجنا تھا اور وہ جھوم رہا تھا۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ رسی کے سہارے نہیں اتر سکے گا۔ میں نے کہا۔ ”اسے رسی سے باندھ کر نیچے اتارو.... جلدی....“

فتح خان کے آدمیوں نے اسے بغلوں سے رسّی گزار کر باندھا اور کنارے تک لائے۔ وہ مزاحمت کر رہا تھا مگر خود کو آزاد نہیں کرا سکتا تھا۔ قربانی کے بکرے کی طرح اسے نیچے دھکیل دیا اور پھر رسّی کے سہارے وہ نیچے جانے لگا۔ ابھی وہ درمیان میں تھا کہ میں نے روک دیا۔ ”بس اب رسّی کہیں باندھ دو، اسے یہیں لٹکا رہنے دو۔“

کسی طرف سے فائرنگ یا مزاحمت نہیں ہوئی تھی اس کا مطلب تھا کہ کوئی نیچے تھا تو وہ وائس بم کا شکار ہو گیا تھا۔ رسی کو ایک طرف باندھ دیا گیا اور سب نیچے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے سات رسیاں باندھی تھیں۔ بیتو نے پوچھا۔ ”جو نیچے ملے ان کا کیا کرنا ہے؟“

نیچے موجود گارڈز بہت خطرناک تھے انہیں موقع ملتا تو وہ ہمیں نہیں چھوڑتے اور ہمارے پاس نہ تو وقت تھا اور نہ ذرائع تھے کہ انہیں قیدی بنا لیتے۔ ہم صرف سات تھے۔ ان کا ایک ہی حل تھا۔ میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”دیکھتے ہی شوٹ کر دینا۔ البتہ جو بم کا شکار ہوں اور تمہاری پہنچ میں ہوں ان کو سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دینا۔ مگر یاد رکھنا بلا ضرورت فائر نہیں کرنا ہم جتنی خاموشی سے نیچے پہنچ جائیں اتنا ہی اچھا ہوگا۔“

ہم نے رسیاں نیچے لٹکائیں اور سب ایک ساتھ نیچے جانے لگے۔ کلپ میں ہونے کی وجہ سے رسی پر گرفت تھی اور صرف ایک ہاتھ سے رسی چھوڑی جا سکتی تھی۔ دوسرا ہاتھ ہتھیار سنبھالنے کے لیے آزاد تھا۔ ایسے میں شانے سے لٹکی رائفل سب سے بہترین ہتھیار تھا کیونکہ بہ وقت ضرورت اسے چھوڑا بھی جا سکتا تھا۔ ریلنگ سے نیچے آتے ہی مجھے ایک وسیع ہال دکھائی دیا۔ یہ ان سیڑھیوں کے چاروں طرف تھا۔ اوپر جو کمرے تھے یہاں ان کے نیچے بھی ہال تھا اس لیے اس کی وسعت بہت زیادہ ہو گئی۔ مگر جہاں تک میں دیکھ رہا تھا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف سیڑھیوں کا ایک بڑا حصہ غائب تھا اور آس پاس بھی دھماکے کی تباہی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نچلی سیڑھیوں کے پاس آیا تو ریلنگ پر ٹک کر ہال میں اتر آیا۔ رسی چھوڑ دی تھی۔ اتنے میں باقی سب بھی نیچے آ چکے تھے۔ دوسری طرف کئی افراد تھے جو وائس بم کی تباہ کاری کا شکار ہو گئے تھے اور ان میں سے کوئی ہوش میں نہیں تھا۔

میں گھوم کر اس طرف آیا جہاں فتح خان کا ایک آدمی خنجر نکالے ان کی گردن کاٹنے کی تیاری کر رہا تھا مگر میں نے اسے روک دیا اور ان پانچ افراد کو چیک کیا جو پوری طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس گیس ماسک اور نائٹ ویژن بھی تھے مگر وائس بم ان کے لیے غیر متوقع ثابت ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کے کانوں سے خون نکل آیا تھا شاید اس کے کان کا پردہ پھٹ گیا تھا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی کیونکہ فیوز اڑا ہوا تھا۔ میں نیچے آتے ہوئے تار کا ٹکڑا لے آیا تھا۔ اس کے پیس کر کے دو افراد کو دیئے اور ان کو سمجھایا کہ نیچے جاتے ہوئے جہاں روشنی نظر آئے وہ کسی بھی ساکٹ میں انہیں ڈال کر آن کر دیں۔ اس حصے کا فیوز اڑ جائے گا۔ ویسے مجھے حیرت ہوئی تھی کہ کنور پیلس جیسی عمارت کا بجلی کا نظام اتنا ناقص تھا کہ ایک ہی فیوز پر دو فلور چل رہے تھے۔ اس لیے جب فیوز اڑا تو دونوں فلور تاریکی میں ڈوب گئے۔ جب تک میں بے ہوش افراد کو چیک کر رہا تھا باقی سب اس فلور کے سامنے نظر آنے والے کمرے اور حصے چیک کر رہے تھے۔

اس سے نچلے فلور پر روشنی دکھائی دے رہی تھی اور اونچی بلندی سے وہ گراؤنڈ کے بجائے میزانائن فلور لگ رہا تھا۔ وائس بم کی آواز نہ صرف اس عمارت بلکہ اس کے آس پاس بھی گئی ہوگی اور یقیناً اب نیچے والے ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ اچھا حربہ تھا اگر ان کے پاس توڑ ہوتا تو وہ پہلے سے کر کے رکھتے۔ اسے دوبارہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بیتو نے چند منٹ بعد رپورٹ دی۔ ”اب یہاں کوئی نہیں ہے۔“

”ہمیں نیچے جانا ہوگا۔“ میں نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ پھر گورکھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے نیچے اتارو.... یہ ہماری ڈھال ہوگا۔“

وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ رسی کاٹ کر اسے نیچے اتارا۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے تھے کہ وہ خود کو آزاد نہ کرا سکے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم آگے چلو گے لیکن کوئی آواز نہ نکالنا اور نہ ہی بھاگنے کی کوشش کرنا ورنہ فوری مارے جاؤ گے۔“

وہ دہشت زدہ تھا مگر میری بات سمجھ گیا اس نے سر ہلایا تھا۔ اسے آگے رکھتے ہوئے ہم دبے قدموں سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ سب نے گیس ماسک منہ پر فٹ کر لیے تھے۔ چند لمحے بعد ہم اس میزانائن فلور پر تھے۔ جس میں سیڑھیوں کے چاروں طرف چھوٹی راہداری تھی اور اس سے چاروں طرف مختلف راستے نکل رہے تھے۔ یہاں بھی کوئی نظر نہیں آیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ بیتو نے ہاتھ کے اشارے سے فتح خان کے آدمیوں کو مختلف سمتوں کو چیک کرنے کا حکم دیا۔ وہ راہداری میں پھیل گئے۔ وہ مختلف راستوں پر دیکھ رہے تھے۔ یہاں بھی گھپ اندھیرا تھا لیکن نائٹ ویژن سے سب صاف نظر آ رہا تھا۔ میں سیڑھیوں پر تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب دشمن کی طرف سے مزاحمت کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ ایسا تو ممکن نہیں تھا کہ دشمن سکون سے بیٹھ گیا ہو۔ وہ نیچے تھے اور ہماری آمد کا

انتظار کررہے تھے۔

دیکھا جائے تو یہ ناقص حکمت عملی تھی لیکن بڑا کنور ایک چیز سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ سادی اس کے ساتھ تھی اور وہ بھی نچلے فلور پر تھی اس کی وجہ سے ہم اس فلور پر حملے کے دوران کوئی تباہ کن ہتھیار استعمال نہیں کرسکتے تھے جس کی تباہی کا احاطہ وسیع ہو۔ وہاں ہم صرف آتشیں ہتھیار استعمال کرسکتے تھے اور ان کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود بڑے کنور کو کچھ آدمیوں کو یہاں چھوڑنا چاہیے تھا مگر ایسا لگ رہا تھا اس نے اپنی ساری قوت ایک جگہ جمع کرلی تھی۔ مگر منطق کہہ رہی تھی ایسا ممکن نہیں ہے۔ نیچے کوئی نہ کوئی ٹریپ ہوگا۔ کیا اس صورت میں ہم سب کا ایک ساتھ ہی نیچے جانا مناسب تھا؟ میں نے بیتو کو بلایا۔ ''میں سوچ رہا ہوں ہمیں خفیہ راستہ بھی استعمال کرنا چاہیے۔''

''وہ کیوں شوبی؟''

''نیچے وہ ہمارے منتظر ہیں اور انہوں نے جان لیا ہے کہ ہم ان سیڑھیوں سے نیچے آرہے ہیں۔ اس لیے خفیہ دروازے والی سیڑھیوں پر ان کی توجہ اتنی نہیں ہوگی ہم اس طرف سے بھی حملہ کریں تو یہ ان کے لیے غیر متوقع ہوگا۔''

''بات تو سمجھ میں آتا ہے۔'' بیتو نے سر ہلایا۔

''میں ایک آدمی کے ساتھ اس طرف سے جاتا ہوں کیونکہ میں وہ جگہ دیکھ چکا ہوں۔ تم باقیوں کے ساتھ اسی طرف سے نیچے اترو مگر بہت احتیاط سے کسی ٹریپ کا خیال رکھنا اور اس قیدی کو آگے رکھنا۔ اگر کچھ ہوا تو یہی سب سے پہلے نشانہ بنے گا اور تم لوگ ہوشیار ہوجاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے شوبی۔'' بیتو نے مستعدی سے کہا۔

میں نے فتح خان کے آدمیوں میں سے ایک نوجوان کو پاس بلایا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''سنگین خان۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ اسم بامسمّیٰ تھا۔ نوجوانی کے باوجود چہرے کے تاثرات سنگین تھے۔ جسم دبلا لیکن گٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو کپڑے کے نیچے پتھر لگا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ ہم اوپر والے راستے سے نیچے جائیں گے۔''

ہم واپس آئے اور رسی کی مدد سے اوپر پہنچے۔ میں نے ریڈیو پر بیتو سے کہا۔ ''محفوظ حد تک آگے جاؤ اور جب کسی کی موجودگی محسوس ہو تو رک جانا جب تک میں نہ کہوں آگے مت جانا۔''

''یس سر۔'' بیتو نے کہا۔

کمرے سے سیڑھیوں کی طرف کھلنے والا خفیہ راستہ کھولا۔ یہ یقیناً بجلی سے کام کرتا تھا اور اس کی بجلی کا سسٹم بھی الگ تھا ورنہ یہاں کا فیوز اڑ جانے کے بعد اسے بھی کام نہیں کرنا چاہیے تھا مگر وہ کام کررہا تھا۔ میں آگے تھا۔ پہلے مجھے دیکھا مگر وہاں کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہورہا تھا اور سب سے نچلے فلور پر روشنی ہورہی تھی۔ خفیہ دروازے کو دوسری طرف سے کھولنے یا بند کرنے کا میکنزم چھپا ہوا تھا اس لیے مجبوراً اسے کھلا چھوڑنا پڑا۔ شاید کچھ دیر بعد وہ خود بند ہوجاتا۔ سنگین مجھ سے چند سیڑھیاں پیچھے تھا۔ وہ ذرا بے احتیاطی سے چل رہا تھا جس سے آواز پیدا ہورہی تھی۔ میں نے مڑ کر اسے اشارہ کیا کہ وہ بالکل بے آواز چلے۔ اس نے سر ہلایا اور اب احتیاط سے قدم رکھنے لگا۔ ہر دس بارہ سیڑھیوں کے بعد میں سن گن لیتا تھا کہ نیچے کوئی ہے تو نہیں۔

میں اتنا نیچے آیا کہ مجھے راہداری دکھائی دینے لگی۔ یہاں کسی قدر روشنی تھی، میں نے نائٹ ویژن آف کردیا۔ پھر جھک کر دیکھا۔ اگر کوئی اس طرف نگران تھا تو اسے میرے پاؤں پہلے نظر آتے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دو سیڑھیاں مزید اتر کر دیکھا اور اس بار مجھے اس کمرے کے سامنے دو افراد دکھائی دیئے جس میں نیچے جانے والا خفیہ راستہ تھا۔ وہ خودکار رائفلوں سے مسلح اور پوری طرح چوکس تھے۔ ان کی نظریں بھی اسی طرف مرکوز تھیں۔ گویا انہیں اس طرف سے خطرہ تھا۔ اگر میں بے احتیاطی سے اترتا تو وہ مجھے دیکھ لیتے۔ شاید سیڑھیوں کے ٹوٹے بلبوں سے انہوں نے جان لیا تھا کہ کوئی یہاں سے گزرا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے انہوں نے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے ذرا اوپر ہوکر بیتو سے رپورٹ لی۔ اس نے بتایا۔ ''شوبی ہم نیچے آگیا ہے مگر یہاں کئی آدمی ہے اور ایسا لگ رہا ہے ہمارا انتظار کررہا ہے۔''

میں فکرمند ہوگیا۔ ''کتنے آدمی ہیں؟''

''پانچ چھ ہے۔''

میری فکر مزید بڑھ گئی تھی۔ ''بیتو ڈیجیٹل میپ پر دیکھو، کیا اس میں یہ خفیہ سیڑھی موجود ہے۔''

''ایک منٹ ہم دیکھتا ہے۔'' اس نے کہا اور کچھ دیر بعد بولا۔ ''نہیں شوبی ایسا کوئی سیڑھی نہیں ہے۔ البتہ اس سے آگے والا راہداری موجود ہے جدھر سے آپ آیا۔''

''راہداری میں سیڑھیوں کی طرف سے الٹی طرف کا تیسرا کمرا ہے۔''

''بالکل ہے۔''

''اس کے واش روم میں آؤ۔''

''آگیا۔''

''اس میں ایک کونے میں تین دیواروں والا حصہ بنا ہوا ہے سامنے اُلٹے کونے پر؟''

''نہیں شوبی اس میں ایسا کوئی چیز نہیں ہے۔''

''خبیث۔'' میں غرایا۔

''شوبی ہم کیا کیا؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''تمہیں نہیں ایک اور شخص کو کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بیتو واپس آؤ، آگے مت جانا.... اوپر آکر اسی خفیہ راستے سے نیچے آؤ.... میں پھر کہہ رہا ہوں آگے مت جانا۔''

''ہم آتا ہے۔'' بیتو بولا اس نے کچھ اور بھی کہا تھا لیکن اس کی آواز فائرنگ کے بے پناہ شور میں گم ہوگئی۔ آواز اتنی شدید تھی کہ یہاں تک بغیر ریڈیو کے بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دو تین بار بیتو کو پکارا۔ وہ بھی جواب میں کچھ کہہ رہا تھا مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بہرحال اس کی آواز سے مجھے تسلی ہوئی تھی کہ وہ ٹھیک تھا۔ سنگین اس وقت نیچے کی نگرانی کررہا تھا اس نے مجھ سے کہا۔

''وہ دونوں آگے آرہے ہیں۔''

''سنگین دونوں کو گرانا ہے۔ بالکل موقع نہیں دینا ہے۔ میں یہاں سے نیچے کودوں گا۔'' میں نے سیڑھی کے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نیچے آکر دیوار کی آڑ سے انہیں نشانہ بناؤ گے۔ دو طرف سے حملہ ہوگا تو وہ جوابی کارروائی نہیں کرسکیں گے، میری بات سمجھ گئے؟''

''ہم سمجھ گیا۔''

''گڈ! جیسے ہی میں نیچے کودوں اور وہ میری طرف متوجہ ہوں گے تب تم نیچے جاتے ہوئے انہیں نشانہ بناؤ گے۔ دیر کروگے تو میں مارا جاؤں گا۔''

''آپ فکر نہ کرو۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں نے سر ہلایا اور ریلنگ سے ہوتے ہوئے نیچے چھلانگ لگادی۔ ابھی میرے پاؤں فرش سے لگے تھے کہ سنگین کی رائفل گولیاں اگلنے لگی۔ دونوں گارڈز مجھ سے چھ سات گز دور تھے اور مجھے دیکھتے ہی انہوں نے رائفلیں سیدھی کرنا شروع کردی تھیں۔ مگر اس سے پہلے وہ فائرنگ کرتے سنگین نے دونوں کو نشانہ بنالیا تھا۔ وہ جھٹکے کھاتے پیچھے گئے تھے۔ حفظ ماتقدم میں، میں کسی حد تک مڑی سیڑھی کی دیوار کے ساتھ چپک گیا تھا مگر انہیں فائرنگ کا موقع نہیں ملا تھا۔ سنگین نے ان کے سروں کو نشانہ بنایا تھا کیونکہ بلٹ پروف کی موجودگی عین ممکن تھی۔ پاس جاتے ہوئے اس نے رائفل کو سنگل موڈ پر کرتے ہوئے دونوں کو مزید چند گولیاں ماریں۔

میں نے آڑ سے نکلتے ہوئے سیڑھیوں سے آگے نکلنے والے راستے کی طرف دیکھا جہاں سے فائرنگ کا بے پناہ شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے دوبارہ بیتو کو پکارا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''ہم اوپر آگیا ہے پر قیدی اور دو ساتھی مارا گیا ہے۔''

''اوہ! اب جلدی کرو.... مجھے لگ رہا ہے مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔'' میں نے کہا اور رائفل سیدھی کرکے ان تین گارڈز پر برسٹ مارا جو سامنے سے نمودار ہوئے تھے۔ دو گرے اور تیسرا پلٹ کر بھاگا۔ ان کی طرف سے چلائی چند گولیاں میرے آس پاس سے گزر گئی تھیں۔ مجھے عقب سے عجیب سی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سنگین دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا دبوچے ہوئے تھا اور اس سے خون پھوٹ رہا تھا۔ گولی اس کی گردن سے گزر گئی تھی۔ وہ گرنے لگا تو میں نے تیزی سے اسے سنبھالا اور نیچے لٹا دیا۔ اس نے گردن اتنی مضبوطی سے پکڑی تھی کہ مجھے زخم دیکھنے کے لیے باقاعدہ زور لگا کر اس کے ہاتھ ہٹانا پڑا تھا اور فوراً ہی خون فوارے کی طرح اچھلا تھا۔ زخم بہت بڑا اور خطرناک تھا۔ اس کا بچنا محال لگ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ سانس لینے کی کوشش کررہا تھا مگر ایک منٹ سے بھی پہلے اس نے دم توڑ دیا۔ میں گہری سانس لے کر پیچھے ہوا اور پھر اس کی رائفل، اضافی ایمونیشن اور بم لے لیے تھے۔ مجھے ان کی ضرورت پڑسکتی تھی۔ میری رائفل خالی تھی اس کا میگزین تبدیل کیا۔ پھر میں نے بیتو سے پوچھا۔ ''کہاں ہو؟''

''سیڑھیوں سے نیچے آرہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تیزی سے آؤ، یہاں بس میں ہوں۔''

کچھ دیر بعد بیتو اوپر سے نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے فتح خان کے بچ جانے والے دو ساتھی تھے۔ سنگین کی لاش دیکھ کر وہ چند لمحے کور کے تھے۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''مجھے لگ رہا ہے مجھے ٹریپ کیا گیا ہے اور ہمیں جان بوجھ کر اوپر الجھایا گیا تھا۔''

”مگر کیوں؟“

”تاکہ بڑا کنور سادی کو لے کر سیف ہاؤس میں جا سکے۔“ میں نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”اس فلور کی لائٹ بھی اُڑا دو۔“

فتح خان کے ایک آدمی نے تار کی مدد سے یہاں کا بھی فیوز اُڑا دیا۔ روشنی بند ہوتے ہی ہم نے نائٹ ویژن آن کر لیے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں رکا۔ پھر بیتو کو اشارے سے پاس بلایا۔ ”فائرنگ کون کر رہا تھا؟“

”ہم کو لگ رہا ہے وہاں آٹو میٹک رائفل لگا تھا جیسا ڈیوڈ شا نے لگایا تھا کیونکہ وہ پانچ آدمی فائر نہیں کیا۔“

”ایسا ہی کوئی ٹریپ یہاں بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ آلہ کہاں ہے جو دیواروں کے پار زندہ چیزیں دکھاتا ہے۔“

بیتو نے اپنے بیگ سے وہ آلہ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے اسے آن کیا اور کمرے کی طرف رخ کیا مگر وہاں کوئی فرد نہیں تھا۔ میں نے راہداری کے باقی کمرے چیک کیے۔ وہ بھی خالی تھے۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ فلور خالی ہو گیا ہے لیکن کسی ٹریپ کی موجودگی عین ممکن تھی۔ فتح خان کے آدمی سیڑھیوں کے پاس تھے۔ بیتو فکر مند تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شوبی اب کیا کرنا ہے؟“

”ہمیں نیچے جانا ہے لیکن شاید یہ اتنا آسان نہ ہو۔“ میں نے کہا اور رسّی نکال کر ایک ہینڈ گرنیڈ کمرے کے دروازے کے ہینڈل سے لگایا۔ پھر اس کی پن سے رسّی منسلک کی اور اسے چھوڑتے ہوئے سیڑھیوں تک آئے، یہاں محفوظ پوزیشن لے کر میں نے پن کھینچ لی۔ چند لمحے بعد زوردار دھماکا ہوا اور دروازہ اُڑ گیا۔ دھویں اور گرد کا ایک ریلا آیا تھا۔ اس کے ذرا بیٹھتے ہی ہم تیزی سے آگے آئے۔ مجھے خدشہ تھا کہ دروازے کے ساتھ کوئی ٹریپ نہ لگا دیا گیا ہو۔ اسی لیے میں نے دروازہ ہی اُڑا دیا اگر اس کے ساتھ کوئی ٹریپ ہوتا تو وہ بھی اُڑ جاتا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا میرا اندازہ غلط تھا۔ ماسک کی وجہ سے ہم دھویں اور گرد سے بھی محفوظ رہے تھے۔ ایک آدمی کو راہداری میں چھوڑا تھا تاکہ کوئی بے خبری میں نہ آ جائے۔ میں بیتو کے ساتھ واش روم میں آیا جہاں خفیہ راستے والا خانہ تھا۔ بیتو نے دیکھا اور بولا۔

”یہ تو میپ میں نہیں تھا۔“

”اسی لیے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔“

”اب ہم سمجھ گیا آپ منشی کو گالی دے رہا تھا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”وہی شخص اس مشن کی ناکامی کا ذمے دار ہے۔“

”پر شوبی اسے کیا فائدہ ہوا.....وہ بھی تو کنوروں کا دشمن ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ اس نے ڈیوڈ شا کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلائی ہے اور وہ اس زعم میں رہ گیا کہ اسے کون دھوکا دینے کی جرات کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”منشی دل جی کا اپنا کوئی مقصد ہے جو ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا لیکن جلد سمجھ میں آ جائے گا۔“

”شوبی یہ کیسے کھلے گا؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن اسے اُڑایا جا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس صورت میں اندر موجود افراد فوراً ہوشیار ہو جائیں گے۔ راستہ ایسا ہے کہ اس کا دفاع آسان ہے۔“

”شوبی ڈبل حملہ کرو۔“ بیتو نے تجویز دی۔ ”پہلے اسے اُڑاؤ پھر اندر گرنیڈ پھینک دو۔“

میں نے انکار کیا۔ ”نہیں، مجھے خدشہ ہے سادی نیچے نہ ہو۔“

”اوہ، ہم دیدی کو بھول گیا تھا۔“ بیتو بولا۔

”پہلے اسے کھولنا ہو گا۔“ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ یہاں گرنیڈ لگانے کی جگہ نہیں تھی۔ بیتو نے اس کا حل نکالا۔ وہ سیفٹی ٹینک کا ڈھکن اٹھا لایا اور اسے دروازے کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر گرنیڈ اس میں پھنسایا اور رسّی گرنیڈ کی چابی سے باندھی۔ اسے کمرے تک لائے اور پھر رسّی کھینچ لی۔ دھماکا ہوتے ہی بیتو نے واش روم کا دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔

”اب سارا دھواں اور گرد نیچے جائے گا۔“

چند منٹ بعد ہم اندر داخل ہوئے تو صاف ستھرے اور چمکتے دمکتے واش روم کا حشر ہو گیا تھا۔ خفیہ دروازے میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا تھا جس سے ایک آدمی گزر کر جا سکتا تھا۔ میں نے زندہ اجسام کی نشان دہی کرنے والے آلے کو آگے کیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ تقریباً پچیس فٹ دور دو زندہ جسم تھے اور وہ حرکت کر رہے تھے۔ وہ سیڑھیوں والے راستے سے دور تھے۔ اب یہ دو فرد کون تھے میں ان کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ بیتو نے مشورہ دیا۔ ”ان کو

وارننگ دو کہ ہتھیار پھینک کر سامنے آ جائیں ورنہ اگلا بم ان کے ٹکڑے کر دے گا۔“

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور دونوں افراد تیزی سے وہاں سے دور ہٹ گئے۔ وہ اس چھوٹے ہال میں آنے والی سرنگ کی طرف چلے گئے تھے اور پھر وہ آلے کی رینج سے نکل گئے۔ مگر خطرہ تھا نیچے بھی خود کار رائفل کی موجودگی عین ممکن تھی۔ اس قسم کے ہتھیاروں کو مستقبل کی جنگ کے ہتھیار کہا جاتا ہے لیکن یہ جنگوں سے پہلے عام زندگی میں استعمال میں ہو رہے تھے۔ میں نے بیتو سے کہا۔ ”میں نیچے جا رہا ہوں۔“

بیتو کے ذہن میں بھی ٹریپ کا خیال تھا۔ اس نے اختلاف کیا۔ ”ہم جائے گا۔“

”میں جاؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تم اوپر رہو اور جب میں کہوں تو نیچے آؤ ان دونوں کو بھی بلا لو۔“

بیتو سمجھ گیا کہ میں نہیں مانوں گا۔ مجبوراً اس نے ان دونوں کو بلایا اور میں دروازے کے خلا سے ہوتا ہوا سیڑھیوں پر آ گیا۔ یہاں ملبا بکھرا ہوا تھا اور مجھے سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا۔ میں نے زندہ اجسام کی نشان دہی کرنے والا آلہ آگے رکھا تھا اور وہ بتا رہا تھا کہ فی الحال اس کی حد میں کوئی زندہ چیز نہیں تھی۔ چھوٹا ہال خالی تھا۔ میں نیچے تک آیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ وہاں کوئی ٹریپ نہیں تھا۔ میں نے ریڈیو پر سرگوشی میں بیتو کو ان دونوں سمیت نیچے آنے کو کہا۔ چند لمحے بعد وہ بھی نیچے تھے۔ میں نے اشارے سے سب کو بولنے سے منع کیا اس کا پورا امکان تھا کہ یہاں ہونے والی گفتگو کہیں سنی جا رہی ہو۔ بیتو نے فولادی دروازے کی طرف دیکھا اور اشارے سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

میں نے جوابی اشارے سے بتایا کہ ممکنہ طور سیف ہاؤس ہے۔ میں دیوار کے ساتھ رہتے ہوئے آلہ لے کر سرنگ کی طرف بڑھا۔ سرنگ کے پاس آتے ہی اس پر دو دھبے نمایاں ہوئے تھے۔ وہ مشکل سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھے جہاں سے سرنگ ذرا مڑ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ کسی قدر آڑ سے مجھے ایک گارڈ کا پاؤں دکھائی دیا۔ میں نے ملبے کا ایک ٹکڑا لے کر ان کی طرف اچھال دیا۔ ٹکڑا گرا تو وہ بھڑک کر پیچھے ہوئے تھے۔ پھر ایک نے رائفل نکال کر ہال کی طرف برسٹ مارا۔ اس بند جگہ فائرنگ کا شور بے پناہ تھا۔ جیسے ہی اس کی رائفل خاموش ہوئی میں نے جوابی برسٹ مارا۔ پھر آلے پر دیکھا وہ پیچھے ہٹ رہے تھے اور پھر آلے کی حد سے نکل گئے۔ میں نے بیتو کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھا۔ میں نے رائفل سنگل موڈ پر کر لی تھی۔ سرنگ کے موڑ کے پاس آ کر میں نے پھر آلہ دیکھا وہ دونوں اب پندرہ گز کے فاصلے پر تھے۔

میں نے اچانک سامنے آ کر سامنے والے کے پیر پر فائر کیا اور اس سے پہلے وہ جوابی کارروائی کرتے میں دوبارہ آڑ میں آ گیا تھا۔ اس میں مشکل سے ایک لمحہ لگا تھا۔ گولی نشانے پر بیٹھی اور گارڈ کی چیخ گونجی تھی۔ اس کے ساتھی نے پھر برسٹ مارا۔ میں آلے پر دیکھ رہا تھا۔ برسٹ مارنے کے بعد دوسرا گارڈ اپنے ساتھی کو سنبھال رہا تھا۔ ممکنہ طور پر اس کی توجہ اب میری طرف نہیں تھی۔ میں دوبارہ آڑ سے نکلا اور اس بار اسے نشانہ بنایا۔ اس بار بھی میں نے اوپری جسم کے بجائے پیروں کا نشانہ لیا تھا۔ گارڈ اپنے زخمی ساتھی کو سہارا دے کر لے جا رہا تھا اور اس کی پشت میری طرف تھی۔ گولی اس کی ران میں اتر گئی اور وہ کراہ کر اپنے ساتھی سمیت گرا۔ اب وہ اپنی رائفل سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر رائفل کی نال ماری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ دوسرا پہلے ہی بے حال تھا اس نے ہاتھ اٹھا دیے اور بولا۔ ”مجھے مت مارنا۔“

”تم صرف ایک شرط پر زندہ رہ سکتے ہو۔“ میں نے رائفل کی نال اس کے سینے سے لگا دی۔ ”مجھے بڑے کنور کا پتا بتاؤ وہ کہاں ہے؟“

”بڑا کنور سیف ہاؤس میں جا چکا ہے۔“ اس گورکھے گارڈ نے پڑھے لکھے انداز میں کہا۔ اس کی اردو یا ہندی صاف تھی۔ اس نے میرے خدشے کی تصدیق کر دی تھی۔ لیکن میں نے اسے جھٹلایا۔

”بکواس! اتنے گارڈز کے ہوتے ہوئے اسے سیف ہاؤس میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ تو وہی جانے۔“ گارڈ نے کراہ کر کہا۔ گولی نے اس کے گھٹنے کی ہڈی توڑ دی تھی اور وہ شدید تکلیف میں تھا۔

”باقی گارڈز کہاں ہیں، کم سے کم بیس افراد اور ہونے چاہئیں اور یہاں صرف تم دو ہو؟“

”پندرہ گارڈز بڑے کنور کے ساتھ ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”باقی سات سرنگ کے دوسرے حصوں میں ہیں۔“

”سیف ہاؤس کا دروازہ کیسے کھلتا ہے جب کہ یہ

ظاہر کوئی چیز نہیں ہے دروازہ کھولنے والی۔"

"بڑے کنور کے پاس اس کا ریموٹ کنٹرول ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔ "صرف اس کی مدد سے یہ دروازہ کھولا اور بند کیا جاسکتا ہے۔"

میرے مزید کچھ سوالوں کے جواب میں اس نے سیف ہاؤس کی نوعیت بیان کی۔ یہ چاروں طرف سے دس سینٹی میٹر موٹی خاص اسٹیل کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا اس کا رقبہ تقریباً دو سو مربع گز تھا۔ اس میں ایک اسپیشل سوٹ اور محافظوں کے کمرے اور ایک خاص کنٹرول روم بھی تھا جس سے پورے پیلس کے خاص خاص حصوں پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔ یہاں سے کنٹرول ہونے والے کیمرے اور مائیک خفیہ تھے اور سوائے چند خاص افراد کے کسی کو ان کی لوکیشن کا علم نہیں تھا۔ سیف ہاؤس میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ یہ بم کے حملے سے بھی محفوظ تھا۔ اسے پیلس پر قبائیلوں کے حملے کے بعد تعمیر کرایا گیا تھا اور اس کے لیے خاص طور سے جرمنی سے انجینئر اور سامان آیا تھا۔ تعمیراتی مزدور بھی نامعلوم مقام سے لائے گئے تھے۔ جنہیں کام کے بعد یہاں سے لے جایا گیا تھا۔ اس کے خاص اسٹیل کو صرف تین ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا شعلہ کاٹ سکتا ہے اور اس میں سوراخ کرنے کے لیے جتنی گیس درکار ہوگی اسے حاصل کرنا ہی بہت مشکل ہے۔ دوسرے لفظوں میں سیف ہاؤس تک رسائی ناممکن تھی۔

"کیا باہر کسی طریقے سے اندر رابطہ کیا جاسکتا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "چھوٹے ہال میں مائیک لگے ہوئے ہیں اور وہاں موجود ہر فرد کو اندر دیکھا جارہا ہوگا۔" گارڈ نے جواب دیا تو میں چونکا اور ریڈیو پر بیتو سے کہا۔

"تم تینوں فوراً سرنگ میں آجاؤ۔"

بیتو ان دونوں کو لے کر آگیا۔ میں نے اسے مختصراً گارڈ سے حاصل شدہ معلومات سے آگاہ کیا۔ بیتو مضطرب ہوگیا۔ "شوبی اب کیا کرے وہ ڈیڈی کو اندر لے گیا ہے۔"

"یہی نہیں بڑا کنور ہماری یہاں موجودگی سے بھی واقف ہے۔ مجھے یقین ہے ان سرنگوں میں خفیہ کیمرے اور مائیک ہوں گے جنہیں تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔"

"ہمارے بارے میں بے شک جان جائے پر ہم اندر کیسے جاسکتا ہے؟"

یہ سوال میرے ذہن میں بھی تھا۔ مگر اس سے پہلے کچھ سوال اور بھی ذہن میں آرہے تھے۔ میں نے گارڈ سے پوچھا۔ "تم لوگ آپس میں کس طرح رابطہ کرتے ہو؟"

اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا لیکن نہایت جدید واکی ٹاکی سیٹ نکالا۔ "تمام گارڈز کے پاس یہ ہوتا ہے ہم اسی سے ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہیں۔"

میں نے اسے نظر جما کر دیکھا۔ "تم مجھے پہچانتے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "آپ ادھر بڑے کنور کے پاس تھا۔ میں نے آپ کو کئی بار دیکھا تھا۔"

"میں بڑے کنور کا دوست نہیں ہوں لیکن میں اس کا جانی دشمن بھی نہیں ہوں، میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ لیکن کچھ لوگ اس کی جان کے دشمن ہیں اور وہ اسے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان میں سرفہرست منشی دل جی ہے۔ یہاں حملے کا منصوبہ اسی نے بنایا تھا اور ہم اسی وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ گھر کا بھیدی تھا۔ مگر اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی استعمال کیا ہے۔ اس وقت پیلس میں موجود میرے سارے ساتھی مارے جاچکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی ہلاکت کے پیچھے منشی دل جی ہے۔ اس سے پہلے اس نے ہمارے ہاتھوں کنور پیلس کی سیکیورٹی کو ختم کرایا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت یہاں آنے والا ہے اور اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے بلکہ یہاں پیلس میں اس کے چھپے حامی موجود ہیں جو اس کی مدد کریں گے۔"

گارڈ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "آپ مجھے کیوں بتا رہے ہو، میں کیا کرسکتا ہوں۔"

میں کھڑا ہوگیا۔ "میں تمہیں نہیں اسے بتا رہا ہوں جو سب کچھ کرسکتا ہے۔ بڑے کنور کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

جواب میں خاموشی رہی تھی۔ میں نے پھر کہا۔ "میں منشی دل جی کا منصوبہ سمجھ چکا ہوں اور تم یہ مت سمجھو کہ تم سیف ہاؤس میں محفوظ رہو گے، مجھے یقین ہے اس کے پاس تمہارے لیے بھی کوئی سرپرائز ہوگا۔ دیر کرو گے تو پھر موقع نہیں ملے گا ابھی وقت ہے مجھ سے بات کرلو۔"

ایک بار پھر خاموشی طاری رہی تھی۔ لیکن میں تیسری بار بولنے جارہا تھا کہ میرے ہاتھ میں موجود واکی ٹاکی سے بپ ابھری۔ میں نے اس کے ریسیور کا بٹن آن کرکے کان سے لگایا۔ "ہیلو...."

"شہباز...." دوسری طرف سے بڑے کنور کی مخصوص ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ میں چھوٹے ہال کی طرف چلا آیا۔

"اس کا مطلب ہے تم نے سنا ہے جو میں نے کہا ہے؟"

"ہاں، میں نے سب سن لیا ہے اور میں تم سے متفق نہیں ہوں۔"

"میرا خیال ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب تم مجھ سے متفق ہوجاؤ گے۔ میں نے جو کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔"

"پیلس پر حملہ تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیا ہے؟"

"ہاں منشی دل جی ہمارے ساتھ شامل ہے۔"

"لیکن اصل میں حملہ تم نے کیا ہے، تم سادھنا کو لے جانا چاہتے ہو؟"

"چلو تم ایسا ہی سمجھ لو.... ہمارا منصوبہ کامیاب رہا.... مگر عین موقع پر سب الٹ پلٹ گیا۔ باہر سے میزائل مار کر اندر موجود دونوں اے پی سی تباہ کردیں۔ اسنائپر نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کیا رامن تمہارے ساتھ ہے؟"

"نہیں وہ کہیں اور ہے۔"

"پتا نہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو یا نہیں بہرحال میں حملہ آوروں کے ساتھ نہیں تھا بلکہ بدقسمتی سے اس سے پہلے پیلس کے دو آدمیوں نے مجھے گرفتار کرلیا تھا۔ وہ مجھے یہاں لائے اور رامن نے مجھے اپنے قبضے میں کرلیا اور ان دونوں کو قید کر دیا کہ وہ تمہیں نہ آگاہ کرسکیں۔ میں قید خانے والی عمارت میں تھا۔"

بڑے کنور کے لہجے میں حیرت آئی۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"اس کا ثبوت سرنگ میں میری موجودگی تھی۔ مجھے تو ہیلی کاپٹر سے اترنے والی ٹیم کے ساتھ آنا تھا۔ لیکن میں قید خانے کی عمارت میں تھا اور جب وہ میزائل حملے میں تباہ ہوئی تو میں نے اتفاق سے خفیہ راستہ تلاش کرلیا۔"

"شہباز مجھے لگ رہا ہے تم سچ نہیں کہہ رہے ہو۔"

"اس کے برعکس مجھے لگ رہا ہے تم میری بات کو تسلیم کررہے ہو ورنہ اب تک مجھے جھٹلا چکے ہوتے۔ بہرحال میرے آدمی دو بکتر بند گاڑیوں میں اندر آئے اور تمہیں سن کر تعجب ہوگا وہ ان ہی میزائلوں کا نشانہ بن گئے جن سے پیلس کی عمارتوں کے داخلی دروازے تباہ کیے گئے تھے، مقصد اندر موجود لوگوں کو باہر نکلنے سے روکنا تھا۔ جو اسنائپر تمہارے گارڈز کو نشانہ بنا رہے تھے انہوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی اور مجھے مجبوراً قید خانے والی عمارت میں واپس آنا پڑا تھا۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟"

بڑا کنور کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا تھا پھر اس نے پوچھا۔ "منشی دل جی کس طرح سے تمہارے ساتھ شامل ہوا؟"

"اس کے ساتھ دو درجن یا اس سے زائد مقامی مسلح افراد ہیں اور اس کی ذمے داری کنور پیلس کے باہر کسی مدد کو یہاں تک آنے سے روکنا تھا جیسے پولیس یا کوئی بھی جو کنور پیلس آنا چاہے۔ یہ بتاؤ کیا تمہارا اب پیلس سے باہر رابطہ نہیں ہے، تم مدد طلب نہیں کرسکتے؟"

"تمہارے ساتھ آدمی کہاں سے آئے؟" اس نے میرا سوال نظرانداز کرکے پوچھا۔

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے۔ کنور میں تمہارا دشمن نہیں ہوں میں صرف سادی کو واپس لینے آیا ہوں۔ وہ میری بہن اور میرے دوست کی بیوی ہے۔ تم اچھی طرح جان گئے ہو گے کہ وہ اس زندگی سے کتنا خوش ہے وہ اپنا ماضی بھول چکی ہے۔ سادی کے ناتے میں نے کبھی تمہاری یا راج کی جان لینے کی کوشش نہیں کی حالانکہ مجھے بہت مواقع ملے۔ مجھے یہ معلوم بھی تھا تم دونوں مجھ سے دشمنی سے باز نہیں آؤ گے۔"

"مجھے تسلیم ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لیکن منشی دل جی تمہارے پورے خاندان کا دشمن ہے۔ اس کا مقصد اس جائداد اور جاگیر پر قبضہ کرنا ہے۔"

"وہ کسی صورت ایسا نہیں کرسکتا.... میرے بعد راج اور اس کے بعد اس کے لڑکے اس جاگیر کے وارث ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن منشی دل جی کی باتوں سے لگا کہ اسے پورا یقین ہے وہ اس جاگیر کا مالک بن جائے گا۔ ورنہ تم سوچو وہ اس خطرناک مہم میں کیوں ہمارا ساتھ دیتا۔"

بڑا کنور کسی قدر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں انتظار کررہا تھا کہ وہ کچھ بولے۔ جب وہ نہیں بولا تو مجھے کہنا پڑا۔ "تم وقت ضائع کررہے ہو۔"

"مجھے تمہاری بات کا کسی حد تک یقین آگیا ہے۔"

اس نے کہا۔

”اس صورت میں تم فوری یہاں سے نکلو اور میرے ساتھ چلو۔“

”میں اور سادھنا سیف ہاؤس میں محفوظ ہیں۔“

”یہ بتاؤ کہ منشی دل جی سیف ہاؤس سے واقف ہے؟“

”بالکل واقف ہے۔“

”کیا یہ اسی کی نگرانی میں تعمیر ہوا ہے؟“

”نہیں یہاں تمہارا اندازہ غلط ہے اسے ایک جرمن انجینئر نے ڈیزائن اور اپنی نگرانی میں تعمیر کرایا ہے۔ منشی دل جی کا اس کی تعمیر میں کوئی کردار نہیں تھا۔“

”پھر بھی وہ اس کے فنکشنز کے بارے میں تو جانتا ہے نا.... مجھے یقین ہے وہ سیف ہاؤس میں رسائی حاصل کر سکتا ہے۔“

”وہ یا کوئی دوسرا فرد یہاں نہیں گھس سکتا۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”اگر وہ یہاں گھس نہیں سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ پھر یہاں کیوں آ رہا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تم کچھ زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہو۔ سیف ہاؤس یا ایسی چیزیں انسان کے ارادے سے زیادہ مضبوط نہیں ہوتی ہیں۔ کہنے کو تمہاری سیکیورٹی بھی بہت مضبوط ہے لیکن دیکھ لو ضرورت کے وقت یہ کام نہیں آئی۔“

بڑے کنور سے گفتگو کرتے ہوئے میرے ذہن میں پھر وہی سوال آ رہا تھا کہ جب منشی دل جی اس جاگیر کا مالک نہیں بن سکتا تھا تو وہ یہ ساری تگ و دو کیوں کر رہا تھا؟ منشی دل جی نہایت شاطر اور کربہ مسکینی لیے ہوئے ایسا شخص تھا جس کے ظاہر و باطن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ کسی بڑے مقصد کے تحت ہی یہ سب کر رہا تھا۔ صرف بدلہ لینے کے لیے وہ اس حد تک نہیں جا سکتا تھا۔ بڑے کنور نے میری بات پر کہا۔ ”مجھے خوش فہمی نہیں ہے لیکن سیف ہاؤس سچ مچ محفوظ ہے۔ تم جانتے ہو امریکی صدر کی رہائش گاہ وائٹ ہاؤس کے نیچے بھی ایسا ہی ایک سیف ہاؤس ہے تم اسے تقریباً اتنا ہی محفوظ سمجھ سکتے ہو۔“

”یہ بحث بیکار ہے کہ سیف ہاؤس کتنا سیف ہے۔ مجھے یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ منشی دل جی کا یہاں ایسا کون سا مفاد ہے جس کے لیے وہ اس حد تک چلا گیا۔ تم نہیں جانتے اس مشن کو ناکام بنا کر اس نے صرف مجھے ہی نہیں ایک اور بہت بڑی شخصیت کو اپنا دشمن بنا لیا ہے اور ایسا وہ بلا مقصد نہیں کر سکتا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کنور پیلس یا تم سے منشی دل جی کا ایسا کون سے مفاد وابستہ ہے؟“

بڑا کنور کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں ایسے کسی مفاد سے واقف نہیں ہوں۔“

”اگر تم سچ مچ کسی ایسے مفاد سے ناواقف ہو تو جلد تم واقف ہو جاؤ گے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”کیا تمہارے دوسرے گارڈز جن کے پاس یہ واکی ٹاکی ہے ہماری گفتگو سن سکتے ہیں؟“

”نہیں جب تک کال نہ کی جائے کوئی ہماری بات نہیں سن سکتا۔“

”کیا تم سیف ہاؤس سے پیلس کے بیرونی حصوں پر نظر رکھ سکتے ہو؟“

”ہاں یہاں ایسا سسٹم ہے جو پیلس کے سو سے زائد حصوں کو دکھا سکتا ہے۔“

”تب بہتر ہوگا تمہارے آدمی مسلسل کیمروں پر نظر رکھیں۔“

”شہباز تم میری اتنی خیر خواہی کیوں کر رہے ہو؟“ بڑے کنور نے بہت دیر بعد کام کا سوال کیا۔

”مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے، مجھے صرف سادی کی فکر ہے کہ وہ محفوظ رہے۔ منشی دل جی جتنا تمہارا دشمن ہے اتنا ہی تمہارے بہن بھائیوں کا بھی دشمن ہے۔ اگر اس نے یہاں ٹیک اوور کر لیا تو وہ کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“

”مجھے یقین نہیں ہے کہ منشی ایسا کر سکتا ہے۔“

میں ہنسا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ وہ اہنسا کا پجاری....“

”میرا مطلب ہے وہ یہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔“ بڑے کنور نے ناگواری سے کہا۔ ”تم اسے کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہو۔“

”تمہارے باقی گارڈز کہاں ہیں؟“

”تمہیں ان سے کیا ہے؟“

”اگر تم چاہتے ہو کہ مزید کوئی اور یہاں داخل نہ ہو تو انہیں اس سرنگ کے تمام داخلی راستوں کی نگرانی کا حکم دو۔“ میں نے کہا۔ ”سیف ہاؤس کے سامنے والے چھوٹے ہال میں، میں اور میرے ساتھی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور رابطہ ختم کر دیا۔ میں نے فتح خان کے آدمیوں کو حکم دیا کہ دونوں زخمی گارڈز کو

چھوٹے ہال میں لے آئیں۔ وہ انہیں یہاں لے آئے۔ زخموں کی مرہم پٹی تو ممکن نہیں تھی لیکن خون روکنے کے لیے ان کے زخموں پر گدیاں رکھ کر اوپر سے ٹیپ کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ان سے اسلحہ لے لیا تھا۔ میں اس معاملے میں ان پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تک وہ ہمارے خلاف لڑتے رہے تھے ان کے کتنے ہی ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بڑے کنور کی طرف سے انہیں ہتھیار ڈالنے کا کوئی حکم بھی نہیں ملا تھا اس لیے وہ بدستور دشمن اور حالت جنگ میں تھے۔ میں نے انہیں خبردار کر دیا کہ اگر انہوں نے کوئی غلط حرکت کی تو نتیجے کی ذمے داری ان پر ہوگی۔ بیتو زندہ اجسام کی نشان دہی کرنے والے آلے کے ساتھ سیڑھیوں پر تھا تاکہ کوئی بے خبری میں اس طرف سے نہ آ جائے۔ باقی سرنگ کی طرف نگرانی کرنا آسان تھا۔ فتح خان کے دونوں آدمی وہیں لگا دیے تھے اور میں ہال میں تھا۔ میں فولادی دروازے کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ اتنا چمک دار تھا جیسے اسٹیل کے بجائے چاندی سے بنا ہو۔ ہاتھ پھیرنے پر بھی یہ عجیب سا لمس دے رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے بیتو سے آلہ لے کر اسے سیف ہاؤس پر چیک کیا تو اس کے دوسری طرف چند زندہ اجسام دکھائی دیے مگر یہاں آلے کی رینج صرف دس فٹ رہ گئی تھی۔ میں نے آلہ بیتو کو واپس کر دیا۔

”شوبی۔“ کچھ دیر بعد بیتو نے ریڈیو میں کہا۔ ”ادھر کچھ لوگ ہے۔“

میں تیزی سے سیڑھیوں پر آیا۔ بیتو تباہ شدہ دروازے کے نیچے بیٹھا تھا اور اس نے آلے کا رخ سامنے کر رکھا تھا۔ اس پر تین سرخ نقطے حرکت کر رہے تھے۔ وہ پچیس فٹ سے زیادہ دور تھے اس کا مطلب تھا وہ کمرے سے باہر راہداری میں تھے۔ میں نے بیتو سے کہا۔ ”اگر یہ واش روم میں آئیں تو گرنیڈ استعمال کرنا۔“

”شوبی، ان میں فتح خان نہ ہو۔“

”اگر وہ ہوتا تو ریڈیو پر رابطہ کر سکتا تھا اور دوسرے یہ تین ہیں باقی دو کون ہیں۔ نہیں یہ دشمن ہیں۔“ میں نے کہا۔ اسی لمحے واکی ٹاکی نے بپ دی۔ میں اسے لے کر نیچے آیا۔ ”کیا ہوا؟“

”کنور پیلس کے بیرونی کیمرے ایک ایک کر کے ناکارہ ہو رہے ہیں۔“ بڑے کنور نے پہلی بار کسی قدر فکرمندی سے کہا۔

”ایسا صرف گھر کا بھیدی کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”باہر تمہارے جو آدمی ہیں ان سے رابطہ ہے؟“

”کچھ سے رابطہ ہے لیکن وہ سب عمارتوں میں محصور ہیں۔“

”پھر بھی انہیں حکم دو کہ وہ چیک کریں۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”یہاں سرنگ میں سیف ہاؤس سے باہر کتنے آدمی ہیں؟“

”سات آدمی ہیں دو تمہارے ساتھ ہیں۔“

”اور پندرہ تمہارے ساتھ ہیں۔“

”ان کو بھول جاؤ دروازہ نہیں کھلے گا۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”میرے ساتھ تمہارے دونوں آدمی زخمی ہیں ان کے پیروں میں گولیاں لگی ہیں اور وہ میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ میرے ساتھ تین آدمی ہیں۔ اس طرح ملا کر کل گیارہ افراد ہوئے۔ پھر تمہارے آدمی مجھ پر اور میرے آدمیوں پر اعتماد بھی نہیں کریں گے۔ اس صورت میں ہم مل کر باہر سے آنے والوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟“

”میں اپنے آدمیوں سے بات کرتا ہوں۔“ اس بار بڑے کنور نے خود پیشکش کر دی۔ ”وہ زخمی ہونے کے باوجود تم سے مل کر آنے والوں کا مقابلہ کریں گے۔ باقی بھی تمہارے ساتھ مل کر اس جگہ کا دفاع کر سکتے ہیں۔“

لیکن میں بڑے کنور کے آدمیوں پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ان سے کہو کہ وہ جہاں ہیں وہیں اپنا کام کریں اس جگہ کی ذمے داری ہماری ہے۔ وہ میرے کام میں مداخلت نہ کریں اور میں ان کو نہیں چھیڑوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ بڑے کنور نے کہا۔ ”کیمرے ناکارہ ہونے کا عمل جاری ہے اور اس وقت نصف کیمرے ناکارہ ہو چکے ہیں۔“

”تم مانو یا نہ مانو یہ منشی دل جی کا کام ہے وہی گھر کا بھیدی ہے۔“ میں نے کہا اور کال بند کر دی۔ مجھے اوپر آنے والوں کی فکر تھی۔ بیتو ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی۔

”وہ کمرے میں آ گیا ہے۔“

میں اوپر آیا اور بیتو سے آلہ لے لیا جس کی اسکرین پر تین سرخ دھبے حرکت کر رہے تھے۔ میں نے بیتو کو نیچے بھیج دیا۔ تینوں افراد کمرے میں حرکت کر رہے تھے جیسے کمرے کی تلاشی لے رہے ہوں۔ کوئی آواز نہیں تھی کیونکہ واش روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے گرنیڈ نکال لیا تھا میرا اندازہ یہ آخری

گرنیڈ تھا لیکن سنگین سے حاصل کیے چار گرنیڈ، چار اسموک بم اور ایک واکس بم باقی تھا۔ واکس بم کی جگہ نہیں تھی اس لیے اسے جیکٹ کی کلائی میں موجود پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔ جیکٹ پھولی ہی تھی اس لیے کلائی پر غور کیے بغیر اس کی موجودگی کا پتا چلانا ممکن نہیں تھا۔ تینوں میں سے ایک واش روم کے پاس تھا۔ اچانک اس نے دروازہ کھول کر کوئی چیز اندر پھینکی اور میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ میں نے بے ساختہ سیڑھیوں سے نیچے چھلانگ لگائی اور ابھی نصف راستے میں تھا کہ خوفناک دھماکا ہوا۔ خفیہ دروازے سے آگ کا ایک طوفان برآمد ہوا تھا جس نے چھوٹے ہال تک میرا پیچھا کیا اور اگر میں لڑھک کر ایک طرف نہ ہو جاتا تو یہ مجھ تک آجاتا۔ نیچے گرتے ہی میں اٹھا تھا اور چلا کر بیتو کو آواز دی۔

''ہم ادھر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ فتح خان کے دونوں آدمی دوڑے آرہے تھے میں نے دھاڑ کر کہا۔

''تم یہاں کیوں آرہے ہو واپس جاؤ۔''

وہ واپس بھاگے تھے۔ میں نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ آلہ کہیں گر گیا تھا اور اب نظر نہیں آرہا تھا۔ ملبے میں اسے تلاش کرنا مشکل تھا اور اس کے لیے وقت چاہیے تھا۔ یہاں وقت بالکل نہیں تھا اوپر والے کسی لمحے نیچے آسکتے تھے اور اگر وہ ایسا ہی ایک بم یہاں پھینک دیتے تو ہمارے بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ جیسے ہی دھواں کم ہوا اور واش روم میں لگی آگ کی روشنی دکھائی دینے لگی میں نے گرنیڈ اندر پھینک دیا۔ اس دوران میں واکی ٹاکی مسلسل بپ دے کر رہا تھا لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔ دھماکے سے پہلے میں آڑ میں ہو گیا تھا اور مجھے خوشی ہوئی جب دھماکے کے ساتھ چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ وہ نیچے آنے کی کوشش کر رہے تھے اور گرنیڈ کا نشانہ بن گئے تھے۔ اس بار زیادہ تباہی پھیلی تھی اور واش روم کا خاصا بڑا حصہ ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ یہ راستہ بند ہو جائے۔

اوپر والوں کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا تو میں ملبے میں آلہ تلاش کرنے لگا۔ وہ مشکل سے چار بائی چھ انچ کا تھا اور اس کا ایک طرف والا حصہ مکمل اسکرین تھا۔ دیکھنے میں مضبوط لگتا تھا لیکن کیا کہا جا سکتا تھا کہ اس کی کیا حالت ہوگی ہوگی۔ میری کوشش ناکام رہی۔ آلہ پتا نہیں کہاں گیا تھا؟ بیتو میرے ساتھ تھا اور وہ اوپر کی نگرانی کر رہا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شوبی ادھر تو راستہ بند ہو گیا ہے۔''

''نہیں ابھی کھلا ہے اسے بند کرنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے ان تین کے پیچھے اور لوگ بھی آئے ہوں گے۔''

''کیسے بند کرو گے؟''

''مجھے اوپر جانا ہوگا۔'' میں نے کہا ''اگر کمرے میں آگ لگ جائے تو زیادہ اچھا ہوگا وہاں فرنیچر اور کارپٹ کے ساتھ پردے ہیں۔ اس کے بعد وہاں سے اندر آنا ممکن نہیں ہوگا۔''

''آگ کیسے لگائے گا؟''

''یہ تو اوپر جا کر دیکھنا ہوگا۔'' میں نے واش روم سے آتا شعلوں کا انعکاس دیکھ کر کہا۔ ''گرنیڈ کے استعمال سے آگ لگ سکتی ہے لیکن بعض اوقات لگی آگ بھی بجھ جاتی ہے۔''

میں نے رائفلیں بیتو کو تھما دیں یہ مشکل کر رہی تھیں۔ پستول نکال کر میں اوپر کی طرف بڑھا۔ اب سیڑھیوں پر اتنا ملبا آگیا تھا کہ اس کے قدمچے ہی ختم ہو کر رہ گئے تھے اور مجھے بہت احتیاط سے اوپر جانا پڑ رہا تھا ورنہ پاؤں سلپ کرتا تو میں واپس نیچے آتا۔ نیچے گرنے سے میری چوٹوں میں اضافہ ہوا ہوگا لیکن اس وقت مجھے ان کا ہوش نہیں تھا۔ بہرحال کوئی چوٹ یا زخم ایسا نہیں تھا جو مجھے حرکت کرنے سے روک دیتا۔ دھماکوں نے دروازے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا مگر اندر ایک بڑا ملبے کا ڈھیر رکاوٹ بن کر موجود تھا۔ میں نے پہلے اندر جھانکا اور اس کے لیے نائٹ ویژن بند کیا وہاں روشنی تھی۔ واش روم میں جابجا آگ لگی تھی اور گوشت جلنے کی بو آرہی تھی۔ یہ بو ان کے گوشت کی تھی جو فرشتۂ اجل کے پیام بر بن کر آرہے تھے مگر خود اس کا شکار ہو گئے۔ میرا دل پہلے ہی خراب ہو رہا تھا میں نے بہ مشکل خود کو قے کرنے سے روکا۔

سانس روک کر میں اندر داخل ہوا اور خاصی مشکل سے اندر آیا۔ مجھے گرا ملبا ہٹانا پڑا تھا۔ سیڑھیوں کا ابتدائی حصہ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ ایک اور گرنیڈ اسے مکمل طور پر بند کر سکتا تھا۔ اندر دو لاشیں تھیں اور دونوں کی حالت بری تھی۔ ایک ٹب میں پڑا تھا اور دوسرا کموڈ پر گرا ہوا تھا۔ واش روم کا دروازہ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ تیسرے فرد کو نہ پا کر میں محتاط ہو گیا تھا لیکن اس کی لاش کمرے میں واش روم کے دروازے پر پڑی تھی اس نے غالباً اندر جھانکا تھا کہ گرنیڈ کا نشانہ بن گیا اس کا چہرہ تقریباً اڑ گیا تھا۔ اس سے نظر بچاتے ہوئے میں اندر آیا اور بیڈ شیٹ کھینچ کر اسے واش روم میں لایا اور آگ دکھا کر دوبارہ بیڈ روم میں آیا۔ میں نے پہلے

پردوں کو آگ دکھائی۔ پھر جلتی چادر کو بیڈ پر پھینک دیا۔ لکڑی کی ایک تپائی آگ میں رکھی تو اس نے کچھ دیر میں آگ پکڑ لی تھی اسے ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ رکھا۔ الماری کے پٹ کھولے اندر سوٹ لٹک رہے تھے میں نے ایک سوٹ نکال کر اسے آگ دکھائی اور الماری میں پھینک دیا۔ اتنی دیر میں اندر اچھا خاصا دھواں بھر گیا تھا اور اگر میرے منہ پر گیس ماسک نہ ہوتا تو سانس لینا بھی محال ہو جاتا۔ اوپر سے گرمی بھی ہو گئی تھی۔

میں بیڈ کے دوسری طرف تھا کہ اچانک ہی دروازہ کھلا اور میں وہیں نیچے گر گیا۔ بیڈ سے اٹھتے شعلوں نے میرا پردہ رکھ لیا تھا۔ کسی نے اندر جھانکا اور فلمی انداز میں بولا۔ ''ادھر تو نرک بن رہا ہے.... بابو اور اس کے آدمی کہاں ہیں؟''

''نرک میں۔'' میں نے دل میں کہا اور بیڈ کی آڑ سے سرکتے ہوئے اسے پستول سے نشانہ بنایا کیونکہ اس نے نرک میں قدم رکھ دیا تھا اور فوراً ہی وہ نرک میں داخل ہو گیا۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی تھی۔ وہ پلٹ کر گرا تو کسی نے باہر سے برسٹ مارا۔ میرے پاس صرف پستول تھا اور یہ خودکار رائفل کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور ایک گرنیڈ باہر پھینک دیا۔ گرنیڈ گرتے ہی کوئی چلایا اور افراتفری مچی تھی وہ بھاگ رہے تھے۔ دھماکا ہوتے ہی میں اٹھ کر بھاگا کیونکہ میرے پاس بس یہی چند لمحے تھے۔ کمرا پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ واش روم میں داخل ہو کر میں راستے تک آیا اور اس سے باہر نکل کر گرنیڈ سے پن نکال کر عین دروازے کے ملبے کے اوپر رکھ دیا اور پھر خود تقریباً پھسلتا ہوا نیچے پہنچا تھا کہ اوپر دھماکا ہوا۔ ملبے کی بارش میں بھیگتا ہوا میں دیوار کی آڑ میں ہوا تھا۔ سر پر کچھ لگا تھا دکھن کے ساتھ نمی کا احساس ہوا۔

میں نے چھو کر دیکھا زخم سے خون نکل رہا تھا مگر یہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ گرد اور دھواں چھوٹے ہال تک آرہا تھا۔ دونوں زخمی گارڈز کھانس رہے تھے اور بیتو وہاں نہیں تھا۔ میں نے ریڈیو پر اسے آواز دی۔ ''تم کہاں ہو؟''

مگر بیتو کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ میں مضطرب ہو گیا۔ میں نے فتح خان کے آدمیوں سے پوچھا۔ ''تم دونوں کہاں ہو؟''

اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ میں نے جیکٹ سے ریڈیو نکالا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گرنے پڑنے کے دوران میں اسے ضرب لگی تھی اور وہ آف تھا۔ میں نے اسے آن کیا مگر اس کی روشنی نہیں جلی۔ اسے تھپکا اور زور سے ہاتھ مارا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ ریڈیو نے بہت غلط موقع پر جواب دیا تھا۔ بیتو کو میں نے یہاں رہنے کو کہا تھا۔ وہ بنا کسی وجہ کے یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ہوش والے گارڈ سے پوچھا۔ ''میرا ساتھی کہاں گیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم، وہ اچانک سرنگ کی طرف چلا گیا۔''

یقیناً بیتو کو فتح خان کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی پیغام ملا ہوگا۔ میں کیونکہ اوپر مصروف تھا اس لیے بیتو یا تو مجھ سے رابطہ نہیں کر سکا یا اسی وقت ریڈیو خراب ہوا اور وہ مجھے بتا نہیں سکا۔ دھماکے نے سیڑھی کے اوپری حصے کو گرا کر راستہ بند کر دیا تھا۔ اب کوئی بے خبری میں نہیں آسکتا تھا جب تک وہ راستہ صاف نہیں کرتا۔ اس طرف سے اطمینان کے بعد میں سرنگ کی طرف بڑھا۔ فتح خان کے آدمی مشکل سے بیس گز دور تعینات تھے مگر اب مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ بیتو سمیت دونوں غائب تھے۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے ایک چھوٹی سی سیاہ شے نیچے پڑی دکھائی دی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو مجھے لگا جیسے یہ ریڈیو کا کوئی حصہ ہو۔ میں نے اپنا ناکارہ ریڈیو نکال کر اس سے موازنہ کیا تو یہ ریڈیو کا ایک ٹکڑا ثابت ہوا تھا۔ میں فکرمند ہو گیا۔ اس ٹکڑے کا پایا جانا کسی گڑبڑ کی نشان دہی کر رہا تھا۔ یہاں کچھ ہوا تھا جس کے نتیجے میں یہ ٹوٹا تھا۔ اس کے باقی پیس سمیٹ لیے گئے تھے لیکن یہ رہ گیا تھا۔ میرے پاس صرف پستول تھے اور دونوں رائفلیں بیتو کو دے گیا تھا اور اب وہ اسلحے سمیت غائب تھا۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس وقت سب میری توقع کے خلاف جا رہا تھا۔ پہلے میں پکڑا گیا، پھر حملہ ناکام رہا اور کرنل اپنے آدمیوں سمیت مارا۔ پھر فتح خان آتے ہی غائب ہو گیا اور اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ بڑے کنور نے بہت چالاکی سے مجھے اس چھوٹے ہال سے ہٹایا اور ساوی سمیت سیف ہاؤس میں چلا گیا۔ اب بیتو غائب تھا۔ میں نے پستول سامنے رکھا تھا اور دبے قدموں چل رہا تھا۔ اچانک مجھے واکی ٹاکی کا خیال آیا اور میں نے اسے نکال کر اس کا معائنہ کیا۔ اس پر ایک سے لے کر صفر تک نمبر موجود تھے۔ میں نے ایک نمبر دبایا اور کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف بپ جا رہی تھی۔ پھر بڑے کنور نے کال ریسیو کی۔ اس نے

مرتعش لہجے میں کہا۔ ”شہباز تم کہاں تھے؟“
”میں اوپر سے آنے والا راستہ بند کر رہا تھا۔ دشمن نے وہاں تک رسائی حاصل کرلی ہے، میں نے سیڑھیاں تباہ کردی ہیں۔“
”وہ سرنگ میں گھس آئے ہیں۔ تمہارا ساتھی ٹریپ ہوگیا ہے۔ میں نے تمہیں کال کرکے خبردار کرنا چاہا لیکن تم کال ریسیو نہیں کررہے تھے۔“
”وہ اسے کہاں لے گئے ہیں؟“
”میں نہیں جانتا کیونکہ اب سرنگ میں لگے کیمرے بھی ناکارہ ہونا شروع ہوگئے ہیں۔“ بڑے کنور نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”صرف چند سرنگوں کے کیمرے کام کررہے ہیں۔“
”میں جس جگہ ہوں کیا یہاں کا کیمرا کام کررہا ہے؟“
”نہیں تم نظر نہیں آرہے ہو۔ تم کہاں ہو؟“
میں نے اسے اپنی لوکیشن بتائی۔ ”یہاں روشنی بند ہے شاید اس لیے کیمرا کام نہیں کررہا ہے؟“
”یہ کیمرے تاریکی میں بھی کام کرتے ہیں۔“
نائٹ ویژن گرد کی وجہ سے دھندلا گئی تھی۔ میں نے اسے اتار کر پھونک مار کر صاف کیا اور دوبارہ لگایا۔ ”جہاں کیمرے کام کررہے ہیں وہاں کوئی نظر آرہا ہے؟“
”نہیں۔“ اس نے کہا۔
”اس کا مطلب ہے خطرہ سر پر آچکا ہے۔ اب بھی وقت ہے تم سادی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ.... ممکن ہے کچھ دیر بعد وقت تمہارے ہاتھ میں نہ رہے۔“
”میں اور سادھنا یہاں محفوظ ہیں۔“ اس نے پہلے والا جواب دیا اور کسی قدر توقف کے بعد بولا۔ ”شہباز، میری آفر ہے تم اندر آجاؤ لیکن اس کے لیے اپنے پاس موجود تمام ہتھیار پھینک دو۔“
”مجھے تمہاری پیشکش منظور نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے ساتھی کی فکر ہے۔“
”میرا نہیں خیال کہ وہ اب بچا ہوگا۔ اس پر بیک وقت تین آدمی ٹوٹے تھے اور وہ بہت مشکل سے ان کے قابو میں آیا تھا۔“
”یہاں دو آدمی اور تھے وہ کہاں چلے گئے؟“
”وہ اس سے پہلے یہاں سے جاچکے تھے اور پھر کسی کیمرے میں نظر نہیں آئے۔“ بڑے کنور نے کہا۔ ”تمہارے ساتھی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے ریڈیو پر پیغام ملا ہے۔“

صورت حال سامنے آرہی تھی اور اسی لحاظ سے میری تشویش میں اضافہ ہورہا تھا۔ جیتو کو ریڈیو سے بلا کر ٹریپ کیا گیا تھا اور ایسا صرف کوئی ایسا فرد کرسکتا تھا جس کے پاس یہ ریڈیو ہوتا۔ یعنی ہمارا ہی کوئی ساتھی۔ اب وہ کون تھا؟ کیا فتح خان کا کوئی ساتھی بھی بِک گیا تھا اور ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ فتح خان کے تمام ساتھی جرائم پیشہ تھے اور وہ پیسے کی خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہوتے تھے۔ اگر انہیں منشی دل جی کی طرف سے منہ مانگی قیمت دی گئی ہو تو ان کے نہ بکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر یہ بات درست تھی تو میں خود اپنی آستین میں سانپ لے کر آیا تھا۔ دونوں رائفلیں میں نے جیتو کے حوالے کردی تھیں اور اب میرے پاس صرف دو پستول اور ان کے میگزین تھے۔ دو گرنیڈ اور چار عدد اسموک گرنیڈ تھے۔ میں نے پستول نکال لیا اور آگے بڑھا۔ واکی ٹاکی پر بڑے کنور سے رابطہ تھا۔ میں نے پوچھا۔
”جس وقت میرے ساتھی کو بلایا گیا یہاں کے کیمرے کام کررہے تھے؟“
”ہاں اس وقت کیمرے کام کررہے تھے۔“ بڑے کنور نے جواب دیا۔ ”اس کے فوراً بعد یہ کیمرے ناکارہ ہوئے اور میں بس اتنا دیکھ سکا کہ تین افراد اسے پکڑ کر لے جارہے تھے۔“

بڑے کنور کے ان الفاظ سے مجھے امید ہوئی کہ جیتو خیریت سے ہوگا۔ اگر اسے مارنا ہوتا تو وہیں مار دیتے۔ ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”اسے لے جانے والوں کی شناخت نظر آرہی تھی؟“
بڑا کنور کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”بہ ظاہر وہ پیلس کے آدمی لگ رہے تھے۔ لیکن وہ میرے آدمی نہیں ہوسکتے۔ ان میں سے چار میرے رابطے میں نہیں ہیں۔ جن تین سے رابطہ ہے وہ جمنازیم والی عمارت کے پاس ہیں۔“
جمنازیم والی عمارت مرکزی پیلس کے پیچھے تھی۔ بہ ظاہر وہ ایک کونے میں تھی اور وہاں سے حملہ کرنا بیکار بھی ہوسکتا تھا۔ اصل اہمیت پیلس کی سامنے والی عمارتوں خاص طور سے گیسٹ ہاؤس اور تقریبات کے لیے مخصوص عمارت کی تھی۔ مجھے یاد ہے رامن اسی عمارت میں تھا۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا کہ اس کی سرنگ کون سی والی تھی۔ مرکزی سرنگ کے چاروں طرف کوئی درجن بھر سرنگیں نکل رہی تھیں۔ آ تے

وقت وہ سرنگ دائیں طرف تھی اور اب اسے بائیں طرف ہونا چاہیے تھا۔ میں اندازے سے اس سرنگ میں داخل ہوا۔ یہاں بلب روشن تھے۔ میں راستے میں آنے والے سارے بلب توڑتا آیا تھا یہاں کے دونوں بلب بھی توڑ دیئے اب سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے نائٹ ویژن آن کیا اور سیڑھیوں کا معائنہ کیا۔ یہاں بٹن سیڑھیوں پر نہیں تھا بلکہ اوپر سے چوتھی سیڑھی کے ساتھ دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ تھا اور نائٹ ویژن کی وجہ سے نمایاں نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے تین بار دبایا اور فوراً ہی ہلکی سی سنسناہٹ کے ساتھ دروازہ کھلنے لگا۔ میں نے پستول سامنے کرلیا۔

عام حالات میں، میں کبھی اس طرح اندھا قدم اٹھانا پسند نہ کرتا لیکن اب حالات کچھ اور تھے۔ سادی اپنے بھائی کے پاس اور فی الحال محفوظ تھی لیکن بیتو کے بارے میں مجھے خدشہ تھا کہ وہ بدترین دشمنوں کے قبضے میں جا چکا تھا اور اس کا گرم خون اسے کسی مشکل میں پھنسا سکتا تھا۔ مصلحت اسے کبھی آئی نہیں۔ اسے بچانے کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ دروازہ کھلا اور میں نے نائٹ ویژن آف کردی کیونکہ دوسری طرف تیز روشنی تھی۔ یہ بھی ایک سجا ہوا لیکن خالی کمرا تھا اور یہاں خفیہ دروازہ ایک طرف موجود دیوار گیر الماری کے ساتھ ویسے ہی چوکور سے حصے میں کھل رہا تھا جہاں ایسے تمام خفیہ دروازے کھلتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک طرف تو ان دروازوں کو خفیہ رکھا جا رہا تھا اور دوسری طرف انہیں یوں چوکور خانوں میں رکھا گیا تھا اور یہ ہر جگہ نمایاں تھے۔ پتا نہیں اس میں کیا مصلحت تھی؟ کمرا خالی تھا۔ حالانکہ رامن نے یہاں کچھ افراد کو نگران بنایا تھا۔ فرش کے قالین پر ایک جگہ دھبا تھا۔ قالین کا اپنا رنگ ہلکا جامنی تھا اس لیے یہ دھبا غیر نمایاں تھا۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا تو ہلکا سا گیلا تھا اور میری انگلی پر سرخ رنگ لگا جس سے لہو کی مہک آرہی تھی۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں رامن نے اپنے آدمی کو خفیہ دروازہ کھولنے کی پاداش میں شوٹ کیا تھا۔ قالین پر اسی کا خون تھا۔

کمرے کی سجاوٹ اور دیواروں پر موجود فحش تصاویر بتا رہی تھیں کہ یہ کمرا عیاشی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ میں دروازے تک آیا اور باہر کی سُن گُن لی۔ مجھے لگا جیسے کہیں دور کچھ لوگ آپس میں باتیں کررہے ہوں۔ میں نے کان لگا کر سننا چاہا مگر آوازیں واضح نہیں تھیں۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو ایک بڑا ہال دکھائی دیا۔ کچھ افراد ہال کے اوپری حصے میں تھے۔ یہ سطحوں والا ہال تھا جس میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے حصے میں جاتے تھے اور یہ حصہ کسی گیلری کی طرح اس ہال کے چاروں طرف تھا۔ دروازہ کھولتے ہی آوازیں نمایاں ہوگئیں۔ بولنے والا رامن تھا اور وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "بول کتے.... ورنہ تیرا بھیجا نکال دوں گا۔"

جواب میں کسی کے بھوں بھوں کرنے کی آواز آئی۔ کوئی سچ مچ کتے کی طرح بھونک رہا تھا۔ میں شناخت نہیں کر پایا لیکن مجھے شبہ ہوا کہ وہ بیتو تھا جو رامن کو چڑانے کے لیے یہ حرکت کررہا تھا۔ پھر چٹاخ کی آواز آئی۔ میں نے بیتو کو کہتے سنا۔ "کتا تو تو ہے جو ایک آدمی کو باندھ کر اسے تھپڑ مار رہا ہے، ہاتھ کھول پھر تجھے بتاتا ہوں۔"

"لڑکے، شہباز کو کال کر ورنہ یہ تجھے مار دے گا۔" مجھے منشی دل جی کی آواز آئی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اس دروازے کے عین اوپر والی گیلری میں موجود تھے۔ اس لیے مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر ان کی آوازیں آرہی تھیں۔ منشی جی کی دھمکی پر بیتو نے بے پروائی سے کہا۔

"مار دے.... پر یہ کتا ہے اسے پٹا ڈال کر رکھو۔"

رامن نے مشتعل ہوکر بیتو کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ مار پیٹ کے ساتھ بیتو کے کراہنے کی دبی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ پھر منشی دل جی نے کہا۔ "بس۔"

رامن رک گیا تو بیتو نے پھر اسے چھیڑا۔ "تم تو کتے سے گیا گزرا ہے اس کے گلے میں بھی پٹا ہے تم بغیر پٹے کا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" منشی دل جی نے سرد لہجے میں کہا۔ "رامن اگر یہ میرے تین گننے تک شہباز کو کال کرنے پر آمادہ نہ ہو تو اسے شوٹ کردینا۔"

میں بے ساختہ باہر نکل آیا اور فوراً ایک طرف موجود دو مسلح افراد چونک کر میری طرف متوجہ ہوئے لیکن اس سے پہلے وہ اپنی رائفلیں سنبھالتے میں نے دونوں کو شوٹ کر دیا۔ میری مہارت سے زیادہ اتفاق کو دخل تھا کہ دونوں کے سروں پر گولیاں لگیں اور وہ نیچے گر کر ساکت ہوگئے۔ فوراً ہی سامنے گیلری سے چند افراد نمودار ہوئے ان کے پاس خودکار اسلحہ تھا اور اب ہال میں ٹھہرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ میں دوڑا اور واپس کمرے میں آگیا۔ عقب میں کئی رائفلیں ایک ساتھ گرجی تھیں مگر اتنی دیر میں، میں واپس

آچکا تھا۔ فائرنگ کے ساتھ لوگوں کے چلانے کی آوازیں بھی آرہی تھی۔ گولیاں کھلے دروازے سے گزر رہی تھیں۔ میں نے دو اسموک گرنیڈ یکے بعد دیگرے ہال میں پھینک دیئے۔ جو لوگ کمرے کی طرف آرہے تھے وہ پلٹ کر واپس بھاگے۔ فائرنگ رک گئی تھی اور رامن کے دہاڑنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں سے پوچھ رہا تھا۔ "یہ کیا ہورہا ہے؟"

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ حالات کی تبدیلی کے پیچھے منشی دل جی تھا اور رامن ایک بار پھر اس کا دست راست ثابت ہوا تھا، گویا اس نے بڑے کنور کو بھی دھوکا دیا تھا۔ بہ ظاہر وہ اس کا ملازم تھا لیکن اندر سے وہ منشی دل جی کے ساتھ تھا۔ اسی نے اندر کی فورس کو اس طرح استعمال کیا تھا کہ وہ ناکارہ ہوکر رہ گئی تھی۔ جو وفادار تھے ان کو بچا لیا تھا اور جو بڑے کنور کے وفادار تھے انہیں پہلے ہمارے ہاتھوں مروایا اور پھر کرنل اور اس کے آدمیوں کا بھی صفایا کرادیا۔ اب حالات مکمل طور پر منشی دل جی اور رامن کے ہاتھ میں تھے۔ یقیناً منشی دل جی کے ساتھ اس کے وہ آدمی بھی ہوں جنہیں باہر رہ کر ہمیں بیک اپ دینا تھا۔ اب بیک کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بیتو کی جان بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا لیکن مجھے صاف نظر آرہا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جلد یا بدیر وہ میرے گرد گھیرا تنگ کرتے، مجھے ہتھیار ڈالنے پڑتے ورنہ مارا جاتا۔

"یہ شہباز ہے۔" منشی دل جی نے کہا اور بلند آواز سے بولا۔ "شہباز! تم میری آواز سن رہے ہو؟"

میں چپ رہا تو اس خبیث نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ "ٹھیک ہے میں تین تک گنوں گا اور اس لڑکے کا سر اڑا دوں گا۔"

"شوبی اگر آپ ادھر ہے تب بھی اس کا بات مت سننا۔" بیتو نے چلا کر کہا۔

"ایک...دو.....تین۔" منشی دل جی نے کہا

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" میں نے اس کے تین گننے سے پہلے چلا کر کہا۔ "میں یہاں موجود ہوں۔"

"شہباز جی۔" منشی دل جی کے لہجے میں روایتی مکاری آگئی۔ "بہتر ہے ہتھیار پھینک کر سامنے آجاؤ۔"

"تاکہ تم مجھے ماردو۔"

"میرا تمہیں مارنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" منشی دل جی نے کہا۔ "ورنہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا ہم جانتے تھے کہ تم سرنگ میں ہو اور وہاں بچنے کی کوئی جگہ نہیں، جب رامن نے تمہیں پکڑا تھا تب ہی مار دیتے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ رامن کو اس حملے کے بارے میں علم نہیں تھا اس نے تو اپنے طور پر یہ کامیابی حاصل کی تھی۔"

"رامن کو پتا تھا صرف وقت کا پتا نہیں تھا۔" منشی دل جی نے گھبرائے بغیر کہا۔ "رازداری کی وجہ سے حملہ خفیہ رکھا گیا تھا۔ کنور پیلس میں ایسی سیکیورٹی ہے کہ کہیں کی جانے والی بات بھی سنی جا سکتی ہے۔"

"اس کے باوجود رامن نے قید خانے میں مجھ سے کھل کر بات کی تھی۔"

"قید خانے کا سسٹم آف کردیا گیا تھا۔" منشی دل جی نے کہا۔ "شہباز جی تم وقت ضائع کررہے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تمہارا ساتھی زندہ رہے تو ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔"

اس وقت مجھے وائس بم کا خیال آیا تھا اور میں اسے کلائی سے نکالنے جا رہا تھا کہ عقب سے دروازہ کھلنے کی سنسناتی آواز آئی۔ ہال میں دھواں پھیلا ہوا تھا اور وہ اب کمرے میں بھی آرہا تھا مگر ماسک کی وجہ سے بچت تھی۔ دوسری طرف منشی دل جی کی پرسکون آواز بتا رہی تھی کہ اسے بھی اس گیس سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں دیوار کی آڑ سے حرکت کرتا کھلے دروازے سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور میں واپس اپنی جگہ دبکنے پر مجبور ہو گیا۔ دروازے کے سامنے سے گزرے بغیر میں خفیہ دروازے تک نہیں جا سکتا تھا۔ وہ چند سیکنڈ میں کھل گیا اور مجھے رامن کی آواز آئی۔ "شہباز اب تم میرے نشانے پر ہو۔ کوئی حرکت مت کرنا ورنہ میں شوٹ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

اندر دھواں بھرنے سے منظر صاف نظر نہیں آرہا تھا لیکن رامن کی آواز اسی کونے سے آرہی تھی۔ جب تک منشی دل جی نے مجھے باتوں میں لگایا تھا وہ کہیں اور سے ہوکر سرنگ کے اس خفیہ راستے تک آگیا تھا۔ میں ساکت رہا تو رامن نے پھر للکارا۔ "شہباز! آخری بار کہہ رہا ہوں ہتھیار پھینک دو۔ تم اتنے ضروری نہیں ہو۔"

یہ بات تو میں بھی جانتا تھا کہ میں صرف بڑے کنور کے لیے ضروری تھا اس کے علاوہ یہاں موجود کسی دشمن کے لیے ضروری نہیں تھا بلکہ مجھے تعجب تھا کہ وہ مجھے زندہ کیوں رکھنا چاہتے تھے؟ میں نے ٹھنڈی سانس لی اور پستول پھینک

دیا۔ رامن نے کہا۔ ”دوسرا پستول بھی۔“

میں نے وہ بھی پھینک دیا تو اس نے مجھے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے اس کی بھی تعمیل کی۔ فوراً ہی دروازے سے دو افراد اندر آئے، ایک نے میرے سر پر رائفل کی نال رکھ دی اور دوسرے نے میری جامہ تلاشی لی اور اس نے تمام گرینیڈز نکال لیے تھے۔ پھر میری ٹانگوں سے بندھے خنجر نکالے ایک میرا تھا اور دوسرا رامپوری جو میں نے رامن سے حاصل کیا تھا۔ مجھے نہتا کر کے ہال میں لایا گیا۔ اس دوران میں وہاں موجود ایگزاسٹ فین چلا دیئے گئے تھے جو تیزی سے گیس کھینچ کر باہر پھینک رہے تھے۔ ویسے سب نے گیس ماسک پہن رکھے تھے۔ حد یہ کہ بیتو کے پاس بھی تھا جیسے ہی میں نے اسموک بم پھینکے اس نے ماسک منہ پر چڑھا لیا تھا۔ چند منٹ میں ہال گیس سے صاف ہو گیا۔ منشی دل جی کے اشارے پر اس کے ایک آدمی نے منہ سے ماسک ہٹا کر گہری سانس لی اور جب اسے کچھ نہیں ہوا تو باقی سب نے بھی ماسک اتار دیئے تھے۔ بیتو کے ہاتھ پیچھے کر کے پلاسٹک کی کس جانے والی ہتھکڑی سے باندھ دیئے گئے تھے، یہی سلوک میرے ساتھ کیا گیا۔ میں نے خود ہاتھ رضا کارانہ پیچھے کر لیے تھے۔ ایک آدمی نے اس پر کس کر ہتھکڑی باندھی مگر میں نے ہاتھ سخت کر لیے تھے۔ اس لیے ہتھکڑی پوری طرح نہیں کسی تھی۔ مگر یہ بات وہ محسوس نہیں کر سکا اسے لگا کہ اس نے ہتھکڑی کس کر باندھی ہے۔ میں نے منشی دل جی کی طرف دیکھا۔

”تم کامیاب رہے.... تم نے ہمیں استعمال کیا اور یہاں تک پہنچ گئے۔“

”ہاں میں کامیاب رہا۔“ اس نے تکبر سے کہا۔ ”لیکن اصل مرحلہ ابھی باقی ہے۔“

”سیف ہاؤس میں گھسنے کا؟“

”وہ بھی مسئلہ نہیں ہے۔“ منشی دل جی نے کہا۔ ”ابھی تم دیکھو گے۔“

”باہر بکتر بند گاڑیوں پر میزائل کس نے مارے تھے؟“

”میرے آدمیوں نے۔“ منشی دل جی بولا۔ ”اس کرنل کو بڑی خوش فہمی تھی کہ یہ ہتھیار کوئی مقامی استعمال نہیں کر سکتا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”یہ گورے خود کو کچھ زیادہ ہی اونچا سمجھتے ہیں اور اسی چکر میں منہ کے بل گرتے ہیں۔ میں مسلسل کرنل کو سمجھا رہا تھا کہ تم پر اعتماد نہ کرے۔ مگر اس نے میری نہیں سنی۔ وہ تمہیں بے ضرر سمجھ رہا تھا۔“

”کرنل اور اس کے ساتھی نرک جا چکے ہیں۔“ منشی دل جی نے تصدیق کی۔ ”ان میں سے کوئی نہیں بچا.... جو باہر تھے انہیں میرے آدمیوں نے مار کر ان کی جگہ لے لی اور پھر ان کے ہتھیار ان پر ہی استعمال کیے۔“

مجھے خیال آیا کہ کنور پیلس کے گارڈز مختلف عمارتوں میں مقید تھے لیکن وہ وہاں سے مزاحمت کر سکتے تھے پھر منشی اور اس کے آدمی کیسے اندر آئے۔ اس کے ساتھ اس وقت درجن سے زیادہ افراد تھے اور یہ سب مقامی تھے۔ انہوں نے مختلف طرح کے لباس پہن رکھے تھے اور وہ صورت سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ مجھے فتح خان کے باقی دو آدمی بھی نظر نہیں آئے، اس کا مطلب تھا وہ مارے جا چکے تھے۔ میں نے بیتو کی طرف دیکھا، چہرے پر مار پیٹ کے نشانات تھے وہ آسانی سے قابو میں نہیں آیا ہوگا۔ ”میرے ساتھی کو کیسے قابو کیا؟“

”بہت آسانی سے۔“ منشی دل جی مسکرایا۔ ”اسے ریڈیو کی مدد سے بلایا.... تمہاری آواز سن کر یہ دوڑا آیا۔“

”میری آواز؟“ میں نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں ریکارڈڈ آواز تھی۔“

”فتح خان کے آدمی کہاں ہیں اور وہ خود کہاں ہے؟“

اس بار منشی دل جی نے صرف شانے اچکائے۔

میں نے ہمیشہ اسے کرتے پاجامے میں دیکھا تھا آج پہلی بار وہ پتلون اور جیکٹ میں تھا۔ جیکٹ کی ایک جیب لٹکی ہوئی تھی یعنی اس میں کوئی ہتھیار تھا لیکن بظاہر وہ خالی ہاتھ دکھائی دے رہا تھا اور اسے ضرورت نہیں تھی۔ درجن بھر مسلح گرگے وہ باہر سے لایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ سب پر بھر تھا یہاں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جسے وہ جواب دے اور اس خیال سے اس کی گردن اکڑی جا رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نے نہایت چالاکی سے ہمیں استعمال کیا تھا اور بظاہر کامیاب رہا تھا لیکن میرا ایمان ہے قدرت اگر کسی گھٹیا شخص کو کچھ دیر کے لیے اوپر لاتی بھی ہے تو وہ زیادہ دیر اس جگہ نہیں رہ سکتا ہے اس کا گھٹیا پن اس کے زوال کا باعث بن جاتا ہے۔ منشی دل جی نے ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی نکال کر کسی سے پوچھا۔ ”نیچے کیا رہا؟“

دوسری طرف سے جواب سن کر اس نے واکی ٹاکی رکھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”انہیں نیچے لے چلو۔“

میں نے محسوس کیا کہ رامن اس کے ساتھ تھا لیکن اس کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ حالانکہ اس نے ابھی جان پر کھیل کر مجھے قابو کیا تھا۔ اگر میں اس کی طرف ایک گرینیڈ پھینک دیتا تو اس کا بچنا محال تھا۔ مگر یہاں وہ رامن کو نظر انداز کر رہا تھا۔ رامن کے علاوہ پیلس گارڈ کی وردی میں چار افراد اور تھے۔ منشی دل جی نے نیچے کا پوچھا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے کچھ آدمی نیچے بھی تھے اور وہ بڑے کنور کے وفاداروں کا صفایا کر چکے تھے۔ تبھی ہم نیچے جا رہے تھے۔ میں نے منشی کی طرف دیکھا۔ ”تم لوگ اندر کیسے آئے؟ سیدھے راستے سے آنا تو ممکن نہیں ہے۔“

وہ عیاری سے مسکرایا۔ ”تم نے ٹھیک کہا.... میں اسی سرنگ سے آیا ہوں۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”اس کا مطلب ہے پیلس سے باہر جانے کے لیے ایک خفیہ راستہ موجود ہے؟“

”ہاں لیکن ان بھائیوں کو اس کا علم نہیں ہے۔“ منشی جی نے فخر سے کہا۔ ”یہ راستہ صرف مجھے معلوم ہے۔“

”ممکن ہے کوئی اور راستہ بھی ہو اور تمہیں اس کا علم نہ ہو۔“

میری بات پر وہ فکر مند ہوا تھا۔ ہم اس کمرے میں آئے جہاں سے خفیہ راستہ نیچے جا رہا تھا۔ پہلے رامن اپنے آدمیوں کے ہمراہ نیچے اتر گیا۔ پھر ہم باری باری نیچے آئے۔ منشی دل جی کے آدمی آگے پیچھے پھیل گئے تھے۔ ان کی قیادت ایک کالا اور موٹا سا شخص کر رہا تھا اس کے چہرے پر اس کے اعمال خباثت لکھے ہوئے تھے۔ یہاں تاریکی تھی اور ان لوگوں نے اپنی رائفلوں پر لگی ٹارچیں روشن کر لی تھیں۔ منشی دل جی نے مجھ سے پوچھا۔ ”کوئی اور راستہ کہاں ہو سکتا ہے؟“

”سیف ہاؤس سے....“ میں نے جواب دیا۔ ”سیف ہاؤس بھی سو فیصد محفوظ نہیں ہے۔“

”اس سے کوئی راستہ نہیں ہے۔“ منشی جی نے نفی میں سر ہلایا۔

ہم سیف ہاؤس والے ہال کی طرف جا رہے تھے۔ منشی دل جی کے آدمی پہلے ہی چلے گئے تھے۔ اب مختلف راستوں پر اس کے آدمی موجود تھے۔ تاکہ اگر کوئی اوپر سے آنے کی کوشش کرے تو اسے روکیں۔ اچانک آگے فائرنگ کا شور گونجا۔ میں نے منشی دل جی کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا تھا؟“

”میرے آدمیوں کو پیلس کا کوئی آدمی مل گیا ہوگا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”وہ راستہ صاف کرنے آگے گئے ہیں۔“

”آدمی مل گیا ہوگا یا انہوں نے ان دو نہتے اور زخمی گارڈز کو مار دیا ہے جو کسی کا نقصان نہیں کر سکتے تھے۔“

”ممکن ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ویسے تمہیں ان کے بارے میں اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم چھوٹے ہال پہنچے اور وہاں رہ جانے والے دونوں گارڈز کی لاشیں دیکھ کر میرے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ میرے پاس موجود واکی ٹاکی بھی منشی کے آدمیوں کے قبضے میں جا چکا تھا مگر اسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ہال میں آتے ہی بلند آواز سے کہا۔ ”بڑے کنور جی.... آپ کا خادم حاضر ہے۔“

منشی دل جی کی اردو صاف تھی۔ وہ خ اور ض دونوں روانی سے بول رہا تھا اس نے انہیں کھ اور ج میں تبدیل نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد کسی پوشیدہ اسپیکر سے بڑے کنور کی ٹھہری آواز آئی۔ ”منشی تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”آپ جانتے ہیں بڑے کنور جی.... مجھے کس چیز نے آنے پر مجبور کیا ہے۔“ منشی دل جی نے مخصوص عیاری سے کہا۔ ”کیا آپ اپنے پرانے خادم کو اندر آنے کو نہیں کہیں گے؟“

”منشی تم جانتے ہو یہاں کوئی نہیں آ سکتا تم نے بیکار میں زحمت کی ہے۔“

”میں جانتا ہوں اور مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”جلد یا بدیر آپ باہر آنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔“ بڑے کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے تم نے کیمرے اور کمیونیکیشن سسٹم ناکارہ کر دیا ہے لیکن سیف ہاؤس کا دروازہ کھولنے کا ریموٹ صرف میرے پاس ہے۔ جب تک میں نہ چاہوں یہ نہیں کھل سکتا۔“

”ایسا نہ کہیں بڑے کنور جی، میرا نام منشی دل جی ہے۔ ایسے ہی آپ کا منشی نہیں بن گیا تھا۔ کچھ گن مجھ میں بھی ہیں۔ ہر تالا اور ہر دروازہ کھول سکتا ہے۔“

”اسے نہیں کھول سکتے.... یہ اتنی موٹی فولادی شیٹ کا

بنا ہوا ہے کہ طاقتور ترین بم بھی اس پر اثر نہیں کرسکتا۔ صرف آکسی ٹلین کا شعلہ اسے کاٹ سکتا ہے اور اتنا بڑا پیس کاٹنے میں جس سے ایک آدمی گزر کر اندر آسکے دو ٹن سے زیادہ گیس درکار ہوگی۔"

اس گفتگو کے دوران میں اور بیتو ایک کونے میں کھڑے تھے اور منشی کے دو مسٹنڈے ہم پر لگے ہوئے تھے۔ میں غیر محسوس انداز میں بیتو کے پاس آنے لگا۔ اس نے بھی محسوس کرلیا۔ اس نے کسی قدر سر موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ریڈیو کا ایئر فون اس کے کانوں میں تھا اسی طرح میں نے بھی اپنے کانوں میں لگا رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا تو بیتو نے غیر محسوس انداز میں ذرا پیچھے ہوکر دیکھا اور پھر شاید اسے میری کلائی میں موجود وائس بم کا پتا چل گیا۔ اس نے سر ہلا کر مجھے اشارہ دیا تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ درجنوں ٹارچیں روشن ہونے سے ہال میں خاصی روشنی ہوگئی تھی۔ ورنہ دھماکے کے بعد یہاں کی روشنیاں بھی بند ہوگئی تھیں۔ شاید بجلی کی لائن متاثر ہوئی تھی۔ مگر ایک مسئلہ تھا میں خود سے یہ بم نہیں نکال سکتا تھا' یہ کلائی کے درمیان میں جیکٹ کی آستین میں موجود ایک جیب میں تھا۔ یہ جیب ایک چھوٹی سی زپ سے بند تھی۔

اول تو میری اس جگہ تک رسائی نہیں تھی اور دوسرے اگر میں زپ کھول بھی لیتا تب بھی بم نکالنا بہت مشکل کام تھا۔ یہ کام بیتو کرسکتا تھا مگر وہ میرے پاس آتا اور پیچھے ہوتا تو نگران چوکنا ہوجاتے۔ وہ خاص طور سے ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ منشی نے بندھی حالت میں بھی ہمیں چھوٹ نہیں دی تھی۔ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کس طرح ذرا سے موقع سے فائدہ اٹھا کر بازی پلٹ سکتا تھا اس لیے وہ ذرا سا موقع دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔ میں نے بیتو سے پوچھا۔ "جب تم کو جھوٹا پیغام ملا تو تم سرنگ کی طرف گئے تھے۔ وہاں فتح خان کے آدمی موجود تھے۔"

"وہ غائب تھا۔" بیتو نے کہا۔

"منہ بند رکھو۔" ایک نگراں غرایا۔ میں نے اسے نظر انداز کرکے بیتو سے اگلا سوال کیا۔

"ان کی طرف سے کوئی پیغام ملا تھا؟"

"نہیں۔" بیتو نے کہا۔ "جیسے ہی ہم ایک موڑ کے پاس پہنچا اچانک تیز روشنی ہوئی اور جب تک ہم اپنا نائٹ ویژن آف کرتا تین آدمی ٹوٹ پڑا۔ انہوں نے پہلے ہم کو قابو کیا اور پھر سارا ہتھیار چھین لیا۔ ہم نے مزاحمت کیا تو یہ ہوا۔" اس نے اپنا منہ آگے کیا جس پر زخموں اور نیل کے نشانات تھے۔ نگراں غراتا ہوا آگے آیا تو ہم دونوں جلدی سے چپ ہوکر سیدھے کھڑے ہوگئے۔ وہ کچھ دیر ہمیں گھورتا رہا پھر اپنی جگہ واپس چلا گیا۔ میں نے دیکھا۔ منشی دل جی کہیں چلا گیا تھا اور رامن بھی وہاں نہیں تھا۔ میں فکر مند ہو گیا۔ منشی دل جی کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے پورا اعتماد تھا کہ وہ سیف ہاؤس کے اندر پہنچ جائے گا۔ اس کی اور بڑے کی کنور کی گفتگو میں بعض معنی خیز باتیں بھی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا منشی دل جی جس مقصد کے لیے آیا تھا بڑا کنور بھی اس سے واقف تھا۔ اب تک جو ہوا تھا اس میں کئی باتیں بہت غیر متوقع ہوئی تھیں۔ مگر کچھ باتیں ایسی تھیں جو ہوئی تو تھیں مگر وہ واضح نہیں تھیں وہ میرے اندر کہیں کھٹک رہی تھیں۔ حالات کی تیزی مجھے سوچنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔

چند منٹ بعد منشی دل جی رامن کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ وہ دونوں آپس میں آہستگی سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا ان میں کسی بات پر اختلافی بحث ہورہی ہے۔ رامن خوش نظر نہیں آرہا تھا۔ قریب آنے پر وہ منشی دل جی سے دور ہوگیا اور منشی دل جی جا کر سیدھا سیف ہاؤس کے فولادی دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے بڑے کنور کو مخاطب کیا۔ "بڑے کنور جی میں آپ سے آخری بار کہہ رہا ہوں یہ دروازہ کھول دیں، میں وعدہ کرتا ہوں آپ کو اور سادھنا کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں صرف اپنا مقصد حاصل کروں گا اور یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا' یہ جاگیر آپ کی رہے گی۔"

"تمہارا مقصد کبھی پورا نہیں ہوگا۔" بڑے کنور نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

منشی دل جی نے گہری سانس لی۔ "میں نے تمہاری جتنی خیر خواہی کرنی تھی کرلی۔ اب تم مجھ سے شکایت نہیں کر سکو گے۔" اس نے کہتے ہوئے اپنے لباس سے واکی ٹاکی نکالا اور اس کا ایک بٹن دبا کر بولا۔ "سب کو شوٹ کردو اور دروازہ کھلواؤ۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا اور میں چلّایا۔

"کنور ہوشیار! سادی کو لے کر چیمبر....."

میرا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ سیف ہاؤس کے اندر سے فائرنگ کا شدید شور سنائی دی تھی اور پھر ایک چیخ سنائی دی جو سادی کی تھی۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(منظر علی خان لاہور کا جواب)

انجم انعام..........لاہور

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

کائنات بشیر..........ڈی آئی خان

یہ کون لوگ اندھیروں کی بات کرتے ہیں
ابھی تو چاند تیری یاد کے ڈھلے بھی نہیں

اکبر علی سید..........بہاولپور

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

قیصر ڈوگر..........اٹک

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

(نزہت گل کوئٹہ کا جواب)

شکیل الرحمٰن..........کھاناں

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ارشد خان..........کوٹلی

وہی ہوا نا بدلتی رُت میں، تم نے ہم کو بھلا ہی ڈالا
کوئی بھی رُت ہو، نہ چاہتوں کا زوال ہوگا یہ طے ہوا تھا

(منشی عزیز مے لڈن کا جواب)

تو ید احمد..........لاہور

مہکی مہکی فضا یہ کہتی ہے
تم کہیں آس پاس رہتی ہو

ایم افضل کھرل..........عظیم والا ننکانہ صاحب

مجھ سے کیا پوچھتے ہو میرے کاروبار کا دوست
اندھوں کے شہر میں آئینہ بیچتا ہوں

منشی خورشید احمد کنول..........لڈن

میرے لیے تو صرف دعا ہوگیا وہ شخص
سارے دکھوں کی جیسے دوا ہوگیا وہ شخص

(شاہد جہانگیر شاہد پشاور کا جواب)

نوشین اکرم..........لاہور

آپ سے مل کے تو عام بات بھی اچھی لگی
دھوپ بھی اچھی لگی برسات بھی اچھی لگی

وحید حیات خان..........کراچی

اے الٰہی رحم فرما حالات پہ ہمارے
ہو امن کا بول بالا پھر سے شہر قائد میں

منشی محمد عزیز مے..........لڈن

ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

نازش تبسم صوفی..........گجرات

ابر کی طرح ہے وہ' یوں نہ چھو سکوں کبھی
ہاتھ جب بھی پھیلائے آگیا دعاؤں میں

ضیا احمد ضیا..........چنیوٹ

اس مقتل میں تیرے عہد کی مائیں
کیوں دیتی ہیں بچوں کو جوانی کی دعائیں

محمد عمران جونانی..........کراچی

آتا ہوں تیرے سامنے صرف ٹیکنے ماتھا
کوئی ایسا سجدہ کر عطا جو مجھ کو ہلادے

ارشد خان..........کوئٹہ

ایسی خالی نسل کے خواب ہی کیا ہوں گے
جن کی نیند کا سرچشمہ تک چڑس میں ہے

نیاز ملکانی..........سوئی

اگر ہم واقعی کم حوصلہ ہوتے محبت میں
مرض بڑھنے سے پہلے ہی دوا تبدیل کرلیتے

حسن خان.........سوات
ایک شب غم کے اندھیرے پہ نہیں ہے موقوف
تو نے جو زخم لگایا ہے وہ گہرا اترا

ناہید نیازی.........شیخوپورہ
اے صبح حشر ہم سے سوال و جواب کیا
ہم آرہے ہیں ہجر کی راتیں گزار کے

سعید احمد چاند.........کراچی
کہتا تھا کہ ہم ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے
اب روٹھ گئے ہیں تو منانے نہیں آیا
(ناہید فاطمہ وینہ جہلم کا جواب)

رانا حبیب الرحمان.........سینٹرل جیل لاہور
یہ سچ ہے کہ ترے پیار نے بدل دیا
ورنہ کہاں آتی تھی ہمیں محبت کی زباں
(ضیاالدین شیخوپورہ کا جواب)

امامہ تجمل.........لطیف آباد
مجھے کوئی ظلمتِ شب سے نکالے
میں تارا ہوں شب کا سحر مانگتا ہوں

خاقان عباسی.........چوکی
میرے خوابوں کی یہ تعبیر ٹھہری
کچھ اسیر رہے کچھ اسیر کر گئے

ارشد محمود.........لاہور
میری باتوں میں میری یادوں میں
حساب کرکے بتاؤں تو بے حساب ہو تم
(ممتاز الحسن کراچی کا جواب)

ناہید صفدر.........حیدرآباد
ذرا ٹھہرو کہ بارش ہے یہ تھم جائے تو پھر جانا
کسی کا تجھ کو چھو جانا مجھے اچھا نہیں لگتا
(بشیر احمد بھٹی بہاولپور کا جواب)

عمران اکرم وسلیم کامریڈ.........کھاتاں
سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

حنیف امام سید.........ڈہرکی
ساتھ لمحوں کا اور یاد برسوں کی
اچھے لوگوں کی یہی بات بری لگتی ہے

امجد محمود......سکرنڈ
سنا ہے سب کچھ مل جاتا ہے دعا سے
ملتے ہو خود یا مانگوں خدا سے

ذیشان احمد.........نواب شاہ
ساون آیا گرجے بادل جاگ اٹھے ارماں
سیج سجاکے یہ آس ہے آئے گا مہمان
(آصفہ بتول ملتان کا جواب)

آفتاب احمد نصیر اشرفی......لاہور
تجھے حواس کی آوارگی کا علم کہاں
کبھی میں تجھ کو تیرے سامنے تلاش کروں

زاہد علی......راولپنڈی
تیری یاد کے وہ تحفے ہیں
جو لمحہ لمحہ مجھ پہ اترے
(ماہ رخ لطیف آباد کا جواب)

وحید ریاست بھٹی......کلرسیداں
اس گلشن ہستی میں لگتا نہیں دل اپنا
آئے ہیں خدا جانے ہم کس سے جدا ہوکر

محمد عمران جونان......کراچی
اپنی مرضی سے کب نظر میں رہتے ہیں
لوگ نصیبوں سے ذکر میں رہتے ہیں

گل آفریدی......چمن
اور میں لامحدود ہوجاؤں سمندر کی طرح
تو ہے دریا یہ دریا جُو بہ جُو میرے لیے
(عنایت مصطفیٰ لاہور کا جواب)

افضل کریم......پشاور
جب بھی آئی ہے موسم کی اداؤں میں تبدیلی
اس شخص کا بدل جانا بہت ہی یاد آتا ہے

نازش پروین......لاہور
جس سے فسانۂ ہستی میں تسلسل تھا کبھی
اس محبت کی روایت نے دم توڑدیا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہورہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کررہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کردیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 103
30 جون 2014ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔
نام: ....
پتا: ....
....
انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔
کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جون 2014ء تک علمی آزمائش 103 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....
پتا ....
....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) 64

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 103

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک علمی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جون 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کا سوال

دریائے فرات کے مغربی کنارے واقع ایک مشہور شہر جسے فارس کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں سپاہیوں نے آباد کیا تاکہ فارس کے باغی اگر کبھی حملہ کریں تو انہیں روکا جائے۔ اس شہر کے قریب کبھی شہر بابل ہوا کرتا تھا جو کھنڈر میں تبدیل ہو کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ ابوالعباس نے 750 ہجری میں اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس دوران یہ شہر بہت بارونق تھا اور تجارتی و مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ اس شہر کو علمی مرکز ہونے کا بھی فخر حاصل ہے کہ یہاں کی رسم الخط نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ اس شہر کو کئی اور وجہ سے بھی شہرت حاصل ہے۔

علمی آزمائش 101 کا جواب

چنیوٹ صوبہ پنجاب میں دریائے چناب کے بائیں کنارے پر ایک شہر آباد ہے جو زمانہ قدیم میں چینیوں کی آبادی تھی۔ زمانہ قدیم میں ایک حسین دوشیزہ جو حکمران کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اس کا نام چندن تھا اس نے علاقے کو شکارگاہ بنایا تھا۔ اسی نے یہ شہر بسایا جو آج لکڑیوں کی نقاشی کے لیے پوری دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔

انعام یافتگان

1۔ احمد قریشی، سکھر　2۔ ذیشان زیدی، چنیوٹ　3۔ مرتضیٰ خاص خیلی، حیدرآباد
4۔ نیاز کھوکھر، جہلم　5۔ ابوبشر، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے احمد علی، واصف احمد۔ پشاور سے غازی توفیق، مانک اسلم، فرید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، شاہ وقار، نہال زیدی، ابشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر اسلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بخش ملک، نسیم فردوس، ارہام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر، شیر نواز، اطہر نواز، عظیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید نعیم، اصغر طوری بخش، محمود اچکزئی، نذرانہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ امیر الاسلام، محمد ندا حسین، ندیم ناصر، جمیل عثمانی، توفیق ملک، فیضان انصاری، تصویر فاطمہ، علی اکبر، ذیشان حسن۔ مانسہرہ سے عباس خان، رفیق لاہوری، زاہد خاور، نسیم ارشاد۔ پارہ چنار سے زاہد علی طوری، فائق مانسہروی، لیاقت علی، حسن بخش، زاہد خان۔ اظہر الدین، سید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ نوید شہزاد خواجہ آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جبیں خٹک، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام، اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ سید عباس علی، ارباز خان، زوار حسین زیدی، نسیم اختر نیازی، فتح ملک۔ اٹک سے خالد چوہدری زبیر اللہ خان، فیض اختر، شاہ جبران، بلقیس کوکب، اقبال احمد چشتی، احسن خان اچکزئی، طارق حبیب، فرقان حمیدی، فیض مسیح، جمنا اختر، محمد علی مشاہد، ثنا بخاری، آفتاب مقصود، اختر حسین، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، جاوید اقبال، ڈھوڈا مل، ثروت ناز، اختر عباس، نعیم اختر، نعمت مرزا، منظر خان، بھیکو مل، ثنا یونکی، سید عزیز الدین، محمد احمد طیر۔ لاہور سے مسز نادر شاہ، سلیم درانی، زرینہ انصاری، فلک شیر فیض ملک، ثاقب خان، محمد پہلوان اختر، کمال حسن، شاہینہ بتول، نذیر مرزا، انور کلیم شاہ، ثنا بخاری، بہادر خان، انوار شاہ، یوسف خان، سلمان زیدی، چوہدری نیاز مسلم خان، ماسٹر قیوم محمد، کوکب گردیزی، شہباز خان، ابراہیم شاہ، بیگم انوار شاہ، نگار ملک، فیض الحسن، ظہیر الحسن قزلباش، نیاز سومرو، محمد بلال مصطفیٰ، اسد شکیل، افتخار احمد تارا، نوشین ملک مرزا یوسف بیگ، احمد یاسین ملک، بیگم صفدر جاہ، شگفتہ مشتاق، رانا حبیب الرحمن عبدالرشید۔ ملتان سے عقیل احسن، شہروز، ناصر حسین، کلب اصغر زیدی، خاقان عباسی، ثاقب علی، فہد ریاض، طالب حسین، حبیب الرحمن، اصغر خان، فصاحت علی، نیاز فتح علی، فہیم مرزا، اصغر حسین زیدی، محمد شفیق بھٹی، محمد یحییٰ معین۔ پشاور سے مولانا ریاض محسن، قاسم جان، ندیم احسن، عصمت گل، بی بی فرحین، عباس رعنا، احمد مجاہد، تنویر احسن فاروقی، گل خان، حسن زکی، فہمیدہ گل، عجب خان، بابا شاہ، مرتضیٰ زیدی۔ شیخوپورہ سے فراز حسن، سہیل بٹ، مہدی علی خان، کوکب توقیر، خاقان سید، فدا مجید، مصطفیٰ برلاس، ندا امتیاز، ثریا فاطمہ۔ ڈیرہ غازی خان سے افتخار احمد، محمود نیاز، فتح الباری، محمد توقیر، ارشاد حسین، فہیم الدین، ناصر حسن، خان محمد خان۔ ڈیرہ اسماعیل سے فاروق چوہان، قیصر خان۔ جہلم سے عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، بازق بخاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ جاوید محمد خان، نعمت اللہ، ندیم امتیاز۔ حیدرآباد سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منگیرا، زبیر شاہ، تقی بخش، امتیاز حسن، خالد نظامانی، فہد قریشی، کلیم عثمانی، محمد یاسین اندوری۔ بہاولنگر سے ضیا تسنیم، نوشین خٹک، افتخار علی، عباس علی، سعید شہزاد بخاری۔ بہاولپور سے یاسمین فرحت، فراز احسن فاروقی، خالد بٹ، فیض لاشاری، قیام الدین، نگار مصطفیٰ۔ میانوالی سے سہاب خان۔ لیہ سے فقیر محمد۔ مظفرگڑھ سے فیضان محمد عثمان، عبادت حسن، قیصر خان، ناصر محمود، شیر خان۔ جہلم سے ابرار شیخ۔ منڈی بہاؤالدین سے زاہد علی، تاثیر حسین، فرحت خان، ندا علی، ناصر کیانی، احمد جاوید، سعید مصطفیٰ۔ ساہیوال سے محمد افضل خان، کھلابٹ سے قاضی محمد صابر۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ منظر خان، حسن عالم، ارشد حسین، ندا آفاق، جاوید مظفر۔ درویش خان، محمد مظہر، سید محمد میثم رضوی، فرحت حسین باقری، فیاض محمد، اکبر خان۔ سرگودھا سے اطہر یونس، ثناء اللہ، فتح باری، آفتاب خان، نوید ہاشمی، آفتاب محمد خان، رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، کلیم خان، عباس اختر، منظر حسین، نصیر عباس، عظمت اللہ، نصیر عباس، نصرت افروز، امجد خان، نعیم خان، حکیم اللہ، ارباز خان۔ کوہاٹ سے فدا حسین۔ رحیم یار خان سے افضال میو، امجد اقبال، فصاحت خان، نیاز حسن، نسیم احمد، ملک فیروز الدین، ارشد محمود، ثنا بتول، فہیم شاہ، محمد سراج الدین، اختر عباس، عمر مقصود، ایم اے شاہد، علی عباس، خادم حسین، فیض شاہ، فیض بلوچ۔ نگار جہاں، محمد خواجہ، سید احترام حسین رضوی، مریم ریاض، سید عزیز الدین، بختاور شاہ، عارفہ سلطان، کہکشاں تسنیم وجاہت علی، ابرار احمد، عنایت مسیح، کاوش اختر علی احمد، نجم الدین حیدر، تنویر حسین زیدی، کلیم اللہ فہمی، رجب علی مرزا، نوازش علی شاہ، منور علی، اسلام آباد سے ذیشان شاہ، انجم بٹ، ذوالقرنین، بلال مصطفیٰ، شریف الحسن، جاوید قیصر، فصاحت مرزا، سلام خان، نادر خان، مرید علی خاکوانی، مہر خان، صلاح الدین، اسلم خان، انور یوسف زئی، بیگم امتیاز علی دستوری، اصغر عباس۔ راولپنڈی سے فتح الدین، غضنفر عباس، شریف شاہ، قاسم جان، فیض خان، رضوان احمد ہاشمی، عدنان سعیدی، ابرار الحسن، نادر بھٹ، شیر کمال، عباس بھکری، نثار عباس حقانی، علی خان، صالح الرحمن، ڈاکٹر سعادت علی خان، فہد شیخ۔ شریف صدیقی، امام الدین، سعید عباس زیدی۔ میرپور خاص سے، کوئٹہ سے نور الحسن زیدی نور، حجاب چنگیزی، تقی چنگیزی، فرحت بابر خاقان عباسی، نوازش علی، عنایت اچکزئی۔ منڈی بہاؤالدین سے تاثیر حسین، ندا علی، احمد جاوید، زاہد علی، فرحت جان، ناصر کیانی، سعید مصطفیٰ، سیالکوٹ سے آفاق احمد، حسن عالم، ندا آفاق، درویش جان، سید محمد میثم رضوی، منظر خان، ارشد حسین جاوید مظہر، محمد مظہر، فرحت حسین باقر علی۔ سرگودھا سے اطہر حسین، فتح باری، ثناء اللہ، آفتاب خان۔ ٹنڈو جان محمد سے تھری امولکھ۔ ساہیوال سے محمد افضل خان (فرید ٹاؤن)۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ۔ گوجرانوالہ سے احسان الحق بھٹی ایڈووکیٹ، محمد رضا (سوئی گیس روڈ)۔ حافظ آباد سے محمد عقیل چٹھہ۔ ہوتی مردان سے محمد انور (باڑی چم)۔ پنڈی بھٹیاں سے محمد عظیم، معظم علی، عمر خان۔ وہاڑی سے منشی محمد عزیز مے، سعید احمد چوہان، محمد مدثر عزیز مے۔

ممالک غیر سے امان اللہ (دبئی یو اے ای) بشیر خان (مانچسٹر یوکے) اصغر علی (یوکے) سعید خان (جرمنی) نواز خان (زاہدان، ایران) احمد جان (ٹوکیو جاپان) شاہدہ طاہر محمود چوہدری (ٹمن اک (یو ایس اے)

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم !
ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ سفاک بھی ہوتے ہیں، اس کا ادراک ہر ایک کو ہے۔ میرے سسرال والے بھی سفاکیت میں بہت آگے تھے۔ خود میرا شوہر جو مجھے اپنی زندگی کہا کرتا تھا اس نے بھی حد کردی تھی۔ وہی کچھ میں آج سنانے آئی ہوں۔ امید ہے میری سرگزشت آپ کو بھی پسند آئے گی۔

شمائلہ شمی
(فیصل آباد)

''شمی تو میری حیات ہے۔'' حیات احمد اتنے والہانہ انداز میں کہتا کہ میں شرما جاتی تھی۔ حیات میرا شوہر تھا اور ہماری چند دن پہلے شادی ہوئی تھی۔ میرا تعلق رحیم یار خان سے ہے۔ شادی کرکے میں ملتان آئی تھی۔ رشتہ ایک دور پرے کے رشتے دار کے توسط سے ہوا تھا۔ حیات احمد کا خاندان ہمارے لیے اجنبی تھا مگر بابا کے یہ رشتے دار اس سارے خاندان سے اچھی طرح واقف تھے۔ ملتان شہر کے نواح میں ایک نئی پوش بستی میں ان کا خاندان تھا اور شہر میں ہی ان کی ایک چھوٹی جننگ فیکٹری تھی۔ پیچھے سے بھی یہ لوگ کھاتے پیتے زمیندار تھے اور اب بھی ان کی بہت بڑی زمین تھی۔ اس لحاظ سے مجھے دولت مند سسرال ملا تھا۔ جب کہ میرا میکا زیادہ پیسے والا نہیں تھا۔ بابا درمیانے درجے کے زمیندار تھے اور میرے بھائی منڈی میں آڑھت کا کام کرتے تھے۔ شہر میں ہمارا خوب صورت کوٹھی نما مکان تھا۔ گھر میں گاڑی اور دوسری سہولتیں بھی تھیں۔ گھر میں سب پڑھے لکھے تھے کیونکہ بابا کو تعلیم کا شوق تھا انہوں نے اپنی محنت سے گریجویشن کیا تھا۔ اسی طرح میرے تینوں بھائی اور بڑی بہن بھی پڑھی لکھی تھیں۔

میں نے کالج سے گریجویشن کیا اور میری خواہش تھی کہ بہاولپور یا ملتان یونیورسٹی سے ماسٹر کی ڈگری لوں۔ مگر امی نے اجازت نہیں دی۔ مجھے ہاسٹل میں رہنا پڑتا اور امی اس کے لیے تیار نہیں تھیں اس لیے میں دل مسوس کر رہ گئی۔ حالانکہ بابا کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور بھائی بھی تیار تھے بس امی کی وجہ سے رہ گئی۔ ایک بار داخلے کا وقت نکل گیا تو میں نے امی کو دوسرے سمسٹر کے لیے منانے کی کوشش شروع کی تھی کہ حیات احمد کا رشتہ آگیا۔ وہ ایم بی اے تھے اور اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ فیکٹری کا کام دیکھتے تھے۔ حیات احمد کے باقی دو بھائی بھی پڑھے لکھے تھے اور ان کے والد بھی تعلیم یافتہ تھے مگر ان کی والدہ بالکل ان پڑھ تھیں، حد یہ کہ انہیں آج تک اپنا نام لکھنا بھی نہیں آیا تھا۔ گھر والوں کو رشتہ پسند آیا۔ حیات احمد نہ صرف پڑھے لکھے بلکہ صورت شکل کے بھی اچھے تھے۔ عمر زیادہ نہیں تھی وہ چھبیس برس کے اور مجھ سے چھ سال بڑے تھے۔

بابا اور بھائیوں نے چھان بین کی۔ واحد اعتراض جو ہوسکتا تھا اس کے بارے میں انہوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ حیات احمد کی اپنی ماموں کی بیٹی سے شادی ہوئی تھی، یہ دو سال پرانی بات تھی اور یہ شادی صرف ایک مہینے برقرار رہی تھی اس کے بعد لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی اور پھر واپس نہیں آئی اس کا واحد مطالبہ طلاق تھا جو بالآخر حیات احمد نے چار مہینے بعد دے دی تھی۔ ہمارے رشتے دار جن کے توسط سے یہ رشتہ ہو رہا تھا ان کا کہنا تھا کہ لڑکی ذرا تیکھے مزاج کی تھی اور اس کی شوہر سے بنی نہیں۔ ایک بار وہ گھر سے گئی تو مصالحت کی ہر کوشش ناکام رہی کیونکہ لڑکی کا واحد مطالبہ طلاق تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ حیات احمد کے مزاج سے سمجھوتا نہیں کرسکتی.... بابا نے دبے لفظوں میں پوچھ لیا کہ حیات احمد کے ساتھ کوئی طبی مسئلہ تو نہیں تھا۔ اس پر ان رشتے دار نے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ اس رشتے کو آگے کرنے سے پہلے انہوں نے خود لڑکی کے گھر والوں سے اس بارے میں معلوم کیا تھا۔

اتفاق سے ان کے حیات احمد کے ماموں سے بھی تعلقات تھے اور انہوں نے یہی کہا کہ اس طلاق میں لڑکی اور لڑکے دونوں کا قصور تھا کیونکہ وہ آپس میں سمجھوتا نہیں کرسکے تھے۔

تین مہینے چھان بین چلتی رہی، اس دوران میں بابا اور بھائی ملتان جا کر حیات احمد اور اس کے گھر والوں سے مل آئے۔ انہیں گھر کا ماحول اچھا لگا تھا۔ پھر امی کی ایک کزن ملتان میں رہتی تھیں۔ امی نے ان کے توسط سے حیات احمد کے ماموں کے گھر کی خواتین سے رابطہ کیا اور انہوں نے بھی ایسی کوئی بات نہیں بتائی جس سے ہمیں کھٹکا ہوتا۔ ہاں انہوں نے حیات احمد اور ان کی والدہ کو برا بھلا ضرور کہا تھا۔ عورتوں کا کہنا تھا کہ اس طلاق میں اصل ہاتھ حیات احمد کی والدہ کا تھا۔ مگر انہوں نے بھی کوئی ٹھوس وجہ نہیں بتائی تھی۔ اس سے یہی درست لگا کہ دونوں میاں بیوی مزاجوں کے فرق کی وجہ سے نباہ نہ کرسکے تھے۔ بابا اور بھائی بھی مطمئن واپس آئے تھے اس لیے طویل صلاح مشورے کے بعد بالآخر ہاں کر دی گئی کیونکہ خاندان بہت اچھا، پڑھا لکھا اور کھاتا پیتا تھا۔ حیات احمد کے گھر والوں کی کوئی شرط نہیں تھی سوائے اس کے کہ لڑکی اور اس کا خاندان شریف اور تعلیم یافتہ ہو۔

تین مہینے ہاں کرنے میں لگے تھے اور تین ہی مہینے شادی میں لگے۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کاش یہ رشتہ نہ ہوتا تو میں یونیورسٹی میں داخلے کی کوشش کرسکتی تھی کیونکہ ان ہی دنوں داخلے ہو رہے تھے۔ مگر میں دلہن بننے کی تیاری کر رہی تھی۔ بالآخر وہ دن آیا جو ہر لڑکی کے لیے بہت خوشیاں، بہت سے خدشات اور بہت سی انجانی چیزیں لے کر آتا ہے۔ پنجاب میں بھی اب رات میں شادیاں ہونے لگی ہیں۔ مگر یہ رواج بڑے شہروں کی حد تک ہے۔ برات دوپہر بارہ بجے ہمارے ہاں پہنچ گئی تھی۔ ایک بجے نکاح ہوا اور دو بجے کھانے کے بعد دو گھنٹے میں دوسری رسومات نمٹا کر رخصتی کر دی گئی تھی۔ سردیوں کے دن تھے اس لیے جلدی رخصتی کی گئی ابھی ڈھائی تین گھنٹے کا سفر بھی تھا۔ برات گاڑیوں اور ایک بڑی بس میں آئی تھی۔ میں جس کار میں تھی اس میں میرے ساس سسر کے علاوہ میرے جیٹھ تھے جو

گاڑی چلا رہے تھے۔ حیات احمد دوسری گاڑی میں تھے اور میں اپنی ساس کے ساتھ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ حیات احمد کیوں نہیں میرے ساتھ بیٹھے۔ سات بجے ہم ملتان پہنچ گئے۔

کئی گھنٹے کی طویل اور نت نئی رسومات کے بعد بالآخر دس بجے مجھے تنہائی ملی اور میں تکیے سے کمر لگا کر بیٹھی تو مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔ کئی گھنٹے کے سفر کی تھکن بھی تھی جو حاوی آگئی۔ پھر مجھے حیات احمد نے جگایا۔ وہ دیر سے آئے ہوئے تھے اور میرے پاس بیٹھ کر بس مجھے دیکھ رہے تھے۔ جگا کر انہوں نے معذرت کی۔ ”سوری.... میں نہ جگاتا لیکن اب مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔“

میں نے شرما کر جلدی سے گھونگٹ درست کیا۔ ”آپ کب آئے؟“

”بہت دیر ہوئی.... شاید آدھا یا پون گھنٹا ہوا۔“

”مجھے جگا دیا ہوتا۔“

”نہیں تم بہت تھک کر سو رہی تھیں، میں نے سوچا سونے دوں، ابھی تم نے میرے ساتھ بہت دیر جاگنا ہے۔“ حیات کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تو میں شرما گئی۔ بہت دیر بعد جب قربتوں کی کئی منزلیں طے ہو چکی تھیں اور جب دو دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے تھے تو میں نے شکوہ کیا۔

”آپ میرے ساتھ کیوں نہیں آئے؟“

”ایک تو ماں جی کا حکم تھا کہ میں دوسری گاڑی میں آؤں، دوسرے میں چاہتا تھا تم ریلیکس ہو کر سفر کرو۔ میری موجودگی میں تم اتنے آرام سے نہ رہتیں۔“

میں نے سوچا تو وہ واقعی ٹھیک کہہ رہے تھے ان کی موجودگی میں تو میرا سر گھٹنوں سے لگا رہتا جب کہ میں نے آرام سے سر لگا کر سفر کیا تھا۔ یہ میرے سسر کی گاڑی تھی جو بڑی اور آرام دہ تھی۔ مگر ساتھ ہی مجھے ماں جی کے حکم والی بات کھٹکی تھی۔ میں نے پوچھ لیا۔ ”ماں جی نے ایسا کیوں کہا؟“

”پتا نہیں.... ہم میں سے کوئی ماں جی سے ان کے کسی حکم کی وجہ نہیں پوچھتا، بس ہم عمل کرتے ہیں۔“ وہ آرام سے بولے۔ ”میں نے تو آج تک ابا جی کو بھی ان کی کسی بات پر اعتراض یا سوال کرتے نہیں دیکھا۔“

اس وقت مجھے امی کی کزن کی بات یاد آئی کہ حیات احمد اور ان کی پہلی بیوی کی طلاق میں اصل کردار ان کی ماں کا تھا۔ لیکن میں نے اس وقت اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کہنے والے کسی کے بارے میں ہزار باتیں کر سکتے ہیں۔ اصلیت تو ہمیشہ تجربے سے سامنے آتی ہے۔ صبح تک حیات احمد نے بہت پیار اور نرمی سے سمجھا دیا تھا کہ میں اس بیڈروم کی حد تک خودمختار تھی لیکن اس سے نکلنے کے بعد مجھے ہر کام اپنی ساس کی مرضی سے کرنا تھا۔ حیات احمد نے جس طرح سمجھایا تھا اس سے مجھے یہ بات بری نہیں لگی تھی اور میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ان کی امی کی خوشنودی کا خیال رکھوں گی۔ ان چند باتوں کے سوا اس پہلی رات حیات احمد نے مجھے ایسا پیار اور اعتماد دیا کہ میں ان کی ہر بات دل و جان سے ماننے پر تیار ہو گئی تھی۔ اگر وہ میری جان مانگتے تو میں وہ بھی دینے سے گریز نہ کرتی۔

ایک ہفتے بعد بھائی مجھے لینے آئے تو حیات سے جدا ہونے کے خیال سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا اور میرے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ مجھے تین دن کے لیے جانا تھا اور پھر حیات مجھے لینے آتے۔ میں نے جس گھر میں اور جن لوگوں کے ساتھ ساری عمر گزاری تھی ان کے ساتھ یہ تین دن میں نے یوں گزارے جیسے کسی کو بے گناہ جیل میں ڈال دیا جائے اور اسے کہا جائے کہ وہ تین دن بعد رہا ہو گا۔ تیسرے دن حیات آئے تو میری جان میں جان آئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب اس شخص کے بغیر میری زندگی بیکار تھی۔ حیات احمد کے بغیر میں کچھ بھی نہیں تھی۔ جب وہ مجھے اپنی حیات کہتے تو مجھے لگتا کہ وہ اصل میں میری حیات ہیں۔ ایک ایسا شخص اتنی شدت سے میرے دل و جان میں سما گیا تھا جسے میں چند دن پہلے تک صرف نام سے جانتی تھی۔ حیات ایک دن ہمارے ہاں رکے تھے اور پھر مجھے لے کر ملتان آگئے۔

سسرال میں شروع کا ایک ہفتہ تو بہت اچھا گزرا تھا۔ میرے ساس سسر کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اتفاق سے یہاں بھی سب شادی شدہ تھے۔ میری چار شادی شدہ نندیں تھیں اور دونوں جیٹھ بھی شادی شدہ تھے۔ صرف ایک بہن حیات سے چھوٹی تھی باقی سب ان سے بڑے تھے۔ اس بار واپس آئی تو گھر والوں کا رویہ معمول کے مطابق لگا۔ شاید اس لیے کہ شادی کا پروٹوکول ختم ہو گیا تھا۔ مگر کسی کا رویہ ایسا نہیں تھا جو محسوس ہوتا۔ بڑا سا بھرا پرا گھر تھا۔ میرے دونوں جیٹھ اوپر والی منزل پر رہتے تھے اور میں ساس سسر کے ساتھ نیچے تھی۔ لیکن کچن ایک ہی تھا سب کے لیے ساتھ کھانا بنتا تھا اور یہاں ساتھ کھانے کا رواج تھا۔ ناشتا سب اپنی سہولت اور وقت کے لحاظ سے کرتے تھے۔ دوپہر کے کھانے پر ہم

عورتیں اور بچے ہوتے تھے۔ البتہ رات کو سب کا دسترخوان پر ہونا لازمی تھا۔ صبح کا ناشتا ایک ملازمہ بناتی تھی۔ باقی دو وقت کا کھانا ہم تین بہوئیں مل کر تیار کرتے تھے۔ کیا بننا ہے اور کیسے بننا ہے؟ یہ میری ساس طے کرتی تھیں۔

رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہو گیا کہ صرف کچن نہیں بلکہ دوسرے معاملات پر بھی میری ساس کا مکمل ہولڈ تھا۔ گھر میں ہر کام ان کی مرضی سے ہوتا تھا۔ ہاں ہم بہوؤں کو اوڑھنے پہننے، کھانے پینے اور آنے جانے کی مکمل آزادی تھی۔ اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں صرف اطلاع کر دینا کافی ہوتا تھا اور اگر گھر کے کسی کام یا پروگرام سے تضاد نہ ہوتا تو میری ساس خوشی سے اجازت دے دیتی تھیں۔ البتہ ہمیں صرف شوہروں کے ساتھ جانے کی اجازت تھی یا اگر کسی نے میکے جانا ہوتا تھا تو میکے سے کوئی آکر لے جائے۔ ہمیں اکیلے یا ڈرائیور کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں تھی۔ تینوں مل کر بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ ہاں ساس ساتھ ہوتیں تو ہم ڈرائیور کے ساتھ بھی جا سکتے تھے۔ اپنے کمروں کی حد تک ہم مکمل خودمختار تھے۔ اس سے ہٹ کر ہم اپنے کمرے سے باہر ایک گلدان بھی اپنی مرضی سے کہیں رکھنے کے مجاز نہیں تھے۔ یہ بھی میری ساس طے کرتی تھیں۔

حیات احمد کا خاندان بہت بڑا نہیں تھا مگر اس میں اچھے خاصے گھرانے شامل تھے، اتفاق سے اکثر رشتے دار ننھیالی تھے یعنی میری ساس کے رشتے دار تھے۔ ان کے چار بھائی تھے اور دو بہنیں تھیں۔ وہ سب ملتان یا اس کے آس پاس رہتے تھے۔ ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا یا ہم کسی کے ہاں جاتے تھے۔ سوائے ان ماموں کے جن کی بیٹی سے حیات کی شادی ہو کر ختم ہو گئی تھی۔ نہ ہی ہمارے ہاں سے کوئی ان کے ہاں جاتا تھا۔ میں شادی کے دو مہینے کے اندر سب سے مل چکی تھی سوائے اس گھرانے کے۔ ان ہی دنوں خاندان میں ایک شادی تھی۔ میری ساس کی ایک بہن کی بیٹی کی شادی تھی اور ہم سب دو دن پہلے سے اس میں مدعو تھے۔ کیونکہ ہم بہوؤں کو اپنے شوہر اور گھر بھی دیکھنا ہوتا تھا اس لیے طے ہوا کہ ہم شادی سے ایک دن پہلے جائیں گے اور میرے ساس سسر دو دن پہلے چلے گئے۔

ہم شادی سے ایک دن پہلے پہنچے تو مجھے میری جیٹھانی رضوانہ نے بتایا کہ یہاں سحرش اور اس کا پورا گھر آیا ہوا تھا۔ سحرش حیات کی پہلی بیوی تھی اور مجھے تجسس تھا کہ اسے دیکھوں۔ اس خواہش کے پس پشت کوئی وجہ نہیں تھی بس ایک خیال تھا کہ وہ کیسی ہو گی؟ اب میری خواہش پوری ہو رہی تھی۔ پہلی رات تو اس سے ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ اس کی طبیعت کچھ خراب تھی اور وہ آرام کر رہی تھی۔ مگر اگلے دن جب ہم برات کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے یعنی خود تیار ہو رہے تھے۔ تو غیر متوقع طور پر اکیلے میں سحرش سے سامنا ہو گیا۔ میں جس کمرے میں تیار ہو رہی تھی وہ اچانک وہاں آگئی۔ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا مگر دیکھتے ہی مجھے لگا کہ وہ سحرش ہے۔ وہ اچھی خوب صورت لڑکی تھی اور نک سک سے تیار ہوئی تھی۔ میں نے ہچکچا کر پوچھا۔ ”آپ....“

”سحرش ہوں اور آپ یقیناً شائلہ ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے سنبھل کر کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”تم بہت غلط جگہ آگئی ہو....“

”پلیز مجھ سے اس بارے میں کوئی بات نہ کریں۔“

”تم بے خبری میں ماری جاؤ گی۔“ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”یہ لوگ بہ ظاہر بہت اچھے لگتے ہیں مگر ان کی اصلیت اچانک سامنے آتی ہے اور آدمی ششدر رہ جاتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ انہوں نے خود پر مہذب اور پڑھے لکھے ہونے کا نقاب چڑھا رکھا ہے۔ ان کی اداکاری اتنی پکی ہے کہ میں حیات کی ماموں زاد ہونے کے باوجود ان کے بارے میں پہلے سے نہیں جان سکی تھی۔ جو حیات ابھی تم پر جان چھڑک رہا ہو گا وہی....“

”میں نے کہا نا مجھ سے کوئی بات نہ کریں....“ میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

”مرضی تمہاری۔ لگتا ہے تم بھی میری طرح ٹھوکر کھا کر سیکھو گی۔“ عقب سے اس کی آواز آئی لیکن میں سنی ان سنی کر کے نکل آئی۔ مجھے سچ مچ غصہ آرہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ واپس جا کر اسے کھری کھری سنا دوں۔ مگر اب میں اسے دیکھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ پھر پوری تقریب کے دوران میں اسے نظرانداز کرتی رہی اور وہ جہاں ہوتی اکثر مجھے ہی دیکھتی تھی۔ پتا نہیں دوسروں نے یہ بات محسوس کی یا نہیں لیکن میں نے بہت زیادہ محسوس کی تھی۔ یہاں مرد اور عورتیں الگ الگ حصوں میں تھے اس لیے حیات نہیں تھے اور میں نے شکر ادا کیا کہ وہ نہیں تھے ورنہ وہ میرے چہرے سے بھانپ جاتے۔ شام کو رخصتی کے بعد جب ہم واپس جا رہے تھے تو حیات نے پوچھ لیا۔

”کیا بات ہے تم کچھ چپ چپ ہو؟“
”نہیں تو۔“ میں زبردستی مسکرائی۔ ”بس تھکن ہو رہی ہے۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر اچانک پوچھا۔ ”سحرش سے تمہاری ملاقات ہوئی؟“

میں اقرار کرنے جارہی تھی لیکن نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ ”نہیں۔ہاں اسے دیکھا....وہ بھی تقریب میں اور دور سے۔“

”اچھا کیا جو تم اس سے نہیں ملیں....ورنہ وہ تمہارا ذہن خراب کرنے کی کوشش کرتی۔“

میں نے حیات کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”میں آپ کو جانتی ہوں۔میرے لیے اتنا کافی ہے اس کے لیے مجھے کسی سے ملنے یا اس کی باتوں سے اپنا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

حیات نے محبت سے مجھے دیکھا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ہاں ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے جو اگلے مہینے ملے گا۔“

یہ فروری کا آغاز تھا۔میں نے بے چینی سے کہا۔ ”اگلا مہینا تو ابھی دور ہے۔“

”کتنا دور ہے بس بیس دن تو رہ گئے ہیں۔“

”اور یہ بیس دن کیسے گزریں گے؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”آپ نے بلاوجہ مجھے تجسس میں ڈال دیا ہے۔“

”اسی کا مزہ ہے، تم اندازے لگاتی رہو کہ سرپرائز کیا ہوگا۔“

شادی کے بعد میں بس دو بار میکے گئی تھی اور ابتدائی دنوں کا اُبال کم ہونے کے بعد اب مجھے امی، بابا اور گھر والوں کی یاد بہت ستانے لگی تھی۔میں نے ایک دو بار حیات سے کہا لیکن انہوں نے کام کا عذر کیا تو میں چپ ہوگئی۔میرا خیال تھا سرپرائز شاید اسی سلسلے میں تھا۔میں نے ایک دو بار حیات کو کریدا مگر وہ اس معاملے میں بہت کچے نکلے تھے۔انہوں نے بتا کر نہیں دیا۔شادی کے بعد ہم ویسے تو بہت ساری جگہوں پر گھومنے پھرنے جاتے رہے تھے۔ ایک بار حیات کے دوست کی زمینوں پر گئے تھے وہاں ہم نے ایک جھیل پر آنے والے پرندوں کا شکار بھی کیا تھا مگر ہم باقاعدہ ہنی مون منانے کے لیے کہیں نہیں گئے تھے۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کے ہاں نئے شادی شدہ جوڑے کے ہنی مون پر جانے کا رواج ہے یا نہیں۔کئی بار مجھے خیال آیا کہ حیات سے معلوم کروں مگر میں نہ پوچھ سکی۔مجھے اچھا نہیں لگا تھا کہ میں خود سے کہہ کر ہنی مون پر جاؤں۔

مارچ کی پہلی تاریخ کو حیات آفس سے آئے تو چینج کرنے کمرے میں آئے۔میں مدد کے لیے آئی تو انہوں نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں اتنی بے چینی کیوں ہے؟“

میں حیران ہوئی۔ ”کیسی بے چینی؟“

”سرپرائز کی۔“

”وہ تو میرے ذہن میں بھی نہیں ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں تو آپ کو چیزیں دینے آئی تھی۔“

میری صفائی پر وہ کچھ خاموش ہوئے تھے پھر ان کا موڈ اچھا ہو گیا اور انہوں نے کہا۔ ”رات کو بتاؤں گا۔“

رات حیات نے بتایا کہ آنے والے سنڈے کو ہم ہنی مون ٹرپ پر روانہ ہو رہے تھے۔پہلے ہم ایک ہفتہ لاہور میں رک کر وہاں سیر و تفریح کرتے اسلام آباد جائیں گے اور پھر مری اور اس سے آگے جا کر برف دیکھیں گے۔“

”سچ۔“ میں خوش ہوگئی۔ ”بہت مزہ آئے گا۔“

”بس یہی سرپرائز تھا۔“

ہم مارچ کے پہلے ہفتے میں روانہ ہوئے تھے اور تیسرے ہفتے ہم مری اور اس سے آگے کاغان تک جاتے۔ اس وقت تک برف موجود ہوتی۔میں تیاریوں میں لگ گئی۔اتوار والے دن ہم روانہ ہوئے۔وہاں ہمارا قیام میرے سسر کے ایک دوست جہانگیر انکل کے گھر تھا۔ان کا خاندان ملتان میں ہی ہوتا تھا وہ خود لاہور میں رہتے تھے اور مجھے اچھے نہیں لگے تھے کیونکہ پہلی ملاقات میں انہوں نے مجھے کچھ عجیب ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا تھا۔وہاں صرف وہ تھے یا ملازمین تھے۔تنہائی میسر آتے ہی میں نے حیات سے کہا۔ ”ہم کہیں اور نہیں ٹھہر سکتے تھے۔یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

”ہوٹل میں بھی کوئی نہیں ہوتا ہے اور پھر انکل جہانگیر کے اپنے مشاغل ہیں وہ ہماری تنہائی میں مخل نہیں ہوں گے۔“

واقعی ایسا ہی تھا۔ہم تقریباً اکیلے ہوتے تھے۔عام طور سے صبح کے ناشتے پر جہانگیر انکل سے ملاقات ہوتی تھی اور پھر وہ چلے جاتے تھے۔ہم بھی گھومنے نکل جاتے۔دوپہر کو باہر ہی کھاتے تھے اور جب واپس آتے تب بھی وہ کم ہی ملتے تھے۔پورے ہفتے میں ہماری ان سے مشکل سے دس

ملاقاتیں ہوئی تھیں۔البتہ اسلام آباد جانے سے ایک دن پہلے چھٹی کا دن تھا وہ گھر میں تھے اور صبح سے گھر میں موجود تھے۔ناشتے کے بعد انہوں نے پہلی بار ہمیں پوری کوٹھی دکھائی ورنہ اب تک ہم اپنے کمرے اور ڈائننگ ہال تک محدود تھے۔کوٹھی کے عقبی حصے میں بڑا سا خوب صورت برڈ ہاؤس تھا جہاں بے شمار قیمتی اور نایاب پرندے رکھے ہوئے تھے۔ایک بڑا سا سوئمنگ پول تھا۔یہ دیکھ کر مجھے شرم آئی کہ سوئمنگ پول کے ساتھ لائف سائز عریاں نسوانی مجسمے بھی تھے۔مجھے گھبراہٹ ہوئی اور میں حیات سے کہہ کر وہاں سے نکل آئی۔حیات نے مجھے یہ تو بتایا تھا کہ انکل جہانگیر عیاش طبع آدمی ہیں اور اسی وجہ سے یہاں اکیلے رہتے تھے۔گھر والوں کو ملتان میں رکھا ہوا تھا۔ملتان میں ان کی بہت بڑی زمین تھی اور یہاں انہوں نے ٹیکسٹائل مل کھولی ہوئی تھی۔مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنے کھلے ڈلے ہوں گے۔وہ بلا جھجک مجھے اور حیات کو سوئمنگ پول والی طرف لے گئے تھے۔

میں اپنے کمرے میں آگئی۔آج ہمیں شالامار باغ جانا تھا مگر انکل جہانگیر نے اصرار کر کے روک لیا کہ ان کے ساتھ لنچ کر کے جائیں۔ابھی میں آئی تھی کہ چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔میں سمجھی کہ کوئی ملازمہ ہوگی۔کوٹھی کے اندر کے کاموں کے لیے تین ملازمائیں تھیں۔ورنہ حیات کو دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”یس۔“

دروازہ کھلا اور انکل جہانگیر اندر آئے تو میں نے بوکھلا کر دوپٹا لیا تھا۔میرا خیال تھا کہ ان کے پیچھے حیات بھی ہوں گے لیکن وہ اکیلے تھے۔میں نے پوچھا۔ ”انکل آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے بلا لیا ہوتا۔“

”خوب صورت لوگوں کے لیے ہم خود زحمت کرتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔پھر ایک بڑا سا شاپر میری طرف بڑھایا۔ ”تم پہلی بار میرے گھر آئی ہو، یہ میں نے تمہارے لیے کچھ تحفے لیے ہیں۔“

یہ روایت تھی اس لیے میں نے شاپر لے لیا۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی انکل؟“

”ضرورت تھی....اس میں ایک سوٹ ہے۔ریڈی میڈ ہے، میں نے اندازے سے لیا ہے امید ہے تمہیں ناپ پورا ہوگا۔“ کہتے ہوئے انہوں نے جس طرح میرا معائنہ کیا تھا مجھے بے چینی ہونے لگی تھی۔

غزل

یہ کس طرح سے محبت میں خوار اس نے کیا
کہ شہ سوار کو ہے خرسوار اس نے کیا
گو اہلیہ نے مری شرٹ کی دھلائی کی
مرا گریباں مگر تار تار اس نے کیا
میں بے وقوف نہ کچھ بھی سمجھ سکا اب تک
مجھے اشارہ مگر بار بار اس نے کیا
مجھے ہے لوٹ لیا کھیل میں محبت کے
مری رقم سے نیا کاروبار اس نے کیا
میں چاہتا رہا فرزند کو بہت اس کے
جواب میں مرے بچوں سے پیار سے اس نے کیا!
یقیں کسی نے بھی شانہ نہیں کیا تیرا
یہ کیا غضب ہے مرا اعتبار اس نے کیا

اقبال شانہ

”شکریہ انکل۔“ میں نے ان کے عقب میں دیکھا۔ ”حیات کہاں ہیں؟“

”وہ ذرا برڈ ہاؤس میں لگا ہوا ہے، میں نے سوچا تمہیں گفٹ اور کمپنی دیدوں، تم بور ہو رہی ہوگی۔“

یہ جان کر میری گھبراہٹ سوا ہوگئی کہ حیات کوٹھی سے باہر تھے۔ ”میں بور نہیں ہو رہی تھی....میں نے سوچا کہ تیار ہو جاؤں جانے کے لیے۔“

”اس میں تو وقت ہے ابھی۔“ وہ وہیں کرسی پر براجمان ہوگئے۔

”ہاں لیکن حیات کو پسند نہیں ہے کہ میں عین موقع پر تیار ہوں۔اس لیے میں نے سوچا کہ ابھی تیار ہو جاؤں۔“

وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے اس لیے بادلِ ناخواستہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”ٹھیک ہے تم تیار ہو....حالانکہ تم ان عورتوں میں سے ہو جنہیں تیار ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے وہ ہر حال میں اچھی لگتی ہیں۔“

میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور میں نے بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیا ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ پوچھ لوں کہ کیا وہ اپنی بہوؤں کی بھی اسی طرح تعریف کرتے ہیں۔ان کے دو شادی شدہ بیٹے تھے۔حیات خاصی دیر بعد آئے تھے اور تب تک میں نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔میں نہیں چاہتی تھی کہ حیات سے کچھ کہوں اور ان کا موڈ آف ہو جائے۔پچھلے کچھ

عرصے میں وہ ایسی باتوں پر بھی مجھ سے موڈ آف کر لیتے تھے جن میں میرا کوئی قصور نہیں ہوتا تھا بس وہ ان کو بری لگتی تھیں۔اس لیے میں احتیاط کرنے لگی تھی کہ ایسی کوئی بات میرے توسط سے ان تک نہ پہنچے۔ البتہ وہ شاپر دیکھ کر چونکے۔ ''یہ کیا ہے؟''

''انکل نے دیا ہے۔'' میں نے تفصیل میں جانے اور یہ بتانے سے گریز کیا کہ وہ میرے کمرے میں آئے تھے۔ ''میرے لیے کچھ تحفے ہیں۔''

''اوہ اچھا۔'' انہوں نے بس اتنی دل چسپی لی تھی۔

''حیات ہم کب اسلام آباد جائیں گے؟''

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''تم کو معلوم تو ہے ہم کل جائیں گے۔''

''میں اب بور ہوگئی ہوں یہاں۔''

''ابھی نکلیں گے تو تمہاری بوریت دور ہو جائے گی۔''

میں تیار ہو گئی کیونکہ انکل جہانگیر سے کہہ چکی تھی۔میں نے حیات کی فرمائش پر ساڑی پہنی تھی۔ان کے گھر میں ساڑی پہننے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ اپنا شوق یہاں پورا کر رہے تھے۔انہوں نے اسی لیے دو ساڑیاں لی تھیں۔جب ہم لنچ کی میز پر آئے تو وہاں انکل جہانگیر نے جس طرح مجھے دیکھا تھا مجھے پھر غصہ آنے لگا تھا۔ اتفاق سے میں ان کے دائیں طرف... بیٹھی تھی اور وہ بار بار مجھے دیکھ رہے تھے۔بڑی مشکل سے میں نے چند نوالے لیے اور اٹھ گئی۔حیات نے حیرت سے دیکھا تو میں نے کہا۔ ''بس میں نے کھالیا۔''

''کچھ تو کھاؤ آج تو خاص تمہارے اعزاز میں سب بنا ہے۔'' انکل جہانگیر بولے۔

''بس میں نے کھالیا۔'' میں نے کہا۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔میں کچھ دیر آرام کروں گی۔''

میں نے کہا اور وہاں سے جانے لگی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں کچھ دیر وہاں رکی تو کچھ کہہ بیٹھوں گی۔ مجھے اس شخص پر شدید غصہ آرہا تھا جسے اپنی عمر اور مجھ سے تعلق کا خیال بھی نہیں تھا۔جب میں ڈائننگ روم سے نکل رہی تھی تو میں نے اس کی آواز سنی' وہ حیات سے کہہ رہا تھا۔ ''کوئی خوش خبری ہے کیا؟''

اپنے کمرے میں آکر میں رو دی تھی۔ جب حیات کو معلوم تھا کہ ان کے باپ کا یہ دوست کس قماش کا آدمی ہے تو وہ مجھے یہاں کیوں لائے تھے اس وقت مجھے ان پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ان کے آنے سے پہلے میں نے اپنا چہرہ صاف کر لیا۔مگر میرا موڈ آف رہا تھا اور یہ بات حیات نے بھی محسوس کرلی۔انہوں نے چلنے کو کہا تو میں صرف اس لیے تیار ہوگئی کہ میں اس شخص کے گھر میں کم سے کم وقت گزارنا چاہتی تھی۔باہر نکل کر میرا موڈ بہتر ہوا تھا۔حیات نے پوچھا تو میں ٹال گئی تھی کہ میرا موڈ ٹھیک ہے۔پھر ہم جہاں گئے وہاں میں نے جان بوجھ کر دیر کی۔شام تک ہم شالامار میں رہے پھر آس پاس کے تاریخی مقامات کو دیکھا اور پھر میں نے حیات سے فوڈ اسٹریٹ چلنے کو کہا۔رات کا کھانا ہم نے وہیں کھایا تھا اور پھر ایک جگہ سے آئسکریم کھاتے ہوئے ہم رات دیر سے واپس آئے تھے۔میں نے سکون کا سانس لیا کہ جہانگیر سے سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اگلی صبح جب ہم ناشتے کی میز پر پہنچے تو ملازمہ نے اطلاع دی کہ صاحب کی طبیعت خراب ہے اور وہ آرام کر رہے ہیں۔ مجھے اچھا لگا تھا کہ جاتے ہوئے اس کی صورت نہیں دیکھنا پڑی لیکن جب ہم نکل رہے تو حیات کے کہنے پر مجھے اس کے کمرے میں خدا حافظ کہنے کے لیے جانا پڑا تھا۔وہ سرخ آنکھوں اور سوجے ہوئے چہرے کے ساتھ بیڈ پر دراز تھا اور وہاں مجسموں کے بجائے دیواروں پر واہیات تصاویر لگی تھیں۔میں اسے خدا حافظ کہہ کر جلدی سے وہاں سے نکل آئی۔میرا موڈ پھر آف ہوگیا تھا۔حیات باہر آئے اور ہم کوٹھی سے نکلے تو میں نے ان سے صاف کہہ دیا۔ ''آئندہ آپ نے اگر اس کوٹھی میں آنا ہو تو مجھے مت لائیے گا۔''

حیات کو بھی احساس ہو گیا تھا انہوں نے معذرت کی۔ ''سوری مجھے اندازہ نہیں تھا کہ انکل نے اپنے بیڈروم کو بھی اس قدر رنگین بنا رکھا ہوگا۔''

''اس شخص کو تعلق اور چھوٹے بڑے کا لحاظ بھی نہیں ہے۔کیا اس کے گھر والے یہاں نہیں آتے ہیں، اس کی بہو' بیٹیاں اس کمرے اور سوئمنگ پول والے حصے کی طرف نہیں جاتی ہوں گی؟''

''پتا نہیں، ویسے میرا خیال ہے وہ لوگ یہاں نہیں آتے ہیں۔''

''کچھ بھی ہو میں آپ کو بتا رہی ہوں اب اگر آپ مجھے لے کر لاہور آئے تو میں اس کوٹھی میں ہرگز نہیں رکوں گی۔''

''اب شاید ہی آنا ہو۔'' حیات نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو اب تمہیں یہاں نہیں آنا پڑے گا۔''

حیات نے اسلام آباد جانے کے لیے جی ٹی روڈ منتخب کی تھی کیونکہ موٹروے ذرا دور پڑتی تھی۔جی ٹی روڈ بھی اچھی ہے لیکن اس پر ٹریفک بہت زیادہ تھا۔حیات کے پاس چند سال پرانی کار تھی اور انہوں نے بہت سنبھال کر رکھی تھی اس لیے نئی لگتی تھی ہم اسی میں سفر کر رہے تھے۔اس سے یہ سہولت تھی کہ کہیں بھی جاتے تو ٹیکسی یا کسی کی کنوینس کے محتاج نہیں تھے ہر جگہ اپنی گاڑی میں گھومتے تھے۔میں پہلے تو باہر دیکھتی رہی پھر بور ہو کر میوزک سننے لگی۔حیات ڈرائیونگ کرتے ہوئے بات نہیں کرتے تھے۔میں نے نشست ذرا پیچھے کرلی اور آنکھیں بند کرکے ریلکس کرنے لگی۔میں نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی۔اس لیے جب اچانک کار کو شدید دھچکا لگا تو میں اچھل کر ڈیش بورڈ اور ونڈ اسکرین سے ٹکرائی تھی۔میرا سر بہت زور سے ونڈ اسکرین پر لگا تھا۔میرا سر گھوم رہا تھا اس کے ساتھ ہی شاید کار بھی گھوم رہی تھی۔میں نے دیکھا کار کھیتوں میں گھسی جا رہی تھی اور حیات اسٹیئرنگ پر اوندھے منہ پڑے تھے پھر کار خود رکی اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

مجھے ہوش آیا تو میں ایک آرام دہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور میرے ماتھے پر پٹی رکھ کر اسے ٹیپ لگایا گیا تھا۔جسم ہلکا پھلکا ہو رہا تھا مگر گلا خشک تھا۔میں چونک کر اٹھی تو سب سے پہلے میری نظر بیڈ کی سائیڈ دراز پر رکھے پانی کے جگ اور گلاس پر گئی۔میں نے بے تابی سے گلاس میں پانی نکالا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔پھر کمرے کا جائزہ لیا۔دیواروں پر ہلکا گلابی رنگ تھا۔بیڈ کے اوپر ٹیوب لائٹ لگی تھی اور دوسری دیواروں پر چھوٹے کرسٹل لیمپ لگے تھے۔ایک طرف کھڑکی پر گلابی رنگ کے پردے تھے اور فرش پر چمکیلے گلابی رنگ کا قالین تھا۔بیڈ ڈبل تھا اور اس پر بہت آرام دہ گدا تھا۔ایک طرف چار پٹ والی بڑی الماری تھی، دوسری طرف جہازی سائز کی ڈریسنگ ٹیبل تھی۔کونے میں چھوٹا صوفہ سیٹ اور گلاس ٹاپ ٹیبل تھی۔کمرا بڑا تھا اور یقیناً کسی بڑی عمارت کا حصہ تھا۔یہ اسپتال نہیں تھا تو پھر میں کہاں تھی؟

میں گھبرا کر اٹھی، سب سے پہلے اپنا جائزہ لیا۔میرے جسم پر لباس ٹھیک تھا یعنی کسی نے مجھے چھیڑا نہیں تھا۔میرے سینڈلز بیڈ کے برابر میں رکھے تھے۔جسم صاف ستھرا تھا اگر کہیں خون یا کچھ اور لگا تھا تو صاف کر دیا گیا تھا۔ مجھے بازو میں تکلیف ہوئی تو میں نے آستین اوپر کی، کہنی کے جوڑ پر انجکشن کا نشان تھا۔بلکہ دو نشان تھے یعنی مجھے دو انجکشن لگے تھے۔شاید اسی اثر سے میرا جسم ہلکا پھلکا ہو رہا تھا ورنہ حادثے میں یقیناً مجھے خاصی چوٹیں لگی تھیں۔مگر کوئی ایسی چوٹ نہیں تھی کہ مجھے اسپتال میں داخل ہونا پڑتا۔میری کلائی سے گھڑی بندھی تھی اور میں نے وقت دیکھا تو میں چونک گئی۔شام کے سات بج رہے تھے جب کہ جس وقت حادثہ پیش آیا تو شاید گیارہ کے آس پاس کا وقت تھا اس کا مطلب تھا میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ بے ہوش رہی تھی۔پھر مجھے حیات کا خیال آیا۔وہ کہاں تھے؟ میں جلدی سے سینڈل پہن کر دروازے تک آئی۔ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا لیکن وہ یقیناً باتھ روم کا تھا۔

ایک دروازہ باہر جانے والا تھا مگر جب میں نے اسے کھولنے کے لیے ہینڈل گھمایا تو وہ لاک نکلا۔ہینڈل گھوم رہا تھا مگر دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔گویا میں اس کمرے میں قید تھی۔میں نے کوشش کی اور پھر تھک کر چھوڑ دیا۔ذرا سی کوشش سے میں ہانپنے لگی تھی۔پھر میں دوسرے دروازے کی طرف آئی یہ کھلا ہوا تھا اور میرے اندازے کے عین مطابق باتھ روم کا تھا۔یہ بڑا اور بہت اعلیٰ درجے کا باتھ روم تھا جس میں باتھ ٹب سمیت تمام سہولتیں تھیں۔ایک طرف پوری دیوار آئینہ تھی۔ مجھے لگا جیسے میں کسی بڑی سی کوٹھی میں ہوں۔میں واپس آئی اور دروازہ بجایا۔ ''کوئی ہے.... مجھے یہاں کیوں قید کیا ہوا ہے؟.... دروازہ کھولو۔''

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔وہاں اتنی خاموشی تھی کہ سینے میں دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔میں نے آئینے میں اپنا معائنہ کیا۔میرے سر پر چوٹ آئی تھی اور اس کی دھمک ابھی تک تھی مگر جسم میں درد نہیں تھا۔اب مجھے خوف آنے لگا تھا۔پتا نہیں حادثے میں کیا ہوا تھا؟ حیات کو آخری بار میں نے اسٹیئرنگ پر بے سدھ پڑے دیکھا تھا اور کار بے قابو ہو کر کھیتوں میں گھس گئی تھی۔شاید پیچھے سے کسی گاڑی نے ٹکر ماری تھی۔مگر مجھے یہاں کون لایا؟.... مجھے اپنے پرس کا خیال آیا مگر وہ یہاں نہیں تھا اس میں میرا موبائل تھا۔پتا نہیں وہ گاڑی میں رہ گیا تھا یا مجھے یہاں لانے والوں کے قبضے میں تھا؟ میں نے ایک بار پھر دروازہ زور و شور سے بجایا۔ہر گزرتے لمحے میرا خوف بڑھ تھا۔میں کس کے قبضے میں تھی اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ میں دروازہ پیٹ رہی تھی اچانک باہر سے کلک کی آواز آئی اور

پھر ہینڈل گھوما۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ دروازہ کھلا اور ایک لمبی تڑنگی اور گوری چٹی عورت سامنے کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے بی بی کیوں شور کرتا ہے؟" اس نے پٹھانوں کے سے لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو مجھے یہاں کیوں قید کر رکھا ہے؟"

"ہم نازک بی بی۔" اس نے اپنا تعارف کرایا، عام حالات میں میں اس تضاد پر ہنس دیتی مگر ان حالات میں ہنسی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"تم نے مجھے کیوں قید کیا ہے۔ میرا شوہر کہاں ہے؟"

"ہم نے قید نہیں کیا ہم اِدھر کا نگران ہے۔ ہم کو تمہارے شوہر کا بھی نہیں پتا۔"

"تب یہاں کا مالک کون ہے۔ مجھے کوئی تو لایا ہو گا۔"

"اِدھر کا مالک کوئی اور ہے۔ پر ہم کو بتانے کا اجازت نہیں ہے۔"

میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ "یہ جگہ کہاں ہے؟"

"ادھر جنگل میں۔" اس نے جواب دیا۔ "ہم کو جگہ کا نہیں معلوم ہے۔ تم بولو بھوک لگی ہے کھانا لائے.... چائے شربت جو بولو لائے گا۔"

"مجھے یہاں سے جانے دو۔" میں دروازے کی طرف بڑھی تو وہ چٹان کی طرح راہ میں حائل ہو گئی۔ میں نے اسے ہٹانے کی کوشش کی مگر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ دے سکی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ زور زبردستی سے یہاں سے نہیں نکل سکتی اس لیے روہانسے لہجے میں کہا۔ "اللہ کے واسطے تم بھی عورت ہو، میں کسی کی بیوی ہوں .... کسی کی امانت ہوں.... مجھے جانے دو ورنہ میں بے آبرو ہونے پر مرنے کو ترجیح دوں گی۔"

"بی بی پریشان نہ ہو۔" خلافِ توقع اس نے نرمی سے کہا۔ "ابھی آرام کرو تم کو کچھ نہیں ہو گا۔ ادھر ڈیرے پر کوئی نہیں ہے۔ مالک بھی نہیں ہے تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اب دروازہ تب بجانا جب کوئی ضرورت ہو۔" اس نے کہتے ہوئے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر لیا۔ اس کا لاک باہر سے کھلتا تھا۔ میں تھکے انداز میں واپس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور پھر لیٹ کر رونے لگی تھی۔ مجھے حیات یاد آ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھا؟ اگر وہ ٹھیک تھا تو اس وقت پاگلوں کی طرح مجھے تلاش کر رہا ہو گا۔ حادثے کے بعد ہم سڑک سے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ یقیناً کسی نہ کسی نے ہماری گاڑی کو دیکھا ہو گا۔ ممکن ہے پہلے اس ڈیرے کے مالک نے دیکھا ہو اور وہ مجھے گاڑی سے نکال لایا تھا اس نے صرف مجھے نکالا تھا ورنہ حیات بھی میرے ساتھ ہوتے۔

اگر حیات وہیں رہ گئے تھے تو بعد میں کسی اور نے انہیں اسپتال پہنچایا ہو گا اور اللہ کرے وہ ٹھیک ہوں۔ میں نے دل سے دعا کی۔ پھر میں نے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے دعا کی، اس دوران میں میرے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔ نہ جانے کب تک اسی طرح روتے ہوئے میں سو گئی۔ ایک بار میری آنکھ کھلی تو مجھ پر ہلکا کمبل پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا شاید نازک بی بی مجھ پر ڈال گئی تھی۔ یہاں ابھی تک سردی تھی شاید کھلا علاقہ ہونے کی وجہ سے۔ میں کمبل میں گھس گئی جیسے اس کی پناہ لے رہی ہوں۔ دوبارہ میری آنکھ کھلی تو مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ صبح ہو گئی تھی کیونکہ گھڑی میں سات بج رہے تھے۔ میں نے کل صبح کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے پردہ سرکا کر باہر جھانکا۔ یہ چھوٹے شیشوں والے پٹ تھے جن پر اندر کی طرف مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔

شیشوں کے پاس ایک خوب صورت باغ تھا۔ اس پر گلاب کے تختے لہلہا رہے تھے۔ کوئی بیس گز دور چار دیواری تھی اور اس کے پار گھنے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ نازک بی بی ٹھیک کہہ رہی تھی یہ جگہ جنگل میں تھی۔ تبھی یہاں کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے پٹ کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ فکس تھے۔ کھلتے نہیں تھے۔ میں ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آئی۔ اس کی درازیں کھول کر دیکھیں مگر ان میں سوائے کنگھے اور برش جیسی چیزوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ الماریوں کے لاک لگے تھے اور یہ بہت مضبوط لاک تھے، میں نہیں توڑ سکتی تھی۔ پھر واش روم میں آئی وہاں بھی مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جس سے میں اپنی حفاظت کا کام لے سکتی یا یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتی۔ اچانک باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے باہر آئی۔ نازک بی بی ہاتھ میں ایک بڑے سائز کی پلاسٹک ٹرے اٹھائے ہوئے تھی۔ اس میں ناشتا تھا۔ اس نے میز پر ٹرے رکھی اور بولی۔

"بی بی ناشتا کر لو میں کچھ دیر بعد آ کر برتن لے جاؤں گی۔"

وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر ناشتا کیا۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی، اس کے باوجود کھانے کے لیے مجھے خود پر جبر کرنا پڑا تھا۔ پراٹھے اور تلے ہوئے انڈے تھے ساتھ میں ایک چھوٹے کیتلی نما تھرماس میں گرم چائے تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ ساری چیزیں پلاسٹک کی تھیں۔ حتیٰ کہ چائے کا مگ بھی ایک خاص قسم کے پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔ کوئی شیشے یا تام چینی کا برتن نہیں تھا۔ شاید انہیں خطرہ تھا کہ میں ایسی کسی چیز کو ہتھیار کے طور پر یا خودکشی کے لیے نہ استعمال کر لوں۔ اس سے مجھے خیال آیا اور میں نے کمرے کا دوسری نظروں سے جائزہ لیا۔ بیڈ اور دوسرا فرنیچر پارٹیکس اور لکڑی کا بنا ہوا تھا مگر اس سے کوئی حصہ الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میز بھی لکڑی کی تھی اور اس پر بہت موٹے شیشے کا ٹاپ تھا۔ صوفے گدیلے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اگر میں کسی طرح میز کا شیشہ توڑ دوں تو اس کے ٹکڑے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ مگر ٹوٹی میز فوراً نظروں میں آ جاتی۔

مجھے جس طرح اطمینان سے یہاں قید کیا تھا اس سے صاف لگ رہا تھا کہ قید کرنے والوں کو کوئی خوف نہیں تھا۔ نہ اُن کو یہ ڈر تھا کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گی۔ میں ایک کمزور عورت ہوں اور مجھ پر ایک تنومند نگران عورت لگا کر وہ مطمئن تھے۔ پولیس کی بھی رسائی یہاں ممکن نہیں تھی۔ یہ تو یقینی بات تھی کہ اب تک میری گم شدگی کی رپورٹ کرائی جا چکی ہو گی اور حیات کے ساتھ ساتھ اب مجھے پولیس بھی تلاش کر رہی ہو گی۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگا کہ میں پورے ایک دن سے غائب تھی اور اگر میں یہاں سے چھوٹ جاتی اور واپس حیات کے پاس پہنچ جاتی تو کیا میں اپنی پاکیزگی کا یقین دلا سکتی تھی؟ میں نے سوچا تو مجھے اندر سے یقین ہوا کہ حیات مجھ پر ضرور یقین کریں گے۔ وہ جانتے ہیں میں ان سے جھوٹ نہیں بول سکتی ہوں۔ دوسروں کا مجھے نہیں معلوم تھا۔ مگر اس وقت تو مجھے یہاں سے نکلنا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہو گا۔

ناشتے کے بعد نازک بی بی آ کر برتن لے گئی اور میں نے اس سے جو کچھ کہا وہ اس نے سنی ان سنی کر دیا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد میں چپ ہو گئی اور خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخیں مار کر روؤں۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ اگر میں نے حواس کھو دیئے تو شاید کبھی یہاں سے آزاد نہ ہو سکوں۔ میں دوبارہ باتھ روم میں آئی۔ یہاں شیمپو اور دوسرے لیکوئیڈز کی بوتلیں تھیں جو صفائی کے کام آتے ہیں۔ مگر ساری بوتلیں نرم پلاسٹک کی تھیں۔ ڈبلیو سی اور فرش صاف کرنے والے آلات بھی پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے اور ان سے ہتھیار کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ ٹب کے اوپر روشن دان تھا اور اس پر اندھا شیشہ لگا ہوا تھا اس سے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اچانک میری نظر ڈبلیو سی کے فلیش ٹینک کی طرف گئی۔ اس کے اوپر سرامک کا بنا ہوا بھاری ڈھکن تھا مگر اس کی ساخت ایسی تھی اسے پکڑ کر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے معمولی سی کوشش سے اسے فلیش ٹینک سے الگ کر لیا۔ یہ تقریباً ایک فٹ لمبا اور سات انچ چوڑا تھا۔ وزن ڈھائی تین کلوگرام تھا۔ میں نے اسے مشکل سے اٹھایا تھا اور آسانی سے استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ اگر میں اسے توڑتی تو آواز یقیناً باہر تک جاتی اور نازک بی بی تفتیش کے لیے آ جاتی۔ میں نے اسے واپس رکھ دیا۔ اب مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ مجھے کسی خاص مقصد کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ کوئی دولت مند اور اوباش آدمی جسے عورتوں سے... دلچسپی ہو۔ اس طرح کا کمرا جس سے کوئی بھی آسانی سے باہر نہ جا سکے اور نازک بی بی جیسی طاقتور عورت کوئی ایسے ہی نہیں رکھتا ہے اس کا مطلب تھا میں یہاں لائی جانے والی پہلی عورت نہیں تھی۔ مجھ سے پہلے بھی لائی گئی تھیں۔

اب مجھے خیال آیا کہ کہیں میں بردہ فروشوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی۔ آج کل اخبارات اور میڈیا میں ایسی کہانیاں عام ہیں جب موقع پا کر کسی جوان لڑکی یا عورت کو اغوا کر لیا گیا۔ پھر اسے کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اکثر لڑکیاں اور عورتیں ایک سے زیادہ بار فروخت ہوتی ہیں اور بے شمار بار ذلت سے گزرتی ہیں۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں اندر ہی اندر خود کو پکا کرنے لگی کہ مجھے بہر صورت یہاں سے آزاد ہونا تھا۔ میں کمرے میں ٹہل رہی تھی اور جب تھک جاتی تو بیڈ پر بیٹھ جاتی ابھی تک میرے ذہن میں کوئی ایسی ترکیب نہیں آئی تھی جس کی مدد سے میں یہاں سے آزادی حاصل کر سکتی تھی۔ نازک بی بی دوپہر میں کھانا لے کر آئی مگر میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے انکار کر دیا تو اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کھا لے بی بی، ہو سکتا آج رات تجھے زیادہ توانائی کی ضرورت ہو۔"

میں چونک گئی۔ "کیا مطلب؟"

”مطلب بھی سمجھ جائے گی۔“ وہ ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ مگر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ مجھے آج رات کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے اندر جیسے گھنٹی سی بجنے لگی تھی۔ کیا وہ خطرہ سامنے آنے والا تھا جو رہ رہ کر میرے ذہن میں آرہا تھا؟ میں بے چین ہوگئی۔ ہر شریف عورت کی طرح مجھے سب سے پیاری اپنی آبرو تھی۔ اگر مجھے موقع ملتا تو میں جان دینا پسند کرتی۔ میں ایک بار پھر واش روم میں آئی۔ میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جس سے آسانی سے اپنی جان لے سکوں مگر وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر میں فلیش ٹینک کے ڈھکن سے میز کا شیشہ توڑ دوں تو مجھے کوئی ایسا ٹکڑا مل سکتا تھا جسے میں چاقو کے طور پر استعمال کرتی۔ مگر ابھی اس پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ جب نازک بی بی ٹرے لے جاتی تب میں یہ کام کرسکتی تھی۔ وہ دو بجے آئی اور کھانے کو جوں کا توں دیکھ کر بولی۔

”تمہارا مرضی بی بی۔“

وہ ٹرے اٹھا کر لے گئی۔ اس کے جاتے ہی میں حرکت میں آئی اور واش روم سے فلیش ٹینک کا ڈھکن لا کر اسے احتیاط سے شیشے پر مارا۔ مگر وہ بہت مضبوط شیشہ تھا۔ اگلی بار میں نے اس پر کمبل رکھ کر مارا تو آواز نہیں آئی مگر ٹوٹا پھر بھی نہیں تھا۔ تیسری بار میں نے بہت قوت سے مارا اور اس بار شیشہ آواز سے ٹوٹا تھا مگر ضرب کی آواز نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں ساکت رہ گئی۔ میری نظر دروازے پر لگی تھی مگر جب کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو میں تیزی سے حرکت میں آئی۔ کمبل ہٹایا۔ میز کا شیشہ دو حصوں میں بٹ کر نکل گیا تھا۔ میں نے ایک حصہ نکالا اور اسے قالین پر رکھ کر اوپر سے کمبل رکھ کر دوبارہ توڑا۔ اس بار اس میں سے دو لمبے اور نوکیلے ٹکڑے نکل آئے تھے۔ ایک تو چاقو جیسی دھار والا تھا۔ میں نے اسے لیا اور واش روم میں آئی۔ ٹب میں پانی کھول کر میں نے کلائی سامنے کی اور ہمت کرنے لگی کہ اسے کاٹ سکوں مگر جب میں نے شیشہ کلائی پر رکھا تو میری ہمت جواب دے گئی۔ میں یہ نہیں کرسکتی تھی۔

میں سسک کر رونے لگی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں نے کمرے میں آکر جلدی سے میز کا باقی شیشہ اور اس کی کرچیاں صاف کرکے انہیں بیڈ کے نیچے ڈالا اور صرف چاقو جیسی دھار والا ٹکڑا اپنے پاس رکھا تھا۔ شیشہ کیونکہ شفاف تھا اس لیے جب تک غور سے نہ دیکھا جاتا تب تک میز کے شیشے کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہوتا۔ مجھے خیال آیا کہ نازک بی بی آئے گی تو میں اس پر چاقو سے وار کروں تو میرا دل لرز کر رہ گیا۔ میں شروع سے کمزور دل کی تھی، کبھی بھی نہیں مار سکتی تھی۔ کسی انسان کو مارنا تو بڑی بات تھی۔ میں زخمی بھی نہیں کرسکتی تھی۔ شام تک اسی کیفیت میں بیٹھی رہی کہ اب کیا کرنا ہے۔ شام کو اچانک دروازہ کھلا تو میں نے جلدی سے شیشے کا چاقو تکیے کے نیچے کرلیا۔ اس بار بھی آنے والی نازک بی بی تھی اور اس کے ہاتھ میں وہی بڑا سا خوب صورت شاپر تھا جس میں جہانگیر نے مجھے تحفے دیئے تھے۔

”اس میں سوٹ ہے وہ پہن لو، میں آٹھ بجے آؤں گی۔“ اس نے کہا اور شاپر میز پر رکھنے لگی تھی کہ میں نے جلدی سے کہا۔

”نہیں یہ مجھے دے دو۔“

”لے لو بی بی۔“ اس نے کسی قدر تعجب سے شاپر مجھے تھما دیا اور بولی۔ ”اچھی طرح تیار ہونا اس میں سرخی پاؤڈر بھی ہے۔“

وہ حکم دے کر باہر چلی گئی۔ یہ شاپر کار میں تھا۔ میں نے اسے بیڈ پر الٹ دیا۔ سلک جیسے نرم اور قیمتی مگر بہت ہلکے کپڑے کا لباس تھا۔ اس سے جسم جھلکتا۔ بہت اعلیٰ قسم کی برانڈڈ میک اپ کٹ تھی۔ ایک پرفیوم تھا۔ سوٹ بغیر دوپٹے کے تھا اور اس کا مقصد صاف ظاہر تھا مجھے کسی کے لیے تیار ہونا تھا۔ یہ سب دیکھ کر مجھے ایسا جنون سوار ہوا کہ میں نے شیشے کے چاقو سے پورا سوٹ لیر لیر کر دیا۔ اس کوشش میں میرے ہاتھ پر بھی جگہ جگہ کٹ لگے تھے اور ان سے خون بہنے لگا تھا مگر اس وقت مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ہانپتے ہوئے میں نے سب چیزیں نیچے پھینک دیں اور اپنے چہرے پر آنے والے بال ہٹائے تو ہاتھ کا خون چہرے پر لگ گیا تھا۔ میری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی تو اپنے چہرے پر لگا خون نظر آیا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے قریب آکر دیکھا پھر ہتھیلی سے رسنے والا خون ہونٹوں کے آس پاس لگایا۔ جیسے جیسے خون رس رہا تھا میں بار بار منہ اور ناک کے آس پاس لگا رہی تھی۔ کچھ دیر میں ایسا لگا جیسے میرے منہ ناک سے بری طرح خون نکلا ہے۔

میں واش روم میں آئی اور فلیش ٹینک کا ڈھکن اٹھایا اور اسے لا کر کمبل میں لپیٹ کر مشکل سے گھما کر قالین پر دے مارا۔ مگر یہ نہیں ٹوٹا تھا۔ اگلی بار میں نے زیادہ زور سے مارا اور اس بار یہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ میں نے ایک ٹکڑا

منتخب کیا یہ آسانی سے ہاتھ میں آرہا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بیڈ کے نیچے ڈال دیا۔ یہ میرے پاس آخری موقع تھا اگر میں کچھ نہ کرپاتی تو شاید پھر میں ہمیشہ کے لیے اپنی نظر میں گر جاتی اگر زندہ رہتی ہوتو۔ نازک بی بی مجھے چھ بجے کپڑے دے کر گئی تھی اور آٹھ بجے آنے کو کہا تھا۔ مگر میں سات بجے ہی بستر پر ایک خاص انداز میں لیٹ گئی۔ میں نے بائیں طرف کروٹ لی ہوئی تھی اور میرا دایاں ہاتھ کمبل کے پاس تھا جس کے نیچے ڈھکن کا ٹکڑا تھا۔ میرا ایک ہاتھ زخمی تھا مگر اب خون رک گیا تھا۔ اس طرح لیٹنا آسان نہیں تھا مگر میں خود پر جبر کرکے لیٹی رہی۔ اگر نازک بی بی یا کوئی اور وقت سے پہلے اور اچانک آجاتا تو مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

جیسے جیسے گھڑی کی سوئی آٹھ بجے کی طرف بڑھ رہی تھی میرے دل کی دھڑکنیں بھی اسی رفتار سے بڑھ رہی تھیں۔ آٹھ بج گئے مگر اب تک نازک بی بی نہیں آئی تھی۔ میں لیٹے لیٹے تھک گئی تھی اور جسم اکڑ گیا تھا لیکن جیسے ہی اٹھنا چاہا دروازے پر مخصوص کلک کی آواز آئی میں جلدی سے پوزیشن میں آگئی۔ میں نے جان کر آنکھیں نیم وا اور منہ کھلا رکھا تھا۔ دیکھنے والے کو یہ نیچرل لگتا۔ نازک بی بی اندر آئی‘ اس نے ایک نظر اپنی لائی چیزوں کا حشر دیکھا پھر مجھے دیکھا تو تیزی سے لپکی تھی اس نے میرے پاس آکر جھکتے ہوئے کہا۔ ”اوئی ماڑا.... لڑکی یہ کیا کیا....“

ابھی اس کا جملہ منہ میں تھا کہ میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور ڈھکن کا ٹکڑا اس کے سر سے لگا۔ اس وار کے پیچھے میری ساری قوت اور نفرت تھی۔ شاید اسی لیے نازک بی بی کو آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں ملا اس نے ہلکی سی اوہ کی اور لڑھک کر پہلے مجھ پر آئی اور پھر اپنے وزن سے نیچے گر گئی۔ اس کے گرتے ہی میں جلدی سے اٹھی۔ سینڈل میں نے پہلے ہی پہن لیے تھے۔ خوش قسمتی سے میرا قد لمبا ہے اور مجھے ہائی ہیل کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اس لیے سینڈل فلیٹ ایڑی والے تھے۔ میں نے ایک نظر بے ہوش نازک بی بی کو دیکھا اور دبے قدموں دروازے کی طرف آئی۔ میں نے باہر جھانکا۔ یہ راہداری تھی جس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ آگے جا کر راہداری بائیں طرف گھوم رہی تھی اور ایک طرف سے یہ بند تھی۔ یہاں فرش تھا اور اس پر چلتے ہوئے سینڈل آواز کرسکتے تھے اس لیے میں نے انہیں اتار کر ہاتھ میں لے لیا اور ننگے پاؤں آگے بڑھی۔ راہداری کے کونے پر آکر جھانک کر دیکھا۔ آگے یہ ایک بڑے سے ہال میں کھل رہی تھی اور ایک طرف کھڑکیاں تھیں جن سے باغ کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں ایک دروازہ بھی تھا جو باغ میں کھلتا تھا۔ میں دبے قدموں اس دروازے تک آئی تھی کہ مجھے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

”اس نے تنگ تو نہیں کیا؟“

”تم جانتے ہو جو ایک بار میرے قابو میں آجائے تو کچھ نہیں کرسکتا۔“ دوسری مردانہ آواز نے کہا۔ لیکن پہلی آواز نے میرا خون خشک کردیا تھا۔ وہ جہانگیر کی آواز تھی۔

”تم نے کام اچھا کیا ہے۔ اس کا معاوضہ بھی اچھا ملے گا۔“

”بس یہ سوچ لینا کہ خطرہ زیادہ تھا۔ بندہ بھی تھا اور وہاں دیکھنے والے بھی بہت تھے، کوئی گڑبڑ ہوجاتی تو میرے آدمی پکڑے جاتے۔ میں نے صرف تمہارے کہنے پر یہ کام کیا ہے۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔ ”سب کچھ ویسے ہوا جیسے سوچا تھا۔ آدمی معمولی زخمی ہوا اور یہ بے ہوش تھی۔ میرے آدمی اسے اٹھا لائے۔“

”آدمی کی فکر مت کرو، میں نے اسے لاہور بھیج دیا ہے۔ ایک دو دن میں وہ ناکام ہوکر ملتان چلا جائے گا۔“ جہانگیر نے کہا اور پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”وہ تیار ہوگئی ہوگی۔“

”بالکل‘ تم نازک بی بی کو جانتے ہو اچھے اچھوں کو سیدھا کردیتی ہے۔ وہ تیار ہوگی اور باقی کام تمہارا ہے۔“

جہانگیر ہنسا۔ ”مجھے تو مزہ ہی اس شکار کا آتا ہے جو بچنے کی کوشش کرے۔“

”بعد میں اس کا کیا کرنا ہے؟“

”وہی جو میں نے کہا۔ میں اس کے آزاد ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“

”اگر میں کچھ دن اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہوں تو....؟“

”رکھ لینا مگر زیادہ لمبا مت کھینچنا.... میری بات سمجھ رہے ہونا.... ابھی دو دن تو میں رکھوں گا اُسے....“

میں دم بہ خود سی سن رہی تھی اور یہ گفتگو یقیناً میرے بارے میں تھی۔ اچانک مجھے ہوش آیا۔ میں کھلی جگہ کھڑی تھی اگر ان دونوں میں سے کوئی ہال سے جھانکتا تو میں صاف نظر آتی۔ نازک بی بی کا بھی پتا نہیں تھا کب ہوش میں آجائے۔ مجھے ان لوگوں کے ہوشیار ہونے سے پہلے یہاں سے نکل

جانا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور باہر نکل آئی۔ احاطے کی دیوار سے لگ رہا تھا یہ بہت بڑی جگہ تھی۔ یہاں جگہ جگہ روشنیاں تھیں اور پورا احاطہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے سینڈل پہنے اور دیوار کے ساتھ لگی جھاڑیوں کی طرف بڑھی۔ وہاں میں کسی کی نظروں سے بچ سکتی تھی اور یہاں سے نکلنے کی راہ تلاش کر سکتی تھی۔ جھاڑیاں دیوار سے ذرا ہٹ کر تھیں اور درمیان میں خلا تھا۔ دیوار تقریباً سات فٹ اونچی تھی اور مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ میں اس پر چڑھ سکوں گی۔ مجھے کسی سہارے کی تلاش تھی جس کی مدد سے میں باہر جا سکوں۔

میں چلتی ہوئی سامنے والے حصے میں آ گئی۔ یہاں سے مجھے پورچ اور گیٹ دکھائی دیا۔ اندر دو گاڑیاں کھڑی تھیں اور گیٹ پر ایک مسلح شخص موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں تیزی سے واپس آئی کیونکہ یہاں جھاڑی ختم ہو گئی تھی اور اس سے نکلتے ہی میں مسلح شخص کی نظروں میں آ جاتی۔ میرے کپڑے جھاڑی سے الجھ رہے تھے ہاتھ پیروں پر خراشیں آ رہی تھیں مگر اس وقت مجھے یہاں سے نکلنے کی فکر تھی۔ میں عقبی حصے میں آئی اور یہاں مجھے ایک طرف رکھی کرسی دکھائی دی۔ یہ پلاسٹک کی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھا اور کوشش کر کے اس پر چڑھ گئی۔ دیوار کے دوسری طرف دیکھا تو وہاں مجھے کانٹے دار جھاڑیاں نظر آئیں جو یقیناً حفاظت کے لیے جان بوجھ کر لگائی گئی تھیں اور یہ دیوار کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ احاطے کی روشنی کسی قدر باہر بھی آ رہی تھی۔ ایک جگہ مجھے کچھ خلا نظر آیا اور میں دونوں ہاتھوں کے بل لٹک کر اس میں اتر گئی۔ یہاں میرے کپڑے اور بال کانٹوں سے الجھے تھے اور بڑی مشکل سے انہیں چھڑاتی خراشیں سہتی ہوئی میں باہر آئی۔ جہاں جہاں کانٹے لگے تھے وہاں بہت زیادہ جلن اور تکلیف تھی مگر میں مارے خوف کے کراہ بھی نہیں رہی تھی کہ میری آواز ان درندوں تک نہ پہنچ جائے۔ جو میرے شکار کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

کھلی جگہ آتے ہی میں تیزی سے بھاگی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں تھی اور مجھے کس سمت جانا چاہیے تھا۔ بس میں اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتی تھی۔ یہاں ہر طرف درخت تھے اور زمین پر پتے بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں۔ مگر کہیں باقاعدہ راستے نہیں تھے۔ بھاگتے ہوئے جب میں تھک جاتی تو رک کر کچھ دیر ستاتی تھی۔ رہائی کی فکر میں کھانے کے ساتھ مجھے پانی کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔ اب بھاگتے ہوئے مجھے پیاس لگنے لگی تھی۔ یہاں دور دور تک سوائے درختوں کے کچھ نہیں تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ کھلی جگہ سے گزر رہی تھی کیونکہ یہاں چاند کی روشنی تھی اور راستہ نظر آ رہا تھا جب کہ درختوں کے نیچے تاریکی تھی اور مجھے تاریکی سے خوف آ رہا تھا۔ میں بھاگتی رہی، کئی بار نیچے گری اور مجھے چوٹیں بھی لگیں، پھر اٹھ کر بھاگنے لگتی۔ بالآخر میں ایک کچے راستے پر نکلی۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس پر شاید بیل گاڑیاں اور تانگے وغیرہ گزرتے تھے۔ گویا میں کسی دیہی علاقے میں تھی۔

نو بج رہے تھے مجھے بھاگتے ہوئے پون گھنٹا ہونے کو آیا۔ ان لوگوں کو یقیناً میرے فرار کا علم ہو گیا ہوگا اور وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے اس راستے پر چل رہی تھی۔ میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں سر جھکائے چل رہی تھی۔ اس وقت میں بے ہوش ہو جاتی تو پھر ان لوگوں یا کچھ اور غلط لوگوں کے ہتھے بھی چڑھ سکتی تھی۔ اس لیے جب زیادہ ہی تھکتی تو کسی درخت سے ٹیک کر ستا لیتی تھی۔ ایسے ہی ایک بار درخت سے ٹیک کر میں نے سامنے دیکھا تو کچھ ہی دور روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ آبادی تھی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ میں آبادی کے اتنے نزدیک آ گئی تھی۔ میں پھر چلنے لگی۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا شاید دو سو گھر ہوں گے اور مسجد آغاز میں تھی۔ یہاں بجلی نہیں تھی اور لالٹین یا دوسری چیزوں سے روشنی کی جاتی تھی۔ میں مسجد کے پاس پہنچی تو اس کے صحن میں چند لوگ بیٹھے آپس میں بات کرتے نظر آئے۔ دروازے پر پہنچ کر میری ہمت جواب دے گئی اور میں تقریباً بے ہوش ہو کر ڈھیر ہو گئی تھی۔ مسجد میں بیٹھے لوگوں نے مجھے دیکھا اور تیزی سے آئے تھے۔

''اے تے کڑی اے۔'' کسی نے کہا۔

''پیچھے ہو۔'' کوئی بولا۔ ''عورت ہے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔''

کچھ دیر بعد کسی عورت نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ ''اٹھ دھیے..... ہمت پکڑ۔''

میرا ذہن چکرا رہا تھا۔ وہ مجھے لے جا رہی تھی اور میں بے ہوش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد جب مجھے ہوش آیا تو میرے منہ میں پانی ٹپکایا جا رہا تھا اور یہ آبِ حیات بن کر میرے حلق سے اتر رہا تھا۔ میں بے تابی سے پانی پینے لگی۔ ''آرام سے دھیے...'' اسی عورت نے کہا۔ میں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں چارپائی پر لیٹی تھی اور عورت چمچ سے میرے منہ میں پانی ٹپکا رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ چراغ جل رہا تھا۔ پانی پی کر مجھے تیزی سے ہوش آیا تھا اس کے بعد مجھے گرم دودھ میں گھی ملا کر دیا گیا اس نے میری توانائی بحال کر دی تھی۔ عورت مسجد کے مولوی صاحب کی بیوی تھی اور یہ مسجد سے متصل ان کا گھر تھا۔ وہی مجھے اٹھا کر لائی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ متجسس تھی کہ میں کون تھی اور یہاں کیسے پہنچی تھی۔ میرے پوچھنے پر عورت جس کا نام صفیہ تھا مجھے بتایا کہ میں جہلم سے کوئی پچاس میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھی۔

میں نے اسے مختصراً اپنی کہانی سنائی کہ میں کس طرح شوہر کے ساتھ جا رہی تھی اور حادثے کے بعد کچھ لوگ مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ میں نے عمداً جہانگیر کا ذکر نہیں کیا تھا بس اپنی بے بسی اور بے چارگی کو پیش کیا تھا تاکہ وہ مجھ سے ہمدردی کریں اور میرے کام آئیں۔ میری توقع کے عین مطابق صفیہ بہت متاثر ہوئی، اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''کتنی سوہنی صورت دی ہے اللہ نے..... بس وہی بچانے والا ہے۔''

کچھ دیر بعد مولوی صاحب کوٹھری کے دروازے تک آئے اور انہوں نے آڑ سے مجھ سے سوالات کیے اور میں نے ان کے جوابات دیے تھے۔ میں نے حیات کا موبائل نمبر اور اپنے ملتان والے گھر کا۔ فون نمبر دیا۔ ''اگر یہاں فون یا موبائل کی سہولت ہے تو.....''

''یہاں بجلی نہیں ہے تو فون یا موبائل کیسے ہوگا۔ دس میل دور جانا ہوگا۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''یہ کام کل ہی ہو سکے گا۔ لیکن تم یہاں بالکل محفوظ ہو، کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ اب تم آرام کرو۔''

میرا لباس کانٹوں سے الجھنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اس لیے صفیہ نے مجھے اپنا ایک جوڑا لا دیا۔ وہ بھاری جسامت کی عورت تھی اس لیے اس کا جوڑا مجھے بہت ڈھیلا تھا۔ مگر اسے پہن کر مجھے سکون ملا تھا کیونکہ میرا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ صفیہ نے میری خراشوں پر لگانے کے لیے مرہم بھی دیا تھا۔ تحفظ اور سکون ملا تو میں آرام سے سوئی۔ صفیہ نے مجھے فجر میں جگایا۔

''بی بی اٹھ کر نماز پڑھ لو..... اللہ کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں بچایا۔''

میں شرمندہ ہو گئی کیونکہ مجھے پہلے ہی یہ کام کرنا چاہیے تھا۔ میں نماز پڑھ کر پھر سو گئی۔ جسم میں پھر درد ہونے لگا تھا۔ یہ گزشتہ رات کی بھاگ دوڑ اور گرنے سے لگنے والی چوٹوں کا نتیجہ تھا۔ دوسری بار میری آنکھ کھلی تو صفیہ نے ناشتے کے ساتھ اطلاع دی کہ مولوی صاحب کال کرنے جا چکے تھے۔ میں بے تابی سے ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ ان کی واپسی دو گھنٹے بعد ہوئی تھی اور انہوں نے بتایا کہ ان کا حیات سے رابطہ ہو گیا تھا اور وہ لاہور سے روانہ ہو گیا ہے۔ امید ہے شام تک یہاں پہنچ جائے گا۔ میں خوش ہو گئی۔ اس بار میں نے شکرانے کے نفل ادا کیے کہ اللہ نے میری عزت ہی نہیں بچائی تھی بلکہ حیات کو بھی محفوظ رکھا تھا۔ میں گن گن کر پل گزارنے لگی۔ صفیہ میرے ساتھ لگی تھی اور میرا دل بہلا رہی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی بہت اچھی فطرت کے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں اور دونوں کی شادی کر دی تھی۔ صفیہ کو بیٹے کی خواہش تھی مگر وہ اللہ کی رضا میں راضی تھی۔ مولوی صاحب کی کچھ زمین تھی اس سے آنے والی آمدنی سے گزارا ہوتا تھا۔ مسجد کے امام کا فرض وہ بلا معاوضہ ادا کرتے تھے۔ دو کمروں کا یہ چھوٹا سا مکان تھا۔

وقت گزاری کے لیے میں صفیہ کے منع کرنے کے باوجود اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اس کے باوجود وقت نہیں گزر رہا تھا۔ جب گھڑی کی سوئیاں دیکھتی تو وہیں رکی نظر آتیں۔ دوپہر ہوئی کھانا کھا کر میں فارغ ہوئی۔ صفیہ دوپہر میں مسجد میں بچیوں کو قرآن پاک پڑھانے جاتی تھی' وہ معذرت کر کے چلی گئی۔ یہ ایک گھنٹا میں نے بہت مشکل سے گزارا تھا۔ پھر مجھے ڈر لگ رہا تھا حالانکہ اس وقت کوئی نہیں تھا۔ مولوی صاحب خود مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ لڑکیوں کو انہوں نے اپنی بیوی کے سپرد کر رکھا تھا۔ صفیہ آئی اس نے چائے بنائی۔ مسجد میں مولوی صاحب کے لیے بھجوا کر اس نے میرے اور اپنے لیے نکالی۔ چار بج رہے تھے اور ابھی میں چائے پی رہی تھی کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ یہاں کسی کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ میری بے تابی محسوس کر کے صفیہ نے باہر جھانک کر دیکھا اور مجھے بتایا کہ کوئی مسجد میں آیا ہے۔ چند منٹ بعد ہی مولوی صاحب حیات کے ساتھ آئے تھے۔ میں نے دیکھ کر صفیہ کو بتایا کہ وہی میرے شوہر ہیں تو مولوی صاحب اندر لے آئے۔ میں کوٹھری میں تھی اور حیات کو اندر بھیج دیا۔ انہیں دیکھ کر میرا

ضبط جواب دے گیا اور میں حیات کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ میرا خیال تھا وہ مجھے دیکھ کر کچھ کہیں گے۔ کچھ بے تابی دکھائیں گے مگر وہ بالکل ساکت تھے۔ میں نے محسوس کیا تو پیچھے ہٹ گئی۔ وہ آہستہ سے بولے۔

''خود کو سنبھالو ہم کہیں اور ہیں۔''

''آپ کیسے ہیں، مجھے تو ہوش ہی نہیں تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، میں بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔ مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ سر پر چوٹ لگی تھی۔'' وہ بولے تو میں نے پہلی بار ان کے ماتھے پر بندھی پٹی دیکھی۔ ''میں نے تمہارا پوچھا تو تم غائب تھیں.... شائلہ تم یہاں تک کیسے آئیں؟''

میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر دھیمی آواز میں حیات کو اپنی کہانی سنانے لگی۔ ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں یہ جان کر کہ مجھے باقاعدہ اغوا کر لیا گیا تھا۔ یہ جگہ جائے حادثہ سے کوئی ستر میل دور تھی اور جب میں نے جہانگیر کا بتایا تو وہ اچھل پڑے تھے۔ ''تم نے خود نہیں دیکھا تھا؟''

''نہیں لیکن آواز سنی اور پھر سارے حوالے بھی وہی دیئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کو لفظ بہ لفظ بتایا ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو اسے لاہور میں ہونا چاہیے۔''

''وہ کسی منسٹر سے ملنے گوجرانوالہ گیا تھا تمہارے سلسلے میں۔''

''وہ جھوٹ بول کر گیا ہے۔ آپ کو یقین نہیں ہے تو اسے کال کر کے دیکھ لیں یہاں موبائل سگنل نہیں ہے وہ آپ سے بات نہیں کر سکے گا۔''

حیات کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ''یہ بہت برا ہوا ہے۔''

''ہاں اس شخص نے ذلالت کی حد کر دی تھی۔'' میں نے کہا تو حیات خاموش ہو گئے پھر انہوں نے کہا۔

''بس اب چلو ہمیں تاریکی سے پہلے سڑک تک پہنچنا ہو گا۔ میں بھی مشکل سے پہنچا ہوں، راستہ بہت خراب ہے۔''

''میں تیار ہوں بس مولوی صاحب کی بیوی سے مل لوں، اگر یہ نہ ملتے تو نہ جانے میرا کیا ہوتا؟''

حیات باہر نکل گئے۔ صفیہ اندر آئی تو میں نے اس کے گلے لگ کر شکریہ ادا کیا۔ وہ اداس تھی۔ اس نے مجھے پیار کیا اور بہت دعائیں دی تھیں۔ میرا سوٹ بیکار ہو گیا تھا اس لیے میں اسی کا سوٹ پہننے پر مجبور تھی۔ میرا دوپٹا ویسے ہی کہیں گر گیا تھا اس نے مجھے اپنی ایک چادر دی۔ اس سے مل کر میں باہر آئی تو حیات گاڑی میں تھے۔ حیات کسی اور کی گاڑی لے کر آئے تھے۔ ہم روانہ ہوئے تو حیات بدستور خاموش تھے۔ میں نے گاڑی کا پوچھا تو وہ بولے۔ ''اس کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ ایک گیراج میں کھڑی ہے۔ بننے میں وقت لگے گا۔ ابھی تو چلنے کے قابل ہو جائے تو واپس لے جاؤں گا۔ یہ ایک جاننے والے کی گاڑی ہے۔''

حیات نے مجھ سے دوبارہ نہیں پوچھا تھا اس لیے میں نے ہی دریافت کیا۔ ''آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا ہے؟''

''بات یقین کی نہیں ہے جب تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے تو....''

''میں نے سنا تھا اور وہ جہانگیر کی آواز تھی۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ اسی کی سازش ہے۔ اسی نے اس آدمی کو ہائر کیا تھا۔''

''کس آدمی کو؟''

''میں نہیں جانتی۔ میں نے اس کی بھی صرف آواز سنی ہے میں صرف نازک بی بی کو جانتی ہوں۔''

''وہ جگہ کہاں ہے جہاں تمہیں قید رکھا گیا تھا؟''

''میں نہیں جانتی، اول تو وہ جنگل تھا دوسرے میں منہ اٹھا کر بھاگی تو مجھے سمتوں کا بھی علم نہیں تھا۔ میں تو بس اپنی عزت بچا کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔''

''تم کب ہوش میں آئیں؟''

''حادثے کے آٹھ گھنٹے بعد۔'' میں نے بازو آگے کیا۔ ''مجھے انجکشن دیا گیا تھا۔''

''بے ہوشی کا؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''گویا تمہیں کچھ نہیں معلوم کہ اس دوران میں تم پر کیا گزری؟''

''نہیں۔'' میں نے بے چینی سے کہا۔ ''حیات آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔''

''کچھ نہیں۔'' ان کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ میں چپ ہو گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ حیات مجھ سے اس لہجے میں بات کریں گے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے زندہ اور سلامت پا کر خوشی سے پاگل ہو جائیں گے مگر ان کا رویہ تو اوسط بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے

دم سادھ لیا تھا۔ صرف ایک سوال کیا کہ میرے گھر والوں کو اس حادثے کا علم تھا؟ حیات نے کہا کہ انہوں نے سوائے اپنے باپ اور بھائیوں کے کسی کو نہیں بتایا ہے۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔

''اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

تین گھنٹے بعد ہم لاہور پہنچ گئے تھے۔ حیات اسپتال سے سیدھے جہانگیر کی کوٹھی گئے تھے۔ ہمارا سارا سامان محفوظ رہا تھا۔ یہ سامان بھی اسی کوٹھی میں تھا جب حیات نے کار کا رخ کوٹھی کی طرف کیا تو میں نے کہا۔ ''میں وہاں قدم نہیں رکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے تم باہر رہنا میں اندر سے سامان لے آؤں گا۔''

''آپ کو جانے کی کیا ضرورت ہے آپ کہہ کر سامان باہر منگوائیں اس بے غیرت شخص کے گھر میں قدم رکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے آپ کی عزت کے خلاف سازش کی ہے۔''

حیات نے جواب نہیں دیا۔ کار کوٹھی کے باہر روکی اور اتر کر اندر چلے گئے۔ چند منٹ بعد وہ سامان لے آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''وہ شاپر نہیں ہے جس میں اس نے مجھے تحفے دیئے تھے۔ اس سے میری بات ثابت ہوتی ہے۔''

اس بار بھی حیات نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہاں سے ہم ایک ہوٹل میں آئے جہاں ایک کمرا لیا اور پھر حیات مجھے وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے اپنے موبائل سے اپنے گھر کال کی اور سب سے سلام دعا کی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ میری طویل گم شدگی محسوس نہ کر لیں لیکن کسی نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بتایا کہ کار میں خرابی کی وجہ سے ابھی ہم آگے نہیں گئے ہیں۔ لاہور میں رکے ہوئے ہیں۔ گھر والوں اور خاص طور سے امی ابو سے بات کر کے میرا ذہن ہلکا ہوا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر حیات نے میری بات کا یقین کر لیا تب بھی ہم جہانگیر کے خلاف کیا کر سکتے تھے۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مجھے تو اس جگہ کا بھی پتا نہیں تھا جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ اگر ہم پولیس میں جاتے تو ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر میں اس شخص کو ایسے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی، اس نے صرف میری آبرو ہی نہیں، میری جان لینے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ اگر میں وہاں سے نہ نکل پاتی تو چند دن ذلت کی زندگی جی کر ذلت کی موت مر جاتی۔ کسی کو پتا بھی نہ چلتا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟

حیات کا رویہ مجھے شاک دے رہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھ سے محبت کا دعویٰ آزمائش کے ایک ہی زلزلے میں زمیں بوس ہو جائے گا۔ جہانگیر کے مکروہ منصوبے کے بارے میں سن کر بھی ان کا ردعمل بہت سرد تھا ورنہ کوئی بھی شوہر طیش میں آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ رات بہت دیر سے آئے اور مجھ سے بات کیے بغیر کروٹ لے کر سو گئے تھے۔ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا مگر حیات نے بھی نہیں پوچھا کہ میں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔ میں ساری رات جاگتی اور روتی رہی۔ صبح میرے سر میں شدید درد تھا اور آنکھیں سوج گئی تھیں۔ مگر حیات نے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ ناشتے کے بعد وہ پھر چلے گئے۔ یہ سارا دن میں اکیلی رہی اور بیشتر وقت روتی رہی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج حیات سے فیصلہ کن بات کروں گی۔ وہ اس بار بھی رات گئے آئے تھے۔ خلاف توقع مجھے بستر کے بجائے صوفے پر بیٹھے دیکھ کر چونکے۔ ''خیریت؟''

''جی نہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''میری زندگی میں اب اس نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو تم؟''

''حیات میں آپ کی بیوی ہوں اور بہت مشکل حالات سے گزر کر آئی ہوں۔ اللہ نے میری عزت رکھی اور وہی میرا گواہ ہے لیکن آپ کو کوئی شک ہے تو آپ مجھ سے کھل کر بات کریں لیکن میرے ساتھ یوں بیگانوں والا رویہ مت رکھیں۔''

''مجھے کوئی شک نہیں ہے۔''

''اور شاید اس ذلیل شخص پر کوئی غصہ بھی نہیں ہے جس نے آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا۔''

''مجھے غصہ ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے ہم اس کے خلاف پولیس میں نہیں جا سکتے۔ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا، الٹا ہماری بدنامی ہو گی۔''

''ٹھیک ہے میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔ اس کا مطلب ہے آپ کو میری بات کا یقین ہے؟''

انہوں نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ''ہاں یقین ہے۔''

''اور میری پاکیزگی پر بھی شک نہیں ہے؟''

"نہیں۔"

"تب آپ کے اس رویّے کا کوئی جواز نہیں بنتا ہے۔ حیات اگر آپ کو مجھ پر شک ہے تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گی۔"

"کس بات پر؟"

"یہی کہ اس شخص کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھواؤں۔"

وہ مضطرب ہو گئے۔ "میں نے کہا نا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"اگر آپ مجھ پر شک کریں گے تو میں یہی کروں گی۔ اگر پولیس نے رپورٹ نہیں لکھی تو میں عدالت جاؤں گی۔" میں نے کہا اور بیڈ کی طرف بڑھی۔ مگر حیات نے مجھے روک لیا۔

"سوری شمی مجھے اپنے رویّے پر افسوس ہے لیکن تم میری ذہنی کیفیت سمجھو کہ مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔"

میں نے تڑپ کر کہا۔ "گزری تو مجھ پر ہے اور اللہ نے کرم کیا مجھ پر۔"

حیات اب میری دل جوئی کر رہے تھے۔ انہوں نے کھانے کا پوچھا اور جب میں نے بتایا کہ میں نے بس صبح کا ناشتا کیا ہوا ہے تو انہوں نے میرے لیے کھانا منگوایا وہ باہر کھا چکے تھے وہ گاڑی لاہور لے آئے تھے اور یہیں اسے ٹھیک کرا رہے تھے۔ اس میں مزید دو دن لگتے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کہیں گے کہ ہم اسلام آباد اور مری کا رہ جانے والا ٹور مکمل کرتے ہیں مگر انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ آنے والے دو دن وہ گاڑی کے ساتھ ہی لگے رہے تھے۔ میں سارا دن ہوٹل میں رہتی تھی۔ حیات کا رویّہ ٹھیک ہونے کے بعد میرے دل کا بوجھ بھی ہٹ گیا تھا اور رفتہ رفتہ جہانگیر کے خلاف میرا غصہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے حیات حق بہ جانب لگنے لگے تھے کہ بغیر ثبوت کے اس کے خلاف کارروائی کا مطلب تھا ایک طاقتور اور دولت مند شخص کو اپنا دشمن کر لیا جائے۔ میں اس کے چنگل سے بچ نکلی تھی میرے لیے یہ بھی کافی تھا۔

تیسرے دن ہم صبح سویرے ملتان کے لیے روانہ ہوئے کیونکہ ہم مقررہ وقت سے پہلے واپس جا رہے تھے اس لیے حیات نے مجھ سے کہا کہ میں گھر میں یہی کہوں کہ میری طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے ہم جلد واپس آگئے۔ میں نے واپس آکر یہی کہا۔ سب معمول کے مطابق ملے تھے مگر میری ساس اور سسر کا رویّہ بہت عجیب تھا انہوں نے صرف میرے سلام کا جواب دیا اور اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کی۔ ان کے انداز میں روکھا پن تھا۔ میں کھٹکی کیونکہ میرے سسر کے علم میں سب تھا اور مجھے یقین تھا انہوں نے ساس کو بھی بتا دیا ہوگا۔ میں نے حیات سے پوچھا تو انہوں نے ٹالنے کے انداز میں کہا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا کیونکہ یہ وہی رویّہ تھا جو چند دن پہلے حیات نے میرے ساتھ روا رکھا تھا۔ اب میرے ساس سسر وہی رویّہ دکھا رہے تھے۔ آنے والے چند دنوں میں ان کا رویّہ ایسا ہی رہا۔ یہی نہیں میں نے محسوس کیا کہ گھر آنے کے بعد حیات کے انداز میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ میری دھمکی کے بعد وہ بدلے تھے مگر اب پھر ویسے ہی ہو گئے تھے اگرچہ اوپر سے وہ نارمل رہنے کی کوشش کرتے تھے مگر صاف نظر آتا تھا کہ وہ کوشش کر رہے ہیں۔

چند دن میں برداشت کرتی رہی پھر مجھے غصہ آنے لگا کہ آخر یہ لوگ چاہتے کیا تھے؟ میرا قصور کیا تھا؟ کیا میں جان بوجھ کر اغوا ہوئی تھی؟ کیا ان کے نزدیک میں باآبرو نہیں رہی تھی؟ اگر ایسی کوئی بات تھی تو انہیں کھل کر کہنا چاہیے تھا۔ ایسا رویّہ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک رات میں نے یہ بات حیات سے بھی کہہ دی تو وہ سرد لہجے میں بولے۔ "ان کا رویّہ ٹھیک ہے اور اگر تم چاہتی ہو کہ کھل کر بات کی جائے تو اس میں تمہارے گھر والے بھی شامل ہوں گے یہ سوچا ہے تم نے؟"

یہ میں نے نہیں سوچا تھا اور نہ ہی مجھے گوارا تھا کہ وہ کسی ناکردہ گناہ کی سزا بھگتیں۔ "میرے گھر والے کیوں شامل ہوں گے۔"

"کیونکہ یہ ہمارے لیے ذلت کی بات ہے۔ ماں جی اور ابا جی اسی وجہ سے تم سے زیادہ بات نہیں کرتے ہیں۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں رو دی تھی۔ "جب آپ کو یقین ہے تو آپ انہیں بتاتے کیوں نہیں ہیں کہ میں پاک ہوں۔ مجھے کسی نے نہیں چھوا۔"

"جو بات میں جانتا نہیں ہوں اس کا انہیں یقین سے کیسے کہوں؟" حیات نے کہا اور کمرے سے چلے گئے۔ میں ساکت بیٹھی رہ گئی۔ میں یہ بھی نہ پوچھ سکی تو پھر آپ نے پہلے جو کہا تھا اس میں کتنا سچ تھا؟ اس کا مطلب ہے انہیں میری پاکیزگی پر یقین نہیں آیا صرف مجھے چپ رکھنے کے لیے انہوں نے یہ بات کہی تھی۔ اس رات میں ڈنر کی میز پر آئی تو

میں نے محسوس کیا کہ سب ہی مجھے نظر انداز کر رہے تھے حتیٰ کہ میری جیٹھانیاں بھی جو مجھ سے نارمل بات چیت کرتی تھیں وہ بھی اب خاموش تھیں وہ مجھ سے نظریں چرا رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے کھانا کھایا اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد حیات آئے تو میں نے ان سے پوچھا۔

"کیا سب کو پتا چل گیا ہے؟"

"کس بات کا؟"

"اسی بات کا کہ میں چوبیس گھنٹے گم شدہ رہی ہوں۔"

انہوں نے شانے اچکائے۔ "ہو سکتا ہے بھائیوں کو پتا ہے انہوں نے اپنی بیویوں کو بتا دیا ہوگا۔"

"تبھی میرے ساتھ اچھوتوں والا سلوک کیا جا رہا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔" خلافِ توقع حیات نے نرم لہجے میں کہا۔ "جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیسے؟"

"یہ وقت ہی بتائے گا۔" انہوں نے کہا اور لائٹ بجھا کر بستر پر لیٹ گئے۔ اس واقعے کے بعد وہ ایک بار بھی میرے پاس نہیں آئے تھے۔ میں روز کی طرح گھٹ گھٹ کر روتی رہی اور پھر خاموش ہو گئی۔ پتا نہیں کس وقت میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ حیات بیڈ پر نہیں تھے۔ میں نے باتھ روم کی طرف دیکھا مگر اس کی روشنی بند تھی۔ حیات وہاں بھی نہیں تھے۔ رات کے تین بج رہے تھے وہ اس وقت کہاں جا سکتے تھے؟ میں اٹھی اور دروازہ دیکھا وہ کھلا ہوا تھا میں باہر آئی۔ عام طور سے رات میں گھر کی روشنیاں بجھا دی جاتی تھیں۔ مگر اس وقت ڈرائنگ روم کی طرف سے روشنی جھلک رہی تھی۔ میں آگے آئی تو مجھے کئی افراد کے بولنے کی آواز آئی۔ ڈرائنگ روم کے داخلی حصے پر موتیوں کی جھالر کا پردہ تھا۔ میں پردے تک آئی تو مجھے اپنے سسر کی آواز آئی۔

"جہانگیر سے تعلق ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہماری جننگ فیکٹری کی کاٹن کا سب سے بڑا خریدار وہی ہے۔ کروڑوں کا بزنس ہے۔"

"لیکن ابا جی اس نے جو کیا...." حیات نے کہنا چاہا۔

"جھوٹ بولتی ہے یہ...." میری ساس نے ان کی بات کاٹی۔ "اپنی سیاہ کاری چھپانے کے لیے وہ جہانگیر پر الزام لگا رہی ہے۔"

وہاں میرے دونوں جیٹھ بھی تھے یعنی میری پوری سسرال جمع تھی۔ میرے بڑے جیٹھ نے ماں کی تائید کی۔ "امی ٹھیک کہہ رہی ہیں.... وہ پُراسرار طور پر غائب رہی اور اس کے پاس اپنی پاکیزگی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اپنی حرکت چھپانے کے لیے وہ جہانگیر انکل پر الزام لگا رہی ہے۔"

"جہانگیر انکل سچ مچ غائب تھے۔ میں نے موبائل سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بند جا رہا تھا۔"

"یہ کوئی ثبوت نہیں ہے بعض اوقات آدمی کا موبائل بند بھی ہوتا ہے نیٹ ورک پرابلم ہوتا ہے۔" چھوٹے جیٹھ نے کہا۔ میں دم بہ خود سی اپنے خلاف لگنے والی فردِ جرم سن رہی تھی۔ حالانکہ وہ سب جانتے تھے کہ جہانگیر کس قماش کا آدمی تھا مگر وہ ان کا بزنس پارٹنر بھی تھا۔ اس لیے میں جھوٹی تھی اور وہ سچا تھا۔ میری ساس نے نفرت سے کہا۔

"ایک بات ثابت ہے اب وہ گندگی کی پوٹ ہے اور اس کی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"تو کیا میں اسے طلاق دے دوں۔" حیات نے پوچھا۔

"نہیں، طلاق کی صورت میں یہ مسئلہ اٹھے گا اور ممکن ہے بات عدالت تک چلی جائے۔" میرے سسر نے کہا۔ "اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔"

"وہ کیا؟" حیات نے پوچھا۔

"اگر شمائلہ اس دنیا میں نہیں رہے گی تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ ہم اپنی بہو کو باعزت دفنا دیں گے۔ یہی اس مسئلے کا واحد مناسب حل ہے۔"

وہ سب خاموش ہو گئے۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا وہاں میرے قتل کی سازش ہو رہی تھی۔ پھر سب سے پہلے میری ساس نے تائید کی۔ "یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے۔"

میرے دونوں جیٹھوں نے بھی تائید کی۔ حیات خاموش تھے مجھے ایک لمحے کو لگا کہ وہ شاید مخالفت کریں۔ مگر وہ بولے۔ "ٹھیک ہے لیکن یہ کام ہوگا کیسے؟"

"یہ کام تم کرو گے۔" وہ سرد لہجے میں بولے۔ "تم اسے اس کے میکے لے جاؤ گے اور راستے میں ڈاکو تم کو روک لیں گے تم مزاحمت کرو گے تو وہ فائرنگ کریں گے اور گولی شمائلہ کو لگے گی۔"

"تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے۔" بڑے جیٹھ نے کہا۔

"ٹھیک ہے ابا جی، میں اسے ایک دو دن میں لے جاتا ہوں۔"

وہ میرے قتل کا منصوبہ طے کر کے یوں اٹھے جیسے میں انسان نہ ہوں کوئی جانور ہوں جسے وہ اپنی نام نہاد عزت پر قربان کر رہے ہوں۔ میں تیزی سے واپس آئی اور حیات کے کمرے میں آنے سے پہلے اپنی جگہ لیٹ کر ساکت ہوگئی۔ اگر ان لوگوں کو پتا چل جاتا کہ میں نے ان کا سارا منصوبہ سن لیا ہے تو وہ اسی وقت مجھے مار دیتے۔ حیات کے آنے پر میں نے بڑی مشکل سے اپنی کپکپاہٹ روکی۔ جو شخص مجھے اپنی حیات کہتا تھا وہی اب میری موت بننے والا تھا۔ حسبِ توقع اس نے صبح مجھ سے سب سے پہلے یہی کہا۔ ”شمائلہ میرا خیال ہے تم کچھ دن کے لیے اپنے گھر چلی جاؤ۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”ماں جی اور ابا جی کا بھی یہی کہنا ہے۔“ حیات نے اس بار کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”آج تیاری کر لینا میں تمہیں کل صبح چھوڑنے جاؤں گا۔“

”جی اچھا۔“ میں نے کہا۔

”اپنا موبائل مجھے دے دو۔“

”وہ کیوں؟“

”سوال مت کرو۔“ حیات کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ”مجھے ضرورت ہے۔“

مجبوراً میں نے اسے اپنا موبائل دے دیا۔ کیا اسے شک ہو گیا تھا کہ میں نے سب کچھ سن لیا ہے اور اب وہ چاہتا تھا کہ میں اپنے گھر والوں سے رابطہ نہ کر سکوں۔ گھر تو مجھے پہنچنا ہی نہیں تھا۔ گھر میں فکسڈ فون بھی تھا لیکن وہ لاؤنج میں تھا اور وہاں ہمہ وقت میری ساس موجود رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس سارے دن میں مجھے موقع نہیں ملا۔ کئی بار میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں چپکے سے فرار ہو جاؤں مگر گیٹ پر چوکیدار تھا اور اس گھر کی بہوؤں کو اکیلے کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی اگر وہ روک لیتا تو میرا پول کھل جاتا اور پھر شاید مجھے موقع نہ ملتا۔ اس لیے میں نے صبر سے کام لیا۔ کل صبح حیات مجھے قتل کے لیے لے جاتا تو شاید مجھے موقع ملتا۔ میں نے دن میں اپنی چیزیں بیگ میں رکھ لی تھیں۔ اس روز حیات جلدی گھر آ گیا۔ ممکن ہے اسے ہدایت ہو کہ مجھ پر نظر رکھے تا کہ میں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر سکوں۔ اب مجھے سحرش کی بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ جب ان کی اصلیت سامنے آئے گی تو شاید مجھے پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے اور لگ رہا تھا کہ مجھے موقع نہیں ملے گا۔ اگلی صبح حیات جلدی اٹھ گیا۔ میرا موبائل ابھی تک اس کے قبضے میں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر کے لیے مجھے دیا کہ میں کال کر کے گھر بتا دوں کہ میں آ رہی ہوں اور اس دوران میں وہ میرے سر پر سوار رہا تھا۔ ناشتا کرتے ہی ہم گھر سے نکل گئے تھے کیونکہ بہ قول حیات کے وہ مجھے چھوڑ کر فوری واپس آتا اسے بہت ضروری کام تھا۔ یہ ضروری کام یقیناً میری باعزت تدفین کا ہوتا۔

☆☆☆

میں اسپتال سے گھر آئی تھی۔ ایک ہفتے تک میں ایک نجی اسپتال میں داخل رہی تھی میرا دایاں پاؤں ٹوٹ گیا تھا اور دو پسلیاں بھی ٹوٹی تھیں لیکن اصل میں مجھے سر کی چوٹ کی وجہ سے اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔ میں پورے چوبیس گھنٹے بے ہوش رہی تھی۔ ایم آئی آر کے بعد پتا چلا کہ انٹرنل بلیڈنگ ہوئی ہے اور اسے صاف کرنے میں ایک ہفتہ لگ گیا تھا۔ حیات اس حادثے میں موقع پر مر گیا تھا اور یوں میں بیوہ ہو گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میری سسرال والے روتے دھوتے حیات کی لاش لے گئے تھے اور میرے بارے میں کہا تھا کہ اب میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے گھر والے ان کے رویے پر حیران تھے۔ مگر اصل حیرت انہیں اس وقت ہوئی جب میں نے ابا جی اور ماں جی کو حقیقت بتائی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اسے خود تک رکھیں کسی بھائی کو بھی نہ بتائیں۔ میں کسی کی آنکھوں میں رسوا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسی لیے میری سسرال والوں سے بھی بات نہ کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔

وہ بات جو میں نے ماں باپ کو بھی نہیں بتائی تھی، وہ تھی کہ یہ حادثہ کیسے ہوا تھا؟ راستے میں میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور میں نے حیات کو بتا دیا کہ میں سب جان گئی ہوں۔ اس پر حیات کا ردِعمل کچھ ایسا تھا کہ اچھا ہوا تم جان گئیں اب مجھے تمہاری حیرت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تب مجھے نہ جانے کیا ہوا میں نے اچانک اسٹیئرنگ پکڑ کر گھمایا اور کار سامنے سے آنے والے ٹرک سے جا ٹکرائی۔ بچنے کا موقع ہی نہیں تھا یہ سب پلک جھپکنے میں ہو گیا۔ ٹرک حیات والی طرف سے ٹکرایا تھا اور وہ موقع پر ہلاک ہو گیا تھا البتہ مجھے اسپتال پہنچایا گیا اور میں بچ گئی۔ صحت یاب ہونے کے بعد میرے گھر والوں نے میری دل جوئی کے لیے مجھے آگے پڑھنے کی اجازت دے دی اب میں ماسٹر کر رہی ہوں۔ میں کسی سے سچ نہیں کہہ سکتی اس لیے یہ سچ بیانی آپ سے شیئر کر رہی ہوں۔ صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے۔

استادی

جناب معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

میں پھر ایک بار اپنے مخصوص انداز میں خود پر گزرا ایک دلچسپ واقعہ سنانے کے لیے سرگزشت کے قارئین کے درمیان آیا ہوں۔ بس آپ مجھے موقع دے دیں قارئین تک پہنچنے کے لیے۔ امید ہے یہ واقعہ سب کو پسند آئے گا۔

صفدر

(کراچی)

میں نہیں جانتا کہ دوسرے شہروں میں اس قسم کے مناظر دکھائی دیتے ہیں یا نہیں لیکن کراچی میں یہ سب بہت عام ہے۔ مثال کے طور پر آپ اپنی گاڑی میں چلے جا رہے ہیں۔ اچانک آپ کو ایک پریشان حال اور مفلوک الحال قسم کے مرد اور عورت جاتے ہوئے دکھائی دے جائیں گے۔

مرد نے عورت کو سہارا دے رکھا ہوگا۔ عورت اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چل رہی ہوگی۔ آپ یقیناً ان بے چاروں پر ترس کھا کر کچھ نہ کچھ دیتے ہوئے نکل جائیں گے۔

یا پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ کسی فٹ پاتھ کے پاس سڑک پر چنے یا مونگ پھلیاں وغیرہ بکھری ہوئی ہیں۔ تھال ایک طرف پڑی ہوئی ہے اور ایک بچہ قریب بیٹھا ہوا رو رہا ہے۔

آپ کو فوراً خیال آئے گا کہ اس بے چارے کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی ہے کہ کسی گاڑی والے نے ٹکر مار کر بے

چارے کا سارا سامان گرادیا ہے اور خود فرار ہوگیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اس وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو بھی آجائیں بہر حال آپ اسے بھی کچھ نہ کچھ دیتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ان کے پاس آپ کی جیب سے پیسے نکلوانے کے اور بھی ہزار طریقے ہوتے ہیں۔

یہ ایک سدابہار قسم کا موضوع ہے۔ ایک صاحب ایک بھکاری کو روزانہ سو روپے دیتے تھے پھر پچاس کر دیا اس کے بعد پچیس دینے لگے پھر دس روپے پر آگئے۔ بھکاری نے پوچھا۔ ''جناب یہ کیا سلسلہ ہے' پہلے سو، پھر پچاس پھر پچیس اور اب صرف دس۔''

وہ صاحب کہنے لگے۔ ''کیا کروں' پہلے میں اکیلا تھا اس لیے سو روپے دیتا تھا پھر شادی ہوگئی تو پچاس کر دیا پھر بیٹا ہوا تو پچیس کر دیا اب ایک اور اولاد ہوگئی ہے اس لیے دس دے رہا ہوں۔''

فقیر کہنے لگا۔ ''واہ بھائی صاحب آپ کو شرم نہیں آتی کہ میرا پیٹ کاٹ کر اپنے گھر کا خرچ چلا رہے ہیں۔'' تو یہ بھیک مانگنے والے کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

لیکن مجھے جو فقیر ملا وہ شاید ان سب سے انوکھا تھا۔ وہ مجھے ایک بار بس اسٹاپ پر مل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میرے پاس آیا اور اپنا ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ''دیکھ بھائی صرف دو سو روپے مانگتا ہوں' اگر تو نے دے دیے تو ٹھیک ورنہ آج کا دن تجھ پر بہت بھاری گزرے گا۔''

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔

کسی فقیر نے آج تک ایسی کوئی بات نہیں کی ہوگی۔ وہ دیکھنے میں اچھا خاصا تھا۔ ہلکی ہلکی ڈاڑھی اور ایک جبّے میں اس کی شخصیت مرعوب کن سی دکھائی دے رہی تھی۔

اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ ان میں جلالی کیفیت تھی۔

پھر اس نے جس انداز میں مجھ سے بھیک مانگی تھی وہ انداز بھی حیران کرنے والا تھا۔ دو سو روپے کا مطالبہ کر رہا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اگر نہ دیا تو آج کا دن بھاری گزرے گا۔

میں جانتا تھا کہ بہت سے توہم پرستوں نے شاید اس کا مطالبہ پورا بھی کر دیا ہو۔ اس قسم کے لوگ انسانی نفسیات سے کھیلنا جانتے ہیں۔

وہ خود کو مجذوب یا کوئی پیر وغیرہ ظاہر کر کے اس قسم کی شہادتیں دیا کرتے ہیں۔

''لا نکال دو سو روپے۔'' اس نے اس بار کڑک دار آواز میں کہا۔ ''کیا سوچ رہا ہے۔''

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آج کا دن چاہے لاکھ بھاری گزر جائے میں تجھے ایک پیسا نہیں دوں گا۔''

میرے اس کھرے جواب پر وہ تلملا کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھ پر قہر آلود نگاہیں ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ بندہ اس کے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔

پھر اس شام دفتر سے واپسی پر میرے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا۔

یہ ایک عجیب حادثہ تھا۔ میں دفتر کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ نیچے سے آنے والے ایک تیز رفتار شخص سے میری ٹکر ہوگئی، اس کی ٹکر سے میں بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ میرا چشمہ گر گیا اور میں نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لیا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ میرے قدم اکھڑ گئے تھے اور میں گرتا چلا گیا۔

دو تین سیڑھیوں تک میں لڑھکتا رہا پھر کسی نے مجھے تھام لیا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ پورے بدن میں اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔

مجھے سہارا دینے والا وہی شخص تھا جس سے میری ٹکر ہوئی تھی۔ وہ سخت شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے میرا گرا ہوا چشمہ اٹھا کر میرے حوالے کیا۔ شکر ہے کہ چشمہ ٹوٹنے سے محفوظ رہ گیا تھا۔

اس نے خود میرے کپڑے جھاڑے اور بڑی لجاجت سے کہنے لگا۔ ''معاف کیجیے گا میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں بہت جلدی میں تھا۔ اسی لیے آپ کو دیکھ نہیں سکا تھا۔''

اب میں اس سے کیا کہتا۔ یہ ایک اتفاق تھا اور اس قسم کے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا۔ ''تم میرے لیے ایک رکشا یا ٹیکسی کر دو اور مجھے سہارا دے کر اس پر بٹھا دینا کیونکہ میں خود سے چل نہیں سکوں گا۔''

''چلیں میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں' میرے پاس گاڑی ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بھائی بس اتنا ہی بہت ہے۔''

وہ مجھے ایک طرف بٹھا کر جلدی سے رکشا یا ٹیکسی پکڑنے چلا گیا تھا بہر حال میں تین دنوں تک دفتر جانے کے قابل نہیں ہوسکا تھا۔ ڈاکٹر چونکہ پڑوس میں تھے اس لیے انہیں گھر پر ہی بلا لیا تھا۔ انہوں نے دوائیں وغیرہ لکھ کر دے دی تھیں۔

بستر پر پڑے ہوئے میں سوچتا رہا کہ یہ محض ایک اتفاق تھا یا اس فقیر کا کہا پورا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آج کا

دن بھاری گزرے گا تو واقعی وہ دن بھاری ہوگیا تھا۔

میرا ایک دوست عیادت کے لیے میرے پاس آیا۔ میں نے جب اسے یہ واقعہ سنایا تو وہ بھی ہنس پڑا۔ ''یار کس قسم کے وہم میں پڑے ہوئے ہو۔ یہ ایک اتفاق تھا اور چونکہ اس فقیر نے ایسی بے تکی بات کہہ دی تھی اس لیے تمہارا دھیان اس کی طرف جارہا ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''یہ میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ یہ اتفاق ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ میں اس قسم کے درجنوں واقعات دیکھ چکا ہوں۔''

بہر حال تین دنوں کے بعد جب میں پھر دفتر جانے کے قابل ہوگیا تو میں نے بس اسٹاپ پر اس فقیر کو تلاش کیا لیکن وہ مجھے نہیں مل سکا تھا۔

دوسرے دن بھی وہ دکھائی نہیں دیا۔ شاید اس نے وہ اڈا چھوڑ دیا تھا یا کہیں اور چلا گیا تھا۔ ایک دن پھر وہ اچانک میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

اس بار وہ مجھے مارکیٹ میں ملا تھا اور اس کا وہی انداز تھا یعنی میرے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ ''لا دو سو روپے دے دے ورنہ آج کا دن بہت بھاری گزرے گا۔''

''تم پھر اپنی منحوس شکل لے کر میرے سامنے آگئے ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''جاؤ یہاں سے میں تمہیں ایک پیسا نہیں دوں گا۔''

''اپنی زبان سنبھال کر رکھ۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''اگر دو سو نہیں دیے تو آج کا دن تیرے لیے بہت بھاری ہوگا۔''

''ہونے دے بھاری تو اپنے آپ کو سنبھال' خود تو بھیک مانگتا پھر رہا ہے اور دوسروں کو بھاری کیے جارہا ہے۔''

وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ پچھلی بار اتفاق ہوگیا تھا' کوئی ضروری نہیں کہ ہر بار کچھ ایسا ہی ہو۔ ہاں اس دن بھی ایک حادثہ ہوا لیکن اس کی نوعیت بہت مختلف تھی بلکہ وہ ایک خوشگوار حادثہ تھا۔

میں ایک بک شاپ میں اپنی پسند کی کتاب تلاش کر رہا تھا کہ ایک خوبصورت سی لڑکی میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی کتاب ہی تلاش کر رہی تھی۔ مجھے ڈکنز کا ایک ناول پسند آیا تھا۔ میں نے وہ ناول شیلف سے نکال لیا اور جب قیمت کی ادائیگی کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ لڑکی جلدی سے میرے پاس آگئی۔ ''پلیز آپ یہ ناول مجھے دے دیں۔ مجھے بہت دنوں سے اس کی تلاش تھی۔'' اس نے کہا۔

''وہ ایک اسمارٹ سی لڑکی تھی۔ ''محترمہ اس ناول کی مجھے بھی تلاش تھی۔''

''اب کیا کروں؟'' وہ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔

''آپ ایسا کریں آپ یہ ناول لے جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ پڑھ کر واپس کر دیجیے گا۔ میں آپ کو اپنا سیل نمبر دے دیتا ہوں۔''

میں نے ناول اس کی طرف بڑھایا اور اس کم بخت نے واویلا شروع کر دیا۔ ''شرم نہیں آتی، بدتمیز بہانے بہانے بات کرتے ہو پھر ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتے ہو لعنت ہو تم جیسے لوگوں پر۔''

میں تو بری طرح بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے موقع پر کسی مرد کی ایک نہیں سنی جاتی۔ چاہے وہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو۔

وہاں اور بھی لوگ تھے۔ میری ایک نہیں سنی گئی۔ اس لڑکی نے اتنا شور مچایا کہ اس کی ہمدردی میں لوگوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں لاکھ اپنی صفائیاں کرتا رہا لیکن کون سنتا ہے فغان درویش۔

مختصر یہ کہ اس رات جب میں بستر پر لیٹا ہوں تو میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ مارنے والے خاصے معقول لوگ تھے اور انہوں نے میری معقول قسم کی ٹھکائی کر ڈالی تھی۔

پھر مجھے اس درویش کی بات یاد آگئی جس نے یہ کہا تھا کہ آج کا دن مجھ پر بھاری گزرے گا اور واقعی حد سے زیادہ بھاری گزر گیا تھا۔

اس درویش نے دوبارہ یہ بات کی تھی اور دونوں بار

میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایسے سچے درویشوں کی کہانیاں گردش کرنے لگیں جن کی ہر بات سچ ثابت ہوا کرتی تھی۔

میں دو دنوں تک دفتر نہیں جا سکا تھا۔

اس بار بھی میرا علاج اسی ڈاکٹر نے کیا تھا جو پہلے چوٹ لگنے کے بعد کر چکا تھا۔ اس نے مجھ سے حیرت سے کہا تھا۔ ''صفدر صاحب یہ آپ کے ساتھ دس دنوں میں دوسرا واقعہ ہے۔''

''جی ڈاکٹر صاحب۔'' میں کراہتے ہوئے بولا۔ ''بس قسمت خراب ہو گئی ہے۔''

''آئندہ سے خود کو ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رکھیے گا ورنہ لمبے ہو جائیں گے۔''

''کوشش کروں گا ڈاکٹر صاحب۔''

خیر تو دو دنوں کے بعد آرام آ گیا تھا اور میں نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ چار پانچ دنوں کے بعد وہ مرد درویش پھر دکھائی دے گیا تھا۔

اس بار وہ میرے پاس نہیں آیا تھا بلکہ میں خود دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ''بابا مجھے معاف کر دیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ آپ مجھ سے دو سو روپے مانگتے رہے، میں نے آپ کو نہیں دیے اس وقت لے لیں مجھ سے۔''

''کیوں فقیروں سے مذاق کرتا ہے۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''اب ریٹ بڑھ گیا ہے دو سو سے کام نہیں چلے گا۔ دو ہزار روپے دینے ہوں گے۔''

''ارے بابا رحم کریں، میں دو ہزار کہاں سے لاؤں؟''

''میں کچھ نہیں جانتا اگر نہیں دیے تو آج کا دن تجھ پر بھاری گزرے گا۔''

''خدا کے لیے یہ مت کہو۔'' میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''بہت بھاری دن دیکھ لیے ہیں، اب برداشت نہیں ہوگا۔''

''تو پھر دو ہزار دے جلدی۔'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف پھیلا دیا۔

''ارے کہاں سے دوں دو ہزار۔'' میں جھلا گیا تھا۔ ''بھیک مانگ رہے ہو یا ڈاکے ڈال رہے ہو۔''

''اچھا یہ تیور ہیں تیرے۔'' اس نے گھور کر دیکھا۔ ''جا تو پھر آج کا دن بھی تیرے لیے بھاری ہے۔''

''کیا ہوگا۔ اب کیا ڈرون حملہ ہوگا مجھ پر یا پہاڑ آ گرے گا۔''

لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ پتا نہیں کس قسم کا درویش تھا لیکن وہ جو بھی تھا جیسا بھی تھا اس نے پھر آج کے دن کے بھاری ہونے کی بات کی تھی۔

اب احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ میں اپنے گھر میں جا کر بند ہو جاؤں۔ نہ میں گھر سے باہر نکلوں گا نہ میرے ساتھ کوئی حادثہ ہوگا۔

میں نے ایک رکشے والے کو آواز دی جو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا حالانکہ وہ کرایہ زیادہ مانگ رہا تھا میں پھر بھی اس کے رکشے میں بیٹھ گیا۔ جلد سے جلد گھر پہنچنے کے لیے۔

راستے میں ایک جگہ کچھ لوگوں نے اچانک سامنے آ کر رکشے کو روک لیا۔ یہ ایک تقریباً سنسان سا علاقہ تھا مکانات بنے ہوئے تو تھے لیکن ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے۔

رکشے والے نے ان لوگوں سے کترا کر رکشا نکال لے جانا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ان لوگوں نے رکشا رکتے ہی ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ کر اتار لیا اور اس کو گالیاں دینے لگے۔

اس وقت پتا چلا کہ پرانی دشمنی کا چکر تھا اور رکشے والے کو انہوں نے اتفاقاً گھیر لیا تھا۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں رکشے والے کو بچانے کے لیے درمیان میں آ گیا تھا اور وہ غصے میں بھرے ہوئے لوگ رکشے والے کو چھوڑ کر مجھ سے بھڑ گئے۔

نتیجہ وہی ہوا جو ایسے موقع پر ہوا کرتا ہے۔ ان لوگوں نے میری خاصی ٹھکائی کر ڈالی۔ میں نے خود کو بچانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے خود کو بچانا ممکن نہیں تھا۔

اس بار میں پورے ایک ہفتے بستر پر رہا تھا اور میرے علاج کے لیے وہی ڈاکٹر آیا تھا جو پہلے بھی دو بار میری مرہم پٹی کر گیا تھا۔ اس بار اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''صفدر صاحب ایک بات بتائیں، کیا آپ کو مار کھانے کا شوق ہے؟''

''لعنت بھیجیں۔ یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں، کس کو مار کھانے کا شوق ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر ایسے واقعات آپ ہی کے ساتھ کیوں پیش آ رہے ہیں۔''

''اب میں کیا بتاؤں، میری بدقسمتی میں جب بھی اس درویش کی بات ماننے سے انکار کرتا ہوں میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔''

''کون سا درویش۔''

میں نے ڈاکٹر کو اس درویش کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ''او خدا تو یہ ماجرا ہے۔ صفدر صاحب آپ اسے ناراض نہ کیا کریں، کسی بھی قیمت پر نہیں ورنہ آپ کے لیے عذاب ہو جائے گا۔ اس کے پیر پکڑ لیں۔ معافی مانگ لیں اس سے۔''

''ہاں بھائی یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

اس حالیہ ٹھکائی نے میرے ہوش کچھ اس طرح بھی اُڑا دیے کہ دفتر سے مجھے جواب دے دیا گیا تھا۔ باس نے کہا تھا۔ ''بھائی یا تو تم زخمی ہونے کا شوق پورا کر لو یا پھر ملازمت کر لو۔''

''جناب مجھے ملازمت ہی کرنی ہے۔''

''افسوس ہے کہ اب ہم تمہارا یہ شوق پورا نہیں کر سکتے۔'' اس نے کہا۔ ''تم اپنا حساب لے کر جا سکتے ہو۔''

بہرحال اس دفتر سے میری چھٹی ہو گئی۔ اب مجھے پھر اس درویش کی تلاش تھی جس کی بددعاؤں نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا۔ وہ ایک بار اسٹاپ پر پھر دکھائی دے گیا۔ ایک آدمی اسے ہزار کا ایک نوٹ دے رہا تھا۔ اس آدمی کے ہٹتے ہی میں اس درویش کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''بابا، مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کے مرتبے کو نہیں پہچانا تھا۔ میں مار کھاتے کھاتے تنگ آ چکا ہوں۔ آپ جب بھی فرماتے ہیں کہ آج کا دن بھاری گزرے گا تو وہ دن واقعی بہت بھاری گزرتا ہے۔''

''اچھا تو پھر نکال تین ہزار روپے۔''

''بابا میری جیب میں صرف تین ہزار روپے ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ بھی اس لیے کہ دفتر والوں نے میری چھٹی کر دی ہے۔''

''اچھا تو تیرے ساتھ یہ ہوا ہے۔''

''جی بابا۔'' میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ ''میں تو اب کہیں کا بھی نہیں رہا۔''

''کیا تو اپنا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے؟''

''کون نہیں چاہے گا بابا۔''

''تو پھر آ میرے ساتھ، میں تیرا مستقبل بنا دیتا ہوں۔'' اس نے ایک شان بے نیازی سے کہا۔ ''کیونکہ مجھے تجھ پر ترس آ گیا ہے۔''

''بڑی مہربانی۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک مکان میں لے آیا تھا یہ ایک چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا مکان تھا۔ ڈرائنگ روم بہت بڑا تھا، سلیقے کے ساتھ صوفے رکھے ہوئے تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن ایک شرط پر تمہارا مستقبل بنے گا کہ تمہیں ہمارے ساتھ شامل ہونا ہوگا۔''

''آپ کے ساتھ شامل ہونا ہوگا، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی؟''

''تم پوری بات سن لو۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تم شامل نہیں ہونا چاہتے ہو تو انکار کر دینا لیکن یہاں سے باہر جا کر تم ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے، اگر یہ شرط منظور

ہے تو پھر میں اس بات کو آگے بڑھاتا ہوں ورنہ یہیں ختم سمجھو۔"

"نہیں نہیں آپ بتائیں۔ میرے پاس تو کوئی آپشن بھی نہیں ہے۔"

"دیکھو ہمارا ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے ٹیکنیکل سوسائٹی آف بیگرز۔ یعنی بھیک مانگنے والوں کی سائنسی سوسائٹی۔ ہماری سوسائٹی کے بے شمار رکن ہیں اور سب کو ہینڈسم سیلری ملتی ہے۔ سب خوش ہیں۔ ہماری انکم بھی اچھی خاصی ہے۔"

"پلیز ذرا تفصیل سے بتائیں یہ سب کیا ہے؟"

"یہ ہماری نئی تکنیک ہے۔" اس نے بتایا۔ "تکنیک یہ ہے کہ ہم کسی ایک بندے کو منتخب کر لیتے ہیں۔ اس کی نگرانی کی جاتی ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے۔ کہاں جاتا ہے، یہ سب ہمارے علم میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے تم کو دیکھا۔ میں بس اسٹاپ پر تمہارے پاس پہنچ گیا اور تم سے دو سو روپے مانگ لیے۔ ظاہر ہے کہ تم نہیں دے سکتے تھے۔ میں نے بھی دن بھاری ہونے کی خبر سنائی اور ہمارا ایک آدمی سیڑھیوں پر تم سے ٹکرا گیا۔"

"کیا کہہ رہے ہو وہ تمہارا آدمی تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہمارا ایک کارکن، پھر دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ ایک لڑکی تمہیں ملی اور اس نے تمہاری ٹھکائی کروا دی۔"

"ہاں تو وہ لڑکی...؟"

"ہاں وہ بھی ہماری ورکر ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب سمجھا تو وہ رکشے والا... اس کے دشمن، وہ سب ڈراما تھا۔"

"ہاں سب ڈرامے، اب خود سوچو جب میں اس طرح پھر کسی کے سامنے جا کر کہوں کہ لا مجھے دو ہزار روپے دے تو وہ دے گا یا نہیں دے گا۔"

"کیوں نہیں دے گا۔ وہ تو تمہیں خدا کا خاص بندہ سمجھنے لگے گا۔"

"بس یہی ہے وہ تکنیک جس کی مدد سے ہم ہر مہینے لاکھوں روپے کما لیتے ہیں اور اپنے ورکرز کو ہینڈسم سیلریز بھی دیتے ہیں۔"

"اوہ خدا۔" میں نے اپنا سر تھام لیا۔

اس دوران کچھ لوگ کمرے میں آ گئے اور میں سب کو پہچانتا چلا گیا۔ وہ مجھے گرانے والا، وہ لڑکی، وہ رکشے والا اور اس کے دشمن سب کے سب ہنستے بولتے ہوئے کمرے میں چلے آئے تھے۔

اس آدمی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان لوگوں کو بتایا۔ "ان سے ملو، یہ ہماری ٹیم کے نئے ممبر ہیں۔ مسٹر صفدر۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "کیوں صفدر صاحب آپ کو ہماری جاب منظور ہے۔ شروع میں آپ کو پچیس ہزار ملیں گے۔"

"منظور ہے۔" میں نے فوراً جواب دے دیا۔

وہ سب مجھ سے باری باری ہاتھ ملاتے رہے۔ اس شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صفدر تمہاری ڈیوٹی کچھ اور ہوگی۔ تم آؤٹ ڈور پر نہیں جاؤ گے بلکہ یہاں بیٹھ کر کام کرو گے۔"

"یہاں کیا کام کرنا ہوگا۔"

"ایک تو ہر رکن کا حساب کتاب رکھنا۔ ان کو ڈیوٹی پر بھیجنا، اس کے علاوہ سب سے اہم بات نئی نئی پلاننگ کرنا کہ کسی شخص کے دن کو بھاری کس کس طرح کیا جا سکتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ میں تیار ہوں۔"

سب نے مجھے مبارکباد دی اور اس دن سے میں اس انوکھی سوسائٹی کا ایک اہم کارکن ہوں۔ اسی لیے آپ کو یہ سمجھا رہا ہوں کہ اگر کوئی درویش قسم کا آدمی آپ کے سامنے آ کر کہے کہ لا پانچ سو روپے نکال تو فوراً دے دیں ورنہ وہ دن آپ پر واقعی بھاری ہو جائے گا اور آپ ہفتے تک اپنی چوٹوں کو سہلاتے رہیں گے۔

ہاں ایک بات اور اگر کوئی ایسا شخص آپ کے سامنے آ جائے اور وہ آپ سے اسی انداز سے رقم کا مطالبہ کرے تو یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ وہ ہماری سوسائٹی کا بندہ ہو سکتا ہے وہ واقعی درویش ہی ہے۔"

اس کی آسان پہچان یہ ہے کہ جو شخص آپ کو دن کے بھاری ہونے کی بددعا دے رہا ہے وہ ہماری سوسائٹی کا رکن ہے اور جو بددعا نہیں دے رہا وہ واقعی کچھ اور ہے کیونکہ خدا کے نیک بندے کسی کو بددعائیں نہیں دیتے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دوں کہ آپ چاہے خدا کے نیک بندے کو کچھ دیں یا نہ دیں لیکن ہمارے بندے کو ضرور کچھ دے دیں ورنہ آپ کا دن واقعی بہت بھاری ہو جائے گا۔

اندھی سوچ

محترم مدیر

السلام علیکم!

ایک روداد قلم بند کرکے ارسالِ خدمت کررہی ہوں۔ گوکہ یہ روداد میری نہیں لیکن اس روداد کی مرکزی کردار میری واقف کار ہے۔ وقت کے لحاظ سے یہ روداد بہت اہم ہے کیونکہ اپنے شہر کراچی میں یہ جرم ایک وبا کی شکل اختیار کررہا ہے۔ سڑکوں اور بسوں میں پوسٹر، بینرز کے ذریعہ اس جرم کی تشہیر ہورہی ہے۔ لوگ لٹ رہے ہیں اور حکومت، قانون نافذ کرنے والے خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ امید ہے اس روداد کو پڑھ کر کچھ عقل تو ضرور آجائے گی۔

صدف آصف

(کراچی)
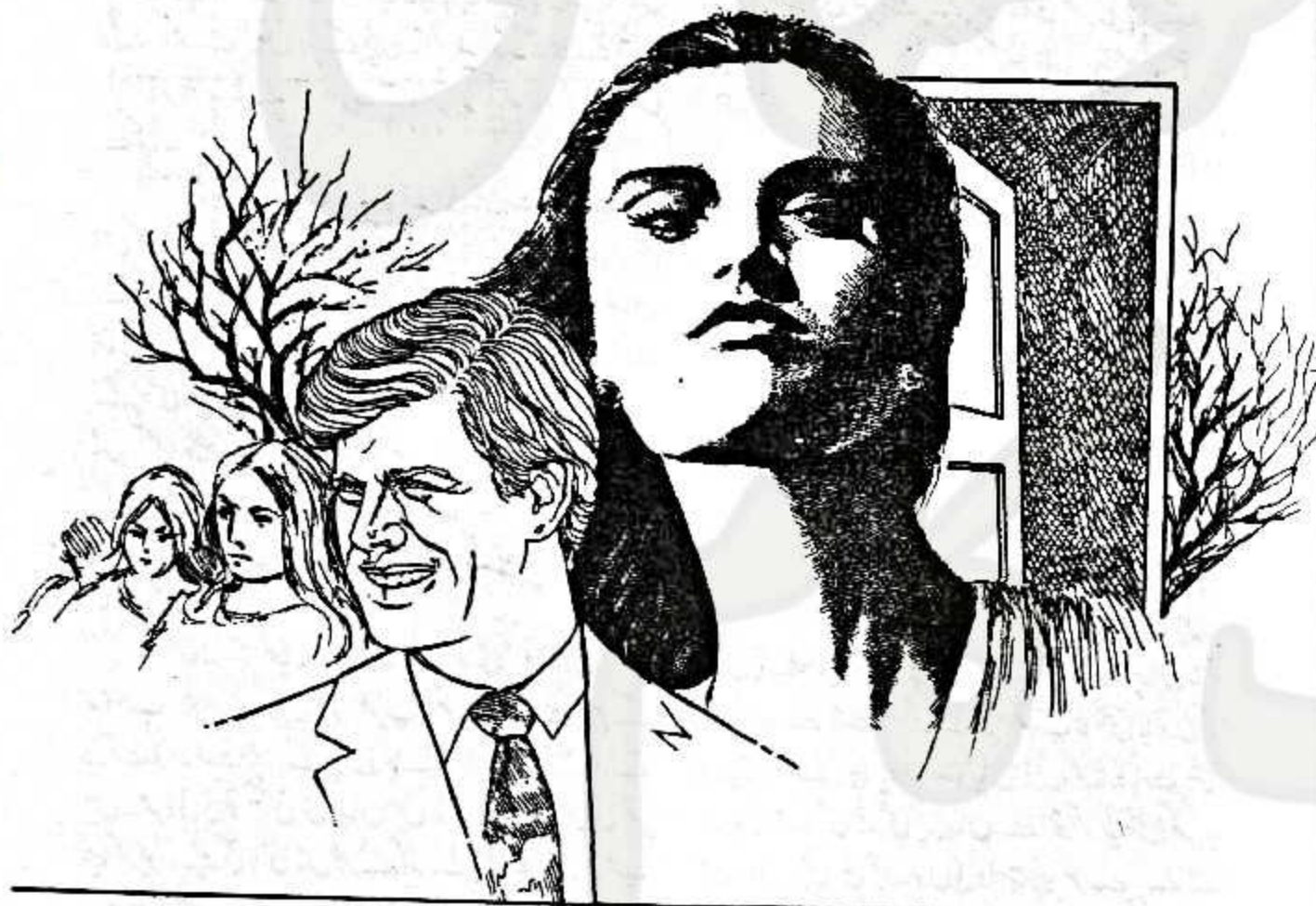
"ہاں بھابی، تو منصور کے گھر والوں نے کیا جواب کہلوایا؟" ربیعہ حنیف نے شربت کا ٹھنڈا میٹھا گلاس رمضان بھابی کو پکڑاتے ہوئے بڑی آس سے انہیں دیکھا۔ رجو جو اسی کمرے کا پونچھا لگا رہی تھی جہاں وہ دونوں بیٹھے بات کر رہے تھے، اس کے کان بھی اسی طرف لگ گئے۔ گھر گھر جھاڑو پونچھا کرنے والی رضیہ مائی کا کام یہی تھا۔ ہر گھر سے سن گن لینے کے بعد اِدھر کی اُدھر کرکے خواتین کے ذوقِ تجسس کو ہوا دینا۔ اس طرح وہ محلے کی

عورتوں سے تنخواہ کے علاوہ بخشش بھی وصول لیتی۔ ویسے بھی یہ ساری معلومات اس کے کام کی تھیں۔

''بس بیٹا، ان لوگوں کو کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے۔ بڑی بہن بولی، عمرہ، منصور سے بڑی لگتی ہے۔ بھلا بتاؤ اب میں کیا بولتی؟'' رمضان بھابی نے نظریں چرائیں۔

''اس دن تو ان لوگوں نے عمرہ کو پسند کرلیا تھا'' ربیعہ اس پر بہت پُرامید ہوگئی تھیں۔ انکار کا سن کر انہیں ایک دم دھچکا لگا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''اپنے طور پر تو بڑی کوشش کی مگر آج کل لڑکے والے، انہیں اللہ ہی سمجھے۔ ہاتھوں میں فیتہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں۔ ناپ تول کر لڑکی پسند کرتے ہیں'' رمضان بھابی نے گھونٹ گھونٹ بھرتے ہوئے گلاس ختم کرکے ٹرے پر پٹخ کر اس پر غصہ نکالا اور ناگواری سے بولیں۔

''اچھا، پتا نہیں۔ میری عمرہ میں کیا کمی ہے؟ رنگ بھی صاف ہے۔ ناک نقشہ بھی سبک۔ لمبے لمبے بال۔ پتا نہیں لوگ اندھے کیوں ہوگئے ہیں۔ اقرار ہوتے ہوتے ایک دم انکار ہوجاتا ہے؟'' ربیعہ نے سر پر ہاتھ مار کر افسردگی سے کہا۔

''شاید ان کالے لمبے بالوں کی نحوست ہی ہے جو اس کا رشتہ ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔ جب دیکھو کھول کر نیم کے درخت تلے بیٹھی رہتی ہے، تم بھی کچھ نہیں بولتیں'' رمضان بھابی نے عمرہ پر نگاہیں ٹکا کر کہا جو اس وقت بھی درخت تلے بچھی چارپائی پر بیٹھی سیدھی مانگ نکال کر بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی .... گھر گھر جا کر رشتے لگانے والی کو اپنی غلطیاں دوسروں کے کھاتے میں کیسے ڈالتے ہیں اس پر.... عبور حاصل تھا۔ جب ہی تو اس کی پبلک ڈیلنگ اتنی شاندار تھی۔

''خالہ...... ٹھیک بولی۔ بچی باجی' ہمارے پیر صاحب جوان لڑکیوں کو (مغرب) مگرب کے بعد نیم کے درکت (درخت) کے پاس جانے سے بھی منع کرتے ہیں۔ عمرہ بی بی تو بیٹھتی ہی یہاں ہیں۔'' رجّو نے مالکن کی نظر بچا کر پوچھے کی بالٹی میں بھرے گدلے پانی میں ہی غڑاپ سے کپڑا بھگوتے ہوئے چٹخارا بھرا۔ اسے ایسی باتوں میں بہت مزہ آتا تھا۔ ویسے بھی اس گھر پر تو اس کی کئی مہینوں سے نظر تھی، پر ربیعہ ہاتھ آتے آتے چکنی مچھلی کی طرح پھسل جاتیں۔

''اے لو...... سن رہی ہو ربیعہ۔ اس چٹی ان پڑھ کو عقل ہے' پر تم کو یہ بات سمجھ نہیں آئی'' رمضان بھابی نے اپنے بٹوے میں سے پانوں کی ڈبیا نکال کر ایک مرجھایا ہوا پان کلے میں دباتے ہوئے ربیعہ کو جھاڑا۔

''ہاں جی' اللہ والے لوگ ہیں۔ کہتے ہیں کنواری لڑکیوں کے جن چمٹ جاوے ہے'' رضیہ اپنی تعریف پر پھولے نہ سمائی، کام کاج چھوڑ کر ان کے پاس زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ دونوں کی معنی خیز مسکراہٹ پر عمرہ ایک دم پزل ہونے لگی، ماں کی تنبیہی نظروں میں ہونٹوں کو بھینچ لیا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ دونوں کو جی بھر کر سنائے۔

''اللہ جی! میں کیا کروں، لوگوں کی زبانوں کو کیسے تالا لگاؤں؟ تو بڑا رحیم ہے۔ کریم ہے۔ میری بیٹی کا نصیبہ بھی کھول دے'' ربیعہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ دعا دل سے آہ کی طرح نکلی۔ ان دونوں کی باتوں سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود انہوں اپنی زبان بند رکھی، غصہ بھی شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئیں۔ جہاں جہالت بول رہی ہو' کبھی کبھی وہاں خاموشی ہی بہترین جواب ہوتی ہے۔

''ایک پان تو دینا۔'' رجّو نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بھابی کے بٹوے کو للچا کر دیکھا۔

''چل نگوڑی، تیری نظریں میرے پانوں پر ہی رہتی ہیں۔ پتا ہے نا کتنی مہنگائی ہوگئی ہے۔ پاندان کا خرچہ نکالنا بھی مشکل ہورہا ہے۔'' انہوں نے بڑی دقت کے بعد دوسرا مرجھایا ہوا پان اسے تھماتے ہوئے چار باتیں بھی سنائیں۔ دونوں اب ایک دوسرے کے ساتھ مصروف ہوگئیں۔

عمرہ نے ماں کو شکایتی نظروں سے دیکھا اور بالوں کو لپیٹتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ ربیعہ کی نگاہیں جھک گئیں۔ جواب تو وہ بھی ہزار دے سکتی تھیں' پر ان ناخواندہ خواتین سے بحث کرنے کا مطلب لایعنی باتوں کو طول دیتے ہوئے بلاجواز صفائیاں پیش کرنا۔ بات یہیں ختم ہوجاتی تب بھی خیر تھی پر یہاں سے اٹھ کر یہ جس گھر جاتیں ان ماں بیٹی کی مجبوریوں کی داستان مزے لے لے کر دہراتیں۔ یہ انہیں گوارا نہ ہوا۔ کیوں کہ بند ہو مٹھی تو لاکھ کی' کھل گئی تو پھر خاک کی۔

☆☆☆

عمرہ کی دو چھوٹی بہنوں سدرہ اور فروہ کی شادیاں دو سال قبل ہوچکی تھیں۔ حالانکہ وہ دونوں بہت کم سن تھیں' پر

جیسے ہی لوگوں کے کانوں میں یہ باتیں پڑیں کہ دو چھوٹی بہنیں بیاہی جاچکی ہیں، ایک دم سے وہ عمر رسیدہ نظر آنے لگتی۔

ان سب سے چھوٹا شہیر جو اپنی تعلیم کے حصول میں سنجیدگی سے مصروف تھا۔ اسے بھی بڑی بہن کا دکھ اپنے دل میں پلتا محسوس ہوتا۔ ان لوگوں کی زندگی میں ویسے تو سکون ہی سکون تھا۔ نہ کوئی مالی پریشانی نہ ہی کوئی دوسرا بڑا مسئلہ۔ پر عمرہ کا معاملہ پیروں میں چبھنے والے کانٹے سا ہوگیا تھا۔ جب تک نکل نہ جاتا تکلیف کے ساتھ ساتھ آگے قدم اٹھانا بھی مشکل ہوجاتا۔

ربیعہ کو دو چھوٹی بیٹیوں کی شادی کے وقت ذرا بھی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ سدرہ کو ربیعہ کی بہن صبیحہ نے اپنے بڑے بیٹے رضوان کے لیے لے لیا تو فروہ کے لیے ان کی نند جبیں آگے بڑھیں اور اپنے منجھلے بیٹے آفاق کا رشتہ طلب کرلیا۔ دونوں کو ہی شادی کی جلدی تھی۔ ربیعہ بڑی کی وجہ سے متذبذب تھیں، پر علی احمد جلد از جلد بیٹیوں کو اپنے اپنے گھروں کا ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ راضی ہوگئے۔ یوں ایک ہی تقریب میں دونوں چھوٹی بیٹیوں کو دھوم دھام سے وداع کردیا گیا۔

پیچھے رہ گئی عمرہ جو اس گھر کے درختوں کی سب سے پرانی بیری تھی لیکن اس پر پڑنے والا کوئی بھی پتھر ابھی تک نشانے پر نہیں لگا۔ سب قسمت کے کھیل ہوتے ہیں۔ اسی لیے بہانے بنتے رہے۔ خاندان میں کوئی لڑکا اس کی جوڑ کا نہ ملا۔ ربیعہ نے غیروں میں بر تلاش کرنے کی بڑی کوشش کی۔ پر ان کو تا حال کامیابی نصیب نہ ہو پائی۔ عمرہ کی شادی میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہوتی رہی۔ لڑکے والے آتے کھاتے پیتے۔ ہنس ہنس کر باتیں بگھارتے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے بیٹی کو لڑکے والوں نے پسند کرلیا ہو۔ آس کے جگنو ان کی مٹھیوں میں دبائے وہ لوگ گھر جا کر، مشورے سے جواب دینے کا کہہ کر چلے جاتے۔

جب تک جواب نہیں آجاتا ربیعہ جلے پاؤں کی بلی بنی رہتیں۔ فون کی بیل پر ان کے کان کھڑے ہوجاتے۔ ان دنوں تو علی احمد کے دلاسے بھی اپنا اثر و رسوخ کھودیتے۔ دو، تین دن بعد جب وہاں سے انکار کا جوتا ٹھک کرکے ان کے منہ پر پڑتا تو حق دق رہ جاتیں۔ خوشی کے پھول ابھی کھلنے بھی نہ پاتے کہ پتی پتی ہوکر بکھر جاتے۔

لڑکے والوں کی جانب سے انکار ان پر بہت بھاری پڑتا۔ ربیعہ تو منہ لپیٹ کر لیٹ جاتیں۔ عمرہ کے چہرے پر گنتی دنوں سے پھیلی شرم کی لالی میں زردیاں سی گھل جاتیں۔ شہیر کی شوخیاں جیسے کہیں گم ہوجاتیں اور علی احمد کے کاندھے جھک سے جاتے۔

ربیعہ کا سوچ سوچ کر برا حال ہوجاتا پر انکار کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آتی۔ سب مل کر انہیں سمجھاتے۔ کھانے کی طرف راغب کرتے۔ پر ماں کا دل ایسے وقتوں میں مچل مچل جاتا۔ کبھی رو رو کر اپنا غبار نکالتیں اور کبھی غصے میں رشتہ لگانے والی بھابی کو فون کھڑکھڑاتیں۔ وہ بھی کم نہ تھیں ان کے پاس ہر دفعہ کوئی نیا جواز موجود ہوتا۔

''بی بی کیا کہوں کوئی کہتا ہے'' جی ہمیں تو لڑکی پسند آئی ہے' پر لڑکے نے تصویر دیکھ کر انکار کردیا۔''

تو کوئی کہتا ہے'' دولھا کی بہن یہاں رشتے پر راضی نہیں''

تبھی وہ بتاتیں کہ کہیں سے جواب آیا ہے۔

''استخارہ کروایا تھا...... اس میں نہ آئی ہے۔''

''جانے کیا وجہ ہے پر بی بی بات بنتے بنتے بات بگڑ جاتی ہے''۔ رمضان بھابی جو ابھی پہنچی تھیں' ربیعہ کی بے رخی اور ان کی جرح پر سوکھا منہ بنا کر بولیں۔ اصل میں وہ بھی اس معاملے میں کم دکھی نہ تھیں' فی شادی دس ہزار وصولتی تھیں۔ عمرہ کے لیے کئی رشتے دکھانے کے باوجود بات نہ بن پائی تو انہیں لگا وقت ضائع ہورہا ہے، کیونکہ ان کی روزی روٹی اسی کام سے چلتی تھی۔ وہ بھی چڑچڑی سی ہوگئیں یہاں تو ان کی اپنی گوٹ پھنسی ہوئی تھی۔

''امی' میں ذرا چھت پر جارہی ہوں۔ کوئی کام ہو تو آواز دیجیے گا۔'' رمضان بھابی کی باتیں ناقابل برداشت ہونے لگیں تو اس نے دوپٹے سے سر ڈھانپا اور زینے کی طرف بڑھتے ہوئے ماں کو اطلاع دی۔ عمرہ کو اس وقت تنہائی کی شدید طلب محسوس ہوئی۔

''عمرہ ... دن بہ دن تنہائی پسند ہوتی جارہی ہے''۔ ربیعہ کی سوچ اور نگاہیں بیٹی کی پشت پر جم گئیں جو تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی جارہی تھی۔

عمرہ کے کانوں میں مختلف جملوں کی بازگشت جاری تھی۔

''بیٹا' ہلکا میک اپ کرکے تیار ہوجاؤ .... ان لوگوں کو خود چائے پیش کرنا''۔ لڑکے والوں کے سامنے

جانے سے قبل ربیعہ ہر بار ان کاموں پر زور دیتیں۔

"آپ نے میٹرک کون سے سن میں کیا؟ چھوٹی بہنوں کی شادی پہلے کیوں ہوگئی؟" کسی کی ماں، بہن یا بھابی ایسے سوال ضرور پوچھتیں۔ ایک جیسے لوگ ایک جیسی باتیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ان کی عادی نہیں ہو پارہی تھی۔ ہر بار ایک سی نوٹنکی ان کے ڈرائنگ روم میں سجائی جاتی۔ وہ گوشت پوست کی حساس لڑکی ایسی کٹھ پتلی میں ڈھل جاتی جس کی ڈوری کوئی اور تھام لیتا۔ وہ دوسروں کی انگلیوں پر ناچنے پر مجبور ہوجاتی۔

لڑکے والوں کے سامنے کی جانے والی روز روز کی ایک جیسی پریڈ نے عمرہ کا مورال ڈاؤن کردیا۔ اداسی کے گھیرے میں قیدی بنا دل اپنی ناقدری پر بلبلا اٹھا۔ وجود میں تپش سی جاگ اٹھی۔ جب بھی اقرار کی آس بنتے بنتے انکار کا بھاری پتھر وجود پر آگرتا تو جسم سے جیسے جان ہی کھنچ جاتی۔

اس پر گھر والوں کا اترا چہرہ دیکھ کر وہ ہول اٹھتی۔ دوبارہ ایسے تجربے کے لیے دل کو بمشکل تیار کرتی۔ وحشت کہیں دور بھاگ جانے کی ترغیب دیتی اور وہ گھٹ کر رہ جاتی۔ آدمی لوگوں سے تو بھاگ سکتا ہے، چھپ سکتا ہے، پر اپنے آپ سے بھاگنا مشکل ہوجاتا۔ بہت مشکل۔

"میرا قصور لڑکی ہونا ہے۔ اور بس" عمرہ نے ہوا سے پھڑ پھڑاتے دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے سفید کبوتر کو دیکھا جس کے پر شہیر نے ایک دن قبل ہی قینچ کیے تھے۔ وہ چھت پر ہی اس کے قدموں میں منڈلانے لگا۔ آسمان کی وسعتوں تک جانا۔ اب اس کے اختیار میں نہ رہا۔ عمرہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مٹی کے پیالوں میں پانی اور باجرہ بھرا۔

ناکردہ گناہ کی اذیت بھی بہت گہری ہوتی ہے۔ کئی ایسے سوالات من میں کلبلا اٹھتے جن کے جواب خود کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ اس نے بھی ہونٹ سینے میں ہی عافیت جانی۔ یہ الگ بات ہے کہ من میں پکتا لاوہ باہر نکلنے کو بے تاب ہوا۔

☆☆☆

"باجی۔۔ یقین جانو، عمرہ بی بی کی شادی پر کسی نے بندش کروادی ہے۔ جب ہی تو اتنے رستے (رشتے) آتے ہیں پر واپس لوٹ جاتے ہیں" رجّو نے سوچوں میں گم ربیعہ کو چونکایا اور پاؤں دباتے ہوئے مکھن لگایا۔

"کیا بک رہی ہو۔ کسی کو کیا پڑی ہے جادو ٹونا کروانے کی۔" انہوں نے پاؤں کو جھٹکا اور تیز لہجے میں بولیں۔

"ہائے، ہائے آپ بھی کیسی بھولی ہو۔ انسان کے سو دوست ہوتے ہیں تو ہجار دشمن۔ ویسے بھی آپ نے اوپر تلے چھوکریاں کیا بیاہ دیں، لوگوں کے دل سڑ گئے۔ وہ۔۔ آپ کی جو حبیب خالہ۔۔ سادی کی مبارک باد دینے آئی تھیں، کیسا یہاں بیٹھی حیران ہوئے جارہی تھیں۔ آپ نے کتنے مجے (مزے) سے دو چھوکریاں بیاہ دیں۔ ان کی چار بیٹی ہیں ابھی۔ میں تو کہتی ہوں ان کی ہی نجر لگ گئی بی بی کو۔" رجّو نے ایک پرانا واقعہ دہرایا۔

سدرہ کی شادی کے بعد ان کی امی کی دور پار کی کزن آئی تھیں۔ مبارک باد دینے کے بعد اپنی چار بیٹیوں کی شادی نہ ہونے کی پریشانی ربیعہ سے شیئر کر بیٹھیں۔ اس وقت رجّو بھی وہاں موجود تھی۔

"ارے، بیچاری۔ زینب خالہ تو خود اپنی بیٹیوں کا رشتہ لگوانے کا کہہ رہی تھیں۔ ان کی بیٹیوں کی تو عمریں بھی بہت زیادہ ہوگئی ہیں نا۔ چھوٹی بیٹی عائشہ تو میری عمرہ سے بھی بڑی ہے۔ ان کے مسئلے الگ ہیں۔ یہاں ان باتوں کا کیا ذکر؟" ربیعہ نے کہا اور جلدی جلدی تھال میں ہاتھ چلا کر دال بیننے لگیں۔ دوپہر کے کھانے میں چنے کی دال گوشت پکانا تھا۔

"وہ ہی تو بی بی، ایسے لوگوں کی نجریں ہی تو کھا جاتی ہیں، پر آپ تو سب کو اپنے جیسا سمجھتی ہو۔ میری مانو تو ایک بار حجرت صاحب کے یہاں حاجری دے دو۔ کسم سے ساری مسکلیں دور نہ ہوں تو سو جوتے گن کر میرے سر پر مارنا۔" رجّو نے حضرت کا نام لیتے ہی عقیدت سے انگلیوں کو آنکھوں سے لگا کر چوما اور جما جما کر بات کی۔

"چلو تمہارا کام ختم ہوگیا۔ اب جاؤ مجھے فضول باتوں میں نہ لگاؤ۔" ربیعہ اس کی باتوں سے جیسے الجھ سی گئیں۔ تخت سے فوراً اٹھ گئیں۔

"بی بی جی آپ کی دشمن نہیں ہوں۔ اتنے سالوں تک آپ کا نمک کھایا ہے۔ میرے کہنے پر ہی ایک بار حجرت کے آستانے تک چلی چلو۔ ایسا تاویج (تعویذ) دیں گے کہ مہینوں میں کیا، دنوں میں عمرہ بی بی کھیر سے اپنے گھر کی ہو جائے گی۔" رجّو نے ہمدردی کی آڑ میں ایک نئی راہ دکھائی، پھر انہیں سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن چھوڑ کر خاموشی سے سرخ رنگ کی پلاسٹک کی چپلوں میں اپنے کالے کالے پاؤں ڈالے اور سٹ پٹ کرتی باہر نکل گئی۔

دھوپ کی تمازت یا دل کی دھن۔ ربیعہ کا سراپا

چکرا یا کہ ہاتھ سے دال کا تھال چھوٹ گیا، دیوار کا سہارا نہ لیتیں تو خود بھی زمین پر ایسے ہی بکھر جاتیں۔ جیسے چنے کی دال بکھری پڑی تھی۔ عمرہ آواز سن کر۔۔۔ دوڑ کر باہر آئی تو ماں کا اترا چہرہ دیکھ کر دہل گئی۔

☆☆☆

آپ۔۔ یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں؟" علی احمد ایک لمحے کو سن رہ گئے پھر بے یقینی سے پوچھ بیٹھے۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ان کی سمجھ دار اہلیہ کن راہوں پر چل پڑی ہیں۔

"کیا کروں، ہر دفعہ انکار کا سن کر میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ دل میں ہزاروں اندیشے اور وسوسے پنپنے لگے ہیں۔ خدانخواستہ کسی نے کچھ کرا نہ دیا ہو۔ ایک دفعہ حضرت صاحب سے بھی دعا کروالوں، اللہ والوں کی دعائیں بہت لگتی ہیں۔" ربیعہ نے ہاٹ پاٹ سے گرم روٹی نکال کر ان کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے دبے لفظوں میں کہا۔ عمرہ کو دو دن سے بہت تیز بخار تھا۔ وہ دوا کھا کر سو رہی تھی۔ اس لیے انہیں۔۔۔ کھانے کی میز پر یہ بات کرنے میں آسانی ہوئی۔

"امی، اگر دعا سچے دل سے مانگی جائے۔۔۔ تو کسی بھی لگ سکتی ہے۔۔۔ اس بات کی کیا گارنٹی کہ مانگنے والا اللہ والا ہے یا دنیا والا۔ آپ بھی کن جاہلوں کی باتوں میں آگئیں۔ پلیز ان چکروں میں مت پڑیے۔ دیکھتی نہیں ہیں روزانہ اخبارات میں کیسے کیسے ڈھونگی باباؤں کے قصے چھپتے رہتے ہیں، آج کل ہر چینل ایسے لوگوں کے چہروں پر سے نقاب اتارنے پر تلا ہوا ہے، پھر بھی آپ۔" شہیر نے پلیٹ میں دم کا قیمہ نکالتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے ماں کو سمجھایا۔

"وہ تو ہے۔ میں تمہاری دلیلوں سے انکار نہیں کروں گی، پر بیٹا، ان سب باتوں کے باوجود۔۔ آج بھی جادو ٹونے اور اچھے لوگوں پر برے عمل کروائے جاتے ہیں۔ دنیا حسد کرنے والوں سے بھری پڑی ہے۔ کیا پتا کسی نے میری بچی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردی ہوں۔ فروہ اور سدرہ کی شادیوں کو دو سال ہوگئے ہیں، پر عمرہ کا معاملہ کہیں بیٹھ ہی نہیں پاتا۔ اچھے لوگ اب بھی موجود ہیں نا۔ کچھ ایسا ہو جائے کہ کئی سالوں سے بندھی یہ گانٹھ ٹوٹ جائے۔ عمرہ بھی خیر سے اپنے گھر کی ہو جائے تو میں بھی سکون سے مر سکوں۔" ربیعہ ایک دم جذباتی ہوگئیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑے۔ دل کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوا تو بیٹے اور شوہر کے سامنے یوں بول پڑیں۔ وہ کمزور عقیدہ نہ تھیں، پھر بھی آج کل عدم تحفظ کا شکار تھیں۔ شہیر کھانا چھوڑ کر ماں کو سنبھالنے میں لگ گیا۔

"ربیعہ بیگم، حوصلہ رکھیں۔ ہمیں آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ یہ جو جگہ جگہ آج کل جعلی عاملوں نے اپنی دکان سجائی ہوئی ہے، ان کے چکروں میں نہ ہم خود پڑیں گے نہ ہی اپنے خاندان کے کسی فرد کو اس بات کی اجازت دیں گے۔ ہمارا اللہ پر کامل یقین ہے۔ ابھی اس کی طرف سے ہی دیر ہے، ورنہ کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ بیٹی کی شادی کو روک سکے۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ ان باتوں میں پڑ کر سچائی کی راہ سے بھٹکیں۔" علی احمد کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے نرم لہجے کی سختی ربیعہ کے لیے نئی نہ تھی۔ جب انہیں کسی بات سے شریکِ حیات کو روکنا ہوتا وہ ایسا ہی لب و لہجہ اختیار کر لیتے۔ شہیر نے افسردگی سے ماں کو دیکھا جو سن سی بیٹھی رہ گئیں۔

☆☆☆

"باجی! ایک بات بتاؤں، پر پہلے قسم کھاؤ، ناراج تو نہیں ہوگی۔" رجّو نے ڈرتے ڈرتے ربیعہ سے پوچھا۔ آج کل ان کا خراب موڈ اسے محتاط رہنے کے اشارے دے رہا تھا، پر بات بڑھانی بھی ضروری تھی۔

"ہاں بولو۔" ربیعہ جو ڈسٹنگ میں مصروف تھیں بے خیالی میں بولیں۔ رجّو جھاڑو ایک طرف پھینک کر تیزی سے ربیعہ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ عمرہ جو ابھی بیماری سے اٹھی تھی۔ ٹیبل پر بیٹھی پورج کھا رہی تھی، ناگواری سے رجّو کو گھورنے لگی۔

"رجّو! تمہارے پاس اور کوئی کام نہیں ہے، جو ہر وقت ایک نیا شگوفہ چھوڑتی رہتی ہو۔ بلاوجہ امی کا بھی دماغ خراب کرتی ہو۔ الٹی سیدھی باتوں کی جگہ کام پر دھیان دو۔ صفائی کے نام پر اتنی گندگی مچا رکھی ہے۔ جا کر ٹیرس کی دھلائی کرو۔ اتنا گرد آلود ہو رہا ہے۔" عمرہ کا نہ صرف لہجہ سخت ہوا، بلکہ آواز بھی بلند ہوگئی۔ اس نے رجّو کی طبیعت صاف کردی۔

"نئی بی بی، ایسے ہی باجی کو کچھ بتانا تھا۔" رجّو نے گھبرا کر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی اور جلدی جلدی کرے میں دھیان لگا کر جھاڑو دینے لگی۔ ربیعہ نے بیٹی کو فکر سے دیکھا۔ وہ آج کل بہت زود رنج ہو رہی تھی۔ عمرہ نے اپنا ناشتا ختم کیا اور رجّو کو وارننگ دیتی، نگاہوں سے دیکھتی

ٹیبل سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں؟'' ربیعہ نے تجسس سے مجبور ہوکر دھیرے سے پوچھا۔

''باجی، میں نے عمرہ بی بی کا نام بتایا تھا حجرت صاحب کو۔ انہوں نے اپنے موکلوں سے پتا کیا۔ بتا رہے تھے کہ ان کے رشتے پر بندش کرائی گئی ہے۔'' اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دھیرے دھیرے ربیعہ کو بتایا۔

''کیا بک رہی ہے؟ کسی کو کیا پڑی ہے بندش وندش کرانے کی؟'' ربیعہ نے بھی ڈرتے ڈرتے اندر نظر دوڑائی اور اسے جھڑکا۔

''اللہ قسم باجی! وہ بولے کہ اس کام میں ایک بوڑھی، کالی، موٹی عورت کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔ جس نے آپ کے گھر میں کہیں پڑھی ہوئی سوئی گاڑی ہے۔'' رجو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ربیعہ کے ذہن میں زینب خالہ کا نقشہ گھوما، ان کے خاندان میں بس ایک وہی تھیں جن کی رنگت سیاہی مائل تھی۔ ویسے بھی وہ پچھلے ہفتے روتی دھوتی آئیں۔ ان کی بہو کی کنواری نندوں سے بالکل نہیں بن رہی ہے، بہت پریشان لگ رہی تھیں۔ یہاں پورا دن گزار کر گئیں۔ وہ وسوسوں میں الجھتی گئیں۔

''باجی! وہ کہہ رہے تھے، ایسے سفلی عمل کا توڑ کرنا کچھ مشکل نہیں، بس آپ ایک بار بی بی جی کو آستانے تک لے چلیں۔''

رجو نے جال بچھا دیا۔ اب ان کے پھنسنے کی منتظر تھی۔

''یہ کن چکروں میں پھنسا رہی ہو۔ چلو جاکر باقی کام نمٹاؤ۔'' ربیعہ نے سامنے سے شہیر کو آتے دیکھا تو اسے جھڑک کر منہ موڑ کر میز چمکانے لگیں۔ رجو کا منہ اتر گیا۔

''یہاں سے بہت مال ملے گا۔ حجرت بھی کھس (خوش) ہوجائیں گے، پر باجی...'' وہ بڑبڑاتی ہوئی بے دلی سے برتن دھونے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''لاؤ بیٹا میں تمہارے بیڈ کی چادریں بدل دوں، صبح سے صفائی میں لگی ہوئی ہو تھک گئی ہوگی۔'' ربیعہ نے مسکرا کر عمرہ کے ہاتھ سے صاف بیڈ شیٹ اور کورز لے لیے۔ چھٹی کا دن تھا۔ عمرہ پر صفائی کا بھوت سوار تھا، ویسے ابھی کچن کی بھی خبر لینا باقی تھا۔ شام میں شادی شدہ بیٹیاں مع میاں اور بچوں کے آنے والی تھیں، آج ویسے بھی عمرہ کا جنم دن تھا۔ وہ سب مل جل کر گھر میں ہی ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیاں منا لیتے تھے۔ اسی لیے کھانے میں کچھ اہتمام ضروری ہوگیا۔

اچھا، امی، میں ذرا پلاؤ کے لیے یخنی چڑھا دوں پھر نہا کر کپڑے بدل لوں گی۔'' عمرہ نے مسکرا کر ماں کو دیکھا، دل ہی دل میں رات کا مینیو ترتیب دیتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''ارے، یہ غلاف کیوں نہیں اتر رہا، لگتا ہے جیسے کہیں پھنس گیا ہے۔'' ربیعہ نے گلابی پھولدار چادر بچھانے کے بعد جب تکیہ غلاف اتارنا چاہا تو وہ کہیں پھنس گیا۔ انہوں نے ہاتھ سے ٹٹولا۔

''سی...'' ربیعہ کی انگلی پر خون کا قطرہ ابھر آیا۔ منہ سے سسکی نکلی۔ ٹٹولنے پر کوئی نوکیلی شے ان کی انگلی میں کھب گئی۔ احتیاط سے نکالا تو وہ ایک سوئی تھی۔

''یا اللہ! خیر کرنا! یہ کہاں سے آئی؟ اس کی جسامت بھی عام سوئیوں سے کچھ الگ ہے'' ربیعہ نے بغور ہاتھ میں پکڑی سوئی کا معائنہ کیا۔ وہ تھوڑی بڑی، کالی اور نوک کے پاس سے مڑی ہوئی تھی۔ دل گھبرانے لگا۔ جلدی جلدی اٹھ کر سوئی پھینکنے کمرے سے باہر نکلیں۔ دھڑکتے دل اور تیز تیز قدموں سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

واپس آکر اچھی طرح سے ہاتھ مل مل کر دھونے کے بعد وضو کیا پھر عمرہ پر چاروں قل پڑھ کر پھونکا۔ وا ہموں نے ان کے دل پر اپنے پنجے گاڑ دیے۔ رجو کی باتیں سچ لگنے لگیں۔ فروہ اور سدرہ اپنے ساتھ بہت سی رونقیں سمیٹ لائیں، پر ان کا دل کہیں نہیں لگا۔ دنیا داری کے لیے سب کے بیچ بیٹھ گئیں، پر ان کی نگاہوں میں وہ سوئی ہی گھومتی رہی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کس سے کہیں؟ علی احمد اور شہیر پہلے ہی ان باتوں کے خلاف تھے۔ دامادوں کے سامنے بیٹیوں سے یہ باتیں کرنا مناسب نہ لگا۔ ویسے بھی سب واہمہ قرار دے کر الٹا ان کا مذاق ہی اڑاتے۔ وہ پوری رات گویا انہوں نے انگاروں... پر لوٹیں لگائیں۔

☆☆☆

نہیں امی، میں ان فضول باتوں کو نہیں مانتی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' عمرہ ماں کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ربیعہ نے جاہل رجو کی باتوں کو اپنے سر پر کیوں سوار کرلیا۔ وہ اب سب سے چھپ کر اس کو حضرت کے آستانے لے جانے کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ جب سے اس کے کمرے سے سوئی نکلی تھی، ان کا دل ڈانواں ڈول رہنے لگا تھا۔ وہ ایک بار اس کراماتی بابا کے آستانے پر جانا چاہتی تھیں شاید کوئی راستہ بن جائے۔ ہفتہ بھر پہلے عمرہ کی اٹھائیسویں سال گرہ ہوئی تھی۔ ماہ و سال جیسے ہاتھوں سے پھسلے چلے جا رہے تھے، پر کوئی آس ہی نہیں بن پائی۔

بیٹا، میں کیا کروں؟ جب سے وہ سوئی نکلی ہے سوچ سوچ کر میری نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ ہوسکتا ہے رجو ٹھیک ہی کہہ رہی ہو پھر حضرت صاحب نے اس کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ آخر سوئی نکلی ناں، خیر تم کچھ بھی کہو، میں ایک بار اکیلے ہی ان کے در پر جاؤں گی۔ اگر ان کی باتیں سچ نکلیں تو تم بھی میرے ساتھ چلنا۔'' ربیعہ غصے میں بولیں۔

''امی، پلیز!'' ربیعہ کی ذہنی کشمکش، عمرہ چاہتے ہوئے بھی ماں کو سمجھا نہیں پائی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''بس ایک کرم کرنا، اپنے بھائی، باوا کے سامنے زبان نہ کھول بیٹھنا۔'' ربیعہ چادر پہن کر نکلنے لگیں تو عمرہ کی ناراضی اور پھولے منہ کو دیکھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ بیٹھیں۔ رجو، جو اُن کے خصوصی بلاوے پر آئی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ چھا گئی۔ وہ تیزی سے ان کے پیچھے چل پڑی۔

☆☆☆

رجو کی راہنمائی سے وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ گاڑی کا لمبا سفر طے کرتے ہوئے ایک بستی میں جا پہنچیں یہاں سے ان دونوں کا سفر پیدل شروع ہوا۔ پتلی پتلی گلیوں میں گاڑی اندر نہیں جا سکتی تھی۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ ایک بڑے سے گھر کے سامنے جا کھڑی ہوئیں، جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کچھ ملنگ ٹائپ لوگ وہاں بیٹھے جھوم جھوم کر سرخ آنکھوں سے آنے جانے والوں کو گھور رہے تھے۔ سوالیوں میں خواتین ہی کی بڑی تعداد نظر آرہی تھی۔

رجو نے اندر قدم رکھنے سے قبل ان سے دو ہزار روپے لے کر سائیڈ میں رکھے بڑے سے چندے کے باکس میں ڈال دیے۔ گھر کے اوپر سبز سنہری رنگ کے کئی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اگربتیوں کی خوشبو نے پورے ماحول پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں ربیعہ کا دل گھبرانے لگا۔ بے کلی سی چھا گئی۔ وہ پلٹنے والی تھیں کہ رجو بھانپ گئی۔ ان کا ہاتھ سختی سے تھاما اور خاص کمرے کی طرف بڑھ گئی، جہاں حضرت صاحب اپنے مریضوں کو دیکھتے تھے۔

''بس بی بی، اس سے آگے آپ کو کھود (خود) جانا ہوگا۔ میرے کو منع ہے۔'' وہ انہیں کمرے میں دھکیلتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔

''بیٹھ جاؤ، ربیعہ بی بی!'' گونجدار آواز نے ان کا استقبال کیا۔ ربیعہ کی آنکھیں اندر پہنچ کر تھوڑی دیر میں دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ بابا پکی رنگت والے خاصے لمبے تڑنگے سے تھے۔ کُرتے اور دھوتی میں ملبوس۔ اپنے سامنے کھڑی ایک لڑکی کو گھور رہے تھے جو باقاعدہ کانپ رہی تھی۔

''آ...پ میرا نام بھی جانتے ہیں؟'' ربیعہ نے حضرت صاحب کی سرخ نگاہوں سے آنکھیں چرائیں جو سوال کرتے ہی ان پر ٹک گئیں۔

''ہُنہہ رجو کے ساتھ آئی ہونا۔ اس نے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ بہت پرانی مریدنی ہے ہماری۔ اسی کی سفارش پر تمہیں ملنے کا وقت دے دیا۔ ورنہ یہاں تک پہنچنے کے لیے لوگوں کو مہینے بھر انتظار کرنا پڑتا ہے'' انہوں نے تھوڑی ترشی اور رعونت سے جواب دیا اور ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ویسے بھی ان کی پوری توجہ اس خوبصورت لڑکی کی طرف تھی جس کے چہرے پر عجیب طرح کی بے چارگی دکھائی دے رہی تھی۔

وہاں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ ربیعہ کونے میں بیٹھ گئیں۔ کمرے میں اس لڑکی اور ان کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ بیٹھنے کے بعد انہوں نے نگاہیں گھما پھرا کر ماحول کا جائزہ لیا۔ کمرا کیا تھا بدروحوں کا مسکن لگ رہا تھا۔ ایک طرف بہت ساری تسبیحیں پانی کے پیالے میں بھیگی پڑی تھیں۔ کمرے کی دیوار پر لگی کیلوں پر تازہ اور باسی گلابوں کے ہار ٹنگے ہوئے تھے۔ ماحول میں عجیب سی باس پھیلی ہوئی تھی۔

''شکر ہے عمرہ کو نہیں لائی۔ ایسے ماحول میں تو وہ گھڑی بھر نہ رکتی۔'' انہوں نے لڑکی کو دیکھ کر سوچا جس کے کالے لمبے بال حضرت صاحب نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے... ہوئے تھے۔ ایک خوف سا ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اگر علی احمد یا شہیر کو پتا چلے کہ وہ اس وقت کہاں اور کیسی جگہ بیٹھی ہیں طوفان ہی آجاتا۔

''بتا! لڑکی کو آزاد کرے گا یا نہیں؟'' بابا کی بھاری بھرکم آواز کمرے میں گونجی، انہوں نے کونے میں رکھی مور کے پروں سے بنی ڈنڈی اٹھائی اور لڑکی کے چہرے اور جسم پر ضربیں لگانے لگے۔

''اماں! ارے بچائیے۔ ہم کو کچھ نہیں ہوا ہے'' وہ بیچاری ان کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہی

تھی۔ حضرت صاحب اسے یوں گھور رہے تھے جیسے کوئی شکاری اپنے شکار پر نظر رکھتا ہے۔

"جلا کر بھسم کردوں گا" انہوں نے اس کے بالوں کو ایک جھٹکا دیا۔ وہ بیچاری نیچے گرگئی۔ ربیعہ اسے اٹھانے کو آگے بڑھیں۔

"رک جاؤ بی بی! اس پر ایک جن ہے جو اس کی شادی نہیں ہونے دے رہا۔ اسے ہاتھ مت لگاؤ' یہ چوٹیں لڑکی کو نہیں اس جن کو لگ رہی ہیں"۔ حضرت صاحب کی کڑکتی ہوئی آواز پر وہ وہیں ٹھہر گئیں۔ ایک دم لڑکی کا چہرہ ان کی عمرہ کے چہرے سے بدل گیا۔ ربیعہ کا ہاتھ اپنے سینے پر جا ٹھہرا۔

"باباجی، میں... ابھی پانی پی کر آتی ہوں۔" ربیعہ نے بہانہ گھڑا اور الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے ہاتھ پیر بے جان ہونے لگے، کمرے کے آسیب زدہ ماحول سے باہر نکل کر انہوں نے کھلی فضاؤں میں طویل سانس لی۔ رجّو کو ڈھونڈا۔ وہ کسی سے باتوں میں مشغول تھی۔

ربیعہ جلد از جلد اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

"او بھائی اللہ داد، اس بار حجرت سے بولنا میں جادہ کمیسن (زیادہ کمیشن) لوں گی۔ تم لوگ کرتے ہی کیا ہو۔ گھروں میں جا جا کر عورتوں سے مغز ماری تو ہم لوگ کرتے ہیں۔ اس پر پیسے اتنے کم دیتے ہو۔ اب تو لوگ ویسے بھی پیروں کے پاس آنے سے ڈرتے ہیں۔ یہ تو میری محنت ہے کہ ان کا ایسا نکسہ (نقشہ) کھینچتی ہوں جیسے یہ بڑے کمالی ہوں۔ بیگم لوگوں کو لے ہی آتی ہوں" رجّو کی بات سن کر ربیعہ کے قدم جیسے زمین سے چپک گئے۔ ساری بات صاف ہوگئی۔ وہ اس درخت کی آڑ میں کھڑی تھیں جس کے نیچے وہ دونوں بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اسی لیے رجّو کی نظر اب تک ربیعہ پر نہیں پڑی۔

"اچھا کھالی پیلی مغز کھراب نہ کر۔ اس بار ہجار روپے اوپر دلوا دوں گا، پر وہ جو نیلے بنگلے والی کا بتایا تھا نا، انہیں پٹا کرلا۔ بہوت پیسے والی ہے۔ یہاں آ کر کھوب لٹائے گی۔" اللہ داد نے بھری ہوئی سگریٹ کا کش لگایا اور دھواں رجّو کے منہ پر چھوڑ دیا۔

دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ ربیعہ آڑ سے نکل کر ان کے سامنے آئیں تو دونوں کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"باجی، آپ! ابھی تو گھنٹا لگنا تھا۔" ان کو وقت سے پہلے باہر کھڑا دیکھ کر وہ ہکلانے لگی۔

"اونہہ، کام ہوگیا۔ چلو" ربیعہ ایسے علاقے میں تھیں کچھ بول کر پھنسنا نہیں چاہتی تھیں۔ رجّو پر یہ ظاہر کرکے کہ کام ہو چکا ہے تیزی سے گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ رجّو ان کے پیچھے بھاگی۔

"یا اللہ! یہ مجھ سے کیسی بھول ہوگئی؟! انجانے میں، میں کیسی حماقت کر بیٹھی۔ اگر عمرہ میرے ساتھ آجاتی تو کیا کچھ ہو جاتا۔ تیرا کرم ہے مولا جو گناہ مجھ سے سرزد ہونے جا رہا تھا اس سے بچالیا۔" ربیعہ نے نہایت دکھی ہو کو گاڑی کے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں خود کو کوسا۔ پیچھے بیٹھی رجّو کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ اس کی کترنی کی طرح چلتی زبان کو آج تالا لگ گیا تھا۔

☆☆☆

"جی باجی، وہ سوئی میں نے ہی گلاف (غلاف) میں صفائی کرتے ہوئے لگائی تھی۔ حجرت صاحب ہماری برادری کی چند عورتوں کو پیسے دیتا ہے، ان سے گھروں کی پوری معلومات نکلواتا ہے۔ اس کے بعد ہماری مدد سے پیسے والی بیبیوں کو آستانے پر بلاتا ہے۔ علاج کے بہانے ہجاروں روپے بٹورتا ہے" رجّو نے روتے ہوئے اعترافِ جرم کیا اور بڑھ کر ربیعہ کے پاؤں پکڑ لیے، پر انہیں اس پر ذرا ترس نہ آیا۔ ان کی نگاہوں میں تو بار بار وہ لڑکی گھوم رہی تھی جو اس ڈھونگی اور مکروہ شکل والے پیر کے چنگل میں پھنسی پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس بیچاری کے گھر والے بھی ضعیف الاعتقادی کے ہاتھوں مارے گئے ہوں گے۔

"بھائی شکیل، آپ جیسے چاہیں اس پورے گروہ سے نمٹیں، خاص طور پر اس فریبی انسان کو تو بالکل نہیں چھوڑیے گا، جو پیسے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بہو بیٹیوں پر بھی بری نظر رکھتا ہے" ربیعہ نے اپنے کزن سے کہا، جو پولیس کے اعلیٰ عہدیدار تھے۔ ربیعہ نے آستانے سے واپسی پر پہلا کام یہ ہی کیا کہ ان کو فون کرکے بلایا اور اپنا نام صیغہ راز رکھنے کی شرط پر رجّو اور اس کے حضرت کے کالے کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑا۔

"آپا فکر نہ کریں۔ ان لوگوں کو کیسے ڈیل کرنا ہے میں اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ اسے تھانے لے چلو، باقی تفتیش وہاں جا کر ہوگی۔ ہم بھی تو ذرا اس کے حضرت صاحب کے درشن کریں" انہوں نے سادے لباس میں ملبوس لیڈی کانسٹیبل کو اشارہ کیا اور مسکرا کر بولے۔

"یس سر!" کانسٹیبل رجّو کی طرف بڑھی۔

"باجی، ماف کردو۔ ایسا دوبارہ نہیں ہوگا" رجّو نے ربیعہ کو پکڑ کر شور مچایا تو لیڈی کانسٹیبل نے بڑھ کر اسے ایک الٹے ہاتھ کا تھپڑ لگایا۔

"چپ چاپ چل کر گاڑی میں بیٹھ۔ اگر باہر گلے سے ایک آواز بھی نکالی تو ساری عمر کے لیے جیل میں سڑا دوں گی۔" کانسٹیبل نے رجّو کے شور مچانے پر دھمکایا۔ ایک مُکا پیٹھ پر مارا تو اس کی بولتی بند ہوگئی۔ وہ چپ چاپ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ سر جھکا کر اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔

"اچھا آپا، اب اجازت دیں۔ اگر سارے شہری آپ کی طرح اپنی ذمے داریاں نبھائیں تو مجرم بہت دن تک چھپ نہیں سکتے۔" شکیل احمد نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ وہ بہن کی خواہش پر یہاں سادہ کپڑوں میں خاموشی سے آئے تھے۔ ربیعہ بدنامی سے ڈرتی تھیں اس لیے بھائی کو فون پر پہلے ہی سب سمجھا دیا تھا۔

☆☆☆

واہ بھئی ہماری جھانسی کی رانی۔ آپ نے تو ہمارا سر بلند کردیا۔" علی احمد نے مسکرا کر بیوی کو خراجِ تحسین پیش کیا تو وہ شرما گئیں۔ ان دونوں کے گرد سب لوگ بیٹھے حیرت سے ان کی کہانی سن رہے تھے۔

"شکیل احمد کی ٹیم نے چھاپا مار کر اس پورے گروہ کو حراست میں لے لیا جو گھر گھر کام کرنے والی ماسیوں کے ذریعے معلومات حاصل کرتے پھر ان ہی کے ذریعے کبھی پتلا، کبھی انڈا یا جادو کی سوئیاں برآمد کرواتے۔ بھولی بھالی گھریلو خواتین اپنی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے ان کے جال میں آسانی سے پھنس جاتیں۔ وہ ان کے جذبات سے کھیلتے۔ علاج کے بہانے پیسے بٹورتے۔

ان سب کی گرفتاری کا سن کر ربیعہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں ان کے اندر جاری کئی دنوں کی بے چینی ختم ہوگئی۔ دل پر رکھا بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ اپنے آپ کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگیں۔

"ابوجی! آخر امی کس کی ہیں؟" شہیر نے اپنے کالر کھڑے کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہماری۔" عمرہ، فروہ اور سدرہ نے ایک زبان ہو کر کہا اور بھائی کو شرارت سے دیکھا۔

"سنو، سنو، ایک اور خوش خبری۔ وہ جو پچھلے ہفتے میرے دوست انور اور ان کی اہلیہ آئے تھے نا، انہوں نے اپنے ڈاکٹر بیٹے حمدان کے لیے عمرہ کو پسند کرلیا ہے اب وہ لوگ باقاعدہ منگنی کرنا چاہ رہے ہیں۔ دو مہینے بعد شادی کا ارادہ ہے۔" علی احمد اپنے مزاج کے برخلاف شوخ ہوئے جا رہے تھے۔ سب ان کے گرد جمع ہو کر شور مچانے لگے۔ سدرہ نے بہن کو گلے لگالیا۔

"واہ! زبردست؟" فروہ کے ساتھ شہیر اور سدرہ بھی خوشی سے چیخیں۔ عمرہ شرما کر ایک دم کمرے سے باہر نکل گئی۔

"مجھے تو لڑکا خاصا معقول لگا بیگم۔ آپ سے بھی تو ملا تھا جب واپسی میں انور اور بھابی کو لینے آیا تھا" علی احمد نے یاد دلایا تو انہوں نے سر ہلا دیا، انہیں حمدان سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ نہ صرف خوش شکل لڑکا ہے بلکہ بات چیت میں بھی بہت طریقے کا لگا۔ وہ سوچنے لگیں۔

"کاش... اس کی شادی عمرہ کے ساتھ ہو جائے۔ دونوں ساتھ کتنا جچ رہے تھے۔" اس دن عمرہ حمدان کو چائے سرو کرتے ہوئے اس کی کسی بات پر مسکرائی تو ربیعہ کی نگاہوں میں وہ منظر جیسے بس گیا اس دن کے بعد سے کئی بار ان کے دل سے یہی صدا نکلی۔

"بیگم صاحبہ، کہاں چل دیں۔ ابھی تو محفل عروج پر پہنچی ہے؟" علی احمد نے ایک دم سب کے بیچ سے ان کو اٹھتے دیکھا تو پیچھے سے ہانک لگائی۔ وہ سب کو حمدان کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔ چونک کر ربیعہ کو دیکھنے لگے۔ وہ سنی ان سنی کیے باہر نکل گئیں۔

"اے میرے اللہ! جب تو نے میری دو بیٹیوں کے نصیب اتنے اچھے لوگوں سے جوڑے تو پھر عمرہ کو کیسے بھول جاتا، پر میں کم عقل، نادان تیری رحمتوں کو بھول بیٹھی، بھٹکنے لگی۔ مجھے معاف کردے مالک!" ربیعہ جائے نماز پر سجدہ ریز ندامت کے آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ احساسِ جرم اور شرمندگی انہیں سر اٹھانے نہیں دے رہی تھی۔ ورنہ رجّو کا شیطانی منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو ان کی دنیا تو دنیا آخرت بھی تباہ ہو جاتی۔

ان دیکھا سودا

محترم مدیر سرگزشت
سلامِ تہنیت!
پہلی بار خود اپنی خود نوشت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے میری کہانی میری زبانی سن کر آپ بھی محظوظ ہوں گے۔ یہ کہانی یعنی جو مجھ پر گزری ہے وہ سبق آموز ہے اور آپ کے یہاں ایسی ہی کہانیاں چھپتی ہیں اسی لیے ارسال کیا ہے۔

اشرف
(لاہور)

میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ وقت کہاں سے کہاں چلا گیا ہے اور ہم ابھی تک پرانی لکیریں پیٹے چلے جا رہے ہیں۔

بہت پہلے کی بات ہے۔

شاید میں اس وقت دس گیارہ برس کا تھا۔ جب میرے والدین نے میری شادی چچازاد بہن عظمٰی سے طے کردی تھی۔ ہم شہر میں رہتے تھے اور چاچا گاؤں میں اپنی زمینداری میں مصروف تھے۔

میں نے عظمٰی کو شاید دو تین بار ہی دیکھا ہوگا۔ ظاہر ہے اس عمر میں منگنی وغیرہ کیا سمجھ میں آسکتی تھی۔ میرے لیے اچھے کپڑے بن گئے تھے۔ گھر میں تھوڑا اہلا گلا ہوگیا تھا۔ بس میں اسی میں خوش تھا۔

اس کے بعد میں عظمٰی سے پھر نہیں مل سکا۔ شہر میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے مجھے باہر بھیج دیا گیا۔ اس دوران یہ خبر ملی کہ عظمٰی نے میٹرک پاس کرلیا ہے۔

میں نے بائیو کامرس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی کیونکہ زمانہ اسی کا تھا۔ میں نے باہر رہ کر زندگی کے بے شمار تجربات حاصل کیے۔

دنیا کو گلوبل ولیج کہا جاتا ہے۔ اس کا احساس باہر آکر ہوا تھا۔ روشن اذہان رکھنے والوں سے واسطہ پڑا کرتا۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوا کرتیں۔ سیاست سے لے کر مذہب اور موسیقی سے لے کر لٹریچر تک۔ میں اس لحاظ سے خوش نصیب ہوں کہ وہاں بھی مجھے ایسے بے دار مغز ساتھی مل گئے تھے۔

اس لیے جب میں باہر سے واپس آیا تو میرے سوچنے کا انداز ہی بدل چکا تھا۔ میں نے کیسی کیسی خوبصورتی دیکھی تھی۔ فیشن شوز میں کیٹ واک کرنے والی لڑکیاں میرے سامنے رہی تھیں۔

اور جب واپس آیا تو وہی تقاضا کہ عظمٰی سے شادی کرلو۔ اس نے تو اب بی اے بھی کرلیا ہے اور بہترین کھانے بنا سکتی ہے۔ ایک سے ایک ڈیزائن کے کپڑے سیتی ہے۔ سگھڑ، سلیقہ مند۔

لیکن اب میرے سوچنے کا انداز ہی بدل چکا تھا۔ میں ایسی لڑکی سے کس طرح شادی کرلیتا۔ اسی لیے جب یہ مسئلہ اٹھایا گیا تو میں نے صاف انکار کردیا۔ ”نہیں۔ میں وہاں شادی نہیں کرسکتا۔“

”کیوں۔“ ایک ایٹم بم سا گرا تھا۔ ”کیا پاگل ہوگئے ہو؟ بچپن کے رشتے سے انکار کررہے ہو۔“

”اسی لیے تو انکار کررہا ہوں کہ یہ رشتہ بچپن کا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میرے دیکھنے اور سوچنے کا انداز بدل چکا ہے۔“

”کچھ نہیں بدلا۔“ ڈیڈی غصے سے بولے۔ ”تم باہر جاکر آسمان کے پاس نہیں ہوگئے۔“

”اگر زمین ہی کا باسی رکھنا تھا تو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر کیوں بھیجا تھا۔ مجھے یہیں رہنے دیا ہوتا۔ پھر میں کسی سے بھی شادی کرسکتا تھا۔“

”صاحب زادے تمہیں اپنے انکار کو بدلنا ہوگا۔“

”پلیز ڈیڈ! اس وقت مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں ابھی ابھی باہر سے آیا ہوں۔ مجھے یہاں اپنے پاؤں جمانے دیں۔ پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے دیں۔ اس کے بعد اس موضوع پر بات کروں گا۔“

والدین نے میری یہ بات کچھ دنوں کے لیے اس لیے مان لی کہ ابھی مجھے اپنے شعبہ کے لیے جدوجہد کرنی تھی۔ بہت آگے جانا تھا جو ہر ایک کا خواب ہوا کرتا ہے۔

میں اپنی کوششوں میں مصروف ہوگیا۔ یہ مسئلہ کچھ دنوں کے لیے ٹل گیا تھا۔

میں نے تو طے کرلیا تھا کہ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا۔ لیکن پھر کس سے شادی ہو۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں باہر سے جس طرح اپنا دماغ خراب کرکے کراچی آیا تھا۔ اس مزاج کی لڑکی مجھے کہاں مل سکتی تھی۔

تھوڑی کوششوں کے بعد مجھے ایک بہت بڑی فرم میں بہت اچھی جاب مل گئی۔

گھر والے بہت خوش ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تقاضا بھی بڑھا کہ عظمٰی سے شادی کرلو۔ اس بار میں نے بہت سختی سے انکار کردیا تھا۔ ”نہیں ڈیڈ۔ پلیز، مجھے اپنی زندگی خود گزارنے دیں۔ میں یہ شادی نہیں کرسکتا۔“

”تو پھر کون ہے تمہاری نظر میں۔“

”فی الحال کوئی نہیں ہے۔ لیکن کوئی نہ کوئی ضرور ملے گی۔“

”بے وقوف ہو تم۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ عظمٰی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ جعفر ایک بڑا زمیندار ہے۔ اس کی اکلوتی وارث عظمٰی ہی ہے۔“

”پلیز۔ آپ لوگ یہ لالچ نہ دیں۔ ان چیزوں کی میری نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

”تو پھر ہم جعفر سے انکار کردیں۔“

”ہاں انکار کردیں۔ میں بار بار یہی کہہ رہا ہوں۔“

امی اور ڈیڈی بہت دنوں تک ناراض رہے تھے۔ مجھے یہ اندازہ نہیں کہ اس طرف کیا ردعمل ہوا ہوگا۔ خاص طور پر اس لڑکی عظمٰی نے کیا سوچا ہوگا۔ لیکن مجھے اس کی کیا پرواہ ہوسکتی تھی۔

میں تو اپنی دنیا میں مگن تھا۔

شاندار نوکری، ایک روشن مستقبل اور اس کے ساتھ
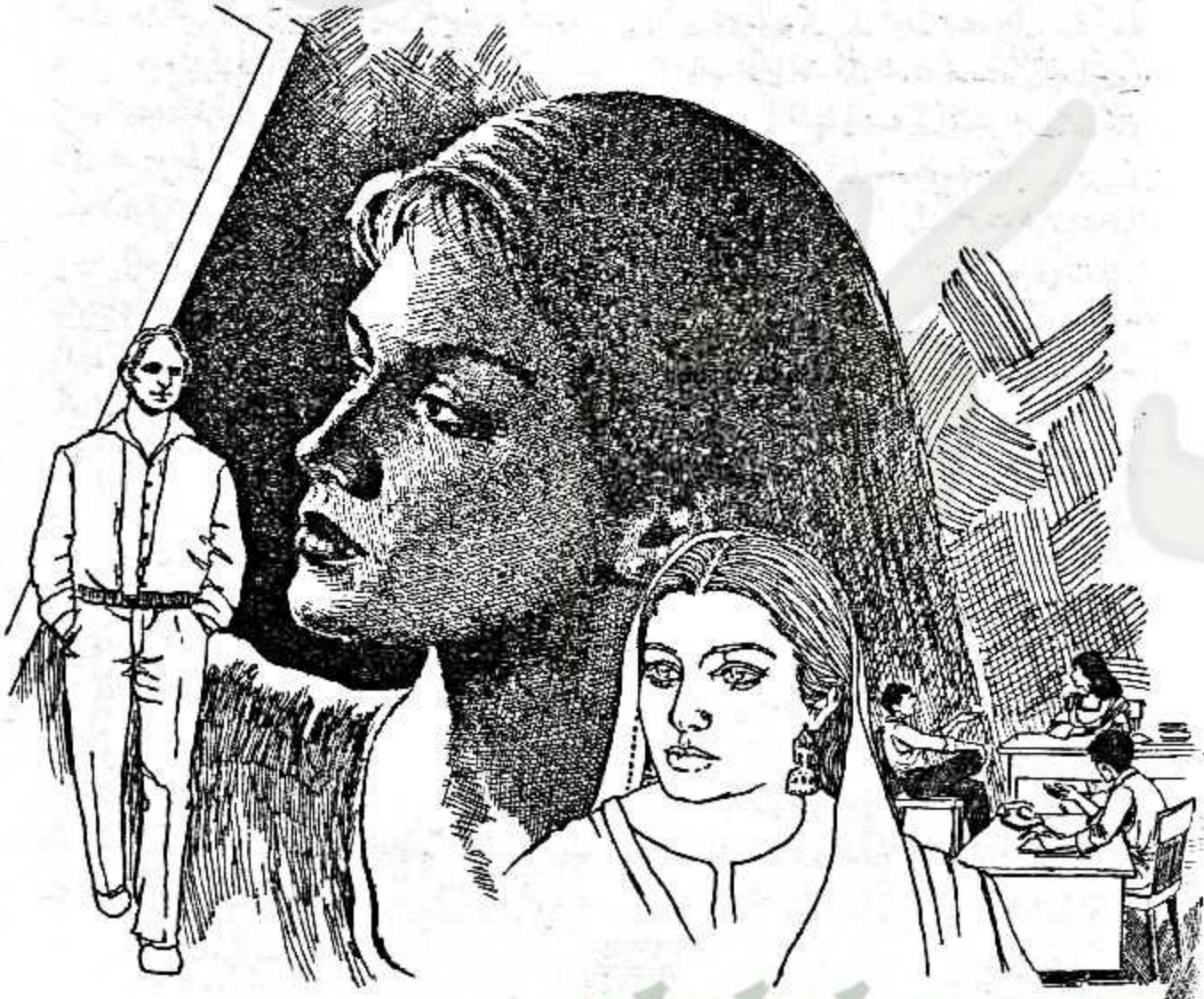
ہی جیون ساتھی کے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش۔ جواب میری معروفیت کا حصہ بن گئی تھی۔ تا کہ میں والدین کو خوش کرسکوں کہ میں نے اپنے لیے اپنے معیار کی لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔

میں مختلف تقریبات میں جانے لگا۔ تا کہ اپنا معیار دکھائی دے سکے۔ لیکن تلاش بے سود رہی۔ اس دوران میرے والدین نے مجھ سے پھر آخری بار عظمٰی سے شادی کے لیے کہا اور میرے انکار پر مایوس ہوگئے اور اس انکار کے پندرہ بیس دنوں کے بعد پتا چلا کہ عظمٰی کی شادی ہورہی ہے۔ اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ مل گیا ہے۔ خس کم جہاں پاک۔

گھر والے شادی میں شرکت کے لیے چلے گئے لیکن میں نہیں گیا۔ اس کی وجہ شرمندگی کا احساس بھی ہوسکتا ہے۔ گھر والے جب شادی سے شرکت کے بعد واپس آئے تو مجھ سے بہت ناراض ناراض تھے۔ میں نے بھی انہیں منانے کی کوشش نہیں کی۔

بہر حال ان کی ناراضگی کچھ دنوں تک برقرار رہی پھر آہستہ آہستہ حالات نارمل ہوتے چلے گئے اور اس دوران میری زندگی میں سارہ کی آمد نے ایک انقلاب برپا کردیا۔

سارہ میری فرم میں ملازمت پر آئی تھی۔ میں نے جب اسے دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہو۔ وہ ایسی ہی تھی۔ خوبصورت اور اسمارٹ۔ اور اس کے ساتھ ہی بے انتہا ذہین۔

اس لڑکی نے چند ہی دنوں میں پورے دفتر کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ بے پناہ خوبیوں کے ساتھ اس کی ایک خوبی اس کی حس مزاح بھی تھی۔ وہ بات سے بات نکالنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ میں نے ایسی حاضر جواب کم ہی دیکھی ہوگی۔

میں اس سے بہت متاثر ہوگیا تھا۔

بالکل وہی معیار جو میں نے اپنے ذہن میں تصور کر رکھا تھا۔ کاش یہ لڑکی میری جیون ساتھی بن سکتی۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے کئی بار میرے پاس آنا پڑتا تھا مختلف فائلز لے کر۔ اسی لیے اس سے بات کرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ جب میں لنچ کے لیے باہر جانے لگا تو میں نے رسماً اس سے بھی پوچھ لیا۔ ”سارہ۔ کیا آپ میرے ساتھ لنچ کرنا پسند فرمائیں گی۔“

”آپ کے ساتھ۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، میرے ساتھ۔ میں برابر کے ہوٹل کوالٹی میں لنچ لیا کرتا ہوں۔“

”وہ تو بہت مہنگا ہوٹل ہے سر۔“

”تو اس سے آپ کو کیا۔ آپ کو انوائٹ تو میں کررہا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر۔ لیکن میری ایسی حیثیت نہیں ہے کہ ایسے ہوٹلز افورڈ کرسکوں۔ اگر ایک بار آپ کے ساتھ گئی تو عادت پڑ جائے گی۔“

اس کی اس بات نے مجھے اور بھی متاثر کردیا تھا۔ اس کی عزت میرے دل میں سوا ہوگئی۔ ”ارے نہیں سارہ۔ ایک دو بار جانے سے عادتیں نہیں پڑا کرتیں۔ اور انسان کو خود پر کنٹرول بھی تو ہونا چاہئے۔ ویسے آپ کی یہ بات سن کے میں بہت خوش ہوا ہوں۔ آپ جیسی حقیقت پسند میں نے بہت کم دیکھی ہے۔“

”یس سر۔ انسان کے لیے جتنا مقرر ہے۔ اس کی پرواز بھی بس وہیں تک ہونی چاہیے۔“

بہت اچھی باتیں تھیں اس کی۔

بہر حال میں کسی طرح اسے ہوٹل لے آنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ پہلی دفعہ وہ مجھ سے کھل کر باتیں کررہی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ ”سر۔ میرا تعلق ایک شریف لیکن غریب گھرانے سے ہے۔“

”سارہ۔ انسان کی اپنی شخصیت کا غربت یا امیری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔“

”آج کل تو ہوتا ہے سر۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”انسان کی عظمت کو ترازو میں نہ تولو۔ انسان تو ہر دور میں انمول رہا ہے۔“

میں اس شعر کے بروقت استعمال پر پھڑک اٹھا تھا۔ ”واہ سارہ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ادبی ذوق بھی رکھتی ہو۔“

”جی ہاں۔ میرے والد اچھے شاعر ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔“

”یہ بہت اچھا ہے۔ تم واقعی ایک قابل قدر لڑکی ہو۔“

”شکریہ سر۔“

ہم بہت دیر تک ریستوران میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

اس شام گھر واپس آیا تو امی ایک بار پھر سوالیہ نشان بنی سامنے کھڑی تھیں۔ وہی ضد کے عظمٰی کو قبول کرلو۔ جعفر چاچا کا پھر پیغام آیا تھا۔

”اوہو امی۔ وہ لوگ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔“ میں نے کہا۔

”بیٹا۔ کیا تم نے یہ سوچ لیا ہے کہ اپنا ارادہ نہیں بدلوگے۔“ امی نے پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے یہ سوچ لیا ہے۔ کیونکہ میں اس سے بہت بہتر کی تلاش میں ہوں۔ اور ہوسکتا ہے کہ مجھے مل ہی جائے (میں نے ابھی ان کو سارہ کے بارے میں اس لیے نہیں بتایا تھا کہ سارہ کی طرف سے کنفرم نہیں ہوا تھا)

”چلو ٹھیک ہے۔“ امی غصے سے بولیں۔ ”میں بھی دیکھتی ہوں تمہاری بہتر کیا ہوتی ہے۔“

عجیب مزاج ہوتا ہے بزرگوں کا۔ اپنی اولاد پر ہر حال میں اپنی مرضی تھوپ دینا چاہتے ہیں۔ اس کے جذبات اور احساسات کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔

دوسرے دن سارہ دفتر نہیں آئی۔ اس کا فون آگیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دفتر میں سب کچھ وہی تھا۔ پہلے جیسا لیکن سارا... دن اس کی کمی محسوس ہوتی رہی۔

ملاقات کو صرف ایک ہی دن ہوا تھا۔ لیکن یہ ایک دن میرے لیے وقت کو روک کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے یہ احساس دلا دیا تھا کہ اس میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ وہ بہت تیزی سے دل میں اتر جانے کا ہنر جانتی ہے۔

دوسرے دن جب وہ دفتر آئی تو میری بے تابی اس سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ ذہین تھی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ میں دفتر میں اس کی غیر موجودگی برداشت نہیں کرپایا ہوں۔

”خیریت تو ہے سر۔“ اس نے پوچھا۔ ”آپ ایک دن میرے نہ آنے سے اتنے پریشان کیوں ہوگئے۔“

”سارہ۔ کیا تم واقعی صرف ایک دن نہیں آئی تھیں۔“ میں نے پوچھا۔

”اوہ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں سمجھ گئی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن انسان کو ہمیشہ سنبھل سنبھل کر چلنا چاہئے۔ تیز رفتاری سے چوٹ بھی لگ سکتی ہے۔“

وہ اپنی میز کی طرف چلی گئی اور میں سوچتا رہ گیا کہ اس نے کتنی گہری بات کہہ دی ہے۔ شام کے وقت جب وہ دفتر آف ہونے کے بعد جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ”سارہ۔ تم نے یہ بالکل ٹھیک کہا تھا کہ تیز رفتاری نقصان پہنچاتی ہے۔ لیکن جب دوڑ لگی ہوئی ہو تو اس وقت تیز رفتاری نہ دکھانے والا نقصان میں رہ جاتا ہے۔“

”بے فکر رہیں سر۔“ وہ مسکرادی۔ ”یہاں ایسی کوئی دوڑ نہیں ہے۔“

کمال کی ذہانت تھی۔ اس نے نہ صرف یہ اندازہ لگالیا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ بلکہ اس نے یہ ظاہر بھی کردیا تھا کہ اس کے لیے ابھی کوئی امیدوار میدان میں نہیں ہے۔

یہ ایک حوصلہ افزا صورتحال تھی۔ میں اس رات اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ میں تو بہت بیچور قسم کا آدمی تھا۔ میرے سامنے تو ابھی ایک شاندار مستقبل تھا۔ اسی لیے خاندان والوں کی مخالفت قبول کرلی تھی عظمٰی کے لیے انکار کیا تھا اور اب دفتر میں کام کرنے والی ایک عام سی لڑکی کے لیے پاگل ہورہا تھا۔ آخر کیوں۔

سیدھا سا جواب تھا کہ سارہ اسی قابل تھی اس کے لیے دنیا والوں سے ٹکر لی جاسکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ بہت کم لڑکیاں اس کے ذہنی معیار تک پہنچ سکتی ہوں گی۔ یا اس جیسی خوش شکل ہوں گی۔

خدا نے اسے بہت سلیقے سے بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔

ایک رات میں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جلدی سے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ ”جی۔ مجھے اشرف صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”میں اشرف ہی بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”عظمٰی“ اس نے بتایا۔ ”آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”اوہ۔ عظمٰی۔“ میں سوچنے لگا۔ بات کروں یا نہ کروں۔ پھر یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس کو سمجھا دیا جائے۔ ”ہاں عظمٰی کہو میں سن رہا ہوں۔“

”کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ میں نے ہوش سنبھالتے ہی آپ ہی کی باتیں سنی ہیں۔ آپ ہی کے

خواب دیکھے ہیں۔"

"یہی تو ہمارے والدین کی غلطی ہے عظمیٰ۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ بڑے ہو کر ہمارے خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ دنیا کو دیکھنے کا انداز کچھ اور ہو جاتا ہے۔"

"آپ کم از کم ایک بار مجھ سے مل تو لیں۔" اس نے کہا۔

"نہیں عظمیٰ۔ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ ہم خواہ مخواہ کی خواہشوں اور امیدوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ تم میرا خیال چھوڑ دو۔"

"ایک بات بتائیں۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔"

"نہیں عظمیٰ۔ بات کسی غلطی کی نہیں ہے۔ میرے تمہارے ذہنی معیار کی ہے۔ معاف کرنا میں گھٹی ہوئی زندگی نہیں گزار سکوں گا۔"

"کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ کسی بھی حال میں مجھے قبول نہیں کریں گے۔"

"نہیں عظمیٰ۔ سوری۔ میں تمہارے معیار سے کچھ اوپر ہو چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے پھر کسی اور کو پسند کرلیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"اب یہ بھی میرا ذاتی معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔" اس نے دوسری طرف سے فون بند کردیا۔

مجھے افسوس تو ہو رہا تھا لیکن میں اپنی جگہ مجبور تھا۔ میں عظمیٰ کو اپنا شریک سفر نہیں بنا سکتا تھا۔ میرے معیار کی تو صرف ایک لڑکی تھی اور وہ تھی سارہ۔

میں بستر پر لیٹا ہی تھا کہ امی کمرے میں آگئیں۔ وہ بہت ناراض معلوم ہو رہی تھیں۔ "تم نے پھر عظمیٰ کے لیے انکار کردیا۔" انہوں نے پوچھا۔

"امی۔ آپ کو کیسے معلوم۔"

"اس کا فون آیا تھا۔ اس نے تم سے فون پر بات کی ہوگی۔ اس کا مشورہ میں نے ہی اس کو دیا تھا۔ اس بے چاری نے تم سے باتیں بھی کیں اور تم اپنی رٹ لگاتے رہے۔"

"امی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ لوگ خاموش کیوں نہیں ہو جاتے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تو خاموش ہو ہی گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تم نے کسی اور کو دیکھ رکھا ہے۔ اسی لیے عظمیٰ کا نام بھی سننا نہیں چاہتے۔"

"ہاں امی۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔"

"اوہ۔" امی جاتے جاتے رک گئیں۔ "کون ہے وہ۔"

"وہ میرے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتی ہے۔" میں نے بتایا۔ "سارہ نام ہے اس کا۔"

"ٹھیک ہے لے آنا اس سارہ کو۔ جس کی وجہ سے تیرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں وہ کتنے پانی میں ہے۔"

"اس طرح نہیں امی۔" میں جلدی سے بولا۔ "اگر آپ یہ سوچ رہی ہوں کہ اس کو بلا کر اس کی بے عزتی کریں یا اسے برا بھلا کہیں تو پھر میں اسے نہیں بلاؤں گا۔"

"اچھا اچھا۔ لے آنا اس کو۔" امی بولتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

امی کی طرف سے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ڈیڈی کو بھی راضی کرلیں گی۔ یہ تو اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ سارہ سے کوئی غیر مناسب برتاؤ نہیں کریں گی۔ ویسے بھی میں امی کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ایسی نہیں تھیں۔ وہ رات میں نے بہت بے چینی میں گزاری تھی۔ نیند آئی تو سارہ کے حوالے سے خوبصورت خواب دیکھتا رہا۔ دوسری صبح دفتر میں جب سارہ اپنی سیٹ پر بیٹھی کام کر رہی تھی تو میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ "سارہ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ شام کو میرے ساتھ چلنا۔ میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کردوں گا۔"

"خیریت تو ہے۔ کہاں لے جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے گھر۔" میں نے بتایا۔

"کیا؟ آپ کے گھر؟" وہ حیران رہ گئی تھی۔ "خیریت!"

"میرے گھر والے تم سے ملنا اور تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اشرف

زندہ قوم، پائندہ شہید

18 جنوری 1949ء ڈھوک پیر بخش (راولپنڈی) میں پیدا ہوئے (اب یہ گاؤں ڈھوک محمد حسین جنجوعہ کے نام سے موسوم ہے۔ 3 ستمبر 1966ء میں فوج میں شمولیت اختیار کی۔ ڈرائیوری کی تربیت حاصل کی، جب 1971ء کی جنگ چھڑی، اس وقت وہ 20 لانسرز کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ وہ اگرچہ ڈرائیور تھے مگر انہوں نے اپنے یونٹ کے ہر معرکے میں غیر معمولی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ کتنا ہی سنگین مرحلہ کیوں نہ ہو، کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر وہ کوئی نہ کوئی مشین گن سنبھال لیتے اور دشمن پر آگ برسانے لگتے تھے۔ 25 دسمبر 1971ء کو ظفروال، شکر گڑھ کے محاذ پر دشمن کے ٹینکوں اور پیادہ فوج کی طرف سے شدید اور براہ راست گولا باری کی پروا کیے بغیر وہ ایک خندق میں جا کر اپنے جوانوں کو گولا بارود پہنچانے کا کام انجام دینے لگے۔ لڑاکا گشتی دستوں کی پرخطر مہمات میں ان کے ہمراہ ہو جاتے۔ 10 ستمبر کو انہوں نے جب دشمن کو "مہر و خورد" گاؤں میں اپنی بارودی سرنگوں کے قریب مورچے کھودتے دیکھا تو انہوں نے فوراً یونٹ کے نائب کمانڈر کو اطلاع دی اور پھر وہ خود اپنے طور پر یکے بعد دیگرے اپنے ایک ایک ٹینک شکن توپ کے پاس پہنچتے توپوں کا رخ درست کراتے رہے، جس کے نتیجے میں دشمن کے سولہ ٹینک تباہ ہوگئے۔ 10 ستمبر کی سہ پہر چار بجے جب سوار محمد حسین اپنے ایک "ری کائل لیس رائفل" بردار کو دشمن کے ٹھکانے دکھا رہے تھے کہ ایک ٹینک سے مشین گن کی گولیوں کی ایک بوچھاڑ نے ان کی چھاتی چھلنی کردی اور وہ میدان جنگ میں شہید ہوگئے۔ انہوں نے نشان حیدر پانے والے پہلے جوان کا امتیاز حاصل کیا ہے۔ آپ کو 17 جنوری 1972ء کو نشان حیدر کا اعزاز نصیب ہوا۔

صاحب۔ میں نے کہا تھا نا کہ تیز رفتاری اچھی چیز نہیں ہے۔"

"یہ تیز رفتاری نہیں ہے۔ بہت سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میری زندگی کے لیے ناگزیر ہو گئی ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر آپ کے یہاں کیسے جا سکتی ہوں۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ آج ہی سارے مرحلے طے نہیں ہو رہے۔ بلکہ میری امی تم کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"اشرف صاحب۔ وہاں کوئی بدمزگی تو نہیں ہوگی نا؟" اس نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ کس بات کی بدمزگی۔ میں نے سب سیٹ کرلیا ہے۔" میں نے کہا۔ "بس تم تیار رہنا۔"

"میں اس طرح دفتر کے کپڑوں میں کیسے چلی جاؤں۔"

"ارے سب ٹھیک ہے۔ تمہاری ڈریسنگ بالکل مناسب ہے۔"

"چلیں۔ جو آپ کی مرضی۔"

میں نے اپنے کمرے میں آکر ان کو فون کر کے سارہ کے بارے میں بتایا تو انہوں نے پھر وہی بات کی۔ "بیٹے۔ میں یہ چاہتی تھی کہ تم ایک نظر عظمیٰ کو دیکھ لیتے۔"

"اب کیا فائدہ امی۔" میں نے کہا۔ "میں نے تو کبھی اس کی تصویر بھی نہیں دیکھی۔ ایک عرصے پہلے اسے دیکھا تھا۔ پھر میں باہر چلا گیا۔ جب سے واپس آیا ہوں تو صرف جعفر چاچا ملنے کے لیے آئے تھے۔ عظمیٰ نہیں آئی تھی۔ پھر میں کیسے جان لیتا کہ وہ اچھی ہوگی۔"

"بیٹا۔ وہ شروع ہی سے بہت شرمیلی ہے۔ وہ تصویر وغیرہ نہیں کھنچواتی ہے۔"

"بس امی تو بات ختم کریں۔ میں اَن دیکھے کا سودا نہیں کرسکتا اور سارہ کو تو میں روز دیکھتا ہوں۔ وہ میری نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب اور کیا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا تو لے آؤ اس کو۔"

میں نے یہ خبر بھی سارہ کو سنا کر ذہنی طور پر اسے تیار کرلیا تھا۔ شام ہوئی تو اس نے واش روم جا کر ہلکا ہلکا میک اپ کرلیا۔ اس سادے سے ٹریٹمنٹ میں بھی وہ بہت

خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

جب میں اسے اپنے ساتھ لے کر چلا تو اس نے راستے میں ایک عجب بات کی۔ ”اشرف صاحب۔ ہوسکتا ہے کہ دوبارہ آج کے بعد اس طرح نہ مل سکیں۔“

”پھر وہی بات۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”کیوں پریشان ہورہی ہو۔ میں نے بتایا نا کہ سارے حالات قابو میں ہیں۔ تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوگا۔“

گھر پہنچا۔ ہم گاڑی سے اتر آئے۔ امی اور ڈیڈی سامنے ہی ایسے انداز سے کھڑے ہوئے تھے۔ جیسے سارہ کے استقبال کے لیے کھڑے ہوں۔

پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ ایسی بات جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ سارہ دوڑ کر امی سے لپٹ گئی تھی۔

پھر ابو نے اسے سینے سے لگالیا تھا۔ میں حیران ہوکر یہ سب دیکھ رہا تھا۔

”کیا آپ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”بے وقوف۔“ ڈیڈی نے کہا۔ ”جانتا کیا معنی۔ یہ بیٹی ہے میری۔ عظمیٰ۔ میرے بھائی کی بیٹی۔ میرا خون۔“

”نہیں ابو۔ یہ سارہ ہے۔“

”تایا ٹھیک کہہ رہے ہیں اشرف صاحب۔ میں ہی عظمیٰ ہوں۔“ سارہ نے کہا۔

”یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔“

”عظمیٰ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ امی نے کہا۔ ”اس لڑکی نے تم کو یہ دکھادیا ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں گنوار اور دقیانوسی نہیں ہوتیں۔ وہ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتی ہیں۔“

”میرے خدا۔ کیا ہے یہ سب۔“ میں چکرانے لگا تھا۔

”میرا ایک دوست ہے شاہ عالم۔ میں نے عظمیٰ کو جعفر کے گھر سے بلا کر شاہ عالم کے گھر رکھا تھا تاکہ تم پوری طرح اس کو سارہ سمجھ سکو۔“

”تو کیا آپ بھی۔“ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جارہا تھا۔

”ہاں۔ ہم سب اس پلاننگ میں شریک تھے۔“ ڈیڈی نے بتایا۔ ”اور تم نے دیکھ ہی لیا کہ عظمیٰ کتنی ٹیلنٹڈ ہے۔ اس نے کس خوبی سے سارہ کا کردار ادا کیا۔“

”اور وہ جو فون آیا تھا۔ وہ آواز تو کسی اور کی تھی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں وہ فون میں نے اپنی سہیلی سے کروایا تھا۔ تاکہ آپ مجھ پر شک نہ کرسکیں۔“ عظمیٰ یا سارہ نے بتایا۔

”اب بتاؤ۔ اب تم کیا کہتے ہو۔“ امی نے پوچھا۔

”امی۔ میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا تھا کہ میں ایک ہیرے کو نظرانداز کررہا ہوں۔“

”تو پھر اب تمہارا کیا فیصلہ ہے۔“ ڈیڈی نے پوچھا۔

”ظاہر ہے ابھی میرا کیا فیصلہ ہوسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے تو سارے راستے یہیں آکر بند ہوگئے ہیں۔“

”لیکن اب میرا فیصلہ کچھ اور ہے۔“ عظمیٰ اچانک بول پڑی۔ ”اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ میں اشرف سے شادی نہیں کرسکتی۔“

”کیا۔“ ڈیڈی اور امی حیران ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

”ہاں۔ آپ دونوں مجھے معاف کردیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ دونوں کو بھی میرا یہ فیصلہ پسند آئے گا۔ آپ اس وقت یہ بھول جائیں کہ اس وقت آپ کا بیٹا اور آپ کی بھتیجی آپ کے سامنے ہیں۔ آپ یہ سوچیں کہ اگر میری جگہ واقعی گاؤں کی کوئی سیدھی سادی لڑکی ہوتی تو اس کا کیا مستقبل ہوتا۔ اشرف نے خاندان نہیں دیکھا۔ بچپن کے رشتے کی پروا نہیں کی۔ انہیں پاکستانی لڑکیاں غیر مہذب دکھائی دیں۔ لیکن پھر سارہ کی خوبصورتی اور ذہانت نے ان کو متاثر کرلیا۔ یہ سارہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ سارہ کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ زندہ حقیقت عظمیٰ کی ہے اور عظمیٰ انہیں قبول نہیں ہے۔ اس لیے عظمیٰ ہی اس رشتے سے انکار کررہی ہے۔“

میں اپنے آپ کو اس کے سامنے بہت چھوٹا محسوس کرنے لگا تھا۔

میں اس سے سوری بھی نہیں کہہ سکتا تھا اور وہ چلی گئی اور میں شرمندگی کی آگ میں جلتا رہ گیا اور آج تک جل رہا ہوں۔

عظمیٰ نے ایک اور نوجوان سے شادی کرلی ہے۔ وہ نوجوان اسے سارہ کے طور پر نہیں، صرف عظمیٰ کے طور پر جانتا ہے اور اس نے عظمیٰ کو دیکھے بغیر قبول کرلیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ان دیکھے کا یہ سودا اس کے لیے کتنا مفید رہا ہوگا۔

ناقابلِ تلافی

محترم مدیر سرگزشت

السلام علیکم!

ایک محیّرالعقول واقعہ جسے عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا اسے میں نے کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ امید ہے یہ واقعہ آپ کو بھی پسند آئے گا۔ گوکہ یقین بہت کم لوگ کریں گے کیونکہ ایسے واقعات عام نظروں سے گزرتے نہیں ہیں۔ یہ واقعہ کوئی مجھے سناتا تو شاید میں بھی یقین نہ کرتی لیکن اس واقعہ کی گواہ میں خود بھی ہوں۔

امیمہ سلیم
(کراچی)

ہوٹل کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آج پروفیسر وارز اپنے وہ شعبدے دکھانے والا تھا جو وہ صرف خاص خاص موقعوں ہی پر دکھایا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے آج کے شو کا ٹکٹ بھی زیادہ بکا تھا!

کاشی نے اس شو کے لیے دو روز قبل ہی اپنی سیٹ محفوظ کرالی تھی۔ اسے شروع ہی سے اس قسم کے شعبدوں سے دلچسپی تھی۔

پروفیسر نے پہلے تو حسبِ معمول وہی شعبدے

دکھائے جو عموماً ہر شعبدے باز دکھاتا ہے۔ یعنی ٹوپی سے خرگوش برآمد کرنا، سادے کاغذوں کو کرنسی نوٹوں میں تبدیل کرنا اور کلائی کی گھڑی کو توڑ پھوڑ کر ڈبل روٹی میں سے صحیح سالم نکالنا۔

جب لوگ ان شعبدوں سے اکتانے لگے تو اس نے اپنے مخصوص شعبدوں کا آغاز کیا۔ اس نے خوبصورت سی ایک لڑکی کو اسٹیج پر بلایا۔ اس لڑکی نے انتہائی چست اور چمکدار لباس پہن رکھا تھا۔ لباس اتنا چست تھا کہ اس کے جسمانی خطوط نمایاں تھے۔

پروفیسر نے مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اپنے استعمال کی اشیا میں سے سیدھے پھل والی ایک تلوار نکال کر اسٹیج کے فرش پر پیوست کردی۔ پھر اس نے مزید دو خوبصورت لڑکیوں کو اسٹیج پر بلایا۔ وہ دونوں بھی انتہائی چست لباس میں تھیں۔ پروفیسر کے اشارے پر ان میں سے ایک نے پہلے آنے والی حسینہ کے ہاتھ پکڑے اور دوسری نے پاؤں۔ پروفیسر نے بھی اس حسینہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیا اور اسے اسٹیج پر پیوست تلوار کی بلندی تک لے گیا۔ پھر اس نے بہت آہستگی سے لڑکی کی کمر تلوار کے دستے پر ٹکادی۔ وہ چند لمحے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا، پھر اس نے دونوں لڑکیوں کو اس حسینہ کے ہاتھ پاؤں چھوڑنے کا اشارہ کیا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ تلوار کے دستے پر کمر کے بل لیٹی ہوئی حسینہ یوں نظر آرہی تھی جیسے وہ کسی آرام دہ بیڈ پر لیٹی ہو۔

کاشی ٹکٹکی باندھے اس منظر کو دیکھ رہا تھا اور ایک کاشی ہی کیا، ہر شخص اس منظر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر چند قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے مجمع پر پھر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور لڑکی کو نظر جما کر دیکھنے لگا۔ اس موقع پر آرکسٹرا بھی انتہائی دھیمی آواز میں بجنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد لڑکی کا جسم خود بہ خود یوں اوپر اٹھنے لگا جیسے رسی سے اوپر کھینچا جارہا ہو۔ اس کا جسم پروفیسر کی نظروں کے ساتھ ساتھ حرکت کررہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی کا جسم تلوار کے دستے سے کئی فٹ اوپر اٹھ گیا لیکن جسم میں اب بھی وہی تناؤ تھا جیسے وہ کسی نادیدہ تختے پر لیٹی ہو۔ وہ مسلسل اوپر کی طرف اٹھ رہی تھی۔ آرکسٹرا کی دھن بھی اس کے ساتھ ہی بلند ہوتی جارہی تھی۔

پروفیسر کی پوری توجہ لڑکی پر تھی۔ مجمع میں سے کچھ لوگوں نے تالیاں بجانے کی کوشش کی لیکن پروفیسر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

لڑکی اسٹیج سے تقریباً چھ سات فٹ کی بلندی پر پہنچ کر رک گئی۔

پروفیسر اب بھی اسے پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی نظروں سے نیچے کی طرف خفیف سا اشارہ کیا۔ لڑکی گویا سلوموشن میں بلندی سے نیچے کی طرف آنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس ایک سو دس پونڈ کی وزنی لڑکی کا وجود بے وزن ہوگیا ہو اور وہ کسی غبارے کی طرح ہلکی پھلکی ہوگئی ہو۔

تلوار کے دستے سے تقریباً چھ انچ کے فاصلے پر آکر وہ رک گئی۔ پروفیسر کی پیشانی کی نسیں ابھر آئیں اور سردی کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی نظروں میں اب وہ تاثیر نہیں رہی کہ وہ لڑکی کے جسم کو مزید نیچے لاتا۔ ارتکاز کے باعث اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔

اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”کوئی میرے اس عمل میں خلل اندازی کررہا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، اپنی اس حرکت سے باز آجائے ورنہ میرا نام بھی پروفیسر وارنر ہے۔ میں اسے دو منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس دخل دینے والے فرد نے اس کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔“

ابھی دو سرا منٹ گزرا بھی نہیں تھا کہ لڑکی کا جسم بہت آہستگی سے نیچے آنے لگا۔

پروفیسر کا یہ ڈراما بھی اصل میں اس کے شعبدے ہی کا حصہ تھا ورنہ مجمع میں موجود شخص کو بھلا اس کے عمل میں دخل اندازی کرنے کی جرأت ہی کیوں ہوتی؟

لڑکی کا جسم آہستہ آہستہ نیچے آیا اور اس کی کمر ایک مرتبہ پھر تلوار کے دستے پر ٹک گئی۔ اس کا جسم اب بھی تیر کی طرح تنا ہوا تھا۔

پروفیسر نے جیب سے رومال نکال کر چہرے سے پسینا خشک کیا اور مجمع کی طرف نظر ڈالی۔ پورا مجمع دم سادھے پروفیسر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

لڑکی اچانک اچھلی اور فرش پر کھڑی ہوگئی۔ پھر اس نے حاضرین کو جھک کر سلام کیا تو ایک مرتبہ پھر تالیوں کا طوفان برپا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اسٹیج کا پردہ گر گیا۔

لوگ دم بہ خود... پردے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اس مرتبہ پردہ ہٹنے پر کیا دیکھنے کو ملے گا؟

پردہ ایک مرتبہ پھر آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔

پھر اسٹیج سے پروفیسر نمودار ہوا۔ اس مرتبہ اس نے لباس تبدیل کرلیا تھا اور وہ قدیم رومی سپاہیوں کے لباس میں تھا۔ اس کے سامنے لکڑی کا تابوت نما بکس رکھا تھا۔ اس کا ڈھکن منقش تھا۔

”اب میں ایک اور بہترین کرتب دکھاؤں گا۔“ پروفیسر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”کمزور دل حضرات سے گزارش ہے وہ یہ کرتب نہ دیکھیں۔“

مجمع دم بہ خود بیٹھا پروفیسر کو دیکھ رہا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے بھی وہاں سے جانے کی کوشش نہیں کی۔

اچانک پروفیسر نے کچھ ایسے انداز میں کنپٹی کھجاتے ہوئے خود میں انگلی داخل کرکے کھجائی جیسے سر میں کھجلی محسوس ہوئی ہو پھر اس نے سر پر پہنا ہوا رومن فوجیوں والا خود اتارا۔ اسے اچھی طرح جھاڑا پھر دوبارہ پہن لیا۔ دوسرے ہی لمحے پھر ویسا ہی کیا جیسے اس کے سر میں کھجلی ہوئی ہو۔ اس نے دوبارہ سر سے خود اتارا تو اس میں سے ایک خرگوش اچھل کر فرش پر آگیا۔ حاضرین اس حرکت پہ قہقہے لگانے لگے۔

پروفیسر نے سنجیدہ ہوکر کہا۔ ”اگر حاضرین میں سے کوئی چاہے تو وہ بھی اس کرتب میں حصہ لے سکتا ہے۔“

”وہ کرتب ہے کیا پروفیسر؟“ کاشی نے پوچھا۔

”بہت مشکل بھی ہے اور انتہائی آسان بھی!“ پروفیسر نے ہنس کر کہا۔ ”یہ صندوق دیکھ رہے ہیں آپ؟ آپ میں سے کوئی چاہے تو اس صندوق میں لیٹ سکتا ہے۔ میں صندوق بند کرنے کے بعد اسے اپنی تلوار سے ایسی جگہ سے کاٹوں گا کہ لیٹنے والے کا سر تن سے جدا ہوجائے گا۔ گھبرایئے مت، وہ محض ایک شعبدہ ہوگا۔ چند منٹ بعد وہی شخص اس صندوق سے صحیح سلامت برآمد ہوگا۔ اگر آپ میں سے کوئی اس کرتب میں حصہ لینا چاہے تو اسٹیج پر آجائے۔“

کاشی نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے صاحب نے اسے روک دیا۔

”افسوس کا مقام ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”سیکڑوں کے اس مجمع میں کوئی بھی اتنا جی دار نہیں ہے کہ میری آفر کو قبول کرسکے۔ ٹھیک ہے، میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ یہ کام میری ایک شاگردہ انجلی کرے گی۔“

دوسرے ہی لمحے اسٹیج پر وہی دوشیزہ نمودار ہوئی جو اس سے پہلے تلوار کے دستے پر اپنے جسم کا توازن برقرار رکھ چکی تھی۔ اس وقت بھی اس کے جسم پر وہی چست اور اشتعال انگیز لباس تھا۔

پروفیسر نے صندوق کا ڈھکن کھول دیا۔ انجلی نے مسکرا کر مجمع کو دیکھا اور بے خوفی سے اس صندوق میں لیٹ گئی۔ پروفیسر نے ڈھکن دوبارہ بند کردیا۔ ڈھکن کے اوپر یکساں وقفے سے تین بہت خفیف سی درازیں تھیں۔ ایسی درازیں جن میں تلوار یا اس قسم کے کسی دوسرے ہتھیار کا پھل داخل ہوسکتا تھا۔ ایک دراز عین اس جگہ پر تھی جہاں انجلی کی گردن ہونا چاہیے تھی۔ دوسری دراز اس کے پیٹ کے مقام پر تھی۔ تیسری دراز گھٹنوں یا اس سے کچھ نیچے تھی۔

پروفیسر نے چوڑے لیکن انتہائی تیز دھار پھل کی تلوار اٹھائی، اسے ہوا میں لہرایا اور بولا۔ ”میری درخواست ہے کہ اگر حاضرین میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس کرتب کے دوران بھی دخل اندازی کرسکتا ہے تو پلیز اس موقع پر نہ کرے۔ یہ انتہائی سنگین نوعیت کا کرتب ہے اور ذرا سی بھی دخل اندازی اس خوبصورت اور نوجوان لڑکی کی جان لے سکتی ہے۔“

اس نے تلوار ہوا میں لہرائی اور اسے اس دراز پر رکھ دیا جو انجلی کی گردن پر تھی۔ پھر تلوار ایک جھٹکے سے نیچے گئی۔ پروفیسر نے تلوار کو یوں جنبش دی جیسے وہ کسی کو ذبح کررہا ہو۔

دوسرے ہی لمحے فرش پر تازہ تازہ خون بہنے لگا۔ جسے پروفیسر کا ایک آدمی کپڑے سے صاف کرنے لگا۔

پروفیسر نے صندوق کا دروازہ کھولا اور بولا۔ ”انجلی کا سر تن سے جدا ہوچکا ہے۔ میں جانتا ہوں، آپ میں سے کچھ لوگوں کو میری بات پہ یقین نہیں آیا۔“

اس نے صندوق میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں انجلی کا کٹا ہوا سر تھا۔ پروفیسر نے اسے بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور اس کی گردن سے اب بھی خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ حاضرین میں موجود بہت سے کمزور دل حضرات کی چیخیں نکل گئیں۔

”پروفیسر! اسے واپس رکھ دو اور اس خوبصورت لڑکی کو زندہ کردو۔“ ایک خاتون ہذیانی انداز میں بولی۔

”خاتون ٹھیک کہہ رہی ہیں پروفیسر!“ کاشی نے کہا۔ ”ہم یہاں لطف اندوز ہونے آئے ہیں، دہشت زدہ ہونے نہیں۔“

پروفیسر نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ مجمع پر ڈالی اور انجلی کا سر دوبارہ صندوق میں رکھ کر اس کا ڈھکن بند کردیا۔

پھر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا اور ایک گلاس میں پانی لے کر اس کے چھینٹے صندوق پر مارتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گھڑی بھی دیکھتا جارہا تھا۔

حاضرین کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔

چند لمحوں بعد اس نے ڈھکن بند کردیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ یہ تمام اداکاری اس شو کا حصہ تھی۔

پھر اس نے اطمینان بھرا طویل سانس لیا، رومال سے چہرے کا پسینا خشک کیا، ایک خالی گلاس اٹھایا اور اسے منہ سے لگالیا۔ دوسرے ہی لمحے حاضرین کو اس گلاس میں پانی نظر آیا جو لمحہ بہ لمحہ پروفیسر کے حلق سے اتر رہا تھا۔ پھر وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ”انجلی! اب سامنے آجاؤ۔“

انجلی سامنے والے دروازے سے حاضرین کو گویا چیرتی ہوئی اسٹیج کی طرف بڑھی۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے لگائے اور کئی ایک نے تو انجلی کو چھونا بھی چاہا لیکن وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر قلابازی کھا کر اسٹیج پر پہنچ گئی۔

”حاضرین!“ پروفیسر نے کہا۔ ”اس کرتب کے بعد اب مجھ میں بالکل سکت نہیں ہے کہ میں مزید کرتب دکھاسکوں۔ اس کرتب کا عمل بہت جان لیوا اور تھکا دینے والا ہے۔ البتہ میرا اسسٹنٹ بھی آپ کو ایسے کرتب دکھائے گا جو آپ نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔“ اس نے رومن فوجیوں والا خود سر سے اتار کر حاضرین کو جھک کر سلام کیا تو پھر ایک خرگوش اچھل کر اس کے خود میں سے باہر نکل آیا۔

حاضرین نے زوردار تالیاں بجائیں اور ہال کافی دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر کے قدموں کے قریب سے دھوئیں کا ایک مرغولہ اٹھا اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے پروفیسر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چند لمحوں بعد وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ لوگوں نے ایک مرتبہ پھر زوردار تالیاں بجائیں اور پردہ آہستہ آہستہ گرگیا۔

کاشی کو اس کے اسسٹنٹ کے شعبدوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے شروع ہی سے اس قسم کے کرتب سیکھنے کا شوق تھا اور وہ اس سلسلے میں اب تک کئی شعبدہ بازوں سے مل چکا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے رقم تو خوب بٹوری لیکن اسے کچھ بھی سکھا کر نہ دیا۔ البتہ کچھ شعبدہ بازوں نے تاش کے معمولی کمالات سکھا دیے۔ ایسے کمالات تو عموماً ان لوگوں کو بھی آتے ہیں جو تاش کے کھیل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

ایک دفعہ تو اس کی جان پر بن گئی تھی۔ ان کے قصبے میں ایک شعبدہ باز آیا تھا۔ قصبے کے لوگوں نے حسبِ معمول اس کے کمالات دیکھے۔ کاشی اس شعبدے باز سے کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر وہ یہ سیکھنا چاہتا تھا کہ وہ شعبدہ باز منہ سے لوہے کے بڑے بڑے گولے کیسے نکالتا ہے۔

وہ ہر شو کے بعد شعبدہ باز کے پیچھے پڑ جاتا کہ مجھے بھی یہ کمال سکھادو۔ میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔

شعبدہ باز پہلے تو راضی نہ ہوا لیکن جب کاشی نے اسے دس ہزار روپے کی خطیر رقم کی پیشکش کی تو وہ راضی ہوگیا۔ اس دور کے لحاظ سے دس ہزار واقعی بہت خطیر رقم ہوتی تھی۔ اس نے یہ شرط بھی عائد کردی کہ میں جس قصبے یا شہر میں جاؤں گا کاشی بھی ساتھ ہوگا۔

کاشی اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور انتہائی لاڈلا بھی۔ اس نے مارے باندھے ایف اے تو کرلیا تھا لیکن اس کے بعد کالج میں داخلہ لے کر بھول گیا تھا۔ وہ مہینے میں دو تین مرتبہ ہی کالج کا چکر لگاتا تھا۔

کاشی کے ماں باپ نے اس کی ضد کے آگے مجبور ہو کر اسے شعبدہ باز کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ شعبدہ باز کا نام نصیر الدین تھا اور وہ گاؤں گاؤں پھر کے اپنے کرتب دکھایا کرتا تھا۔ شعبدہ باز کے ساتھ ساتھ نصیر الدین بہت اچھا جمناسٹ بھی تھا۔

کاشی نے سب سے پہلے اپنے پسندیدہ کرتب یعنی لوہے کے گولے منہ سے نکالنے پر زور دیا۔

شعبدہ باز نے اسے مخصوص قسم کے گولے دیے اور اسے بتایا کہ کس انداز میں صرف ایک گولے کو منہ میں رکھنا ہے۔ بقیہ تین گولے تمہاری مخصوص شرٹ کی ڈھیلی ڈھالی آستین میں رہیں گے۔ آستین والے گولوں میں سے ایک گولا مٹھی میں اس انداز سے پکڑنا ـــــ کہ دیکھنے والوں کو بالکل نظر نہ آئے پھر اسے منہ کے پاس لے جا کر یہ ظاہر کرنا ہے کہ تم نے یہ گولا نکالا ہے، بقیہ دو گولوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کرنا۔ البتہ آخری گولا جو واقعی منہ میں ہے اسے مخصوص طریقے سے باہر نکالنا ہے۔

اب وہ گولا نسبتاً چھوٹا تھا یا پھر شعبدہ باز واقعی مخصوص تکنیک کے ذریعے اسے منہ سے نکالتا تھا، کاشی کو کبھی معلوم نہ ہوسکا۔

کچھ عرصے بعد کاشی کو یہ زعم ہوگیا کہ لوہے کے گولے تو وہ اب اپنے طور پر بھی منہ سے نکال سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے لوہے کا ایک گولا منہ میں ڈال لیا۔ وہ یہ بھول گیا کہ اس کا استاد (شعبدے باز) ایک مخصوص گولے کے علاوہ تمام گولوں کو ہاتھ میں رکھتا تھا اور انہیں منہ کے پاس لے جا کر اس صفائی سے نکالنے کا مظاہرہ کرتا تھا کہ دیکھنے والوں کو یہ ... محسوس ہوتا تھا کہ اس نے گولا منہ سے نکالا ہے۔

کاشی نے گولا منہ سے نکالنے کی کوشش کی تو اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ گھر سے دور دوسرے شہر میں تھا۔ استاد بھی اس وقت موجود نہ تھا۔ تکلیف کی شدت سے کاشی کی جان نکلی جارہی تھی۔ اس نے گولا نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جبڑے ٹوٹ جائیں گے یا دونوں گال اندر سے پھٹ جائیں گے۔ ہر کوشش میں اس کے دانتوں میں بھی شدید تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اپنا یہ دکھ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

دو گھنٹے تک اس عذاب میں مبتلا رہنے کے بعد شعبدے باز کا ایک آدمی کسی کام سے کمرے میں آیا تو کاشی کو اس حال میں دیکھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ تکلیف کی شدت سے نڈھال تھا۔ وہ بولنے سے بھی قاصر تھا۔ اس نے اشاروں میں استاد کے بارے میں پوچھا تو اس شخص نے بتایا کہ استاد تو شام تک آئے گا۔ کاشی نے اشاروں میں اس کی خوشامد کی کہ کسی طرح استاد کو اطلاع کردو ورنہ میں مرجاؤں گا۔

کسی نہ کسی طرح استاد کو اطلاع دی گئی۔ اس کے آنے میں مزید دو گھنٹے لگ گئے۔ اس نے پہلے ان گولوں کا جائزہ لیا جنہیں وہ کرتب کے دوران استعمال کرتا تھا، پھر جھنجلا کر بولا۔ ”احمق لڑکے؟ تو نے غلط گولا منہ میں رکھ لیا ہے۔ اب اسے نکالنے میں شدید تکلیف ہوگی۔ وہ تجھے ہر حال میں برداشت کرنا پڑے گی۔“

اس نے اپنے سامان میں سے ایک عجیب و غریب آلہ سا نکالا اسے کاشی کے دانتوں کے درمیان پھنسایا، پھر اس پر لگے ہوئے اسکرو کو آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔ کاشی کا منہ آہستہ آہستہ یوں کھلنے لگا جیسے جیک کے ذریعے گاڑی اوپر اٹھتی ہے۔

جب اس کا منہ ضرورت سے کچھ زیادہ کھلا تو کاشی کے حلق سے کرب انگیز چیخیں بلند ہونے لگیں۔ وہ استاد کو پیچھے دھکیلنے لگا۔

شعبدے باز نے ایک رسی سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے، دونوں ٹانگیں مضبوطی سے باندھیں، پھر اسے ایک کرسی پر باندھ دیا، شعبدے باز نے اس کا سر بھی کرسی کی پشت سے باندھ دیا۔ پھر وہ بہت آہستگی سے اس اسکرو کو کسنے لگا۔

تکلیف کی شدت سے کاشی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے اسے ذبح کیا جارہا ہو۔ اس کے جبڑوں میں اتنی شدید تکلیف تھی کہ لگتا تھا کہ دونوں جبڑے ٹوٹ چکے ہیں۔ کاشی کا پورا جسم پسینے میں تر تھا۔ شعبدے باز نے اسکرو کو دو تین بل اور دیے۔ کاشی پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ شعبدے باز نے اپنے تھیلے سے انتہائی طاقت ور قسم کا ایک مقناطیس نکالا اور اسے کاشی کے منہ کے سامنے لے گیا۔ دوسرے ہی لمحے گولا اچھل کر مقناطیس سے چپک گیا۔ شعبدے باز نے تیزی سے اس کے دانتوں کے درمیان لگے ہوئے ”جیک“ کا اسکرو ڈھیلا کردیا۔ اس دوران میں کاشی تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہوچکا تھا۔

اس واقعے کے بعد ہفتوں کاشی نے صرف دودھ، دلیے اور ڈبل روٹی پر گزارہ کیا اور درد رفع کرنے والی گولیاں کھاتا رہا۔ شعبدے باز روزانہ اس کے جبڑوں پر ایک مخصوص مرہم کا لیپ بھی کرتا تھا تاکہ اس کے جبڑوں کو نقصان نہ پہنچے اور چہرے پہ آیا ہوا ورم بھی کم ہوجائے۔

صحت یاب ہونے کے بعد کاشی نے وہ شعبدہ سیکھ کر ہی دم لیا۔

☆☆☆

پروفیسر کے شو میں بھی اسے صرف ان شعبدوں میں کشش محسوس ہوئی تھی جن میں پروفیسر نے لڑکی کو بظاہر اپنی نظروں کی قوت سے اٹھایا تھا اور پھر اس کا سرتن سے جدا کرنے کے بعد اسے زندہ سلامت دکھایا تھا۔

جب پروفیسر کا اسسٹنٹ شعبدے دکھا رہا تھا تو کاشی اپنی جگہ سے اٹھا اور ہال سے نکل کر اس جگہ پہنچا جہاں پروفیسر کا ڈریسنگ روم تھا۔

دروازے پہ کھڑے ہوئے تنومند اور گھٹے ہوئے سر والے ایک شخص نے اس کا راستہ روک لیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”اوئے، ادھر کہاں جارہا ہے؟“

”تم کون ہو؟“ کاشی نے پوچھا۔

”میں پروفیسر کا گارڈ ہوں۔“ اس نے جواب دیا جیسے وہ صدر امریکا ہو۔

”بھائی، مجھے پروفیسر صاحب سے ملنا ہے۔ میں ان کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔

”پروفیسر صاحب اس وقت بہت تھکے ہوئے ہیں

اور آرام کر رہے ہیں۔'' گارڈ نے ٹکا سا جواب دیا۔

''میں انہیں پریشان نہیں کروں گا، بس ایک منٹ!''

''بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟'' گارڈ نے درشت لہجے اور بلند آواز میں کہا۔

''تمیز سے بات کرو۔'' کاشی بھی بپھر گیا۔ ''میں کوئی لفنگا نہیں ہوں چاہوں تو ابھی کھڑے کھڑے تمہیں بھی خرید سکتا ہوں اور اس ہوٹل کو بھی، سمجھا!''

''اچھا، خرید لینا لیکن اس وقت یہاں سے دفع ہو جا۔'' گارڈ چیخا۔

کاشی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گارڈ کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ بڑے باپ کا بیٹا تھا اور اس قسم کا لہجہ سننے کا عادی نہیں تھا۔

گارڈ بھی آپے سے باہر ہو گیا اور چیخ کر بولا۔ ''تو کیا پاگل ہے؟ میں تجھے ابھی اس پاگل پن کا مزہ چکھاتا ہوں۔'' اس نے آگے بڑھ کر کاشی کا گریبان پکڑ لیا۔

شور شرابے کی آوازیں اندر کمرے میں بھی جا رہی تھیں۔ کاشی نے جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور گارڈ کو دھکا دے کر کمرے میں گھس گیا۔

پروفیسر میز پر نیم دراز تھا اور وہی حسینہ جس کا سر تن سے جدا ہوا تھا وہ پروفیسر کے پیر دبا رہی تھی۔

کاشی کو اندر آتا دیکھ کر پروفیسر اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں آپ کا ایک پرستار ہوں پروفیسر صاحب!'' کاشی نے کہا۔ ''اور آپ سے صرف ملنا اور آٹوگراف لینا چاہتا تھا۔''

اسی وقت گھٹے ہوئے سر کا گارڈ بھی مرکھنے بیل کی طرح اندر داخل ہوا اور بولا ''پروفیسر صاحب! میرے منع کرنے کے باوجود یہ مجھے دھکا دے کر اندر آیا ہے۔ مجھے تو کوئی پاگل لگتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ میں اس ہوٹل کو کھڑے کھڑے خرید سکتا ہوں۔''

''ہوں!'' پروفیسر نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم باہر جاؤ۔''

وہ کاشی کو گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔

''ہاں تو تم یہ ہوٹل خریدنے کی بات کر رہے تھے؟'' پروفیسر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' کاشی نے جواب دیا۔ ''میرا باپ بہت بڑا جاگیردار ہے اور فیصل آباد میں دو کارخانوں کا مالک ہے۔'' کاشی نے فخریہ انداز میں کہا۔

''بیٹھ جاؤ برخوردار۔'' پروفیسر نے اپنے بیڈ کے نزدیک ہی رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام چوہدری کاشف علی ہے لیکن لوگ مجھے کاشی کے نام سے جانتے ہیں۔'' کاشی نے جواب دیا۔

اس دوران وہ حسینہ اس کو توصیفی انداز میں دیکھ رہی تھی۔ وہ نہ صرف بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا بلکہ مردانہ وجاہت کا بھی نمونہ تھا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت، بھورے بال اور بھوری آنکھیں لڑکیوں کو دیوانہ کر دیتی تھیں۔

''تم کرتے کیا ہو؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''بی اے کرنے کے بعد سے فارغ ہوں اور یہی کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو آپ کرتے ہیں۔'' کاشی نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے کچھ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے، میں والدین کا اکلوتا ہوں۔ کچھ عرصے بعد ابا جی مجھے بھی اپنے کاروبار میں جھوک دیں گے۔''

''تم نے کہا تھا کہ تم بھی وہی کچھ کرتے ہو، جو میں کرتا ہوں، کیا تم (Magicion) شعبدہ باز ہو؟''

''جی ہاں، اس قسم کے کرتب تو دکھا لیتا ہوں، جیسے آپ کا اسسٹنٹ دکھا رہا ہے۔''

اچانک ایسا لگا جیسے پروفیسر کے نزدیک سے کسی کتے کے پلے کی آواز آئی ہو۔

پروفیسر چونک کر بولا۔ ''بہت خوب، اور کیا جانتے ہو؟''

کاشی نے پروفیسر کو کئی کرتب دکھائے۔ پروفیسر اور اس کی خدمت گار لڑکی بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''پروفیسر صاحب!'' کاشی نے کہا۔ ''کرتب تو بے شمار ہیں لیکن آپ بھی جانتے ہیں کہ ان کے لیے خصوصی تیاری کرنا پڑتی ہے ورنہ میں آپ کو اس سے بھی کہیں زیادہ اور حیران کن کرتب دکھاتا۔'' پھر وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے ایک درخواست ہے۔''

''کیسی درخواست کاشی میاں؟'' پروفیسر اب اس سے بہت شفقت سے بات کر رہا تھا۔

''میں...... میں...... چاہتا ہوں کہ...... آپ...... مجھے اپنی...... شاگردی میں لے لیں۔''

پروفیسر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر

بات کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ بات سے بات نکالتی گئیں اور بات کو بڑھاتی گئیں۔ کچھ کہنے' سننے' سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع دیے بغیر بے تکان بولتی رہیں۔ غصہ کی شدت' زبان کی تیزی اور بے ربط جملے۔ خدا گواہ ہے جو ایک لفظ ہماری سمجھ میں آیا ہو۔ اور نہ ہی یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس شعلہ زن و شعلہ خو پر کس طرح قابو پائیں۔ آخر ہم نے اپنے اندر کی آگ بجھانے والی صلاحیتوں کو جھنجوڑا۔ چرب زبانی کے پائپ میں عاجزی اور خوشامد کا پانی بھر کر اس کا رخ بیگم کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے بیگم' اب چپ بھی ہو جاؤ۔ اس چیخ و پکار کے سبب آپ کے گلے کی نقرئی گھنٹیوں کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ اور سنا ہے غصے کی زیادتی سے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکن اور خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ بدن میں رعشہ پیدا ہونے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ چہرے کی شادابی اور جوانی کا بانکپن جاتا رہتا ہے۔ ایک غصہ ہزار بیماریوں کو دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا ہم نہیں چاہتے کہ اتنی پیاری اور چہیتی بیوی کے چاند سے چہرے پر اس کم عمری میں بزرگی کے آثار نمایاں ہوں۔ بلڈ پریشر اور دیگر بیماریوں کے سبب آپ کی حسین و جمیل سیاہ زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں گلاب' چنبیلی اور موتیا کے بجائے چاندنی چھٹکنے لگے اور اس کم سنی میں آپ ایک سن رسیدہ خاتون نظر آنے لگیں......''

بس وہ کھٹاک سے چپ ہو گئیں۔

اقتباس: بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے' از۔م۔ش غوری

بولا۔ ''یہ سب تو ہم جیسے لوگوں کے کام ہیں کاشی! تم بڑے باپ کے بیٹے ہو، تمہیں یہ سب زیب نہیں دے گا۔''

''میں محض اپنے شوق کی بنا پر آپ کی شاگردی اختیار کرنا چاہتا ہوں، اسے ذریعۂ معاش بنانے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔''

''دیکھو، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، ہاں تمہارے کروڑ پتی ڈیڈی کو ضرور اعتراض ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے اس شہر ہی سے نکلوا دیں؟''

''آپ ان کی فکر نہ کریں۔'' کاشی نے کہا۔ ''وہ میری کوئی بات کبھی رد نہیں کرتے۔ یہ جو کچھ میں نے سیکھا ہے، ان کی اجازت ہی سے تو سیکھا ہے۔ آپ تو صرف یہ بتایئے کہ آپ کی فیس کیا ہوگی؟''

''ارے، میں اس کی کوئی فیس نہیں لیتا۔ ہاں اگر تم میری مدد ہی کرنا چاہتے ہو تو اعلیٰ طبقے میں میرے کچھ شو کرا دو، میں نے ہمیشہ رزقِ حلال پر قناعت کی ہے۔ وہاں بھی اپنی محنت کی کھاؤں گا۔''

''اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔'' کاشی خوش ہو کر بولا۔ ''سب سے پہلا شو تو آپ میرے گھر میں کریں گے، پھر کم سے کم میں 10 شو کرانے کا وعدہ کرتا ہوں۔''

''ہاں، میری ایک شرط اور ہے۔'' پروفیسر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ان شعبدوں کے ذریعے کبھی بھولے بھالے لوگوں کو بے وقوف بنا کر پیسے مت بٹورنا! اکثر لوگ ان شعبدوں کے ذریعے سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنا کر انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ کسی کی رقم دگنی کر دیتے ہیں، کسی کی کوئی قیمتی چیز غائب کر کے اسے دوبارہ حاضر کرنے کے پیسے لیتے ہیں۔''

''پروفیسر صاحب!'' کاشی نے کہا۔ ''آپ مطمئن ہو جائیں۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس کے باوجود میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان شعبدوں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''کاشی بیٹا!'' پروفیسر نے پہلی دفعہ اسے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا۔ ''یہ تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ جادو نہیں صرف ہاتھ کی صفائی ہے ورنہ ہم بھی کروڑ پتی نہ ہوتے۔ یہ صرف نظر بندی کا کھیل ہے۔ ہاں، اس میں وہ کرتب بہت سنگین ہے جس میں کسی کا سر تن سے جدا کرنا پڑتا ہے لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں' پہلے تو تمہیں آسان کرتب سکھاؤں گا۔'' پھر وہ حسینہ سے مخاطب ہوا۔ ''انجلی! محبوب سے کہو کہ ہمارے کمرے میں بہت بہترین کافی اور کچھ کھانے کو منگا لے۔''

کاشی کو ہنسی آ گئی۔ وہ بولا۔ ''وہ محبوب بھی کسی کا محبوب ہو سکتا ہے؟''

''بھئی، نام تو کالے کلوٹے بچے کا بھی گلفام ہوتا

ہے۔ ماں باپ کے لیے تو وہ گلفام یا محبوب ہی ہوتا ہے۔“

انجلی اٹھلاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت اس کے جسم پر چست لباس کی بجائے ڈھیلی ڈھالی باریک کپڑے کی نائٹی تھی۔

”ایک بات اور۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”تم میرے ہر شو میں موجود رہو گے اور اس کے بعد کم سے کم چار گھنٹے میرے ساتھ گزارو گے۔ کچھ سیکھنے کے لیے تمہیں اتنا وقت تو دینا ہی پڑے گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ کاشی نے جیب سے غیر ملکی برانڈ کی انتہائی بیش قیمت سگریٹ نکالی اور اس سے بھی زیادہ بیش قیمت لائٹر نکال کر سگریٹ ہونٹوں میں دبالی۔

پروفیسر نے سگریٹ اس کے ہونٹوں سے گھسیٹ لی اور بولا۔ ”مجھے سگریٹ کے دھوئیں سے الرجی ہے! اس لیے میں نے یہاں کی انتظامیہ پر بھی یہ شرط عائد کر دی ہے کہ میرے شو کے دوران ہال میں کوئی سگریٹ نہیں پیے گا۔ اگر ایسا ہوا تو مجھ سے کام نہیں ہوگا اور میں شو ادھورا چھوڑ دوں گا۔“ یہاں کی انتظامیہ اور گارڈ اتنے سخت ہیں کہ ہال میں داخل ہونے سے پہلے وہ لوگوں سے سگریٹ کے پیکٹ باہر ہی لے لیتے ہیں۔ لوگوں کو بھی معلوم ہے اس لیے وہ زیادہ حجت نہیں کرتے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ کاشی نے کہا ”گارڈز نے میری سگریٹ بھی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ہال سے نکل کر میں نے دوبارہ اپنا پیکٹ ان سے لے لیا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا پیکٹ اور لائٹر جیب میں رکھ لیے۔

☆☆☆

پھر کاشی نے پروفیسر کے خصوصی شعبدے سیکھنے میں دن رات ایک کر دیے۔ پروفیسر بھی اس سے بہت خوش تھا کہ وہ اس کے اسسٹنٹ سے کہیں اچھے اور حیرت انگیز کرتب دکھانے لگا۔ تین مہینے کے اندر اندر پروفیسر نے کاشی کو اپنے وہ دونوں مخصوص کرتب بھی سکھا دیے یعنی لڑکی کو نظروں کے زور پر اٹھانا اور سر تن سے جدا کرنا۔

مزید تین ماہ گزرنے کے بعد پروفیسر نے اسے کامیاب قرار دے دیا بلکہ اسے اپنے طور پر کرتب دکھانے کی اجازت بھی دے دی۔

کاشی نے حسبِ وعدہ پروفیسر کے دس شو بھی کرا دیے۔

پروفیسر جب لاہور سے رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک مرتبہ پھر کاشی کو نصیحت کی کہ میں نے تمہیں جو کچھ سکھایا ہے وہ تفریحِ طبع کے لیے ہے۔ اسے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال مت کرنا۔

پھر پروفیسر یہاں سے رخصت ہو گیا۔ کئی برس گزر گئے۔ کاشی بھی اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے عموماً گھریلو تقریبات میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ لاہور کے ایک دو بڑے ہوٹلوں نے اس سے معاہدہ کرنا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ البتہ ان لوگوں کے اصرار پر اس نے دو چار شو ضرور کر دیے لیکن شرط یہ رکھی کہ ان شوز کی تمام آمدنی کسی رفاہی ادارے کو جائے گی۔

☆☆☆

ایک مرتبہ کام کے سلسلے میں کاشی کا دبئی جانا ہوا۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں اسے ایک طرح دار حسینہ دکھائی دی جو اسے بہت پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کاشی ایسی نظروں کا عادی ہو چکا تھا اس لیے اس نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

اچانک اس حسینہ نے کاشی کو مخاطب کیا۔ ”سنیے!“

کاشی نے پہلی مرتبہ بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر انتہائی چست اور مختصر کپڑے تھے جو دیکھنے والوں کو خوامخواہ اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ اس کی سنہری زلفیں شانوں پہ بکھری ہوئی تھیں۔

کاشی کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ پروفیسر کی اسسٹنٹ انجلی ہے۔ اس نے بہت گرم جوشی سے کہا۔ ”انجلی تم! تم یہاں کیسے؟“

”میں تو در در کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی یہاں پہنچی ہوں کاشی صاحب! میں ایک شیخ کی ملازمت کے لیے یہاں آئی تھی۔ وہ مجھے انتہائی قلیل معاوضہ دیتا ہے اور......“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

”انجلی! چلو سامنے والے ریسٹورنٹ میں چل کر بات کرتے ہیں۔ یہاں تماشا مت بنو۔“

”تماشا تو مجھے وقت نے بنا دیا ہے کاشی صاحب!“ انجلی نے افسردگی سے کہا۔

وہ سامنے والے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ انجلی نے بتایا کہ گزشتہ سال پروفیسر صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے بعد سے وہ دربدر ہے۔ اس نے ایک اور حیران کن انکشاف کیا کہ وہ پروفیسر صاحب کی بیٹی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد پروفیسر صاحب کے اسسٹنٹ کے ساتھ انجلی نے کچھ عرصہ کام کیا لیکن اس کی نیت خراب تھی۔ وہ انجلی کو اپنانا

چاہتا تھا۔ انجلی کو شروع ہی سے اس کی صورت زہر لگتی تھی۔

”میرے انکار پر اس نے مجھے بہت بھیانک سزا دی۔“ انجلی نے کہا۔ ”اس نے مجھے یہاں کے ایک شیخ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اس شیخ کا یہاں بزنس ہے۔ اس نے مجھے مارکیٹنگ میں رکھا، بھاری معاوضہ طے ہوا ہے لیکن وہ رات میں بھی مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ میرے انکار پر اس نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ زبردستی تو نہیں کروں گا لیکن اب تمہیں صرف ڈھائی ہزار درہم ملیں گے اور تمہارا پاسپورٹ میرے قبضے میں رہے گا۔ جب تک تم راہِ راست پر نہیں آؤ گی، اسی تنخواہ پر کام کرنا ہوگا۔“

”تم مجھے اس شیخ کا نام بتاؤ۔“ کاشی نے کہا۔ ”یہاں کے شاہی خاندان سے میرے کاروباری تعلقات ہیں۔ میں ابھی ایک گھنٹے میں تمہارا مسئلہ حل کرا دوں گا۔“

انجلی نے اس شیخ کا نام اور کمپنی کا نام بتایا۔

کاشی نے اسی وقت سیل فون پر اپنے دبئی کے بزنس منیجر اقبال سے رابطہ کیا۔ ”اقبال، میں اسی شاپنگ مال کے ریسٹورنٹ میں ہوں جہاں تم نے مجھے چھوڑا تھا، تم فوراً یہاں پہنچو۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند منٹ بعد اس کا بزنس منیجر اقبال وہاں پہنچ گیا۔ کاشی نے مختصراً اقبال کو انجلی کے بارے میں بتایا اور اس شیخ کا نام اور پتا بھی لکھ کر دے دیا جس کے قبضے میں انجلی کا پاسپورٹ تھا۔

اقبال کے تعلقات شاہی خاندان کے ایک اہم فرد سے تھے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انجلی کو نہ صرف اس کا پاسپورٹ مل گیا بلکہ اس کی واجب الادا رقم بھی شیخ سے موصول ہو گئی۔

اگلے روز کاشی کی پاکستان روانگی تھی۔ اس نے انجلی سے پوچھا۔ ”اب مستقبل میں تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”مستقبل!“ انجلی نے تلخی سے کہا۔ ”میرا بھلا کیا مستقبل؟“

”تو پھر تم میرے ساتھ پاکستان چلو۔“ کاشی نے کہا۔

انجلی اس پیشکش پر راضی ہو گئی۔

پاکستان آ کر انجلی نے شعبدے بازی کے شو کرنا چاہے لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے باپ سے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن اس میں پروفیسر والی بات نہیں تھی۔

کاشی سے اکثر اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ ایک دن کاشی نے شادی کی پیشکش کر دی اور یہ شادی سادگی سے انجام پائی۔

ان کی شادی کو ابھی صرف تین مہینے ہی ہوئے تھے اور وہ ہنی مون منا کر پاکستان لوٹے تھے۔ انجلی بہت خوش تھی اور کاشی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ اس کے دل میں انجلی اسی روز اتر گئی تھی جب اس نے پہلی مرتبہ اسے پروفیسر کے ساتھ اسٹیج پر دیکھا تھا۔

ان ہی دنوں لاہور میں ایک شعبدے باز کی آمد ہوئی۔ وہ خود کو شعبدوں کا شہنشاہ کہتا تھا۔ پورے شہر میں اس کی دھوم تھی۔

ایک دن انجلی بھی اس کا شو دیکھنے چلی گئی۔ کاشی کو اس کا علم نہیں تھا۔ رات کو جب وہ گھر لوٹی تو کاشی اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ انجلی کو دیکھ کر وہ برس پڑا۔ ”تم کسی کو بتائے بغیر آخر گئی کہاں تھیں؟ اپنا سیل فون بھی تم نے آف کر رکھا ہے۔ میں تو تمہاری تلاش میں ابھی نکلنے والا تھا۔“

”میں اس پُراسرار علوم کے ماہر اور جادوگر شیرازی کا شو دیکھنے چلی گئی تھی۔“ انجلی نے جواب دیا۔ ”اس نے ایسے ایسے کرتب دکھائے کہ ڈیڈی کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس نے پورے ہال کو چیلنج کیا کہ اگر کوئی اس کے کسی شعبدے کو دکھا دے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ کام چھوڑ دے گا۔“

”کہیں تم نے کوئی شعبدہ تو نہیں دکھا دیا؟“ کاشی نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں میں تو صرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس بھی وہ دو خاص شعبدے ہیں جو ڈیڈی دکھایا کرتے تھے۔ یعنی لوگوں کی نظر بندی کر کے کسی لڑکی کو اپنی نظروں کی قوت سے کئی فٹ اونچا کرنا اور دوسرے شعبدے میں اس کا سر تن سے جدا کرنا۔“

انجلی کی باتیں سن کر کاشی کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور دوسرے روز وہ بھی اس معروف ہوٹل میں جا پہنچا جہاں شیرازی کا پروگرام چل رہا تھا۔ پروفیسر نے اسے ان تمام کرتبوں کی حقیقت تو بتائی ہی تھی، کئی شعبدوں کے توڑ بھی سکھائے تھے۔

پروفیسر کی طرح شیرازی نے بھی جب صندوق اسٹیج پر رکھ کر حاضرین کو دعوت دی کہ اگر آپ میں سے کوئی اس کرتب میں حصہ لینا چاہے وہ اسٹیج پر آ جائے۔ میں سب کے سامنے اس کی گردن تن سے جدا کر دوں گا اور چند منٹ بعد

وہ زندہ سلامت یہاں موجود ہوگا۔"

کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ شیرازی کے اس چیلنج کا سامنا کرتا۔

شیرازی نے پہلے سوچا کہ وہ اسٹیج پر چلا جائے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ جب شیرازی وہ شعبدہ شروع کرے گا تو میں اس میں رکاوٹ ڈال دوں گا۔ اس وقت شیرازی کی کیفیت دیکھنے والی ہوگی۔ پھر میں اس رکاوٹ کا توڑ کرنے سے پہلے شیرازی سے کہوں گا کہ اتنے بڑے بڑے دعوے مت کیا کرو۔

شیرازی نے بلند آواز میں کہا۔ "آپ میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ اسٹیج پر آئے؟ خاتون آپ تشریف لے آئیں۔" اس نے اسٹیج کے سامنے والی صفوں میں بیٹھی ہوئی خوبصورت سی ایک لڑکی کو مخاطب کیا۔

لڑکی نے انکار کردیا۔

شیرازی نے کہا۔ "پھر مجبوراً مجھے اپنی بیٹی کو ذبح کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

اس کے اشارے پر ایک نوجوان لڑکی قلابازی کھا کر اسٹیج پر آگئی۔ اس کے انداز پر کاشی کو انجلی یاد آگئی۔ اس لڑکی نے بھی انجلی کی طرح شوخ اور انتہائی چست لباس پہن رکھا تھا لیکن وہ انجلی کی طرح خوبصورت نہیں تھی۔

لڑکی نے حسبِ معمول اسٹیج پر دو چار قلابازیاں لگائیں۔ دونوں ہاتھوں کے بل کھڑی ہوئی۔ اپنے جسم کو بالکل گول چھلے کے انداز میں بنایا اور پھر تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا مقصد محض لوگوں کو یہ باور کرانا تھا کہ وہ کتنی پُرکشش اور کتنے متناسب جسم کی مالک ہے۔

پھر وہ شیرازی کے حکم پر اس صندوق میں لیٹ گئی جو اسٹیج پر رکھا تھا۔ شیرازی نے پیچھے مڑ کر کونے میں رکھی ہوئی میز سے ایک دھار دار تلوار اٹھالی۔ اس کا پھل روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ صندوق کی طرف بڑھا۔ چھت کی طرف دیکھ کر اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگی، پھر تلوار لے کر اس صندوق پر جھک گیا جس میں لڑکی لیٹی تھی۔

شیرازی نے ایک مرتبہ مڑ کر حاضرین کو دیکھا، اپنی تلوار ہوا میں لہرائی تاکہ لوگ اس کی خیرہ کن چمک دیکھ سکیں، پھر وہ صندوق پر جھک گیا چند لمحوں بعد ایسی آواز آئی جیسے لڑکی صندوق میں تڑپ رہی ہو۔ شیرازی نے تلوار والا ہاتھ باہر نکالا۔ تلوار خون میں لت پت تھی۔ اس میں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ شیرازی کا چہرہ بھی پسینے میں ڈوب

گیا تھا۔ اس نے تلوار ایک رومال سے صاف کی اور حاضرین کی طرف رخ کر کے بولا۔ "میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے بیٹی کو ذبح کردیا۔"

پھر اس نے صندوق میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا تو اس میں لڑکی کا سر تھا۔ شیرازی نے اس سر کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ کٹی ہوئی گردن سے اس وقت بھی خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ لوگ سانس روکے ہوئے اس ہولناک منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ہال میں کسی عورت کی سہمی ہوئی آواز گونجی۔ "بس کرو...... ہمیں یقین آگیا۔"

شیرازی مسکرایا اس نے سر کو دوبارہ صندوق میں رکھ دیا اور دوسرے کرتب دکھانے میں مصروف ہوگیا۔

حاضرین میں سے کسی کی آواز آئی۔ "دوسرے کرتب بعد میں دکھایئے گا پروفیسر صاحب، پہلے اس لڑکی کو ٹھیک کردیں۔"

شیرازی حاضرین کی طرف تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور بولا۔ "دس منٹ بعد میری بیٹی آپ کے سامنے زندہ سلامت موجود ہوگی اور کرتب دکھا رہی ہوگی۔"

اس نے اپنی چھڑی اٹھائی اسے ہاتھ میں لے کر دوسرا ہاتھ سینے پر باندھے... منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ پھر اس نے چھڑی کو تین مرتبہ لڑکی کے صندوق پر گھمایا اور چھڑی کو صندوق پر رکھ دیا۔

لوگ سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہال میں ایسا سناٹا تھا کہ ایک پن بھی گرتی تو اس کی آواز صاف سنائی دیتی۔

چند منٹ تک شیرازی اسی طرح حاضرین کی طرف منہ کر کے کھڑا رہا، پھر دوبارہ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور مڑ کر صندوق پر رکھی ہوئی چھڑی اٹھائی۔ صندوق کا ڈھکن بہت آہستگی سے کھولا، پھر اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ وہ چھت کی طرف منہ کر کے بولا۔ "بس اب جاؤ، مجھے زیادہ پریشان مت کرو میری بیٹی بہت تکلیف میں ہے۔"

کاشی اس کی بات سن کر مسکرایا اور دل ہی دل میں بولا، ابھی تمہاری سب ڈراما بازی ہوا ہوجائے گی جب تمہاری بیٹی تمہاری کوشش کے باوجود ٹھیک نہیں ہوگی۔ پھر میں اسٹیج پر آؤں گا اور تمہاری بیٹی کو ٹھیک کردوں گا۔

اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اسٹیج کی طرف گہری نظر سے دیکھا اور بولا۔ "تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

شیرازی ابھی تک ڈراما ہی کر رہا تھا۔ لوگوں کا اضطراب بڑھانا چاہ رہا تھا۔ شیرازی نے اب ڈرامے کو زیادہ طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنی چھڑی کو صندوق پر تین مرتبہ گھمایا اور بھاری آواز میں بولا۔ "چلو بیٹی، کھڑی ہوجاؤ۔"

لوگ بے تاب ہو کر اس بند صندوق کی طرف دیکھنے لگے۔ شیرازی خود بھی منتظر تھا اشتیاق بھرے انداز سے صندوق کو دیکھ رہا تھا۔

کاشی بہت دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے شیرازی کے عمل میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ اب وہی اس رکاوٹ کو دور کرسکتا تھا۔ چاہے یہاں بیٹھے بیٹھے کرے یا اسٹیج پر جا کر۔

شیرازی نے پھر کوشش کی اور تیز آواز میں بولا۔ "روزی تم میری آواز سن رہی ہو۔ بس اب باہر آجاؤ۔ مجھے زیادہ تنگ مت کرو۔"

اس نے چند لمحے تک انتظار کیا، پھر صندوق میں جھانک کر دیکھا اس مرتبہ اس کے چہرے پر مایوسی کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی تھی۔ اس کے چہرے پہ پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔

کاشی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور سوچا کہ میں اگلے چند منٹ بعد اسٹیج پر جاؤں گا۔

کاشی نے بہت دیر سے سگریٹ نہیں پی تھی۔ وہ سگریٹ پینے کے لیے ہال سے باہر آگیا کیونکہ اندر تمباکو نوشی ممنوع تھی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا تو اسے معلوم ہوا کہ سگریٹ ختم ہوچکے ہیں۔

اس ہوٹل میں سگریٹ بھی ملتی تھی لیکن انتہائی مہنگے داموں۔ کاشی یہاں سے باہر آگیا۔ سڑک کی دوسری جانب پان سگریٹ کا ایک کیبن نظر آرہا تھا۔ اس نے محتاط انداز میں سڑک پار کی اور کیبن تک پہنچ کر اپنے لیے سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید لیا۔ اس نے ایک سگریٹ یہاں کھڑے کھڑے سلگائی اور تصور میں شیرازی کی بے بسی سے محظوظ ہونے لگا۔ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا تاکہ جلدی سے ہال میں واپس جاسکے۔

☆☆☆

شیرازی کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی ہر کوشش ناکام ہوچکی تھی۔ لوگ اسے بھی اس شعبدے کا ایک حصہ سمجھ رہے تھے۔

ایک آدمی بلند آواز میں بولا۔ "ڈراما بہت ہوگیا پروفیسر اب اس کھیل کا اختتام کرو۔"

شیرازی نے ایک مرتبہ پھر لڑکی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ بھی ناکام رہا۔

اس نے حاضرین کی طرف رخ کر کے کہا۔ "یہاں موجود کسی شخص نے میرے عمل پر بندش کردی ہے۔ میں اس شخص سے درخواست کروں گا کہ وہ اسٹیج پر آکر اس بندش کو ختم کرے۔ اگر وہ یہ شعبدہ جانتا ہے تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ اس عمل میں معمول کو کس تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے۔ وقت جیسے جیسے گزرتا جائے گا میری بیٹی کی تکلیف بڑھتی جائے گی۔"

لوگ اسے بھی ڈرامے کا حصہ سمجھ رہے تھے۔ کچھ دیر مزید گزر گئی لیکن کوئی اسٹیج پر نہ آیا۔ لوگ اب بیزار بیزار سے نظر آنے لگے تھے۔

ایک شخص تلخ لہجے میں بولا۔ "پروفیسر ہم یہاں تفریح کی غرض سے آئے ہیں مزید کوئی ذہنی پریشانی مول لینے نہیں آئے۔"

"میں نے آپ لوگوں سے عرض کیا تو ہے کہ کسی نے میرے عمل میں رکاوٹ ڈال دی ہے۔ آپ لوگ اسے مذاق سمجھ رہے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔" پھر وہ ایک مرتبہ پھر بلند آواز میں بولا۔ "جس کسی نے بھی بندش کی ہے پلیز وہ اسٹیج پر آئے اور آکر بچی کو صحیح کردے۔ میں اس شو کی آدھی رقم اسے دے دوں گا۔"

☆☆☆

کاشی نے سگریٹ ختم کر کے اسے اپنے جوتے سے رگڑا اور واپسی کے ارادے سے سڑک پار کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

وہ آدھی سڑک پار کرچکا تھا کہ سڑک پر اسے دو گاڑیاں نظر آئیں۔ دونوں برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کاشی نے گھبرا کر پیچھے کی طرف پلٹنا چاہا یہاں بھی ایک ٹرک جا رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں اس کے سر پر پہنچ گئیں۔ گاڑی کے ڈرائیوروں نے اسے دیکھ کر بریک لگانے کی کوشش کی ان میں سے ایک گاڑی تو قدرے رک گئی لیکن دوسری گاڑی نے کاشی کو زوردار ٹکر ماری۔ وہ ہوا میں کئی فٹ اچھلا اور سڑک پر دور جا گرا۔ اس کے سر اور جسم کے دوسرے حصوں پر گہری چوٹیں آئی تھیں لیکن وہ زندہ تھا۔ فوراً ہی ایک رفاہی ادارے کی ایمبولینس وہاں پہنچ

گئی اور کاشی کو اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے ایمرجنسی روم میں بھیج دیا۔ کاشی بے ہوش ہو چکا تھا۔

ایک ڈاکٹر نے دوسرے سے کہا۔ ”اس زخمی کی حالت زیادہ سیریس نہیں ہے۔ اس کا سر بھی محفوظ ہے اور جسم کے دوسرے حصے بھی، بس ٹانگ پر فریکچر ہے اور ایک ہاتھ بری طرح زخمی ہے۔“

کاشی کو آپریشن تھیٹر بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

شیرازی اب رونے کے نزدیک تھا۔ لوگ بھی اب سمجھ گئے تھے کہ شیرازی ڈراما نہیں کر رہا ہے بلکہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو چکا ہے۔ شیرازی نے اپنے چہرے سے بہتا ہوا پسینا رومال سے خشک کیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ”دیکھو تم جو کوئی بھی ہو مجھ پر رحم کھاؤ اتنا سنگین مذاق مت کرو۔ میں اس شو سے حاصل ہونے والی تمام رقم بلکہ اب تک یہاں میں نے جتنے شو کیے ہیں ان کی تمام رقم میں تمہارے حوالے کر دوں گا، تمہیں اللہ کا واسطہ اب مزید وقت برباد نہ کرو۔ اسٹیج پر آؤ پلیز میں تمہاری برتری تسلیم کرتا ہوں۔ تم مجھ سے بہتر ہو۔ اب صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں پلیز میری بیٹی کی زندگی سے مت کھیلو۔“

جواب میں بالکل سناٹا چھایا رہا۔

کاشی اسپتال کے ایک کمرے میں بے سدھ پڑا تھا اس کی جیب میں شناختی کارڈ تھا جس کے حوالے سے اس کی بیوی کو اطلاع دے دی گئی تھی وہ اسپتال پہنچنے والی تھی۔

☆☆☆

شیرازی نے گھڑی دیکھی اور شکست خوردہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ”اب صرف دو منٹ رہ گئے ہیں۔ میں رکاوٹ ڈالنے والے سے آخری مرتبہ ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہوں کہ اللہ کے واسطے وہ اسٹیج پر آ کے میری بیٹی کی زندگی بچالے ورنہ......ورنہ......“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

لوگوں کو شیرازی سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ وہ بھی بہ آواز بلند اس نادیدہ رکاوٹ ڈالنے والے سے درخواست کر رہے تھے کہ وہ آ کر شیرازی کی بیٹی کی جان بچالے۔

حاضرین میں سے ایک باریش شخص اٹھا اور بلند آواز میں بولا۔ ”میں رکاوٹ ڈالنے والے سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ پروفیسر کی بیٹی کو بچالے۔ میں اسے اپنی جیب سے دو لاکھ روپے انعام دوں گا۔“

پروفیسر شیرازی نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو خاموش کر دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آپ سب لوگوں کا بہت بہت شکریہ اب وقت گزر چکا ہے اور میری بچی حقیقت میں مر چکی ہے۔ رکاوٹ ڈالنے والے کو شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ اب میں کیا کر سکتا ہوں؟ آپ سب لوگ گواہ رہیے گا۔ میں نے آخری لمحے تک اس شخص کا انتظار کیا۔ اپنی تمام جمع پونجی دے دینے کا وعدہ کیا اس کی برتری تسلیم کر لی۔ آپ نے بھی گراں قدر انعامات کا اعلان کیا لیکن رکاوٹ ڈالنے والا انتہائی بے حس اور ظالم ہے۔ اور اب میں جو کچھ بھی کروں گا اس پہ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہوگا۔“

اس نے خاموش ہو کر اپنے تھیلے سے ایک کیلا نکالا اور سب کے سامنے اسے میز پر رکھ دیا پھر ایک خنجر پکڑا اور بولا۔ ”میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اگر بندش کرنے والا مجھ سے معافی مانگ لے تو میں اسے معاف کر سکتا ہوں۔ میری بیٹی کی تو جان گئی۔ میں نہیں چاہتا کہ رکاوٹ ڈالنے والے کو بھی کوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے۔“

اس نے کچھ انتظار کیا پھر خنجر اٹھا کے کیلے کے بالکل سرے پر اس کی نوک رکھ دی۔

وہ پھر بلند آواز میں بولا ”میرا خنجر مجھے روک رہا ہے لیکن آپ سب گواہ ہیں۔ میں نے اس بے حس اور ظالم شخص کو کسی بھی ناقابلِ تلافی نقصان سے بچانے کی مقدور بھر کوشش کی۔“ اس نے خنجر کی نوک کیلے کے ایک سرے پر رکھی اور اسے دوسرے سرے تک چیر دیا۔

شیرازی کے چہرے پر اس وقت انتہائی دہشت ناک تاثرات تھے۔ اس نے اپنا سامان سمیٹا اپنی بیٹی کی سر بریدہ لاش کو اس صندوق میں رہنے دیا اور پھر وہ صندوق اٹھوا کر باہر لے گیا۔ لوگ آپس میں بولنے لگے۔ جہاں پہلے دہشت ناک خاموشی تھی وہاں اب لوگوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

کاشی کی بیوی پہنچ چکی تھی۔ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی اور اسے ہوش آ رہا تھا۔

اچانک ڈیوٹی ڈاکٹر اور نرس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا کہ کاشی کا جسم اچانک سر سے لے کر پاؤں تک یوں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جیسے اسے لکڑی کاٹنے والے تیز دھار آرے سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔

ہم مجرم

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
نفسیاتی گتھیوں میں الجھی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس شخص سے جب میں ملا تھا تو حیران رہ گیا تھا مگر اس کی داستان دلچسپ لگی تھی اس لیے میں اسے قارئینِ سرگزشت کے لیے پیش کررہا ہوں۔

عزیز صفی پوری
(کراچی)

میں کرداروں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ دلچسپ کردار۔ ماضی کے شاندار کارنامے سنانے والے۔ عجیب حرکتیں کرتے ہوئے۔ حیرت انگیز عادتیں رکھنے والے۔ چاہے وہ استاد محبوب نرالے عالم ہوں یا بلبل ہزار داستان۔

یہ سارے کردار اسی شہر میں رہا کرتے تھے۔ پھر نہ جانے کیوں یہ معصوم لوگ غائب ہوتے چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ کمرشل ازم ایسے کرداروں کو فنا کرتا چلا گیا ہے۔ انسان جیسے جیسے کمرشل ہوتا جا رہا ہے۔ ویسے ویسے

وہ مکار بھی ہوتا جارہا ہے۔ اور مکاری نے معصومیت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

میرے اردگرد یہ کردار ستر اسی کی دہائی کے تھے۔ یعنی آج سے چالیس سال پہلے کے کردار تھے۔ اب تو ایسے لوگ تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتے۔ زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے اور ایک دن خود مجھے بھی فسانہ بن کر رہ جانا ہے۔

”چراغ بجھتے چلے جارہے ہیں سلسلہ وار۔ میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے۔“

لیکن پچھلے دنوں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے حیران کرکے رکھ دیا۔ وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ بظاہر بہت معقول۔ بہت سلیقے سے گفتگو کرنے والا، کھوئی کھوئی آنکھوں والا۔

میں اپنے فلیٹ میں بیٹھا ہوا کوئی کام کررہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ دستکیں بھی اپنی زبان رکھتی ہیں۔

دستک دینے کا انداز بتادیتا ہے کہ آنے والا کتنا کلچرڈ یا اَن کلچرڈ ہے۔ آپ نے بھی بارہا اس کا تجربہ کیا ہوگا۔

کچھ لوگ اس طرح دستکیں دیتے ہیں جیسے آپ نے دروازہ کھولنے میں ایک لمحے کی بھی دیر کی تو وہ دروازہ توڑ کر اندر آجائیں گے۔

یا پھر اس طرح کی دستک ہوتی ہے جیسے خدانخواستہ پولیس نے چھاپا ماردیا ہو۔ اور کچھ دستکیں ہوتی ہیں جیسے کسی نے بھولے سے، بہت مہذب انداز میں آپ کو آواز دی ہو۔

وہ بھی ایسی ہی دستک تھی بہت مہذب۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک جھجکتی ہوئی شرمندہ سی مسکراہٹ تھی۔

”معاف کیجیے، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ اس نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ فرمائیں۔“

”جناب، میں جانتا ہوں کہ آپ کہانیاں لکھتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں آپ کے پاس اپنی کہانی لے کر آیا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو سنا دوں۔“

مجھے اسی لمحے وہ ایک دلچسپ لیکن مختلف کردار محسوس ہوا تھا۔

”آئیں اندر آجائیں۔“ میں نے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیا۔

وہ شکریہ کہہ کر اندر آگیا اور میرے کہنے پر وہ بہت شائستگی سے ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔

”اب فرمائیں، آپ کیا کہانی لے کر آئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”پلیز! پہلے یہ فرمائیں کیا میں آپ کو صورت سے وحشی، جاہل، ظالم یا درندہ قسم کی کوئی چیز دکھائی دیتا ہوں۔“

”ارے نہیں جناب، کیسی بات کررہے ہیں۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”آپ تو ایک مہذب انسان ہیں۔“

”شکریہ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں قاتل ہوں تو کیا آپ میرا یقین کرلیں گے۔“

”بہت مشکل سے یقین آئے گا۔ بلکہ شاید آئے گا ہی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ کے اعتماد کا شکریہ۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں ایک قاتل ہوں۔ میں نے جس کا خون کیا ہے اس کی لاش ابھی تک میرے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔“

اب میں تھوڑا سا گھبرانے لگا تھا۔ ایک آدمی سامنے بیٹھا ہوا اپنے قاتل ہونے کا اعتراف کررہا تھا تو کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی۔ اور وہ کوئی پاگل بھی نہیں معلوم ہورہا تھا۔ بلکہ پڑھا لکھا اور باشعور آدمی تھا۔

”آپ مجھ سے خوفزدہ تو نہیں ہورہے۔“ اس نے پوچھا۔

”جی۔۔ جی نہیں تو۔“ میں نے کہا۔ اس نے میرے اندر کا خوف محسوس کرلیا تھا۔ یہی اس کی ذہانت تھی۔

”لیکن یہ بتائیں، آپ نے کس کا خون کیا ہے؟“

”میں نہیں جانتا اس کو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ میرے پاس آکر مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا تھا۔ پھر میں نے غصے میں آکر اس کا خون کردیا۔ اب اس کی لاش میرے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔“

”آپ کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”عبداللہ۔“ اس نے بتایا۔ ”یعنی اللہ کا بندہ اور یہی میری پہچان ہے۔ میں عبداللہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوں۔“

”ہم سب ہی عبداللہ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بات بتائیں، آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں۔ آپ کو تو پولیس کے پاس جانا چاہیے تھا۔“

”پولیس کو میری بات کا یقین نہیں آتا۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”اس کا کہنا ہے کہ میں پاگل ہوگیا ہوں۔

اسی لیے ایسی باتیں کررہا ہوں۔“

”کیا پولیس نے لاش برآمد نہیں کی۔“

”پولیس والے میرے ساتھ میرے گھر آئے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن انہیں وہ لاش ہی دکھائی نہیں دی۔ حالانکہ سامنے ہی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ٹکڑے کرکے پورے کمرے میں بکھیر دیے تھے۔ اس کے باوجود انہیں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اور وہ برا بھلا کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں ان کا وقت برباد کررہا ہوں۔“

”کمال ہے! وہ کیسی لاش ہے جو پولیس والوں کو نظر نہیں آئی۔“ میں نے کہا۔

”پولیس والوں کو صرف وہ لاش نظر آتی ہے جس کی موت کی تصدیق سے ان کا کچھ فائدہ ہورہا ہو۔“ اس نے کہا۔ ”یہاں تو لاش بھی سامنے تھی اور قاتل خود اپنے جرم کا اعتراف کررہا تھا۔ ایسی صورت میں کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے واپس چلے گئے۔“

”ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔“

”میرے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ سب چھوڑیں۔ آپ یہ بتائیں۔۔ آپ چل رہے ہیں نا میرے ساتھ۔“

”میں آپ کے ساتھ جاکر کیا کروں گا۔“

”میں آپ کو وہ لاش دکھاؤں گا۔ اس کے بعد اپنی کہانی سناؤں گا۔ وہ شخص میرے لیے اجنبی سہی لیکن میں پاگل تو نہیں ہوں کہ کسی کو خواہ مخواہ قتل کردوں۔ کوئی نہ کوئی بیک گراؤنڈ تو ضرور ہوگا۔“

”ہاں، بیک گراؤنڈ تو ہونا ہی چاہیے۔“

”تو پھر چلیں۔ میں آپ کو بیک گراؤنڈ بھی بتادوں گا۔“

اس وقت مجھے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ وہ لاکھ مہذب سہی لیکن ایک خونی تھا اور مجھے اس لاش کو دکھانے لے جارہا تھا جس کے ٹکڑے کرکے اس نے پورے گھر میں پھیلا دیے تھے۔ مجھے اس قسم کی لاش دیکھنے کا نہ تو تجربہ تھا اور نہ ہی کوئی شوق تھا۔

اور دوسری بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ جاکر میں خود بھی کسی چکر میں پھنس سکتا تھا۔

اچانک وہ ہنسنے لگا۔ بہت ہی طنزیہ اور خوفناک قسم کی ہنسی تھی اس کی۔ ”تم ڈر رہے ہو۔ اسی لیے میرے ساتھ نہیں چلنا چاہتے ہو، کہیں میں تمہارا قتل نہ کردوں۔“

وہ اچانک آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ میں اس کا ساتھ دینے سے انکار کررہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر ہی میرے پاس آیا ہوگا۔

وہ جانتا تھا کہ میں کون ہوں اور کہانیاں لکھا کرتا ہوں۔ اسی لیے وہ آیا تھا میرے پاس۔

”سب بزدل ہیں۔“ وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ ”بزدل! کہانیاں لکھنے والے ہیں اور کہانیاں پڑھنے والے ہیں۔ کسی میں بھی حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اپنی کہانیوں میں تو ہیرو کو دس دس دشمنوں کا خون کرتے ہوئے دکھادیتے ہیں۔ لیکن خود ایک لاش کو بھی دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اونہہ لعنت ہے ایسی منافقت پر۔“

وہ اٹھا اور بڑبڑاتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

میں حیران سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

یہ تو طے تھا کہ وہ ذہنی مریض نہیں تھا۔ اس نے یقیناً کسی کو مار کر اس کے ٹکڑے کردیے ہوں گے۔ لیکن وہ لاش مجھے کیوں دکھانا چاہتا تھا۔

اس لیے کہ میں اس کی کہانی لکھ سکوں۔

لیکن یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ کہانی تو میں ویسے ہی لکھ لیتا۔ اگر وہ مجھے اپنے حالات بتادیتا۔ بہرحال اس کے جانے کے بعد میں بھی اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

اس نے اپنا نام تو بتادیا تھا، عبداللہ۔ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور نہ ہی میں نے دریافت کیا تھا۔

اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے پولیس والوں کو بھی لے جاکر لاش دکھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن پولیس والوں کو وہ لاش ہی نظر نہیں آئی۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔ پولیس نے اسے گرفتار کیوں نہیں کیا تھا۔

معاملہ کچھ الجھا ہوا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ وہ میرے ذہن سے محو نہیں ہوسکا تھا۔ اس کی شائستگی اور اس کا لہجہ مجھے متاثر کرگیا تھا۔ میں ایک بار اور اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے کریدنا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن اس سے ملاقات ہو ہی گئی۔ میں کسی کام سے کہیں جارہا تھا۔ رکشا یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک وہ میرے سامنے آگیا۔

”ارے جناب، میں تو آپ کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”میرا پیچھا۔“

”جی ہاں۔ میں آپ کی رہائش گاہ کی طرف گیا تھا۔ میں نے آپ کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے آپ کو

آوازیں بھی دیں لیکن شاید آپ نے نہیں سنا تھا۔ پھر میں آپ کا پیچھا کرتا ہوا یہاں اسٹاپ تک آ گیا۔"

"ہاں، میں رکشے یا ٹیکسی کے انتظار میں یہیں آ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "تم کیسے ہو۔"

"بالکل ٹھیک۔" اس نے کہا۔ "آج میں آپ کو کچھ اور بھی بتانے کے لیے آیا ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اس بار بھی انکار کر دیں گے۔"

"ہاں بتاؤ کیا بات ہے۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بہت رازداری سے بولا۔ "کل میں نے ایک اور خون کیا ہے اور اس کی لاش کے ٹکڑے بھی ہر طرف پھیلا دیے ہیں۔"

"کیا...!" میں غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب یقین ہونے لگا تھا کہ وہ ذہنی مریض ہے۔

"جناب، اس بار میں نے ایک عورت کو مارا ہے۔" اس نے دبے دبے لہجے میں بتایا۔

"بہت خوبصورت اور جوان تھی لیکن میں نے اسے مار دیا۔"

اب اس کے پاس کھڑے ہو کر مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ ذہنی مریض ہی تھا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ کم بخت کوئی ٹیکسی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ورنہ میں اس سے جان چھڑا کر اس میں سوار ہو جاتا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔" وہ بولے جا رہا تھا۔ "میں نے پھر بھی اسے مار دیا۔ خون کر دیا اُس کا۔"

"کیا تم پولیس کے پاس گئے تھے۔" میں نے اسے بہلانے کے لیے پوچھا۔

"کیا فائدہ۔ پولیس والوں کو پھر وہ لاش نظر نہیں آتی۔ ایسا ہو چکا ہے۔ تیسری بار تو وہ مجھے اندر ہی کر دیتے۔ میں اسی ڈر سے ان کے پاس نہیں گیا۔"

'اور میرے پاس کیوں آ رہے تھے۔"

"میں نے بتایا تھا نا کہ اپنی کہانی سنانے کے لیے۔ آپ بس ایک نظر ان لاشوں کو دیکھ لیں۔ پھر میں اپنی کہانی سناؤں گا۔ بہت ہی حیرت انگیز کہانی ہے میری۔"

"دیکھو، تم مجھے اپنے گھر کا پتا بتا دو۔ میں خود پہنچ جاؤں گا۔"

"نہیں، آپ نہیں آئیں گے۔" وہ بے اعتباری سے ہنس پڑا۔ "آپ نہیں آئیں گے کیونکہ آپ مجھ سے ڈرنے لگے ہیں۔ یا تو آپ مجھے پاگل سمجھنے لگے ہیں یا آپ کو یہ خوف ہے کہ میں کہیں آپ کا بھی خون نہ کر دوں۔"

"نہیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ضرور آؤں گا۔"

"چلیں۔ بتا دیتا ہوں۔"

اس نے پتا بتایا بھی اور سمجھا بھی دیا۔ بہت آسان پتا تھا اس کا۔ اس دوران ایک ٹیکسی بھی آ گئی اور میں اس میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر مجھے سوچ میں مبتلا کر گیا تھا۔

آخر کیا تھا یہ سب۔ میں ایک بار پھر یہ بتا دوں کہ وہ کسی طرح بھی ذہنی مریض نہیں تھا بلکہ باہوش انسان تھا۔ ذہنی مریض کی تو آنکھیں بتا دیتی ہیں۔ جبکہ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

تو پھر یہ سب کیا تھا۔ وہ کیوں ایسی بات کر رہا تھا؟

میں یہ بتا چکا ہوں کہ میری زندگی میں ایک سے ایک کردار آئے ہیں۔ اپنے انداز اور اپنے رویّے کی وجہ سے انوکھے بھی اور پُراسرار بھی۔ لیکن یہ سب سے مختلف ہی تھا۔

اچانک ایک بات میرے ذہن میں آ گئی۔

شاید وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہوگا۔ اس نے واقعی مرڈر کیے ہوں گے۔ میں نے ایسے کئی لوگوں کی کہانیاں پڑھی تھیں۔ سیریل کلر قسم کے لوگ۔ جو عام طور پر بہت ٹھنڈے مزاج کے ہوتے ہیں۔ جن کے رویّے بہت شائستہ ہوتے ہیں۔

انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ وہ ایسے ہوں گے۔ لیکن وہ ہوتے ہیں اور جب پکڑے جاتے ہیں تو بڑی دلیری اور بے باکی سے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک انسان کو مارنا کوئی بات نہیں ہوتی۔

دفتر میں میرا ایک ساتھی تھا۔ فرید نام تھا اس کا۔

میں یہ بھی بتا دوں کہ میں جس دفتر میں کام کرتا تھا وہ ایک پندرہ روزہ میگزین کا دفتر تھا۔ گنتی کے سات آٹھ آدمی اس دفتر میں تھے۔

میں اسی میگزین میں سچی کہانیوں کے عنوان سے کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ شاید وہ شخص عبداللہ میری ان ہی کہانیوں کو پڑھ کر میرے پاس آیا ہوگا۔

میں نے اپنی اس الجھن اور اس شخص کا ذکر جب فرید سے کیا تو وہ بہت پُرجوش ہو گیا۔ "یار یہ تو بہت زبردست اسٹوری ہمارے ہاتھ لگنے والی ہے۔"

"وہ تو ہے لیکن کون جانے سچی ہے یا جھوٹی۔ ایسا تو نہیں کہ وہ بس یوں ہی بول رہا ہو۔"

"یا پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ سیریل کلر ہی ہو۔" فرید نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ، اس کا علاقہ کون سا ہے۔ میرا مطلب ہے کہاں رہتا ہے۔"

"پی آئی بی کالونی میں۔" میں نے بتایا۔

"پی آئی بی کالونی۔ یار وہاں تو جمشید روڈ کا تھانہ لگتا ہوگا۔"

"تو پھر۔"

"دیکھو، اگر وہ پولیس والوں کے پاس اپنے جرم کا اعتراف کرنے جاتا ہوگا تو پھر جمشید روڈ کے تھانے میں ہی جاتا ہوگا اور اتفاق سے اس کا ایس ایچ او میرا ایک دوست ہے، عزیز خان۔ اگر کہو تو اس کے پاس چلتے ہیں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ سرے سے جھوٹ ہی بول رہا ہو۔"

"یار چل کر دیکھ تو لیں۔ اس میں کیا حرج ہے۔"

فرید نے اسی وقت موبائل پر اپنے ایس ایچ او دوست کا نمبر ملایا۔ اتفاق سے وہ تھانے میں ہی موجود تھا۔ فرید نے اسے بتایا کہ ہم لوگ اس کے پاس آ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ "جلدی آ جاؤ ورنہ ہو سکتا ہے میں گشت پر نکل جاؤں۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم ایس ایچ او عزیز کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"ہاں بھائی، کیا پرابلم ہو گئی۔" اس نے فرید سے پوچھا۔ "ویسے تو تم کبھی یاد نہیں کرتے۔"

"یار، ایک بات بتاؤ۔ کیا کبھی تمہارے پاس کوئی ایسا بندہ بھی آیا ہے جس نے یہ اعتراف کیا ہو کہ اس نے خون کیا ہے اور لاش کے ٹکڑے گھر میں بکھیر دیے ہیں۔"

"ہاں یار، ایک آیا تو تھا۔" عزیز نے بتایا۔ "پاگل بھی تھا شاید۔"

"آپ مجھے اس کا حلیہ بتائیں۔"

"بھائی، چنگا بندہ تھا۔ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا، بہت اچھی باتیں کرتا تھا۔"

"ہاں، یہ وہی ہوگا بالکل وہی۔" میں نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم لوگوں نے اس کی بات پر دھیان دیا تھا۔" فرید نے پوچھا۔

"کیوں نہیں دھیان دیتے۔ ہمارا تو کام ہی یہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں فوراً موبائل لے کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا گھر پی آئی بی کالونی میں ہے۔"

ن سے نظر ملائے زمانے گزر گئے
یعنی اُدھار کھائے زمانے گزر گئے
پوچھی جو وجہِ وحشت دل میں نے قیس سے
بولا مجھے نہائے زمانے گزر گئے
ہر چیز آ رہی ہے امارات سے مگر
شوہر کو گھر پہ آئے زمانے گزر گئے
سوچو تو یار کب سے الیکشن نہیں ہوئے
گویا فریب کھائے زمانے گزر گئے
دو چار شادی ہال محلّے میں ہیں مرے
گھر میں تو کچھ پکائے زمانے گزر گئے
یارب ہمارے شہر کے لیڈر کی خیر ہو
اس کا بیان آئے زمانے گزر گئے
دامن پہ آپ کے تو جوئیں آپ ہی کی ہیں
ہم کو تو سر کھجائے زمانے گزر گئے
للہ چارہ گر مری خارش کی فکر کر
اُن کو گلے لگائے زمانے گزر گئے

عنایت علی خان

"ہاں ہاں وہی ہے۔" میں نے تائید کی۔ "پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں یار۔ اس نے ہمارا ٹائم برباد کر دیا تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا وہاں۔ پورے فرش پر اخبارات کو پھاڑ پھاڑ کر پھیلایا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا یہ دیکھو یہ ہیں لاشیں۔"

"اوہ! اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پاگل ہی نکلا۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"ہاں یار ایک نمبر کا پاگل۔"

"پھر تم نے کیا کہا۔" فرید نے پوچھا۔

"کرنا کیا تھا جی۔ اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس آ گئے۔ پچھلے دنوں پھر اسی قسم کی کہانی لے کر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا ایک عورت کو مارا ہے، اس بار اس نے اتنی کنفرم بات کی تھی کہ ہم پھر اس کے دھوکے میں آ گئے۔ اس بار بھی فرش پر اخبارات کے پرزے بکھرے ہوئے تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ دیکھو یہ پڑی ہے لاش۔"

"تو یہ ہے کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔" فرید نے کہا۔ "وہ بے چارہ نفسیاتی مریض نکلا۔ لیکن ہم پھر بھی اس کے پاس جائیں گے۔"

"اب کیا کریں گے جا کر۔" میں بول پڑا۔ "خواہ مخواہ وقت برباد ہوگا۔"

"نہیں یار، ایسے لوگوں سے ملنا بہت زبردست

تجربہ ہوتا ہے۔ ان کے اپنے تصورات کی دنیا ہوتی ہے۔ جس میں زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کبھی ٹارزن سمجھتے ہیں، کبھی قاتل، کبھی کچھ اور...... جبکہ بظاہر بالکل نارمل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے مل کر زندگی کا ایک دوسرا پہلو دیکھنے میں آتا ہے۔"

"تو پھر چلو۔"

"بہت ہی آسان ہے اس کا گھر۔" فرید نے بتایا۔ "شبانہ نہاری کے بالکل پیچھے والی گلی ہے۔"

فرید کے پاس اپنی ایک چھوٹی سی پرانی گاڑی تھی۔ لیکن چلتی رہتی تھی۔ ہم اسی گاڑی میں تھانے تک آئے تھے اور اسی گاڑی میں اس شخص کے گھر میں پہنچ گئے۔

اس کا گھر واقعی بہت آسانی سے مل گیا تھا۔

اور وہ اپنے گھر میں بھی تھا۔

وہ ہمیں دیکھ کر پہلے تو حیران پھر پُرجوش ہوگیا۔ "میں جانتا تھا کہ آپ لوگ ضرور آئیں گے۔ کیونکہ میں نے کل ہی ایک اور واردات بھی کی ہے۔"

"اب کون سی واردات کردی بھائی۔"

"ایک بچے کا خون کردیا ہے۔" اس نے بتایا۔

میں اور فرید ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔

وہ ایک ذہین آدمی تھا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ ہمیں اس کی بات پر یقین نہیں آیا ہے اس لیے وہ غصے سے بولا۔ "ٹھیک ہے، آپ لوگوں کو اگر یقین نہیں ہے تو خود آکر دیکھ لیں۔"

اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ ہم اندر آگئے۔

"یہ دیکھیں لاش۔" اس نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

فرش پر اخبارات کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔

اب تو کوئی شک ہی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ واقعی ذہنی مریض ہے۔ ہم خواہ مخواہ اس کی باتوں میں آگئے تھے۔

"لاش دیکھ لی۔" اس نے پوچھا۔

ہم دونوں ہی چپ رہے۔

اس نے پھر کہا۔ "اب سمجھا شاید آپ دونوں کو یقین نہیں آرہا ہے کسی کو بھی یقین نہیں آتا۔ لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ لاش ہے۔ بچے کی لاش۔ پانچ سال کا بچہ تھا۔ کچھ لوگوں نے تاوان کے لیے اس کو اغوا کیا تھا اور تاوان نہ ملنے پر مار کر اس کو کہیں پھینک دیا۔ ان اخبارات میں اس کی خبر چھپی تھی۔ تو یہ اخبار اس بچے کا کفن ہوگیا تھا۔ لاش تو اس کی ایک ہی جگہ پڑی ہوگی۔ لیکن اس کا کفن خبروں کے ذریعے پورے ملک میں بکھر گیا تھا۔ اسی طرح میں نے جب ایک آدمی کا خون کیا تھا تو اس آدمی کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ کوئی اور زبان بولتا تھا اور دوسری زبان والوں نے ماردیا۔ اس کا کفن بھی اخبارات ہی بنے تھے۔ میں نے اس کے کفن کے ٹکڑے کرکے ہر طرف پھیلا دیے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ہی اس کا خون کیا ہو یا کم از کم برابر کا مجرم ہوں۔ پھر ایک عورت ماری گئی۔ بہت ہی بے رحمی سے۔ اس کی لاش بھی کہیں پھینک دی گئی تھی اور اخبارات اس کا کفن بن گئے تھے۔ میں نے جانا میں نے اس کا خون کیا ہے۔ آخر کیوں۔ مجھے ایسا احساس ہوتا رہا۔ پوچھیں کہ میں ایسا کیوں محسوس کرتا تھا۔"

"چلو بتادو بھائی۔" میری آواز رندھ رہی تھی۔

"اس لیے کہ کسی دانشور نے کہا ہے کہ یہ دنیا رہنے کے لیے بہت خطرناک جگہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہاں برے لوگ رہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اچھے لوگ اسے سنوارنا نہیں چاہتے۔ وہ اچھے لوگ بھی برابر کے مجرم ہیں۔ اسی لیے اس ملک میں جو خون بھی ہوتا ہے وہ میرے اور آپ کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ جو بھی ناانصافی ہوتی ہے وہ میری اور آپ کی وجہ سے ہوتی ہے۔"

اور اس سے مجھے احساس ہوا کہ وہ آدمی پاگل نہیں تھا۔ پاگل تو اس کے علاوہ پوری دنیا تھی۔ ہم بھی تو ایک مرد، ایک عورت اور ایک بچے کے قاتل تھے۔

وہ جو اپنے آپ کو قاتل کہہ رہا تھا تو غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے۔

مجھے یاد آیا کہ جیسے حکم دیا گیا ہے کہ خرابی کو اگر ہاتھوں سے روک سکتے ہو تو ہاتھوں سے روکو۔ اس سے کم تر یہ ہے کہ زبان سے برا کہو اگر یہ بھی نہیں کرسکتے تو اپنے دل میں برا سمجھو۔

آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ ہم کہاں اسٹینڈ کرتے ہیں۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہم سب ان جرائم میں برابر کے شریک ہیں۔

ہم اس سے کچھ نہیں کہہ سکے اور اس کے گھر سے باہر آگئے۔ میں اور فرید ایک دوسرے کو دیکھنے سے بھی کترا رہے تھے۔ ہمارے اندر کا بزدل انسان ہمیں برا بھلا کہہ رہا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ اب وہ شخص کہاں ہوگا۔ کیا کررہا ہوگا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں اسے ابھی تک بھلا نہیں سکا ہوں۔

جولین کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ میرے پڑوس میں آکر آباد ہوئی تھی۔ مسلکاً وہ ایک کرسچن لڑکی تھی۔ باتوں میں شوخی، آواز میں کھنک، چال میں لچک اور کردار میں دمک نمایاں تھی۔

اسے میں نے اس وقت دیکھا جب جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آرہا تھا۔ مہینے میں کم از کم دو جمعوں کی نمازیں تو میں پڑھ ہی لیتا تھا۔

ان نمازوں کی ابتدا بھی اس دن سے ہوئی جب میں

نہ خدا ملا......

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم!

آدھا تیتر آدھا بٹیر والا محاورہ آپ نے سنا ہوگا لیکن میں اس سے بھی گیا گزرا بن گیا ہوں۔ ایک لڑکی کی چاہ نے مجھے کیا سے کیا بنادیا۔ گویا مجھے نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

افضل ویکٹر منڈے مسیح

(راولپنڈی)

نے ایک مولوی صاحب سے سنا کہ ”قبر میں فرشتے سب سے پہلے نماز کا پوچھیں گے۔“

اس وقت یہ گفتگو ایک ہوٹل میں ہو رہی تھی۔

میرے دوست تسنیم نے آج کل ایک مولوی صاحب کی صحبت میں بیٹھنا شروع کر دیا تھا اور میری زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔

میں اس وقت اتفاق سے چائے پینے ہوٹل کی طرف چلا گیا تھا جب میں نے تسنیم کو ان ہی مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا۔

مولوی صاحب کے سامنے چائے کی جو پیالی رکھی ہوئی تھی اس میں بالائی کی موٹی سی تہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ تسنیم نے مجھے بھی آواز دے کر اپنی طرف بلا لیا تھا۔

اس نے مولوی صاحب سے میرا تعارف کروایا۔

”مولوی صاحب! یہ میرے دوست ہیں افضل۔“

”ماشاء اللہ۔“ مولوی صاحب نے اپنی گردن ہلائی اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”میں نے تمہیں تو مسجد میں کبھی نہیں دیکھا؟“

”مولوی صاحب! میں ذرا دور کی مسجد میں جا کر نماز پڑھتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کتنی دور کی۔ کیا نماز پڑھنے کے لیے شہر سے باہر چلے جاتے ہو۔“

”قبرستان والی مسجد میں جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”سامنے قبریں نظر آتی رہتی ہیں تو خدا کا خوف دل میں رہتا ہے۔“

”واہ کیا بات ہے۔“ مولوی صاحب یہ جواب سن کر پھڑک اٹھے۔

تسنیم نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔

”ہاں تو میں نماز ہی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ قبر میں فرشتے سب سے پہلے نماز کا پوچھیں گے۔“ مولوی صاحب نے بات آگے بڑھائی۔

”حضرت! قبر تو عیسائیوں کی بھی ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ان سے بھی نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“

”میاں! کیا بات کر رہے ہو؟“ مولوی صاحب بھنا گئے۔ ”ان کے ساتھ تو دوسرا معاملہ ہوگا۔“

”اور جو نماز نہیں پڑھتا اس کے ساتھ کیا ہوگا؟“ تسنیم نے پوچھا۔

”بھائی! اس کے خلاف تو قبر ہی سے کارروائی شروع ہو جائے گی۔“ مولوی صاحب نے بتایا۔ ”پہلے ایک سانپ آئے گا پھنکارتا ہوا جس کے منہ سے آگ نکل رہی ہوگی۔ وہ جلا کر راکھ کرے گا۔ اس کے بعد اس کو دوبارہ گوشت پوس دیا جائے گا۔ پچیس منٹ کے بعد ایک دوسرا سانپ آئے گا۔“

”حضرت! ایک بات بتائیں۔ یہ اتنی ایکوریٹ ٹائمنگ آپ کو کہاں سے معلوم ہوگئی؟“ میں نے پوچھا۔

مولوی صاحب پھر بھنا گئے۔ ”تم کفر کی باتیں پوچھ رہے ہو۔ یہ باتیں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ میرے والد مرحوم حضرت شاکر اللہ گردیزی فرمایا کرتے تھے۔“

میں نے کچھ اور پوچھنا چاہا لیکن تسنیم نے میرے پیر پر اپنا پیر رکھ دیا تھا۔ مطلب یہ کہ خاموش رہو۔

لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے بعد سے میں جمعہ کی نماز پڑھنے لگا تھا۔ مہینے میں کم از کم دو جمعے تو ضرور مسجد چلا جاتا۔

ایک جمعے کی نماز سے واپسی کے وقت میں نے جولین کو دیکھ لیا۔ اس نے نیلی جینز اور سرخ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میرا دل اس کے آس پاس کہیں اٹک کر رہ گیا۔

وہ اس وقت اپنے دروازے پر کھڑی ایک عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ میں اس عورت کو پہچانتا تھا۔ وہ محلے ہی کی تھی اور اس کا کام رشتے لگانا تھا۔ وہ دو بار میرے لیے بھی رشتے لا چکی تھی۔ بہت ہی منہ پھٹ قسم کی عورت تھی۔

وہ میرے لیے جس قسم کے رشتے لے کر آئی تھی، اس سے تو بہتر تھا کہ میں کنوارہ ہی رہ جاتا۔ اس نے جب مجھ کو ان دونوں رشتوں کے بارے میں بتایا تو میں بھڑک اٹھا۔

”خالہ! کیا میرے لیے ڈھنگ کا کوئی رشتہ نہیں ہے جو تم اس قسم کے رشتے لے کر آتی ہو؟“

”یہ کیا بات ہے۔“ عورت بھی تڑخ اٹھی۔ ”ڈھنگ کی لڑکیاں بھی تو ڈھنگ کے بندے ڈھونڈتی ہیں۔ تم سے کیوں شادی کرنے لگیں۔“

عورت کے اس جواب پر میں بھنا کر رہ گیا اور اس عورت سے بات چیت ختم ہی کر دی۔ ایک دن وہ خود ہی میرے پاس چلی آئی تھی۔

”اس بار میں تمہارے لیے ایک ایسا رشتہ لائی ہوں

کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا۔“ میں واقعی خوش ہو گیا تھا۔ ”کہاں ہے؟“

”تمہارے سامنے۔“

”میرے سامنے تو نذیر صاحب رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور سنا ہے کہ ان کی لڑکی کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔“

”میں تمہارے گھر کے سامنے کی بات نہیں کر رہی۔ تمہارے سامنے کی بات کر رہی ہوں۔“ عورت نے کہا۔

میں بری طرح چونک پڑا۔ ”کیا مطلب؟ کس کی بات کر رہی ہو؟“

”اپنی اور کس کی؟“

”کیا؟“

”ہاں۔“ اس نے شرمانے کی کوشش کی۔ ”جیسے تم ہو۔ میں بھی تو ویسی ہی ہوں۔ دوسرے شوہر کی موت کے بعد اکیلی ہو کر رہ گئی ہوں۔“

”معاف کرنا۔ ابھی میرے حالات اتنے برے نہیں ہوئے کہ تم سے شادی کر لوں۔“ میں نے جل کر کہا۔

اس دن کے بعد اس نے مجھ سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ بہت دنوں تک دکھائی نہیں دی اور آج وہ اس خوب صورت لڑکی سے باتوں میں مصروف تھی۔

میں اس لڑکی کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا تھا۔ کیا لڑکی تھی۔ کم از کم اس پورے محلے میں تو اس جیسی کوئی نہیں ہوگی۔

اس میں صباحت، ملاحت، قیامت سب کچھ تھی۔ اس سے پہلے وہ نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر اس عورت کو مخاطب کیا۔ ”کیا حال ہیں تمہارے؟“

اس عورت نے مجھے دیکھ کر برا سا منہ بنا کر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا جبکہ اس لڑکی نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

میں اپنے دروازے کا تالا کھول کر گھر میں داخل ہو گیا۔ اس لڑکی کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں اس کے پڑوس میں رہتا ہوں۔

اب اس لڑکی کے بارے میں کیسے معلوم کیا جائے۔ میرے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ذہن کی ایسی کیفیت تھی جیسے ہوا میں اڑتا چلا جا رہا ہوں۔

مجھے اپنے دوست تسنیم کا خیال آ گیا۔ اس میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہ پورے محلے کی خبر رکھتا تھا۔

اس شعلہ جوالا کے بارے میں بھی وہ خوب جانتا ہوگا۔ میں کچھ دیر بعد اپنے گھر سے باہر آ گیا۔ وہ لڑکی اب دروازے پر نہیں تھی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور رشتے والی خالہ کا بھی دور دور تک پتا نہیں تھا۔

میں تسنیم کے گھر کی طرف چل دیا۔

میں جانتا تھا کہ تسنیم گھر پر ہی ملے گا اور ہوا بھی یہی۔ وہ گھر پر ہی تھا۔

دستک دینے پر جب وہ گھر سے باہر آیا تو میں اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ تسنیم کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”ارے کیا ہوا تمہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا، بخار تو نہیں ہے۔“

”نہیں، نہیں۔ کوئی بخار نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”پھر تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟“

”ارے، یہ تو عبادت کی سرخی ہے۔“ تسنیم نے بے نیازی سے کہا۔ ”رات بھر جاگ کر عبادت جو کرتا ہوں۔ حضرت جی نے کچھ وظائف بتائے ہیں بس آج کل یہی مشغلہ ہے۔“

”اس چکر میں بیمار نہ ہو جانا۔“

”تم لوگ ان باتوں کو کیا جانو۔ خیر یہ بتاؤ مجھ فقیر کے دروازے پر کیسے آنا ہوا؟“

وہ بالکل ترک دنیا والے درویشوں کے انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ چہرے پر بے پناہ بے نیازی کی کیفیت تھی۔ ظاہر ہے اب اسے ایسی خبروں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس کی تو راہیں کچھ اور ہو گئی تھیں۔

”یار! معاف کرنا تم کو زحمت دی۔“ میں نے کہا۔ ”میں یونہی آ نکلا تھا۔“

”نہیں کوئی بات ضرور ہے، بتاؤ۔ ہم فقیر یونہی خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے۔“

”یار! تمہیں بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔“

”اوہو، بتا بھی دو۔ یہ دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہے۔ یہاں تکلف نہیں چلتا۔ یہ خانۂ بے تکلف ہے۔“ وہ بالکل منجھے ہوئے بزرگوں کے انداز میں باتیں کرنے لگا تھا۔

”یار میں دراصل اس لڑکی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا جو میرے پڑوس میں آ کر آباد ہوئی ہے۔ کون لوگ ہیں؟ کیا ہیں؟“

"ہونہہ۔" تسنیم حقارت سے مسکرا دیا۔ "جوگی سے اور جگ کی باتیں۔"

"اسی لیے تو تم سے نہیں پوچھ رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اچھا نہیں لگ رہا تھا مجھے۔"

"خیر اب اتنی مایوسی بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس لڑکی کا نام جولین ہے۔ کرسچن فیملی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اس کا باپ سلوا کسی دفتر میں اچھی پوسٹ پر ہے۔ لڑکی کی ایک خالہ کسی زمانے میں پاکستانی فلموں میں کام کر چکی ہے۔ اس کی پھوپی نے پچھلے سال اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ اب دونوں میں علیحدگی ہو چکی ہے۔ لیکن تم مجھے گناہ گار نہ کرو۔ میں نے اب ایسی باتوں پر دھیان دینا چھوڑ دیا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے گردن ہلائی۔ "ویسے وہ لڑکی خود کیا کرتی ہے؟"

"تم نے مارٹا برادرز کا نام سنا ہے؟"

"ہاں، دواؤں کے اسٹاکسٹ ہیں۔"

"بالکل وہی۔ جولین وہیں کام کرتی ہے۔ شاید باس کی سیکریٹری ہے۔ بہت اچھی آواز ہے اس کی۔ گٹار بھی بجا لیتی ہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے بہت معلومات فراہم کر دیں۔"

"ہم فقیر لوگوں سے زیادہ توقع نہ رکھو۔ ہم دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ دنیا میرے پڑوس میں آباد ہے مگر اپنی دعا سلام نہیں اس فی میل سے۔"

"واقعی دعا سلام نہ ہونے پر یہ حال ہے کہ تم اس کے پورے خاندان تک کا شجرہ اٹھا لائے۔" میں نے کہا۔ "اگر دعا سلام ہوتی تو شاید اس کے بیڈروم تک گھس جاتے۔"

اس فتنے کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ اب سوال یہ تھا کہ ان معلومات سے فائدہ کیسے اٹھایا جائے؟

میں اس درویش صفت انسان سے اجازت لے کر گھر واپس آ گیا۔ راستے میں ہی ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ یہ لوگ فاسٹ، بے تکلف اور بے دھڑک قسم کے معلوم ہوتے تھے۔ اس کا اندازہ اس لڑکی کے لباس سے ہی ہو گیا تھا۔ ایسے لوگ راہ و رسم بڑھ جانے پر ناراض بھی نہیں ہوتے۔

یہ سوچ کر میں نے گھر آنے کی بجائے بیکری کا رخ کیا اور ایک اچھا سا کیک خرید کر اپنے گھر واپس آ گیا۔ گھر آ کر میں نے اس کے دو حصے کیے۔ ایک حصے کو ایک ٹرے میں رکھا اور ہمت کر کے لڑکی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک کے جواب میں اسی لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔

وہ اپنے دروازے پر مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "اوہ مین، میں نے تم کو کہیں دیکھا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں، آج ہی دیکھا ہوگا۔ میں تمہارے پڑوس میں رہتا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "آج میری برتھ ڈے ہے۔ اکیلا آدمی ہوں اسی لیے میں نے سوچا کہ تھوڑا کیک تمہارے یہاں بھی دے دوں۔ کیونکہ تم ہمارے پڑوس میں آئے ہو۔"

"اوہ شیور۔ میں جولین ہوں۔" اس نے بتایا۔

"میں افضل ہوں۔" میں نے کیک کی ٹرے اس کی طرف بڑھا دی۔

"تھینک یو اینڈ ہیپی برتھ ڈے مسٹر افضل۔" اس نے کہا۔ "آؤ اندر آ جاؤ۔"

میں تو اسی قسم کی دعا کر رہا تھا جو بہت جلدی قبول بھی ہو گئی تھی۔ وہ مجھے کمرے میں لے آئی۔ بہت سلیقے سے سجا ہوا ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔

ایک طرف یسوع مسیح اور بی بی مریم کی خیالی تصویریں تھیں۔

اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے ساتھ صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ مسٹر افضل۔"

میں شکریہ ادا کرتا ہوا بیٹھ گیا۔

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟" اس نے پوچھا۔

"میرا گھر بچوں کے بغیر ہے۔" میں نے کہا۔ "اور بچوں کے بغیر اس لیے ہے کہ بیوی نہیں ہے اور بیوی اس لیے نہیں ہے کہ میں نے شادی نہیں کی اور شادی اس لیے نہیں کی کہ آج تک کوئی ڈھنگ کی لڑکی نہیں ملی۔"

"انٹرسٹنگ۔" وہ ہنس پڑی۔ "اور تمہارے پیرنٹس وغیرہ؟"

"کوئی نہیں۔ اکیلا ہوں۔"

"اوہ، سوری۔"

"نہیں نہیں، اس میں سوری کی کیا بات ہے۔" میں جلدی سے بولا۔ "میرے تنہا ہونے میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔

یہ تھی جولین سے پہلی ملاقات۔ اس کے بعد اس سے

ملاقاتیں ہوتی رہیں جو عام طور پر گھر کے دروازے پر ہو جاتی تھیں۔ جب وہ اپنے دفتر سے واپس آتی تو میں بھی کسی نہ کسی بہانے اپنے دروازے پر آ جاتا اور ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگتیں۔

اس دوران میں اس کے گھر والوں سے بھی سلام دعا ہو چکی تھی۔ وہ سب مجھے پسند کرنے لگے تھے۔ اس کی شاید یہ وجہ تھی کہ میں ان کا ایسا پڑوسی تھا جس نے ان سے سلام دعا رکھی تھی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں کئی بہانوں سے ان کے یہاں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں پہنچا چکا تھا۔ ایک بار تو اماں کی برسی کا کھانا۔ دوسری بار ابا کی برسی کا۔ تیسری بار اپنی کسی خالہ کی برسی کا۔ جو مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک بار جولین نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ "مسٹر افضل! یہ تم اپنے مر جانے والوں کو اتنا کیوں یاد رکھتے ہو؟"

"اس لیے کہ یہ بھی مجھے بھلا نہیں سکے ہیں۔" اس وقت میرا لہجہ بہت دانشورانہ اور کھویا کھویا سا ہو گیا تھا۔ "جب میں تنہا ہوتا ہوں تو ان کی یادیں میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میرا دل بہلاتی ہیں۔ مجھ سے باتیں کرتی ہیں۔"

"شاید تم اپنی تنہائی کو بہت فیل کرنے لگے ہو۔"

"ہاں، شاید ایسا ہی ہو۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" اس نے پوچھا۔

"شادی کے لیے لڑکی کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ لڑکی کا باذوق اور خوش مزاج ہونا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "دونوں کے درمیان ذہنی انڈر اسٹینڈنگ ضروری ہے۔ ورنہ ایسا ہی ہے جیسے کسی روبوٹ کے ساتھ زندگی گزار لی جائے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے میری تائید کی۔ "دونوں کا مینٹل لیول ایک ہونا چاہیے۔"

اب ہمارے درمیان اس قسم کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

ایک بار میں نے اس سے فون پر کہا۔ (ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے موبائل نمبر دے دیے تھے) "جولین آج میں بہت اداس ہوں۔"

"تو پھر؟"

"کیا تم میرے ساتھ باہر چلنا پسند کرو گی؟"

"کہاں؟"

"سی ویو پر جا کر بیٹھ جائیں گے اور سمندر کی لہروں کو دیکھتے رہیں گے۔ وہ لہریں جو خود میرے وجود میں بھی اٹھتی ہیں۔ سمندر کی آوازیں سنیں گے۔ ان سے اپنے دل کی باتیں کہیں گے اور واپسی میں کہیں ڈنر کر کے گھر واپس آ جائیں گے۔"

"لیکن..." وہ کچھ ہچکچانے لگی۔

"اوہ، میں سمجھ گیا۔" میں جلدی سے بولا۔ "ظاہر ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو زیادہ نہیں جانتے۔ تمہارے پڑوس میں رہنے سے کیا ہوا۔ آخر ہوں تو اجنبی۔"

"اوہو، نہیں مسٹر افضل۔" اس نے کہا۔ "میں کسی کو اداس نہیں دیکھ سکتی۔ یہ میری کمزوری ہے۔ میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ۔"

کچھ دیر بعد وہ میرے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

آج اس نے بہت خوب صورت ڈریسنگ کر رکھی تھی اور بہت اچھا سا پرفیوم بھی لگا رکھا تھا۔ وہ جس وقت میری بائیک پر بیٹھ رہی تھی اس وقت تسنیم بھی اس طرف آ نکلا۔

وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ خاص طور پر جولین کو میرے ساتھ بائیک پر بیٹھا دیکھ کر... میں نے بائیک لہراتے ہوئے آگے بڑھائی اور اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔

اس وقت میرا دل خوشی سے رقص کر رہا تھا۔

پہلی بار کوئی خوب صورت لڑکی میرے ساتھ میری بائیک پر بیٹھی تھی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس بائیک کو بادلوں میں لے جاتا۔ مریخ اور چاند پر جا کر چلاتا لیکن افسوس شہر کی سڑکیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ قدم قدم پر ٹریفک جام چل رہا تھا۔

میں عام طور پر جب بھی ٹریفک جام میں پھنستا ہوں، زور زور سے گالیاں دینے لگتا ہوں۔ شہر کی سڑکوں کو۔ بے ہنگم ٹریفک کو۔ لیکن اس وقت چونکہ ایک حسینہ میرے ساتھ تھی اسی لیے میں نے اپنی زبان پر قابو رکھا تھا۔ ورنہ دل تو بہت کچھ چاہ رہا تھا۔

بہر حال ہزار خرابیوں کے بعد ہم سی ویو پہنچ ہی گئے۔

یہاں آ کر میں نے پھر اپنے چہرے پر ایک دانشورانہ اور اداسی بھری کیفیت طاری کر لی۔ ہم ایک طرف بیٹھ کر سمندر کی طرف دیکھنے لگے۔

”دیکھو جولین! جانتی ہو آج یہ سمندر مجھ سے کیا کہہ رہا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، میں سمندر کی زبان نہیں جانتی۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”یہ کہہ رہا ہے کہ آج تم نے اپنی تنہائی کی جھیل میں پہلا پتھر پھینک دیا ہے، لہریں پیدا ہونے لگی ہیں۔ دیکھو اس سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دینا، پتھر پھینکتے رہنا۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”اس سے یہ ہوگا کہ لہریں بڑھتے بڑھتے تمہارے اتنے قریب آجائیں گی کہ تم ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو بھی سکتے ہو۔“

”مسٹر افضل! آپ کسی کو اپنا ساتھی کیوں نہیں بنا لیتے؟“

”اسی کی تو کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی۔

اس نے شرما کر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ کچھ بھی ہو وہ ایک مشرقی لڑکی تھی اور مشرقی لڑکیاں اسی طرح شرمایا کرتی ہیں۔

”جولین یہ بتاؤ، کیا تم نے کسی کو اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے؟“

”نہیں ابھی تک نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”افضل صاحب! میں ایک دوسرے مزاج کی لڑکی ہوں۔ ویسے میں کسی کو اداس نہیں دیکھ سکتی۔ کوشش کرتی ہوں کہ اس کا ساتھ دوں۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھوں لیکن کسی کو اس بات کا موقع نہیں دیتی کہ وہ الٹی سیدھی باتیں سوچ لے۔ خواب دیکھنے لگے کیونکہ خواب ٹوٹ جائیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔“

”پھر بھی کسی نے کوشش تو کی ہوگی؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ اس نے صاف دلی سے بتا دیا۔ ”دو آدمی تھے اور وہ دونوں ہی بہت اچھے تھے لیکن میں ان دونوں کا ساتھ نہیں دے سکی۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ دونوں ہی میرے مذہب کے نہ تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”مسلمان تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں بھی مسلمان ہو جاؤں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ میں اپنا مذہب کیسے چھوڑ دیتی؟“

”اس لیے تم نے منع کر دیا۔“

”ہاں اسی لیے۔“ اس نے بتایا۔ ”مجھے بہت دکھ بھی ہوا تھا لیکن افضل صاحب! میں ایک کرسچن لڑکی ہوں۔ مجھ پر یسوع مسیح اور کنواری مریم کا سایا ہے۔ میں ان سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔“

اس نے باتوں باتوں میں مجھے بتا دیا تھا کہ اس کا جیون ساتھی کون ہو سکتا ہے۔ وہ شخص جو اس کے اپنے مذہب کا ہو۔

بہرحال میرے لیے اس وقت اتنا ہی کافی تھا کہ وہ میرے ساتھ تھی اور ہم سمندر کی لہریں دیکھ رہے تھے۔

بہت دیر بعد ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔ اس وقت اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”افضل! تم ایک اچھے انسان ہو، لیکن...“

لیکن کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ مطلب یہ تھا کہ تم اچھے ہو۔ لیکن تمہارا مذہب مجھ سے بہت مختلف ہے اسی لیے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔

لیکن کم از کم اتنا تو ہوا کہ ہم ایک قدم آگے بڑھ آئے تھے۔ اس کے دل میں میرے لیے گنجائش تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے جتلا دیا تھا کہ میں اس کی نگاہوں میں ایک اچھا انسان ہوں۔ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔

واپسی میں پروگرام کے مطابق ہم ایک ہوٹل پر رک گئے۔ وہ اس وقت کسی بچے کی طرح خوش دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے اپنی پسند کے آرڈر دیے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”جولین! میں نے سنا ہے کہ تم گاتی بھی ہو اور گٹار بھی بجاتی ہو۔“

”ارے، یہ تم نے کس سے سن لیا؟“

”بس پتا چل گیا تھا۔ یہ بتاؤ سچ ہے یا نہیں؟“

”ہاں سچ ہے۔“ اس نے گردن ہلا دی۔ ”کسی دن تمہیں بھی سناؤں گی۔“

”ضرور۔ اس دن میرے گھر میں تمہاری خوب صورت آواز کے پھول کھل جائیں گے۔“

”تم باتیں بہت اچھی کر لیتے ہو۔“

”بس، ان باتوں نے ہی تو زندہ رکھا ہوا ہے۔“

ہم بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر جب اس نے یاد دلایا کہ ہمیں بہت دیر ہو چکی ہے تو مجھے ہوش آگیا۔

ہم گھر واپس آگئے۔

اس رات میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ کیا کروں؟ کیا

نہ کروں۔ میں نے ایک پلڑے میں جولین کو بٹھایا اور دوسرے میں اپنے مذہب اور عقیدے کو تو خدا معاف کرے، مذہب اور عقیدے کا پلڑا ذرا ہلکا ہی محسوس ہوا۔ کیونکہ ابھی تک میں صرف نام ہی کا مسلمان تھا۔ دو جمعوں کی نمازیں بھی مولوی صاحب کی باتیں سن کر پڑھ لی تھیں۔ اس کے علاوہ ابھی تک ایسا کوئی کام نہیں کر سکا تھا جس پر میرے مسلمان ہونے کا پتا چل سکتا۔

فرض کرو اگر میں مسلمان سے عیسائی ہو بھی گیا تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ مسلمان ہونے سے کیا فرق پڑ رہا تھا جو عیسائی ہونے سے ہو جاتا۔

مجھے کون سا چرچ جانا تھا، جو آدمی زندگی بھر کبھی مسجد نہ گیا ہو وہ دو دن کی عیسائیت میں چرچ کیسے چلا جاتا۔ اور جہاں تک نام کا تعلق تھا تو نام سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔ افضل نہ سہی۔ ڈیوڈ سالومن سہی اور ویسے بھی مجھ پر انگلیاں کون اٹھاتا۔ خاندان والے تو تھے نہیں۔ دفتر والوں کو اس سے کیا غرض ہو سکتی تھی کہ میں کون ہوں۔ افضل ہوں یا جانسن ہوں۔ انہیں تو مجھ سے کام لینا تھا۔ چاہے کسی بھی نام سے کرتا رہوں۔

یہ سوچ کر میں نے اس رات کرسچن ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عجیب خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ صبح اٹھ کر میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ انگریزی گانوں کے کیسٹ لگا دیے۔ ابا۔ بون ایم سے لے کر مائیکل جیکسن اور میڈونا تک کو سنتا رہا۔

یہاں میں یہ بتا دوں کہ اس قسم کی موسیقی سننا میرا شوق رہا ہے۔ اس کا مذہب کے بدلنے یا نہ بدلنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں ابھی جولین کو یہ خوش خبری نہیں سنانا چاہتا تھا۔ پہلے میں ہو جاتا۔ اپنا نام بدلتا۔ میں نے نام بھی سوچ لیا۔ وکٹر۔ وکٹری سے وکٹر۔ فتح یاب۔ تو میں جب وکٹر بن کر اس کے پاس جاتا تو وہ کتنا خوش ہوتی۔

اب اس بات کی تلاش تھی کہ کرسچن ہونے کا پروسیجر کیا ہوتا ہے۔ مسلمان ہونے کا تو بہت آسان ہے۔ بس کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہو گئے۔ لیکن کرسچن ہونے کے لیے کیا کرتا؟

چرچ جانا چاہیے۔ وہیں سے بتایا جائے گا یا ہو سکتا ہے کہ وہی لوگ کرسچن بنا دیں۔ شہر میں ویسے تو کئی چرچ تھے لیکن میں سب سے بڑے چرچ پہنچ گیا۔

محاورے باز

زبان کے ساتھ ہمیں محاورے بھی آباؤ اجداد اور بزرگوں سے ملے ہیں جن کی بنیادیں انسانی زندگی کے تجربے اور بیتی ہوئی باتیں ہیں۔ ہم جو آج کے دور میں جی رہے ہیں۔ اس دور میں بھی کچھ ایک محاورے روزمرہ کی زندگی کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر گڑھتے اور تراشتے رہتے ہیں جو ہماری زبان کے ایک اہم خلا کو پُر کرتے ہیں۔ زبان پر نئے محاورے آتے رہتے ہیں پرانے تو ساتھ دیتے ہی ہیں۔

فارسی زبان میں لفظ ”محاورہ، مکالمہ“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس بات میں کسی طرح کا کوئی شک نہیں کہ کسی بھی زبان کے محاوروں میں اس ملک کے رسم و رواج، تہذیب صدیوں کی سوچ اور WISDOM گھلی ہوتی ہے۔

اقتباس: محاورے باز از منظور الامین

گیٹ پر ایک مقامی بندہ ہی گارڈ بنا ہوا کھڑا تھا۔

”ہاں بھائی، کس سے ملنا ہے؟“

”فادر سے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا نام ہے؟“

”وکٹر... وکٹر میتھیوز۔“ میں نے اپنے نام کے ساتھ ساتھ اپنے بے چارے مرحوم باپ کا نام بھی بدل دیا تھا۔

”جاؤ وہ سامنے والے کمرے میں۔ دالان کے ساتھ۔“

میں دالان کے ساتھ والے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس وقت وہاں کا فادر اپنے روم میں بیٹھا کوئی حساب کتاب کر رہا تھا۔ میرے دستک دینے پر اس نے آواز لگائی۔

”آجاؤ۔“

میں روم میں داخل ہوا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ”بیٹھو مسٹر!“

میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”یس، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”فادر! میں اپنا مذہب بدلنے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کیا؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”تم کیا ہو؟“

"ویسے تو مسلمان ہوں لیکن صرف نام کا۔" میں نے بتایا۔ "اور اب کام کا مسیحی ہونا چاہتا ہوں۔"

"کس لالچ میں مذہب بدل رہے ہو کسی ملک کا ویزا چاہیے؟"

"نو فادر! مجھے اپنا ملک بہت پسند ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"اپنی خوشی سے ہو رہے ہو یا کسی نے دباؤ ڈالا ہے؟"

"نہیں فادر! مجھ پر کون دباؤ ڈالے گا۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی خوشی سے ہو رہا ہوں اور آپ یہ مت سمجھیے گا کہ یہاں کسی نے مجھے جاب وغیرہ کی آفر دی ہو گی۔ ایسی بات بھی نہیں ہے۔ بہت اچھی جاب ہے میرے پاس۔ میں بہت خوش ہوں۔"

"تو پھر کسی لڑکی نے کہا ہوگا۔"

"نہیں فادر، بالکل نہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "ویسے فادر سچ تو یہ ہے کہ اس کہانی میں ایک لڑکی بھی انوالو ہے لیکن اس بے چاری نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ یہ میں اپنی مرضی سے کر رہا ہوں۔"

"یعنی تم اس لڑکی کو خوش کرنے کے لیے مذہب بدل رہے ہو؟"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"جب تم اس لڑکی کو خوش کرنے میں لگے رہو گے تو مقدس باپ کو کیسے خوش کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کی فکر نہ کریں۔ میں مقدس باپ کو پورا پورا ٹائم دوں گا۔ میں نے تو اپنا نام تک سوچ لیا ہے۔ وکٹر، وکٹر میتھیوز۔"

"اور میتھیوز کون ہیں؟"

"میرے باپ۔"

"اوہ تو تمہارا فادر کرسچن تھا؟"

"نہیں فادر، وہ بے چارے تو مسلمان تھے۔"

"تو پھر تم ان کا نام کیوں بدل رہے ہو؟"

"صرف وکٹر تو اچھا نہیں لگے گا نا۔ وکٹر کے ساتھ کچھ اور بھی ہونا چاہیے تھا۔"

"تو پھر تم وکٹر منڈے مسیح ہو جاؤ۔ اس لیے کہ تم منڈے کے دن میرے پاس آئے ہو۔"

"بالکل ٹھیک ہے فادر۔ وکٹر منڈے۔ نام بھی اچھا لگ رہا ہے۔"

"لیکن تم کو ہر جگہ سے یہ نام چینج کرانا ہوگا۔ شناختی کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ۔"

"یس فادر، یہ سب میں نے سوچا ہوا ہے اخبار میں اشتہار دے دوں گا۔"

"اوکے۔"

اس کے بعد کچھ معمولی سی رسومات ہوئیں اور میں چرچ سے فارغ ہو گیا۔ اس نے مجھے بہت سی دعائیں دی تھیں۔

چرچ میں داخل ہوتے ہوئے میں افضل تھا۔ اب وکٹر منڈے ہو کر واپس جا رہا تھا۔

میں نے راستے سے کچھ پھول اور ایک کیک خرید لیا۔ سب سے پہلے جولین ہی کو یہ خبر سنانی تھی۔ میں نے اپنی بائیک ٹھیک اس کے گھر کے سامنے کھڑی کی۔

جولین خود ہی دروازے پر آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح خوش ہو گئی تھی۔ "آؤ... آؤ... اندر آؤ۔"

"پہلے یہ رکھ لو۔" میں نے پھول اور کیک اس کی طرف بڑھا دیے۔

"جولین! یہ تحفہ تمہیں افضل نہیں بلکہ وکٹر منڈے دے رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"کون وکٹر منڈے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں، میں نے اپنا مذہب بدل لیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں وکٹر منڈے ہو گیا ہوں۔"

"گاڈ بلیس یو..." اس نے کہا۔

"جولین! اب تو تم مجھے اپنا جیون ساتھی بنا سکتی ہو نا؟"

"ہرگز نہیں۔ ہزار بار نہیں۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ "پکڑو اپنے یہ تحفے۔ مجھے وہ لوگ بالکل پسند نہیں ہیں جو اپنا مذہب بدل لیں۔"

"جولین! یہ... یہ تم کہہ رہی ہو۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ لعنت بھیجتی ہوں ایسے بندے پر... ارے جو شخص اپنے مذہب کا نہیں ہو سکا۔ وہ کسی لڑکی کا کیا ہوگا۔ جب تم اپنے مذہب سے بے وفائی کر سکتے ہو تو کسی اور سے بے وفائی تمہارے لیے کیا مشکل ہے۔ دفع ہو جاؤ اور آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش بھی مت کرنا۔"

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا اور میں یہ سوچتا ہی رہ گیا کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

انجام ہوس

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
ایک اہم سرگزشت روداد بھیج رہا ہوں۔ اگر سرگزشت کے معیار کی ہو تو ضرور شائع کر دیجیے گا۔

محمد حنیف قادری
(پنڈی بھٹیاں، حافظ آباد)

اس وقت میں شبو کے ساتھ چوہدری بشیر گجر کے کھیت میں موجود تھا۔ دو مربع اراضی پر پھیلا ہوا یہ کماد کا کھیت ہمارے لیے بہترین جائے پناہ تھی۔ میرے پیچھے ..... چار اضلاع کی پولیس لگی ہوئی تھی۔ میں شبو کے ساتھ پچھلی رات سے بھاگ رہا تھا۔ کسی حرام خور غدار نے میرے دشمنوں سے رقم لے کر اس وقت مخبری کر دی تھی جب میں شبو کے ساتھ ابھی جیپ پر سوار ہوا ہی تھا مگر قسمت کی خرابی یہ ہوئی کہ میری جیپ کے ٹائر بھی پنکچر ہو گئے یا کر دیے

تھے۔ اب وہاں سے بھاگنے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ رات کے تقریباً ایک بجے کا عمل تھا، ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ یہاں تک کہ اگر ہوا سے ایک پتا بھی ہلتا تو اس کا بھی خاطر خواہ شور ہوتا۔ ہم نے سردی سے بچنے کے لیے موٹے کمبلوں کی بکل مار رکھی تھی۔ ابھی ہم گاؤں سے تقریباً دو کلومیٹر کی دوری پر تھے کہ گاؤں کی طرف شور بلند ہوا اور فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ فائرنگ اور للکاروں کی آوازوں کے ساتھ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ شور سے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے پورا گاؤں ہی میرے تعاقب میں اُمڈا چلا آرہا ہو۔ شبّو میرے ساتھ سہمی ہوئی چلی آرہی تھی۔ اس نے اچانک میرا ہاتھ پکڑا اور انتہائی سراسیمگی کی حالت میں کہا۔

’’نصری اب کیا ہوگا۔ وہ لوگ جلد ہی ہمارا کُھرا پکڑ لیں گے اور ان کے پاس گھوڑے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ہمارے سر پر ہوں گے اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ زمان خان اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ تم تو ہو ہی اشتہاری، تمہیں وہ پولیس کے حوالے کردے گا اور کیا پتا وہ تمہیں مار کر ہی پولیس کو خبر کرے اور مجھے کاری کردے۔‘‘

’’نہیں شبّو میری جان!‘‘ میں نے جلدی سے اس کے منہ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ’’ایسا سوچنا بھی مت شبّو، اس سے پہلے کہ کوئی تمہاری طرف میلی نظر سے دیکھے، میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا۔ تم نے ایک مرد کا ہاتھ پکڑا ہے کسی زنخے کا نہیں۔ میں اس خدا سے ڈر کے کہتا ہوں کہ کسی ماں نے ابھی تک کوئی ایسا بیٹا پیدا نہیں کیا ہے جو کہ نصری کا راستہ روک سکے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ میرا رب میرے صدق اور یقین کو دیکھ رہا ہے۔ مجھ پر نہیں تو میرے رب پر یقین رکھو۔‘‘

’’تمہاری یہی باتیں تو میرا حوصلہ ٹوٹنے نہیں دیتیں نصرت! اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔‘‘ شبّو نے ..... میرا ہاتھ ..... مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

شور قریب سے قریب تر آتا جارہا تھا۔ اب راستے میں موجود ڈیرے والے لوگ بھی جاگ چکے تھے اور انہوں نے بھی ہوائی فائرنگ شروع کردی تھی۔ اس وقت ہم گندم کی فصل کے کنارے بنے کھال میں چل رہے تھے۔ جلد ہی اگر ہمیں کوئی سواری نہ ملتی تو ہم یہاں پھنس کر رہ جاتے۔ شبّو کو تو میں تسلی دے چکا تھا مگر حقائق یکسر میرے خلاف جا رہے تھے۔ اچانک ہمارے پیچھے ایک اور شور کا اضافہ ہوا۔

یہ خونخوار..... کُتّوں کا شور تھا۔ یہ انتہائی خطرناک قسم کے سدھائے ہوئے کُتّے تھے جو کہ ہماری بُو پر ہمارے پیچھے لپک رہے تھے۔ ان کا شور ہمارے قریب سے قریب تر ہوتا جارہا تھا۔ آج اگر میں اکیلا ہوتا تو میرے لیے ان کُتّوں اور کُتّے نما انسانوں سے نمٹنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ مگر آج میری ایک کمزوری شبّو کی صورت میں میرے ساتھ تھی اور میں اسے کسی بھی حال میں ان بھیڑیوں کے درمیان چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، اس کے لیے مجھے اگر اپنی جان بھی دینی پڑتی تو میں ہنسی خوشی دے دیتا۔

کُتّے ہمارے عین سروں پر پہنچ چکے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرتے مجھے مجبوراً وہ فیصلہ کرنا پڑا جو میں ابھی کسی بھی حال میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے شبّو کو جلدی سے ایک درخت پر چڑھایا اور کُتّوں کی طرف گن سیدھی کر کے ایک لمبا برسٹ مارا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور کُتّوں کی مہیب چیخوں سے فضا گونج اٹھی۔ میری اس فائرنگ سے کُتّے تو حملہ کرنے کے قابل نہیں رہے مگر اس سے ایک نئی مصیبت کا آغاز ہوگیا۔ ہم ہائی لائٹ ہوچکے تھے۔ اچانک قریبی ڈیرے سے ہم پر فائرنگ کی گئی۔ میں نے پہچان لیا تھا کہ یہ ڈیرا نسیم گل کا ہے۔ اچانک میں نے ایک دلیرانہ فیصلہ کیا اور ڈیرے والوں کو للکارا۔

’’میں نصری ہوں۔ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے نسیم گل۔ میرے پیچھے میرے دشمن لگے ہوئے ہیں۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ یہ دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔

نسیم گل ایک چھوٹا زمیندار تھا اور امن پسند بندہ تھا، اسلحہ وغیرہ اس نے اپنے دفاع کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس نے میری بات سن لی تھی۔ اس نے شاید کسی کو جھڑکا اور اسے ڈیرے میں واپس جانے کے لیے کہا۔ اس کے بعد ڈیرے سے مجھ پر فائرنگ بند ہوگئی۔ نسیم گل نے اپنی آواز حتی الامکان نیچی رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

’’نصری پُتر! میرے بیٹے سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردینا۔ مگر تمہارے دشمن تو تمہارے سر پر پہنچ چکے ہیں۔ زیادہ باتوں کا وقت نہیں۔ سیدھا ڈیرے پر چلے آؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں یہاں کوئی کچھ نہیں کہے گا اور ذرا جلدی۔ وقت ضائع مت کرو۔‘‘

’’میں آرہا ہوں نسیم گل! مگر میرے ساتھ کوئی دھوکا کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ انجام کے تم خود ذمے دار ہو

گے۔‘‘ میں نے نسیم گل کو حتی الامکان ڈراتے ہوئے کہا۔

میں نے شبّو کو قریبی درخت سے اتارا اور اس کے ساتھ جلدی سے ڈیرے کی طرف بھاگا اور اسی وقت کسی نے پیچھے سے برسٹ مارا جو کہ میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے شبّو کو ڈیرے کی طرف بھگایا اور خود کھال میں لیٹ کر برسٹ مارنے والے کی لوکیشن کا اندازہ کیا، اتنے میں اس نے ایک اور حملہ کیا۔ میں نے جلد ہی اپنی لوکیشن تبدیل کرلی۔ دوسرے ہی لمحے گولیاں تڑتڑاتی ہوئی عین اس جگہ پہ کھال کی نرم زمین میں گھستی چلی گئیں جہاں میں چند لمحے پہلے لیٹا ہوا تھا۔ رات کے اس وقت جب اندھیرا ہر سُو پھیلا ہوا تھا اس کی کامیاب نشانے بازی اس کے ماہر ہونے کی غماز تھی مگر اس نے دوسرا برسٹ مار کے اپنی زندگی کی مہلت ختم کرلی تھی۔ اس کی لوکیشن واضح ہوچکی تھی۔ یہ بندہ کیکر کے درخت پر چڑھا ہوا تھا اور اسی لیے وہ مجھ پر کامیاب نشانے بازی کر رہا تھا۔ میں نے اسے کوئی موقع دیے بغیر اس کا نشانہ لیتے ہوئے ایک لمبا برسٹ داغا اور دوسرے ہی لمحے وہ شخص چیختا ہوا درخت سے نیچے آن گرا۔

میں جلدی سے ڈیرے کی طرف بھاگا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی نسیم گل نے کہا۔ ’’نصری پُتر! اللہ بخشے تمہارے والد صاحب کے مجھ پر بہت احسان ہیں اور اب اتنا وقت بھی نہیں کہ میں تم سے کوئی تفصیلی بات کرسکوں۔ شور قریب آچکا ہے۔ وہ لوگ جلد ہی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میری ون ٹو فائیو موٹر سائیکل بالکل تیار ہے۔ تم جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔‘‘

’’آپ کی بڑی مہربانی چاچا جی! خدا نے اگر مجھے زندگی دی تو میں آپ کے اس احسان کا بدلہ ضرور اتاروں گا۔‘‘ میں نے ممنونیت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم جلد ہی ڈیرے کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا وہاں ایک لڑکا موٹر سائیکل کے قریب کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرپل رائفل اور ایمونیشن کا ایک بھاری تھیلا بھی تھا جو اس نے میرے وہاں پہنچتے ہی موٹر سائیکل کے اسٹینڈ کے ساتھ باندھ دیا جبکہ ٹرپل ٹو رائفل مجھے تھما دی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، نسیم گل نے کہا۔

’’بیٹا! انکار مت کرنا۔ آگے جانے کیسے حالات ہوں۔ ہوسکتا ہے تمہیں ان کی ضرورت پڑے۔ یہ ساتھ لے لو۔ اس رائفل کا ہم نے لائسنس بھی نہیں بنوایا ہے لہٰذا تم اسے بے خوف استعمال کرسکتے ہو۔ میرا بیٹا بھی بڑی نہر تک تمہارے ساتھ جائے گا۔ وہاں سے آگے نہر کے دوسرے کنارے کے گاؤں میں اپنے دوست کے ہاں رات گزار کر صبح سویرے اپنے کالج چلا جائے گا۔ یہ سب میں اس لیے کر رہا ہوں تاکہ موٹر سائیکل کی غیر موجودگی تمہارے دشمنوں کو شک میں نہ ڈال دے اور تمہارے جانے کے بعد وہ مجھ سے دشمنی پر نہ اتر آئیں۔‘‘ اس کے بعد وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوا۔ ’’وسیم بیٹے! تم نے سنا میں نے کیا کہا؟ اسے نصرت مت سمجھو۔ یہ میرا بیٹا ہے تو اس ناتے سے یہ تمہارا بھائی ہے۔ اب تمہیں ان باتوں پر عمل کرنا ہے جو میں نے ابھی کی ہیں۔ نصری پتر اللہ حافظ! خدا کرے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔ میری دعائیں ہر دم تمہارے ساتھ ہیں۔ اب بھاگو یہاں سے۔ موٹر سائیکل بڑی نہر کی پٹڑی پر پہنچتے ہی اسٹارٹ کرلینا۔

’’چاچا جی! ایمونیشن تو میں رکھ لیتا ہوں مگر یہ ٹرپل ٹو رائفل آپ رکھ لیں، اس کی مجھے ضرورت نہیں۔ بہرحال آج کے اس احسان کو میں زندگی بھر بھلا نہیں پاؤں گا۔‘‘ میں نے ان سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

ان باتوں میں مشکل ہی سے ایک یا ڈیڑھ منٹ صرف ہوا ہوگا۔ للکار اور فائرنگ کی آواز اب ڈیرے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتے تھے۔ میں نے وسیم اور شبّو سے کہا کہ وہ نکلیں، میں ان کے پیچھے ہی موٹر سائیکل لے کر آرہا ہوں۔ میں جلدی سے اس طرف بڑھا جہاں ٹالی کے درخت کی تازہ کٹی ہوئی شاخیں پڑی تھیں۔ میں نے جلدی سے ٹالی کی ایک مناسب سی شاخ لی اور اسے موٹر سائیکل کے کیریئر سے باندھ لیا۔ چچا نسیم گل میرا مقصد سمجھ گیا تھا۔ میں پیدل ہی موٹر سائیکل کو بھگاتے ہوئے وہاں سے نکلا۔ تھوڑی دوری پر وسیم گل اور شبّو بھی بھاگتے... ہوئے جا رہے تھے۔ بڑی نہر کی پٹڑی ڈیرے سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور یہ فاصلہ ہمیں پیدل ہی طے کرنا تھا۔ اب صورتِ حال یوں تھی کہ مجھ سے کچھ فاصلے پر شبّو اور وسیم بھاگے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے میں موٹر سائیکل سمیت دوڑ لگا رہا تھا اور موٹر سائیکل کے پیچھے بندھی شاخ ہم سبھی کے کُھروں کو مٹاتی جارہی تھی۔ ون ٹو فائیو موٹر سائیکل کو ساتھ لے کر پیدل بھاگنا انتہائی مشکل کام تھا، کجا یہ کہ اس کے پیچھے میں نے ایک شاخ بھی باندھ رکھی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ میں خیریت سے یہ سب کرنے میں کامیاب رہا۔

بڑی نہر کی پٹڑی پر پہنچتے ہی میں نے ٹالی کی شاخ نہر میں گرا دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر ڈیرے کی طرف دیکھا تو مجھے ڈیرے پر کافی روشنیاں نظر آئیں۔ اب بھی وہ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ان کی للکاروں کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں مگر اب ہم مناسب فاصلہ طے کر چکے تھے۔ یہاں وسیم ہم سے جدا ہو گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ ابھی میں نے موٹر سائیکل گیئر میں نہیں ڈالی تھی کہ مجھے کافی دور پگڈنڈی پر گھوڑوں کے دوڑتے ہوئے ہیولے سے نظر آئے۔ لگتا تھا وہ میری راہ پر لگ چکے تھے۔ یا پھر وہ احتیاطاً ناکا بندی کرنے کی غرض سے آگے بڑھ رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے میرے محسن کے ساتھ...... اللہ نہ کرے میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہاں سے نکلنے والے ہر راستے پر پہرا بٹھا دیا جائے گا۔ میرا دشمن سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والا پاورفل شخص تھا۔ ایسے میں پولیس اس کے گھر کی باندی تھی۔ اشتہاریوں اور بدمعاشوں کی ایک فوج اس کے ساتھ تھی اور مجھے ڈھونڈنے میں تو وہ اپنا ہر ذریعہ استعمال کرتا کیونکہ میں ہی وہ کانٹا تھا جو کہ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

اس وقت میں ایک دفعہ تو ان کے چنگل سے نکل آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ون ٹو فائیو نہر کی پٹڑی پر پُرشور آواز کے ساتھ دوڑتی جا رہی تھی اور خدا کا شکر ہے کہ فی الحال دور دور تک میرے پیچھے کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہاں سے میری منزل تحصیل پور گاؤں تھی جہاں میرا ایک جگری دوست احمد یار سرگانہ رہتا تھا۔ میں اگر پکی سڑک استعمال کر سکتا تو یہ صرف دو ڈھائی گھنٹوں کا سفر تھا مگر آج کی رات یہ ناممکن سی بات تھی۔ آگے بڑی نہر پر سے پکی سڑک پل کی صورت میں گزر رہی تھی۔ وہاں رات کے اس وقت پولیس کا پہرا ہوتا تھا۔ رات کے تین بج چکے تھے اور اس وقت سبھی ناکوں پر پولیس تقریباً سو رہی ہوتی تھی۔ اس سردی میں پولیس کا ناکے پر پایا جانا تو محال تھا مگر یہ بہت بڑا رسک تھا اگر وہاں پولیس موجود ہوئی تو؟ اور وہ لوگ جاگ بھی رہے ہوئے تو؟ اور ایسا صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب زمان خان نے اوپر والوں کو فون کر کے بتا دیا ہو اور اوپر والوں نے ہدایات نچلے عملے تک ٹرانسفر کر دی ہوں۔ یہ موبائل اور انٹرنیٹ کا دور ہے اس میں سبھی کچھ ممکن ہے۔ مگر ایک لمبے چکر سے بچنے کے لیے میں نے اللہ پاک کی ذات پر بھروسا کرتے ہوئے نہر کی پٹڑی پر سفر جاری رکھا۔

جلد ہی ہم ناکے تک پہنچ گئے۔ میں نے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں دیکھا، ناکا سنسان پڑا تھا بیریئر کے ساتھ ہی ایک کتا پڑا سو رہا تھا۔ موٹر سائیکل کے شور اور آنکھوں میں روشنی پڑنے کی وجہ سے وہ یک دم اٹھا اور ہم پر بھونکنے لگا۔ بیریئر کے قریب خالی جگہ سے میں نے بڑے آرام سے موٹر سائیکل نکالی اور پکی سڑک پر ڈال دی۔ مگر جونہی میں راستے میں آنے والا پہلا موڑ مڑا پولیس والوں کی موبائل وین سامنے سے تیزی سے آتی نظر آئی۔ یا اللہ خیر! یہ بلا اچانک کہاں سے نازل ہو گئی؟ مجھے لگتا تھا کہ ان لوگوں کو سوتے سے ایمرجنسی میں اٹھایا گیا تھا۔ اب اسپیڈ کم کرنا یا رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ بالکل میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے اسی رفتار سے موٹر سائیکل دوڑانا جاری رکھا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے رکنے کا اشارہ کرتے، میں زن سے ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ کچھ دور جا کر میں خوشی سے چلایا۔ وہ مارا شبّو رانی۔ میرے یہ کہتے ہی شبّو نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس نے سراسیمگی کی حالت میں کہا۔

''موٹر سائیکل کی اسپیڈ بڑھاؤ، وہ لوگ وین پیچھے موڑ رہے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ وہ ہمارے ہی پیچھے آئیں گے۔''

''آنے دو جانِ من! انہیں آنے دو۔ کم از کم ہم اس وقت ان کی فائرنگ رینج سے باہر ہیں۔''

اتنے میں فضا میں تیز سائرن کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی پولیس والوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی۔ مگر سب بے سود۔ میں نے ون ٹو فائیو موٹر سائیکل کی اسپیڈ بڑھائی اور ان سے دور ہوتا چلا گیا۔ لحہ بہ لحہ پولیس اور میرے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ کیونکہ ان کی وین میری موٹر سائیکل کی اسپیڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ لگتا تھا کہ وسیم گل نے اس کی اسپیڈ کے ساتھ بھی کچھ کیا ہوا تھا کیونکہ اس موٹر سائیکل کی اسپیڈ عام ون ٹو فائیو سے زیادہ تھی۔ آج کل کے لڑکے جانے کیا کیا کرتے رہتے تھے مگر اس سب کا فائدہ مجھے ہو رہا تھا۔ آگے ایک یوٹرن تھا اور اس یوٹرن کے بالکل درمیان میں ایک چھوٹا سا پٹرول پمپ تھا۔ گو کہ اس وقت جب کہ شبّو میرے ساتھ تھی یہ بہت رسکی تھا مگر رسک لیے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے یک لخت موٹر سائیکل کی اسپیڈ کم کی اور موٹر سائیکل پٹرول پمپ کے پیچھے بنے کمروں کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگا کر روک دی۔ شبّو میرے اس پاگل پن پر حیران تھی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ میں بہت عرصے سے پولیس والوں کے ساتھ یہ چوہے بلی والا کھیل کھیل رہا تھا اور اس میدان کا بہت پرانا کھلاڑی تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج میں شبّو کی وجہ سے کافی پریشان تھا اور چوہے بلی کا یہ کھیل جلد از جلد ختم کرنا چاہتا تھا۔

پولیس موبائل نمودار ہوئی اور جلد ہی یوٹرن کی نذر ہو گئی۔ ان لوگوں نے پٹرول پمپ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ جونہی آگے نکلے، اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے پٹرول پمپ میں سوئے ہوئے شخص کو جگایا۔ رات کے اس پہر اس لوکل روڈ پر کون آتا تھا اس لیے وہ لوگ رات کے دس بجے ہی سیل بند کر کے سو جاتے تھے مگر میری اس پٹرول پمپ کے مالک سے دوستی تھی۔ اس نے شیشے کے اندر سے مجھے دیکھا تو وہ حیران ہوتا ہوا باہر نکل آیا۔

''نصری بھائی! خیریت، رات کے اس پہر۔ اس نے آگے بڑھ کے مجھے جپھی لگائی۔

''ایک تم ہی تو ہو جہاں میں دیر سویر ہو تو بے خوف چلا آتا ہوں۔ پٹرول پمپ کے پیچھے میری موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ اسے کہیں چھپا دو۔ وسیم گل نامی بندہ لینے آئے گا میرے گاؤں سے۔ شناختی کارڈ دیکھ کر اسے دے دینا۔ اور مجھے تمہاری گاڑی چاہیے ٹنکی فل کر کے میرے حوالے کر دو۔''

قصہ مختصر میں نے اس سے گاڑی لی اور واپس روڈ کی طرف نکل گیا۔ اس گاڑی کا انجن بھی بہت شاندار تھا۔ جلد ہی میں مین روڈ پر جا نکلا۔ اب میں نے اسپیڈ بڑھائی اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔

☆☆☆

کئی غیر معروف راستوں سے ہوتا ہوا میں ایک گاؤں میں اپنے ایک ٹھکانے تک پہنچا۔ وہاں میں نے کچھ دیر آرام کر لینا مناسب سمجھا۔ اس گھر میں ایک بوڑھا اپنی بیوی کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ یہ دونوں ہی میرے تابعدار تھے۔ ان کے تمام اخراجات بھی میرے ذمے تھے۔ یہاں میں کبھی کبھار ہی آتا تھا اور انہیں خرچ وغیرہ دے کر چلا جاتا تھا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انہوں نے میرے ساتھ شبّو کو دیکھا تو انہوں نے سمجھا کہ شاید میں نے شادی کر لی ہے۔ بہر حال ان دونوں میاں بیوی نے ہماری خوب سیوا کی۔ میں تو ناشتا کر کے سو گیا مگر شبّو ابھی ان دونوں کے پاس ہی بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی کون تھے اور میرا ان سے کیا تعلق تھا؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے جس کا یہاں بیان کرنا میں نامناسب سمجھتا۔

بہر حال دوپہر تک میں بڑے آرام سے سوتا رہا۔ ظہر کا وقت تھا کہ موبائل کی تیز آواز سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے نمبر دیکھا تو کوئی اجنبی نمبر سے مجھے کال کر رہا تھا۔ میں نے یس کا بٹن پریس کیا تو میرے دوست قادر یار کی جانی پہچانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''نصرت بھائی! طیفے نے غداری کی ہے۔ پولیس کسی بھی لمحے تم تک پہنچ سکتی ہے۔ جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ موبائل اور سم ضائع کر دو کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ اسی سے تمہاری لوکیشن پولیس والوں پر واضح ہو رہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری یہ ساری باتیں کہیں سنی جا رہی ہوں۔ آپ کے پاس صرف اور صرف پانچ منٹ ہیں۔

''ٹھیک ہے دوست! تمہارا شکریہ۔'' یہ کہتے ہی میں چھلانگ لگا کر بیڈ سے اترا۔ اتنے میں شبّو بھی اٹھ چکی تھی۔ وہ بھی شاید صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کر چکی تھی۔ وہ بھی میرے پیچھے ہی بیڈ سے اتری اور چادر سنبھالتی ہوئی میرے پیچھے بھاگی۔ دونوں میاں بیوی باہر صحن میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ میں نے ان کو انتہائی اختصار کے ساتھ موجودہ صورتِ حال کے بارے میں بتایا اور اپنی موٹر سائیکل نکالی۔ اس ساری کارروائی میں تین منٹ صرف ہو گئے تھے۔ میں نے موٹر سائیکل کو کک لگائی اور گاؤں سے باہر ایک چھوٹے سے پگڈنڈی نما راستے کی طرف بڑھا۔

مگر پولیس شاید پانچ منٹ سے بھی پہلے گاؤں میں داخل ہو چکی تھی کیونکہ ابھی میں گاؤں سے نکلنے والے اس پگڈنڈی نما راستے پر پہنچا ہی تھا کہ پولیس ہماری گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ شبّو میرے پیچھے بیٹھی مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ پولیس کی تین چار گاڑیاں ہمارے پیچھے گلی میں داخل ہوئی تھیں۔ میں جونہی گاؤں سے باہر نکلا میں نے دیکھا پولیس والے بھاگتے ہوئے گاؤں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اس سے پہلے میں ان کی عملداری سے باہر نکل آیا تھا۔ راستے میں ایک کھال جس میں نہری پانی چل رہا تھا۔ میں نے موبائل سم سمیت اس میں پھینک دیا۔

جلدی ہی پولیس والوں کو میرے فرار کا علم ہو گیا۔ اسی دوران کچھ پولیس والے جنھوں نے مجھے گاؤں کے گرد گھیرا ڈالنے سے کچھ لمحے پہلے تیزی سے موٹر سائیکل پر نکلتے ہوئے دیکھا تھا، انہوں نے متعلقہ آپریشن انچارج کو میرے بارے میں اطلاع کر دی۔ ابھی میں اس گاؤں کی حدود سے مکمل طور پر نکلا نہیں تھا کہ وہ لوگ ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے میرے پیچھے لگ چکے تھے۔ جھیل پور گاؤں کی حدود تک میں انہیں چکما دینے میں کامیاب رہا۔ مگر بشیر گجر کے کماد کی فصل تک پہنچتے پہنچتے مجھے راستے کے دونوں طرف سے گھیرا جا چکا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں تھا کہ میں اس دو مربع کماد کے کھیت میں داخل ہو جاؤں اور پیدل ہی دوسری طرف سے نکلنے کی کوشش کروں مگر کھیت میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھے چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔ اب میرا یہاں سے بھاگ نکلنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو شاید میں ان کے اس گھیرے کے مکمل ہونے سے ... پہلے ہی کہیں نہ کہیں سے نکل جاتا مگر شبّو کے ساتھ نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

عصر کے وقت میں اس کھیت میں شبّو کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ شام ہونے سے پہلے پولیس نے مزید نفری منگوا لی تھی، شام ہوتے ہی ان لوگوں نے چاروں طرف نہ صرف تیز لائٹنگ کا انتظام کر دیا تھا بلکہ کماد کے کھیت کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں بھی لے لیا تھا۔ اس وقت بھی کوئی میگافون پر اعلان کر رہا تھا۔

”نصری! اب بھی موقع ہے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو ورنہ یہ کماد کا کھیت ہی تمہارا مدفن ہوگا اور اگر تمہیں اپنا خیال نہیں تو تم اپنے ساتھ موجود خاتون کا ہی خیال کر لو جو کسی اور کی منکوحہ ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے ساتھ ہر ممکن رعایت برتی جائے گی۔“

کھیت کے چاروں طرف ہیڈ لائٹس کی چکا چوند تھی، کھیت میں کہیں کہیں درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ میں نے رات کے تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان کیکر کے درخت پر چڑھ کر حالات کا جائزہ لیا۔ حالات میری سوچ سے بھی زیادہ خراب تھے۔ ہر طرف پولیس کے جوان انتہائی چوکس نظر آ رہے تھے۔ وہ کھیت کی طرف یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے میرے نکلتے ہی مجھے بھون کر رکھ دیں گے اور وہ یہ سب سوچنے میں حق بجانب تھے کیونکہ میں ان کے گھیرے میں تھا۔ ان کے پاس بہترین وسائل تھے۔ ڈی ایس پی صاحب بہ نفس نفیس خود ان کو لیڈ کر رہے تھے اور آج ان میں سے ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ وہ سب پر سبقت لے جائے۔ چاروں طرف کا منظر بالکل واضح نظر آ رہا تھا، یہاں تک کہ ڈی ایس پی کا گنجا سر بھی تیز روشنیوں میں چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو آج میں اس گنجے ڈی ایس پی شیراز چوہدری کا تو کچھ نہ کچھ ضرور کرتا جو کہ چوہدری زمان خان کا چمچہ تھا اور اس نے مجھ پر پانچ بے بنیاد قتل کے کیس بنا کر مجھے اشتہاری قرار دلوا دیا تھا۔ مگر اس وقت شبّو نامی کمزوری نے میرے ہاتھ باندھ رکھے تھے مگر میں بھی معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ کوئی بہتر موقع ملتے ہی میں اس کا یہ ادھار مع سود اسے واپس کرنا چاہتا تھا۔

اس وقت ہر طرف اوس پڑ رہی تھی۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔ سردی بڑھ جانے کی وجہ سے شبّو کافی پریشان تھی۔ وہ بے چاری اس ماحول کی عادی نہیں تھی۔ سردی کی وجہ سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ میں نے اپنی گرم چادر بھی اسے دے دی تھی۔ اب اسے کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا۔

مجھے خطرہ تھا کہ اسے خدانخواستہ بخار نہ ہو جائے۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا صحت مند رہنا انتہائی ضروری تھا۔ اس وقت ہم کھیت کے شمالی سرے سے اندر کی طرف موجود تھے۔ میں یہاں سے باہر نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر مجھے اس کا کوئی بھی قابلِ عمل حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف موت کے ہرکارے پہرے پر موجود تھے۔

مجھے یہاں سے رات کو ہی شبّو کے ساتھ نکلنا تھا، اگر خدانخواستہ صبح ہو جاتی تو پھر یہ ناممکن ہو جاتا۔ وقت لمحہ بہ لمحہ ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا اور میں جو زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوا تھا، آج بے امید سا ہوا جا رہا تھا۔ شبّو نے اچانک اپنا ہاتھ کمبل میں سے نکالا اور میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اندھیرے میں بھی اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور میں نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے آنسو نظر آئے۔ اس نے ٹوٹتے ہوئے لہجے میں آہستگی سے کہا۔

”تمہیں یاد ہے جب ہم بچپن میں چور سپاہی کھیلا کرتے تھے تو جب تمہاری باری چور بننے کی ہوتی تھی تو تم مجھے بہت ستایا کرتے تھے۔ تم ہر بار اتنے انوکھے انداز میں چھپتے تھے کہ میں ڈھونڈتی ہی رہ جاتی تھی مگر تم ملتے ہی نہیں تھے اور جب میں ہار ماننے کے قریب ہوتی تو تم جانے کہاں سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑے ہوتے اور ......“ دکھ کی وجہ سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ہچکیوں کے درمیان روتی ہوئی کہنے لگی۔ ”آج حقیقت میں وہی گیم ہمارے سامنے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج چور کی لسٹ میں، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ آج کوئی حل نکالو ناں اس کا۔“ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا کر چوما اور چومتی ہی چلی گئی۔

شبّو کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھیں بھی بھیگنے لگیں مگر میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جی کڑا کر کے شبّو کو تسلی دی۔

”شبّو! میری جان ہوا کیا ہے؟ ہم انشاء اللہ جلد ہی اس کھیت سے باہر ہوں گے۔ میں اس کھیت اور یہاں کے چپّے چپّے سے واقف ہوں اور میں سارا پلان بنا چکا ہوں بس تم تھوڑی دیر بعد یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ پگلی روتی کیوں ہو؟ جانتی ہو میں کتنا پیار کرتا ہوں تم سے۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس دل کی ہر دھڑکن تمہارا ہی نام لیتی ہے اور ...“

”یہ مذاق کا وقت نہیں ہے وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ میں جانتی ہوں تم مجھے جھوٹی تسلیاں دے رہے ہو۔ ہمارے دشمن کے لیے یہ انتہائی پسندیدہ چوئشن ہے۔ آج کی رات اگر اس نے ہم دونوں کو ختم کر دیا تو وہ اپنے دیرینہ خواب کو پورا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارا مشترکہ دشمن ہمارا ماموں، دولت کی ہوس میں کتنا گر چکا ہے۔ تمہاری اور میری بربادی کے پیچھے اسی کی ہوس ہے۔ اسی سلسلے میں آج میں تم سے کچھ باتیں شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں نے اچانک تمہارے ساتھ بھاگنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اور میں جو تمہاری ہزار منتیں کرنے پر بھی ایسی بات پر راضی نہ تھی، پھر اچانک کیوں راضی ہو گئی جو کہ ایک مشرقی لڑکی کو ہرگز زیب نہیں دیتی اور پھر نکاح کے بعد تو یقیناً نہیں جبکہ میں جانتی ہوں کہ وہ نکاح بھی جعلی تھا۔ میں نے کوئی ایجاب و قبول نہیں کیا تھا اور یہ بات میں نے ماموں سے پہلے ہی کہہ دی تھی کہ اگر انہوں نے میرا زبردستی نکاح کرنے کی کوشش کی تو میں انکار کر دوں گی۔ میری جگہ پہ ان لوگوں نے نوری کو بٹھا دیا تھا اور مولوی صاحب تو پردے میں بیٹھے ہی ایجاب و قبول کے الفاظ سن کر واپس چلے گئے تھے۔ انہیں کیا پتا کہ پردے کے پیچھے کیا کھیل کھیلا گیا؟ اور پھر انہیں پتا ہوتا بھی تو کیا کر لیتے وہ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے بکے ہوئے ہوں۔“ وہ بولتے بولتے رکی پھر سانس لے کر بولی۔

”مگر پھر بھی میں اسے رضائے الٰہی تسلیم کر کے صبر و شکر کے ساتھ اپنی تقدیر کے ساتھ سمجھوتا کرنے ہی والی تھی کہ ایک دل دہلا دینے والے انکشاف نے مجھے لرزا کے رکھ دیا۔ سہاگ رات یہ انہوں نے مجھے دودھ میں بے ہوشی کی دوا پلانا چاہی مگر گھر کی پرانی نوکرانی سلمٰی نے مجھے قبل از وقت اس سے آگاہ کر دیا۔ میں نے دودھ کا گلاس گلدان میں بہا کر دودھ پی لینے کا ناٹک کیا اور بیڈ پر اوندھی ہو کر لیٹ گئی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اب وہ کیا کرتے ہیں؟ مجھے خطرہ تھا کہ اب میری بے ہوشی کے دوران ہی مجھے منکوحہ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی کہ زمان خان اپنے بیٹے نعمان خان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ نعمان خان نے مجھے اچھی طرح ہلا جلا کر چیک کیا مگر میں نے بے ہوشی کا ڈراما جاری رکھا۔ میری بے ہوشی کا یقین ہوتے ہی زمان خان اپنے بیٹے سے گویا ہوا۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ سب حاصل کرنے کے لیے میں نے بہت محنت کی ہے۔ پہلے تو مجھے ایکسیڈنٹ کے ذریعے ان کے والدین کو ختم کرنا پڑا۔ وہ حادثہ نہیں تھا۔ مجھے بہت آگے جانا تھا جبکہ میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ مجھے بے انتہا دولت حاصل کرنا تھی اور اس کا واحد حل ان دونوں کے والدین کی موت تھی۔ بعد میں، میں ان دونوں کزنز کا سرپرست بن گیا۔ آہستہ آہستہ میں نصرت کو بدمعاشی کی طرف دھکیلنے میں کامیاب رہا اور جونہی وہ ان راہوں کا کھلاڑی بنا، میں نے خاموشی سے اس کے کھاتے میں پولیس والوں سے ساز باز کر کے پانچ قتل ڈلوا دیے۔ اب اسے میں کسی نہ کسی طرح پولیس مقابلے میں مروا دوں گا۔ بعد میں یہی ایک کانٹا رہ جائے گا۔ جب یہ اکیلی ستر مربع اراضی کی مالک رہ جائے گی تو ہم اس سے جائیداد اپنے نام پر منتقل کروا لیں گے۔ اگر اس نے یہ نہ کیا تو اسے ختم کرنا ہمارے لیے چنداں مشکل نہ ہوگا۔ گو کہ یہ ہماری بھانجی ہے مگر اس معاملے میں ہم کسی رشتے کے قائل نہیں۔“

اس وقت مجھے اپنے والدین یاد آئے۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب ہم دونوں کے ماں باپ کی لاشیں اکٹھی گھر میں لائی گئی تھیں اور اس وقت یہی ماموں تھا جس نے ہمیں تسلیاں دیں اور ہماری سرپرستی کی۔ میں ماموں زمان خان کو ہمیشہ حق پر سمجھتی رہی۔ یہاں تک کہ میں تمہارے بارے

میں بھی اس کی باتوں میں آتی چلی گئی۔ مجھے شک تو اس وقت پڑا جب اس نے اپنے بیٹے نعمان کے ساتھ میری شادی کرنا چاہی، جبکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں بچپن ہی سے تم سے منسوب تھی اور...... تم سے بے انتہا پیار کرتی تھی۔ مگر تم تھے کہ میری سنتے ہی کب تھے؟ میں نے تم سے بارہا بدمعاشی چھوڑنے کے لیے کہا مگر تم باز ہی نہیں آ رہے تھے۔ میں روز بروز تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتے ہوئے دیکھتی اور خون کے آنسو پی کر خاموش رہتی۔ تم پر قتل کے پرچے ہوئے۔ پھر تم اشتہاری ہوئے اور اس کے بعد ایک دن میں نے سنا کہ تم ماموں سے لڑ جھگڑ کر کہیں چلے گئے ہو۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمہارے بن میرا کیا ہوگا اور پھر جب ماموں اپنے بیٹے نعمان خان سے میرا نکاح کروانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو تم نے مجھے سلمٰی کے ذریعے بھگا لے جانے کا پروگرام بنایا۔ مگر اس وقت میں ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ جب میں تمہاری امانت ہوں تو پھر تم مجھے باعزت طریقے سے کیوں حاصل نہیں کر لیتے؟ میں نے اس سلسلے میں ماموں سے بات کی تو وہ بولے کہ انہوں نے خود کئی بار تم سے کہا ہے مگر تم انکار کر رہے ہو۔ مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہ تھی اور پھر تمہارا خط بھی تو مجھے مل چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماموں جھوٹ بول رہا تھا اور اگر وہ جھوٹ بول رہا تھا تو کیوں؟ میں انتہائی پریشان تھی۔ مجھے حالات کا کچھ کچھ اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود میں گھر سے بھاگ کر تم سے شادی کرنے کی ہرگز خواہاں نہ تھی۔

یہ تمام دولت اور جائداد جس پر ماموں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا وہ ہماری تھی۔ میں ایک بار تم سے مل کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ماموں سے تم سے ملنے کے بارے میں بات کی تو اس نے سختی سے منع کر دیا۔ میں تم سے ملنے کی کوئی ترکیب سوچ ہی رہی تھی کہ ماموں نے اپنے بیٹے کے نکاح کے بندھن میں باندھنے کی کوشش کی اور سہاگ رات پر مجھے مکمل پلان سے آگاہی ہو گئی۔ وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔ اس رات نعمان حد سے زیادہ شراب پیے ہوئے تھا۔ اس لیے مجھے اس کو ہینڈل کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ دوسرے دن ہی میں نے سلمٰی کے ذریعے تم تک پیغام بھیجا اور دوسری رات ہی تم مجھے لینے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔

☆☆☆

شبو اپنے حالات بیان کر چکی تھی۔ یہ تقریباً وہی باتیں تھیں، جن کے بارے میں مجھے کچھ عرصہ پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا اور اس حقیقت کے مجھ پر عیاں ہونے کی وجہ سے ماموں سے میرا جھگڑا ہوا تھا۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ماموں اتنا گر چکا تھا کہ اس نے اس دولت کو پانے کے لیے اپنی دو بہنوں اور بہنوئیوں کو بھی قتل کر دیا تھا۔ شبو میرے پہلو سے لگی اس وقت روئے جا رہی تھی۔ ”ہمارے ساتھ کتنا بڑا دھوکا ہوا ہے۔ میں تو چاہتی تھی کہ ہم دونوں مل کر اپنے والدین کے قتل کا بدلہ لیں مگر؟ ان حالات میں تو مجھے امید کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آ رہی۔“ شبو نے مایوسی سے کہا۔

”شبو! تم نے میرے کندھوں سے ایک بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔ اب میرے لیے فیصلہ کرنا انتہائی آسان ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“

شبو اور میں کماد کے کھیت میں انتہائی آہستگی سے چل کر کماد کی فصل میں ہی ایک درختوں کے جھنڈ تک پہنچے۔ یہاں پہنچ کر میں نے ایک فیصلہ کیا۔ گو کہ یہ سب انتہائی رسکی تھا مگر اب مجھ میں وہ شخص بیدار ہو چکا تھا جو خطرناک سے خطرناک ترین لمحات میں بھی مجھے راستہ بنانے کی دھن عطا کرتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے سوکھی گھاس تلاش کر کے شبو کے چہرے اور سر پر باندھ دیا۔ صرف آنکھوں کا تھوڑا سا حصہ کھلا رہنے دیا تاکہ اسے دیکھنے میں آسانی رہے۔ اس کے بعد میں نے سوکھی گھاس کی چھوٹی سی گٹھڑی شبو کو پکڑائی اور اسے درختوں کے جھنڈ سے تقریباً ایک ایکڑ کے فاصلے پر نیچے لٹا دیا اور خود رائفل لے کر درختوں کے درمیان میں ایک ٹاہلی کے بڑے درخت پر چڑھا۔ یہ درخت اِدھر اُدھر کے درختوں کی شاخوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے خود کو ایک بڑے دوشاخے میں ایڈجسٹ کیا اور چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ تیز سرچ لائٹ کی روشنی میں سب نظر آ رہا تھا۔ پولیس کے جوان اِدھر سے اُدھر حرکت کر رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ڈی ایس پی صاحب کے لیے ایک خیمہ لگ چکا تھا۔ اس خیمے سے کچھ دوری پر دھواں سا اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ شاید وہاں چائے پک رہی تھی۔ یہ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ جس چہرے کی مجھے تلاش تھی وہ نہیں مل رہا تھا اور پھر کافی تلاش کے بعد وہ منحوس چہرہ نظر آ ہی گیا۔

میں نے دیکھا نعمان ایک رنگین چارپائی پر براجمان تھا اور اس کے گرد اس کے کچھ چیلے چانٹے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی زمین پر ان کی رائفلیں پڑی نظر آ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے کافی دور تھا اور یہاں سے اسے رائفل سے ہٹ کرنا انتہائی رسکی تھا۔ گولی اس تک پہنچتی ضرور مگر جانے وہ اسے مارنے میں کامیاب ہوتی یا نہیں اور میں اس کے نتائج سو فیصد چاہتا تھا اس کے لیے مجھے اس کے قریب جانا تھا۔ اتنا قریب کہ میں اسے اس طرح سے ہٹ کر سکتا کہ اس کے بچنے کا کوئی چانس باقی نہ رہتا۔ میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ میں نے شبو کو مناسب ہدایات دیں اور نعمان خان کی طرف بڑھا۔ جلد ہی میں کماد کے کھیت کے سرے کے قریب موجود تھا۔ نعمان خان تیز لائٹس کی روشنی میں اپنے حواریوں سے باتیں کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس کا نشانہ لیتے ہوئے ایک بھرپور برسٹ اس کی طرف داغا۔ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی تیز آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف ہاہاکار مچ گئی۔ میں نتائج کی پروا کیے بغیر کماد کے کھیت میں پیچھے کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے مقام کا درست اندازہ لگا سکتے میں کماد کے کھیت میں کافی دور نکل گیا تھا۔

ہر طرف ایک افراتفری مچ چکی تھی اور مجھے اسی افراتفری کا انتظار تھا۔ میں نے جلدی سے شبو سے سوکھی گھاس کی گٹھڑی لی اور اپنے سر اور چہرے کے گرد مضبوطی سے باندھ لی۔ یہاں سے باہر نکلنے کا ایک بہترین پلان میرے ذہن میں پہلے سے ہی موجود تھا اور اگر سب کچھ میری سوچ کے مطابق ہوتا تو انشاء اللہ جلد ہی ہم پولیس کے گھیرے سے نکل سکتے تھے۔ رسک تو اس میں بھی تھا مگر مجھے امید تھی کہ ایسا کوئی سوچے گا بھی نہیں کہ یوں بھی ہو سکتا ہے؟

یہاں سے قریب ہی پانی کا ایک بڑا کھال گزر رہا تھا جس میں نہر کے ایک موگے اور دو ٹربائنوں کا پانی گزرتا تھا۔ یہ کھال اس کماد کے کھیت میں سے گزرتا ہوا آگے کہیں جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم جلدی سے اس کھال کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوڑے اور سرے کے قریب پہنچتے ہی میں اور شبو دونوں ہی اس کھال کے پانی میں آہستگی سے داخل ہوئے۔ شبو میرے آگے تھی اور اس نے اپنا سارا وجود اور سر بھی پانی میں ڈبو رکھا تھا۔ شکر ہے کہ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا اور ہمیں آگے بڑھنے کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔ ہمیں صرف اشد ضرورت کے تحت ہی اپنی ناک تھوڑا سا اوپر کر کے سانس لینا تھا اور اگر اس وقت کوئی اِدھر دیکھ بھی لیتا تو یہی سمجھتا کہ پانی کے ساتھ کچھ گھاس پھوس تیرتی ہوئی جا رہی ہے۔ نہر کا پانی انتہائی گدلا تھا، گو کہ اس میں دو ٹربائنوں کا صاف پانی بھی شامل تھا مگر پھر بھی یہ اتنا گدلا ضرور تھا کہ اس میں سے ہمارا وجود نظر آنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا اور کچھ ہمیں رات کی تاریکی کا بھی ایڈوانٹیج تھا۔ ہم تقریباً ایک مربع تک آگے تیرتے چلے گئے اس دوران میں نے ناک اور دونوں آنکھیں پانی سے باہر ہی رکھی تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ فکر شبو کی تھی۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ مکمل طور پر گھریلو لڑکی تھی۔ یہ الگ بات کہ گاؤں کی رہائشی ہونے کی وجہ سے وہ کافی نڈر اور باہمت تھی مگر پھر بھی اگر اچانک اس پر کوئی حملہ کر دیتا تو میرے لیے اس کا دفاع کرنا کافی مشکل تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم خطرے سے کافی دور نکل آئے تھے اور یہ تو شاید کسی کی سوچ میں بھی نہیں تھا کہ ہم ایسے بھی نکل سکتے ہیں۔ میں نے جب سمجھا کہ ہم نے مناسب فاصلہ طے کر لیا ہے تو تھوڑا سا سر اٹھا کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ تیز لائٹس بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ اب ان لوگوں نے کماد کی فصل پر تقریباً حملہ کر دیا تھا۔ نعمان خان کی موت نے یقیناً ان لوگوں کو پاگل کر دیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ ایک سوالیہ نشان تھا کہ ایک اکیلا شخص جو کہ چاروں طرف سے مکمل طور پر پولیس کے گھیرے میں تھا، اس نے ان کی موجودگی میں سرِعام ایک بندے کا قتل کر دیا تھا۔

بہرحال میں نے اپنے اور شبو کے یقینی موت کے منہ سے نکل آنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ پانی سے نکلتے ہی ہمیں انتہائی سردی کا سامنا تھا مگر یہ سردی اس خوشی کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی جو کہ پولیس کے مضبوط گھیرے سے نکل آنے پر تھی۔ میں نے اسلحہ تو ایک شاپر میں ڈال کر محفوظ کر لیا تھا مگر باقی ہر چیز پانی میں گیلی ہو چکی تھی۔ کھال کے ساتھ ہی سرکنڈوں کے ایک جھنڈ میں ہم نے اپنے کپڑوں سے پانی نچوڑا...... ابھی ہم کپڑے نچوڑ ہی رہے تھے کہ میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا سگنل دیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے سرکنڈوں سے تھوڑے فاصلے پر ایک شخص سگریٹ پیتا ہوا نظر آیا۔ اس نے گن اپنے کندھوں پر رکھی ہوئی تھی اور اس کی نظریں سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف ہی تھیں۔ شاید یہ وہ آدمی تھا جو کہ اپنی فصلوں کو پانی لگا رہا تھا اور رات کے اس وقت وہ یہ چیک کر رہا تھا کہ پانی کہیں ضائع تو نہیں ہو رہا۔ بہرحال یہ ایک نئی مصیبت تھی اور وہ

شخص... خاموشی سے کھڑا سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف ہی دیکھے جا رہا تھا۔ شاید اسے شک ہوگیا تھا یا پھر ہو سکتا ہے وہ ہمیں کھال سے نکلتے ہوئے دیکھ چکا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے اس نے موبائل پر کسی کو ہمارے بارے میں بتا دیا ہو۔ اگر ایسا تھا تو یہ انتہائی خطرناک صورتِ حال تھی۔

میں نے شبّو کو اس بارے میں بتایا اور اسے خاموش رہنے کو کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس شخص سے نمٹنے کے بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کرتا، وہ شخص سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس میں تو اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ یقیناً یہاں ہماری موجودگی سے واقف ہو چکا تھا۔ گن اس نے کندھوں پر ہی رکھی ہوئی تھی۔ اگر وہ یہاں میری موجودگی سے باخبر تھا تو وہ اتنی بے خوفی سے میری طرف کیوں بڑھ رہا تھا؟ جبکہ اس علاقے میں میرا نام تو دہشت کی علامت تھا۔ گو کہ اس میں زیادہ تر ماموں کا میرے بارے میں تشہیری پراپیگنڈا تھا، مگر پھر بھی دہشت تھی۔ اس سے پہلے کہ میری سوچ کہیں اور بھٹکتی، وہ شخص سرکنڈوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”کیا یہ آپ ہو نصرت بھائی؟“

”اوئے کامی! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ رات کے اس وقت تم اِدھر کیا کر رہے ہو۔“ میں نے سرکنڈوں سے باہر نکل کر اسے جپھی ڈالتے ہوئے کہا۔

”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ صحیح سلامت ان حرام زادوں کے چنگل سے نکل آئے ہو۔ ہم سب ادھر ہی جا رہے تھے تاکہ پولیس والوں کے ساتھ محاذ کھول سکیں؟ پھر جو بھی ہوتا دیکھا جاتا اور بھر جائی کہاں ہے اسے بھی باہر آنے کو کہو۔ اس بے چاری کو بھی تم نے اس سردی میں پریشان کر رکھا ہے۔“

میں نے شبّو کو سرکنڈوں سے باہر آنے کو کہا۔ اتنی دیر میں کامران کا اپنے دوستوں سے رابطہ ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ان کو میرے بارے میں آگاہ کیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جائیں۔ نصرت بھائی جلد ہی... رابطہ کر کے اپنی خیریت سے آگاہ کر دیں گے۔

اس کے آدھ گھنٹے بعد ہم دونوں کامران کے گھر میں بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ کامران کا گھر گاؤں کے بالکل نکڑ پر تھا اس لیے ہمیں گاؤں میں داخل ہونا ہی نہیں پڑا۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے احمد یار سرگانہ بھی گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ بھی مجھ سے جپھی ڈال کر ملا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی والدہ اور بہنیں بھی ہمارے اردگرد جمع تھیں۔ پورا گھر کا ماحول تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں رات گئے پردیس سے لوٹا ہوں اور سبھی گھر والے میرے آنے کی خوشی میں میرے اردگرد جمع ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں شبّو ان سے گھل مل گئی۔ کامران شہر میں ایک پرائیویٹ ادارے کی ایمبولینس ڈرائیو کرتا تھا اور کبھی کبھار شہر سے ایمبولینس گھر بھی لے آتا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ کل شام گھر آتے ہوئے ایمبولینس ساتھ ہی لے آیا تھا۔ صبح ہوتے ہی ہم دونوں کامی کے ساتھ ایمبولینس میں سوار ہو کر فیصل آباد پہنچے۔ راستے میں دو تین جگہ پولیس ناکوں پر ایمبولینس کو روکا گیا مگر کامی کی صورت دیکھتے ہی پولیس والے چیکنگ کیے بغیر ہی ایمبولینس کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دیتے تھے کیونکہ وہ ہفتے میں دو تین بار آتا جاتا تھا۔

جلد ہی ہم فیصل آباد ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں سے نان اسٹاپ ٹرین کراچی کی طرف جانے والی تھی۔ کامی نے دو ٹکٹ خرید لیے اور ہم علیحدہ علیحدہ ڈبوں میں کراچی کے لیے سوار ہوئے۔ کراچی تک کا سفر بخیریت گزر گیا۔

کراچی پہنچتے ہی میں اور شبّو کلفٹن میں اپنے فلیٹ پر جانے کے لیے ایک رکشے میں سوار ہوئے۔ یہ فلیٹ میں نے حال ہی میں ایک دوست سے خریدا تھا۔ اس فلیٹ میں چند دن گزارنے کے بعد ہم ایک نئی شناخت کے ساتھ انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔

مگر اس سے پہلے ہم اپنی ستّر مربع اراضی مناسب داموں پر ایک پارٹی کو بیچ چکے تھے۔ یہ لوگ میرے ماموں کے سیاسی حریف تھے۔ تمام رقم ہمارے مشترکہ اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ اس رات ماموں کا بیٹا برسٹ لگنے سے ہلاک ہو چکا تھا اور پولیس دوسرے دن بارہ ایک بجے تک مجھے کھیت میں تلاش کرتی رہی مگر میں وہاں ہوتا تو انہیں ملتا...! ماموں کو جب اس کے اکلوتے بیٹے نعمان کی لاش ملی تو وہ پاگل سا ہو گیا۔ اسی دوران جب اس کے سیاسی مخالفین نے ستّر مربع اراضی پر قبضہ کیا تو وہ بلبلا اٹھا مگر جب اسے پتا چلا کہ ہم دونوں اپنی زمین ان کے ہاتھوں بیچ چکے ہیں تو وہ مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اس نے قبضہ گروپ کے لوگوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ قبضہ گروپ والے بھی معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان کی جوابی فائرنگ نے زمان خان کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

اعترافِ گناہ

جنابِ مدیرِ اعلیٰ

السلام علیکم!

اس بار میں اپنے عزیز دوست کی سرگزشت اسی کی زبانی سنا رہا ہوں۔ اس میں ہر خاص و عام کے لیے سبق ہے۔ مجھے یقین ہے یہ سرگزشت ہر ایک کو پسند آئے گی۔

محمد ظفر حسین
(کراچی)

آج صبح ناشتے کے لیے میس میں داخل ہونے والا سب سے آخری شخص میں تھا، ویٹرز نے ٹیبل سے خالی پلیٹیں اور دیگر اشیاء اٹھانی شروع کر دی تھیں، سات بجکر بیس منٹ ہوئے تھے اور میس کا ٹائم ختم ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے، میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

اس کا نام محمد گنجو تھا، ہماری میس کا سب سے مستعد اور فرض شناس ویٹر۔ سیاہی مائل سانولی رنگت، چھریرا جسم اور

درمیانے قد کے ساتھ وہ معمولی سے خدوخال کا حامل ایک سادہ سا انسان تھا جس کے چہرے پر واحد خاص بات اس کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں اور ہم وار سفید دانت تھے جو کہ بات بے بات عادتاً نمودار ہو جاتے، ساؤتھ انڈیا سے تعلق ہونے کی وجہ سے مخصوص انداز اور لب ولہجہ میں اردو بولتا اور ہر وقت مسکراتے رہتا۔

”کیا بات ہے صاحب آج آپ لیٹ ہو گئے ہیں؟“

اس نے اپنے مخصوص انداز میں خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ استفسار کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے ناشتے کا مطلوبہ آرڈر دیا اور وہ وقت ضائع کیے بنا اپنی گردن ہلاتے ہوئے مشینی انداز میں کچن کی جانب چل پڑا۔

کنجو نے جھٹ پٹ چند منٹ کے اندر آملیٹ، ابلے ہوئے انڈے اور پراٹھے میز پر سجا دیے۔ کارنر ٹیبل پر چائے، کافی، شہد، دودھ، جام اور جیلی سمیت تمام ناشتے کے لوازمات موجود تھے اور میں ناشتے میں مشغول ہو گیا۔ وہ میز کرسیوں کو ترتیب دینے میں لگ گیا، مجھے جلد از جلد ناشتا ختم کرکے جانے کی جلدی تھی۔ اس دوران جب بھی کنجو سے نظر مل جاتی تو وہ اپنی چمکدار آنکھوں کو گھما کر مخصوص انداز میں مسکرا دیتا، ناشتہ ختم کرکے اٹھا تو وہ لپک کر میری ٹیبل پر آ گیا اور خالی پلیٹوں کو اٹھانے لگا۔

”کیوں بھئی اس دفعہ کب تک چھٹی کا ارادہ ہے؟“ میں نے جاتے جاتے رک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔

”دیکھیں صاحب اس دفعہ رمضان پر جانے کا ارادہ ہے۔“ کنجو نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”ارے ارادہ ہی ہے یا پکا پروگرام ہے؟“ میں نے دروازے پر پہنچتے پہنچتے ہانک لگائی۔

”صاحب پکا ہے، ایک دم پکا۔“ وہ عادتاً دائیں بائیں گردن ہلا کر بولا۔

میں باہر نکل کر تیار کھڑی ہوئی وین میں بیٹھا اور سائٹ کی طرف چل دیا۔

یہ بات پوری کمپنی میں مشہور تھی کہ تقریباً تین سال ہونے کو آئے تھے اور ہر سال سالانہ چھٹی کے موقع پر کنجو کا پکا پروگرام بنتا اور بس بنا ہی رہتا مگر جانے کی نوبت نہ آتی۔ اور بظاہر اس پروگرام کے مؤخر ہونے کی کوئی خاص وجہ نہ ہوتی، یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ دبئی میں مختلف کمپنیوں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسے ورکرز تھے جو کہ کمپنی کی طرف سے سالانہ چھٹی کی سہولت ہونے کے باوجود اس سے فیضیاب نہیں ہوتے تھے اور اپنے ٹکٹ کے اخراجات بچا لیتے تھے۔

دنیا بھر میں اپنی تیز ترین اکنامک ڈویلپمنٹ اور پروگریسو اپروچ کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈیا کی بے پناہ آبادی اور چھائی ہوئی غربت کو دور کرنے کی کوششوں میں مصروف وہاں کی سرکار اب تک وہ مجموعی اقدامات کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائی ہے جس کی بدولت بلا مبالغہ وہ لاکھوں کروڑوں ہندوستانی جو دوسرے ملکوں میں بوجہ روزگار مقیم ہیں اس قابل ہو سکیں کہ انہیں واپس آکر اپنے ملک میں روزگار کی مناسب سہولت حاصل ہو سکے۔ کنجو نے بھی سوچ بچار کرتے ہوئے تین سال گزار دیے تھے اور دوران تعطیل ہونے والے اخراجات اور ٹکٹ کے خرچے بچا لیے تھے۔ یوں تو خلیجی ممالک خصوصاً یو اے ای میں کثیر تعداد میں انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال کے ہنر مند اور غیر ہنر مند افراد کا غلبہ ہے مگر ان میں سب سے کامیاب جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں جس کی وجہ ان کا فطرتاً امن پسند ہونا اور مصالحانہ کاروباری رویہ ہے، رفتہ رفتہ اپنی نرم مزاجی اور صلح جو طبیعت کی بدولت یہ پورے امارات کے ہر طبقہ میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں، یہاں تو یہ بھی مشہور ہے کہ اگر کسی کو گھر میں مالی، باورچی، ڈرائیور کی ضرورت ہے تو یہ اکیلے ایک آدمی کی تنخواہ میں یہ سب کام کرنے کے لیے راضی ہو جاتے ہیں، ان کی اس پالیسی نے بلاشبہ سب سے زیادہ نقصان پاکستانی لیبر کو پہنچایا ہے جو کہ کام میں محنتی مگر رویہ کے حساب سے غصیلے اور پرجوش واقع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ یہ اتنے قلیل مشاہروں پر کام کے لیے راضی ہو جاتے ہیں جتنے میں ایک پاکستانی اپنے ملک میں عام دیہاڑی لگا لیتا ہے۔

خوش قسمتی سے ہماری مذکورہ پاکستانی کمپنی مڈل ایسٹ کی بڑی لیڈنگ کمپنی کے طور پر مانی جاتی اور تمام تر مخالفت اور انڈین کمپنیوں کی کھلی لابنگ کے باوجود اپنا ایک الگ معیار بنانے میں کامیاب تھی، مجھے اس کمپنی کو جوائن کیے ہوئے تقریباً چھ مہینے ہونے کو آئے تھے اور یہاں پر پہلے سے موجود لوگوں کی زبانی اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پڑوسی ملک کے عوام کی اس حالت زار سے ان کی جھوٹی ترقی کا پول کھلتا صاف نظر آتا تھا۔

پاکستانی کمپنی ہونے کے باوجود ہماری کمپنی میں انڈین، بنگلہ دیشی، نیپالی بھی تھے۔ گو کہ غلبہ پاکستانی افسران اور ورکرز کا ہی تھا مگر یہ یو اے ای کی انٹرنیشنل پالیسی کا حصہ تھا جس میں کچھ تعداد دوسرے ممالک کی بھی شامل کرنی پڑتی ہے تاکہ کمپنی کے بین الاقوامی ہونے کا تاثر بنا رہے۔ کمپنی کے دیگر تمام شعبہ جات میں یو اے ای کے مروجہ قاعدے اور قانون رائج ہونے کے ساتھ ساتھ کمپنی کا میس بھی سارے اصولی تقاضے پورے کرتا تھا۔ جونیئر اور سینئر کے لیے یکساں معیار لاگو تھا۔ کھانا اور دیگر لوازمات تقریباً ایک جیسے مگر میس علیحدہ تھے۔ صبح کے ناشتے کے علاوہ آفیسر میس میں کھانا تیار کرکے شیشے کے مخصوص باکس میں بوفے کے اسٹائل میں سجا دیا جاتا تھا۔ مودب کھڑے ہوئے ویٹرز صرف ان کی کمی بیشی پوری کرنے کے لیے وہاں چوکس رہتے۔ پانی کا گلاس بھی خود بھر کر پینے کی ہدایت تھی۔ گو کہ یہ ہمارے ایشین اسٹائل کی کھلی نفی کرتا تھا۔ لیکن میس میں موجود زیادہ تر آفیسران کا تعلق پاکستان سے تھا اس لیے ہم زبان ویٹرز کے ساتھ تھوڑی بہت انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہوتی چلی گئی اور وہ ہمارے لیے چھوٹے موٹے کام کرنے لگے۔ جیسے اگر کھانے کے دوران کسی ویٹر کو اشارہ کیا تو وہ پانی کا گلاس بھر لایا، کھانے کے بعد اگر خوش گپیاں چل رہی ہوں تو ویٹر کو مخصوص اشارہ کیا اور وہ سویٹ ڈش لے آیا۔ یہ سب ایک محتاط اور مخصوص انداز میں چل پڑا تھا۔

کمپنی کا زیادہ تر کام آئل اور گیس سیکٹر میں تھا۔ سخت ترین گرمی، وطن سے دوری اور تنگ بندھی زندگی میں ہم زبان پاکستانیوں کا دم غنیمت تھا۔ 8 سے 12 گھنٹے کی ڈیوٹی مع اوور ٹائم اور آنے جانے کے وقت کو شمار کیا جائے تو 14 گھنٹے کی طویل مشقت ہوتی۔ جب شام کے کھانے پر اکٹھے ہوتے تو دن بھر کی تھکن کچھ کم ہو جاتی۔ دوران طعام ہنسی مذاق چلتا رہتا۔ ایک دوسرے کی سائٹ کا حال پوچھا جاتا۔ پاکستان کی حالیہ صورتحال پر تبصرہ چلتا۔ کبھی کسی کے گھر سے کوئی خوشخبری آ جاتی تو مبارکباد کا تبادلہ ہوتا۔ ہم آٹھ دس افراد کا ایک ٹولہ سا بن گیا تھا جو کہ روزانہ ایک ہی ٹیبل پر ڈنر کرتے اور سوائے چند ایک کے ہم سبھی اس کمپنی میں نئے اور پہلی بار اس ملک میں آئے تھے۔ ہمارے اس گروپ کے تقریباً سارے افراد ایک ہی ایج گروپ سے تھے یعنی 25 سے 30 سال کی عمر تک کے۔ کچھ کچھ چلبلے سے، لاپرواہ، ہنسوڑ اور فقرے باز۔ خود میرا اپنا بھی یہ حال تھا کہ جب تک ایک دو چٹکلے چھوڑ کر، لطیفے سنا کر سب کو ہنسا نہ دوں تو چین نہ آتا۔ ہمارے اس ہلکی مذاق کے دوران روزانہ کوئی نہ کوئی ہمارے مذاق کا نشانہ بن جاتا تھا۔

شام کے کھانے کے لیے پہنچا تو ہمارے گروپ کی مخصوص ٹیبل ابھی تک خالی ہی تھی۔ میں نے جا کر سیٹ سنبھالی ہی تھی کہ کنجو چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

”سلام صاحب“ اس نے دانت نکالے۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور حال چال دریافت کرنے کے بعد پوچھا۔

”کنجو ایک بات بتاؤ؟ تین سال ہونے کو آ رہے ہیں اور تم ابھی تک گھر نہیں گئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری منگیتر کسی اور سے شادی کرکے اپنا گھر بسا لے اور تم بس منہ دیکھتے ہی رہ جاؤ۔“ میں نے اسے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

”ارے نہیں صاحب۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسا ”ابھی تو میری منگنی بھی نہیں ہوئی ہے صاحب، منگیتر تو دور کی بات ہے۔“

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ پھر کس کے خیالوں میں گم رہتے ہو بھئی؟“ میں نے ٹکڑا لگایا۔

کنجو نے شرما کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سر جھکا کر آہستگی سے بولا ”دراصل میری خالہ کی ایک بیٹی ہے، وہ لوگ ذرا پیسے والے ہیں۔ لڑکی بھی مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی ہے، ہم دونوں صرف ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ہماری ماں نے اپنی بہن کے کان میں بات بھی ڈالی ہے مگر باقاعدگی سے کوئی معاملہ طے نہیں ہوا۔ نہ ہی خالہ نے ابھی ہاں... کی ہے۔“ کنجو سادگی سے بولا۔

”اچھا جی ابھی معاملہ طے نہیں ہوا تو پھر کیوں اس کی تصویر موبائل پر لیے لیے پھرتے ہو؟“ میں نے یونہی تکا مارا۔

”ارے صاحب آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ میں نے تو اس کی تصویر ابھی تک کسی کو دکھائی بھی نہیں۔“ کنجو یکبارگی بول اٹھا۔

وہ شرما رہا تھا اور مجھے لگا کہ جیسے مچھلی نے چارا نگل لیا ہے اور آج ہماری تفریح کے جال میں کنجو پھنسنے والا ہے۔

”بھئی یا تو تصویر دکھانی ہوگی یا پھر سب کو بتانا پڑے گا، اب بتاؤ کنجو میاں کون سی بات صحیح ہوگی؟“ میں نے بظاہر سادگی سے پوچھا۔

میرا تیر ٹھیک نشانے پر جا کے لگا، کنجو ایک سادہ اور شرمیلا انسان تھا۔ فطرتاً شریف بھی، اس نے میرے جھانسے

میں آکر موبائل نکالا اور ایک تصویر سامنے کر دی "دیکھیں صاحب یہ ہے میری ہونے والی گھر والی ۔" کنجو نے ارمانوں بھرے مخمور لہجے میں کہا۔

تصویر دیکھ کر مجھے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرنی پڑی۔ بلاشبہ کنجو اگر اپنی رنگت کے معاملے میں رات تھا تو اس کی سپنوں کی شہزادی اندھیری رات تھی۔ سیر سے سوا سیر تو نہیں پورے دوڈھائی سیر زیادہ والا معاملہ تھا۔ معمولی سے بھی کم نقش و نگار، موٹے ہونٹ اور اس پر سیاہ رنگت۔ تصویر میں اس کے قد وقامت کا تو اندازہ نہ ہوتا تھا لیکن کسی قدر بھاری نظر آرہی تھی۔ اس کی ناگن کی طرح بل کھاتی چوٹی جیسے اس کے حسن پر پہرا دیتی نظر آرہی تھی۔ اگر کچھ نمبرز دیے جاتے تو کنجو کی طرح اس کی معصوم سیاہ اور بڑی بڑی آنکھوں کو یا پھر زیرِ لب جھانکتے ہوئے ہموار سفید دانتوں کی قطار کو۔

"کیسی ہے صاحب۔" کنجو نے میری جانب دیکھتے ہوئے اشتیاق بھری نگاہوں سے پوچھا۔

میری رگِ ظرافت پھڑکی۔ "ارے واہ تمہاری گرل فرینڈ تو بالکل ایشوریہ رائے کی کاپی ہے بس تھوڑے سے میک اپ کی کمی ہے۔" وہ میرے مذاق کو نہ سمجھتے ہوئے تھوڑا سا شرما گیا اور اپنی گردن یوں ہلا دی جیسے میرے اس خطاب پر اسے بہت خوشی ہوئی ہو۔

"ارے بھئی تمہاری جوڑی تو ایسے لگے گی جیسے سلّو بھائی اور کترینہ بھابی۔" میری تعریف سن کر کنجو شرماتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

جلد ہی میری زبانی ہمارے گروپ کے تمام دوستوں کو اس کی خبر ہو گئی اور بعد میں سب نے ہی اصرار کر کے باری باری کنجو کے موبائل پر وہ تصویر دیکھ لی، کسی نے انہیں چاند سورج کی جوڑی کہا اور کسی نے شہزادہ سلیم اور انارکلی سے تشبیہ دی، نجانے کس طرح یہ خبر عام ہوتی گئی اور میس کے تمام بے فکروں کو اس کا پتا چل گیا۔ ویسے اس میں ہمارے کیے گئے پروپیگنڈے کا زیادہ اثر تھا کہ جس نے بھی کنجو کی گرل فرینڈ کی تصویر کو دیکھا تھا اس نے ہماری تقلید میں اسے اپنے اپنے طور پر مختلف القابات سے نوازہ تھا۔ اسی دوران میرے دیئے گئے مختلف مزاحیہ ٹائٹل جیسے بلیک کوئن، شبِ دیجور کی سیاہ رات یا رانی کھرجی بغیر میک اپ کے، جیسے نام بھی خاموشی سے پورے میس میں گردش کرنا شروع ہو گئے تھے، پھر آہستہ آہستہ ہوایوں کہ میس میں

کنجو کی آمد کے ساتھ ہی چہ میگوئیوں اور ہلکی پھلکی سرگوشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو پھر آہستہ آہستہ فقرے بازیوں میں بدلتا گیا۔ کوئی اسے لیلیٰ کے مجنوں کا نام لے کر اور کوئی سلمان خان کہہ کر پکارتا مگر یہ سلسلہ صرف یہاں تک ہی نہ تھا بلکہ ہمارے گروپ کے معنی خیز جملوں اور طنزیہ اشاروں کی توپوں کا رخ اب کنجو کی گرل فرینڈ کے حوالے کے ساتھ ساتھ کنجو بیچارے پر بھی ہو گیا اور تو اور ہم لوگوں نے اس کی سیاہ رنگت کو بھی نشانہ بناتے ہوئے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا جو۔۔۔کہ زیادہ تر اس کے پیٹھ پیچھے ہی ہوتا تھا اور کبھی کبھی مختلف انداز میں ڈھٹائی سے اس کے سامنے بھی۔۔۔

اللہ معاف کرے اتنے طنز اور مزاح کے باوجود بھی اس اللہ کے نیک بندے کی زبان سے اف تک نہ ادا ہوا اور نہ ہی اس نے کبھی صدائے احتجاج بلند کی بلکہ اس نے ہماری خدمت میں بھی کوئی کمی نہ آنے دی جس سے ظاہر ہوتا کہ اسے ہمارے رویے سے کوئی چوٹ لگی ہو، اس وجہ سے ہمارے حوصلے اور بلند ہوتے گئے اور ڈھکے چھپے الفاظوں میں مذاق اڑانے کی عادت مزید پختہ ہوتی گئی۔

☆☆☆

جمعۃ المبارک کا دن بڑا خاص اور اہم ہوتا ہے، گلف میں تو ویسے آج کے دن ہفتہ وار تعطیل ہوتی ہے، مگر اکثر و بیشتر کام کی وجہ سے اوورٹائم کرنا پڑ جاتا ہے، عموماً صبح سات بجے سے لے کر گیارہ بجے تک کام کے بعد چھٹی مل جاتی ہے یا پھر گیارہ سے دو بجے تک کھانے اور نماز کی تیاری کا وقفہ ہوتا ہے، جمعہ کے دن چھٹی کی مناسبت سے ہمارے میس میں خاص مینیو ترتیب دیا جاتا ہے۔ لنچ میں بریانی اس دن مینیو کا بطور خاص حصہ ہوتی ہے۔ اس دن بھی اوورٹائم کے بعد سب نے نماز جمعہ ادا کرتے ہی سیدھا میس کا رخ کیا۔ اپنی پلیٹوں میں گرما گرم بریانی لے کر ہم چھ سات کولیگ اپنی مخصوص میز پر آ گئے، بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو بھوک کو مزید مہمیز کر رہی تھی، کمپنی نے بطور خاص پاکستان سے ایک بریانی ایکسپرٹ کک بھرتی کیا تھا جو بریانی کے علاوہ سارے پاکستانی کھانے بڑی عمدگی سے بنانا جانتا تھا۔ بریانی سے انصاف کے دوران سامنے کنجو پر نظر پڑی، جمعہ کے دن تمام ورکرز کو یونیفارم کے علاوہ نارمل ڈریس پہن لینے کی اجازت ہوتی ہے۔ کنجو نے آج گہرے سرخ رنگ کی شرٹ، بلیک پینٹ کے ساتھ پہنی ہوئی تھی، اس کی سیاہ رنگت کے ساتھ سرخ رنگ کا یہ کمبی نیشن عجب ہی نظارہ پیش کر

رہا تھا۔ کھانے کے دوران سب کی رگِ ظرافت پھڑکنا شروع ہوئی، کنجو پر جملہ بازی اور طنز و مزاح کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا۔

"ارے بھئی جس کسی نے سیاہ اور سرخ گلاب ایک ساتھ نہ دیکھے ہوں وہ آج دیکھ لے، ہم میں سے ایک نے تبصرہ کیا۔

"ہائے ہائے، چشم بدور، کوئی نظر اتارے فوراً، دیکھو نظر نہ لگے انارکلی صاحبہ کے منظورِ نظر کو۔"

"ہا، ہا، انارکلی؟" یا جلی ہوئی مونگ پھلی۔" کسی نے پھبتی کسی۔

"ارے کوئی جا کر الیکٹریشن کو بلا کر لائے آج میس میں بہت اندھیرا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

کنجو بیچارا اتنا سادہ تھا کہ شروع شروع میں ہمارے مذاق کو سمجھ بھی نہ پاتا اور اس بیچارے کو پتا بھی نہ چلتا کہ جس بات پر وہ ہم سب کا ہنستے ہوئے ساتھ دے رہا ہے اس وقت نشانہ بھی اسی کی ذات ہے۔ ایک دفعہ حقیقت میں وہ کیمپ باس کو رپورٹ کر بیٹھا کہ میس ممبران کی طرف سے شکایت ہے کہ میس میں لائٹ کم ہونے کی وجہ سے مزید لائٹ لگوانی چاہئیں اور جب الیکٹریشن نے آ کر بتایا کہ وہاں ... مزید کسی لائٹس کی ضرورت نہیں ہے، حقیقت حال کا علم ہونے کے بعد ہمارے ساتھ کیمپ باس بھی ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔

جمعہ کے دن چھٹی ہونے کی وجہ سے میس میں عام دنوں کے مقابلے میں ذرا زیادہ رش ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کو کبھی تھوڑا سا انتظار بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔ ہماری کمپنی میں پاکستان سے ایک نئے کوالٹی کنٹرول آفیسر نے جوائن کیا تھا، آج ان کا پہلا دن تھا۔ وہ میس آئے تو کہیں جگہ نہ پا کر ہماری ٹیبل کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ان سے تعارف ہوا تو کسی نے اس دوران کنجو کو اشارہ کر کے ایک عدد کرسی کی فرمائش کی تو اس نے جی صاحب کہہ کر عادتاً اپنے سر کو ہلایا اور جھٹ پٹ کہیں سے ایک اضافی کرسی اٹھا لایا اور کیوسی صاحب کی خدمت میں پیش کر کے لوٹ گیا۔

"مگر وہ تو انکار میں سر ہلا رہا تھا جب آپ نے اسے کرسی لانے کو کہا۔" کیوسی صاحب نے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے حیرانی کا اظہار کیا۔

"دراصل ساؤتھ کے لوگ جب بھی اقرار میں سر کو ہلاتے ہیں تو تائید کے انداز میں اوپر نیچے کے بجائے نفی کے انداز میں دائیں بائیں سر کو ہلاتے ہیں۔" ہماری اس تشریح پر وہ بھی بے اختیار مسکرا دیے۔ رسمی علیک سلیک اور سلام دعا کے بعد جب تھوڑی سی بے تکلفی بڑھی تو دورانِ طعام ہمارے چٹکلوں اور برجستہ جملوں پر انہوں نے بھی محظوظ ہونا شروع کر دیا لیکن کنجو کی بابت کاٹ دار جملوں اور تضحیک آمیز القابات سے ان کا تجسس بڑھنے لگا کہ آخر وہ کون ذات شریف ہے۔ کھانے کے اختتام سے پہلے انہوں نے بیتاب ہو کر پوچھ ہی لیا۔ "ارے بھئی کون ہیں یہ شہزادہ سلیم اور بلیک کوئن۔"

ان کا اصرار بڑھا تو سب نے مسکرا کر میری جانب دیکھا کیونکہ بلاشبہ اس ڈرامے کی ابتدا میری ہی طرف سے ہوئی تھی اور میں نے ہی کنجو کو بہلا پھسلا کر اس کی گرل فرینڈ کی تصویر دکھانے پر آمادہ کیا تھا۔

"چلو بھئی اب بتا بھی دو۔" کیوسی ریحان صاحب نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

"چلیں آپ کو اصل ماجرا بتا ہی دیتے ہیں۔" میں نے کرسی پیچھے گھسیٹ کر ٹانگیں پھیلائیں اور ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے ہاتھوں کو ڈرامائی تاثر دینے کے لیے پھیلا لیے، دراصل یہ میرا خاص اسٹائل تھا۔ جب بھی کوئی کامیڈی انداز اختیار کرنا ہوتا تھا تب میں یہ طریقہ اپناتا تھا جس سے ابتداء میں ہی مخاطب میری طرف متوجہ ہو جاتا تھا، لوگوں کی نقلیں اتارنا اور مختلف سچویشنز کو مزاحیہ انداز میں بیان کرنا میرا بچپن سے ہی پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے خلا میں تکنا شروع کیا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔

"جھوٹ بولے کوا کاٹے کالے کوّے سے ڈریو، کالے کوّے سے ڈریں یا کنجو سے ایک ہی بات ہے۔ جو کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔" میں نے ایک ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے حلف اٹھانے کی ایکٹنگ کی۔

"تو لیں جناب اب آپ کا تجسس ختم ہوا اور جس عظیم شخصیت کی ہم بات کر رہے ہیں وہ ہیں حسن جمال میں یکتا، دیو مالائی افریقی حسن کے مالک مسٹر کنجو اور دوسری طرف ان کی منظورِ نظر اور ممکنہ زوجہ "مس کالی ووڈ" جو کہ اگر بالی ووڈ چلی جائیں تو سارے خان ان کے راستے میں آنکھیں بچھائے خواب سجائے یوں کھڑے ہوں جیسے اپنی نئی فلم کی ہیروئن کو ریڈ کارپٹ پر سلامی پیش کر رہے ہوں اور اگر ہالی

ووڈ کا رخ کریں تو وہاں ٹام کروز، لیونارڈو ڈی کیپریو، جونی ڈیپ اور براڈ پٹ جیسے ہیروز اپنی پلکیں بچھائے، دل تھام کر اس نئی ہیروئن کی تاریک راہوں میں سر جھکائے باادب باملاحظہ ان کا خیر مقدم کررہے ہوں جن کی تصویر اگر آپ نے دیکھی ہو تو لگتا ہے جیسے چاند کو گرہن لگ گیا ہے یا چاند کی چکوری چاند سے ملنے سے پہلے تارکول کے ڈرم میں گرگئی ہو، برائے مہربانی کمزور دل حضرات رات کے وقت یہ تصویر اکیلے نہ دیکھیں اور دن میں بھی ٹارچ کی روشنی کے بغیر یہ کوشش نہ کریں۔" میں آنکھیں بند کیے خود ہی ہنس پڑا۔

میری تقریر جاری تھی اور ساتھ میں ٹیبل پر ردھم کے ساتھ ساتھ چمچہ بجنے کی آواز آرہی تھی جیسے کوئی محظوظ ہوتے ہوئے میری مزید حوصلہ افزائی کررہا ہو، میں نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "جناب ایک طرف ہے سیاہ رات تو دوسری طرف اس کی شریک حیات، سیاہ آندھی جو چلی آرہی ہے، راستے میں ہر چیز تباہ کرتے ہوئے۔ سیاہ فام گلفام اور ان کے دل کے سیاہ گلاب کی سیاہ کلی مسٹر اینڈ مسز کنجو۔" اس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں کھول دیں مگر یہ آنکھیں برتنوں کے گرنے کی پُرشور آواز سے کھلی تھیں۔ ایک زوردار دھماکا میرے عقب میں ہوا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں کنجو کھڑا تھا۔ اس کے کندھے ڈھلکے ہوئے تھے، کھیر کے سارے پیالے ٹرے سمیت گر کر ٹوٹ چکے تھے۔ کنجو نجانے کب سے پیچھے کھڑا ہوا سب کچھ سن رہا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں تحقیر آمیز گفتگو سن لی تھی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کے دیپ بجھے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ آواز سن کر میس کے دوسرے ویٹرز دوڑ کر آگئے اور کنجو کی مدد کرتے ہوئے ٹوٹے ہوئے پیالوں اور ٹرے کے ٹکڑوں کو صاف کرنے لگے۔

"کیا بات ہے شہزادہ صاحب، لگتا ہے رات آپ ٹھیک طرح سوئے نہیں؟" ایک ٹیبل سے صدا آئی۔

"ارے بھئی بادشاہ سلامت صاحب کیا دن میں بھی خواب دیکھنے شروع کردیے اپنی خوابوں کی ملکہ کے۔"

"بھیا پری سے ملنے پرستان پہنچے ہوئے تھے، وہاں کسی جن نے ٹکر ماردی ہوگی، ہاہاہا۔" کسی اور منچلے نے فقرہ کسا اور سب ہنس دیے۔

دھماکے کی آواز سن کر سب چونکے ضرور تھے مگر کسی کو اس کی حقیقت کا علم نہ تھا لہٰذا جلد ہی سب کچھ بھول بھال کر حسب توفیق فقرے بازی میں لگ گئے۔ مجھے ابتدائی طور پر جو شرمندگی محسوس ہوئی تھی اب آہستہ آہستہ زائل ہونی شروع ہوگئی پھر کچھ ہی دیر میں چائے پیتے ہوئے ماحول کچھ ایسا خوشگوار ہوا کہ رہی سہی پشیمانی بھی دور ہوگئی۔

شام کو ڈنر پر کنجو نظر نہ آیا تو پتا چلا کہ صفائی کے دوران ایک ٹوٹی ہوئی پلیٹ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ پر معمولی سا زخم ڈال گیا ہے لہٰذا پانی سے زخم کو بچانے کے لیے اس کی ڈیوٹی عارضی طور پر اسٹور میں لگا دی گئی ہے۔ ڈنر میں کچھ خاموشی سی رہی، جمعہ کے دن شام کے کھانے میں اسپیشل حلیم ہوتا ہے، سب کی توجہ حلیم اور ساتھ ہی ساتھ اس کو مزید ذائقے دار بنانے کے لیے خصوصی طور پر شامل کیے گئے ایڈیشنل اسپائسی چاٹ اور ہرے مصالحے کی گارنشنگ پر تھی۔ جب سب لوگ اپنی اپنی پلیٹیں تیار کرکے ٹیبل پر آبیٹھے اور کچھ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو گھوم پھر کر موضوع پھر سے کنجو پر آرکا۔

"یار دن میں کچھ زیادہ تو نہیں ہوگیا تھا۔" کھانے کے دوران سائٹ انجینئر قاسم نے لیموں کا ٹکڑا مسلتے ہوئے لب کھولے۔

"کیا زیادہ ہوگیا تھا ڈیئر۔" سپروائزر الطاف نے سی سی کرتے ہوئے پوچھا۔ غالباً اس نے اپنے حلیم کو کچھ زیادہ ہی سپائسی کرلیا تھا۔

"ہاں یار وہ کنجو کہیں زیادہ ہی برا نہ مان جائے، آج تو اس کی کھل کر بے عزتی ہوئی ہے اور اس نے اپنے بارے میں سب کچھ سن لیا ہے۔ کیسی عزت کرتا تھا وہ ہماری اور ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا۔" ایک اور کا ضمیر جاگا۔

"ہاں بھئی تھوڑی تھوڑی سی احتیاط کرو آئندہ کے لیے، سب کی نظریں گھوم پھر کر مجھ پر بار بار اٹھ رہی تھیں۔

"ہاں یار مجھے بھی احساس ہوا ہے، اتنا زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بیشک اس کے پیچھے جو بھی کچھ کہہ ڈالو مگر سامنے احتیاط کرلینی چاہیے مگر ایک بات بتاؤ جب تم لوگوں نے اسے دیکھ ہی لیا تھا مجھے روکا کیوں نہیں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"اتنی دیر سے تو چمچہ بجا کر مابدولت خبردار کررہے تھے مگر جناب تو آنکھیں بند کرکے کامیڈی کے سمندر میں غوطہ زن تھے۔" اصل میں ہوا یوں کہ کھانے کے بعد ہم میں سے کسی نے کنجو کو سوئٹ لانے کا اشارہ کردیا تھا۔ وہ بیچارہ تو ہمارے لیے سوئٹ سرو کرنے آیا تھا اور جب اس نے آکر میرا دلچسپ اندازِ بیان اور انہماک دیکھا تو وہ بھی متوجہ ہوا اور اس کی دلچسپی برتنوں کے ساتھ تب ٹوٹی جب اس نے اپنی

اور اپنی جورو ئے خاص کی شان کے بارے میں وہ سارے قصیدے سن لیے۔

"او چلو جی چھڈو مٹی پاؤ، اتا نئی سوچی دا۔" میٹریل کوآرڈینیٹر ارشاد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

☆☆☆

کمپنی میں چھ مہینے پورے ہوتے ہی ملازمت کے مستقل ہونے کے ساتھ یہ خوشخبری ملی کہ جن لوگوں نے فیملی ویزے کی درخواست دی تھی وہ منظور ہوگئی ہے اور اب انتظامیہ نے کمپنی کے شادی شدہ افسران کو اپنی اپنی فیملی بلوا لینے کا عندیہ دے دیا ہے۔ دبئی میں بڑھتی ہوئی رئیل اسٹیٹ کی قیمتوں اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کرایوں میں کسی مناسب کرائے پر گھر ڈھونڈنا جیسے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، لہٰذا باقی لوگوں کی طرح نظر انتخاب دبئی سے متصل شہر شارجہ پر پڑی جہاں کمپنی کے دیے گئے ہاؤس رینٹ میں مناسب درجہ کا اسٹوڈیو فلیٹ مل ہی گیا، ایک بیڈروم اور لاؤنج پر مشتمل اٹیچ باتھ اور کچن کے ساتھ کرایہ ساڑھے تین ہزار درہم۔ گویا پاکستان میں ان ہی پیسوں سے کوئی شاندار حویلی نما گھر کرائے پر لیا جاسکتا تھا۔ اگلے ہی ہفتے ویزا کا بندوبست بھی ہوگیا اور ثمینہ کے آتے ہی یوں لگا جیسے زندگی کسی تپتی ریت والے صحرا سے نکل کر حسین نخلستان میں بدل گئی ہو۔

چند ہفتوں میں زندگی ایک نئے ڈھب پر چل نکلی، شادی کے دوسرے ہی مہینے مجھے دبئی آنا پڑ گیا تھا اور ان چھ مہینوں میں یہ دوری پہاڑ بن کر آکھڑی ہوئی تھی اور اب جب ملن کا وقت آیا تو یوں لگا جیسے زندگی تو اب شروع ہوئی ہے اور ہمارا اصل ہنی مون ابھی شروع ہوا ہے۔ ثمینہ کے آنے کے بعد ہم نے یو اے ای کا چپا چپا دیکھ ڈالا، دبئی کی رنگین دنیا میں دن اور رات کی کوئی تمیز نہیں ہے، گھومنے پھرنے اور سیر کرنے کے لیے بیشار جگہیں ہیں۔ بیشار پارکس، عالیشان ہوٹلز، شاپنگ مالز اور صاف ستھرے ساحل دبئی کی شان بڑھانے کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں، دبئی کی رومان پرور حسین شاموں میں سمندر کنارے بنی طویل اور پرسکون کورنش پر خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے ہم ایک دوسرے میں کھوسے گئے۔ جمیرہ بیچ کے ریتیلے ساحل پر صاف شفاف نیلگوں سمندر کی ٹھنڈی ہواؤں کا مزہ لیتے ہوئے ڈھلتے سورج کا نظارہ کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ اور پھر ویک اینڈ کی رات کو سمندر کی مچلتی ہوئی موجوں پر سوئمنگ کرنا کسی خواب سے کم نہ تھا۔

ہر ویک اینڈ پر کھانے پینے کی اشیا لے کر لانگ ڈرائیو پر کبھی راس الخیمہ تو کبھی فجیرہ کے ساحلوں پر باربی کیو کا اہتمام کیا جانے لگا۔ زندگی ہنستے کھیلتے گزر رہی تھی کہ ایک دن ڈیوٹی سے واپسی پر ثمینہ نے مجھے شرماتے ہوئے بتایا کہ ہمارے گھر نیا مہمان آنے والا ہے۔ ابتدائی چیک اپ کے بعد تقریباً تیسرے مہینے میں ڈاکٹرز نے یہ خوشخبری سنائی کہ ہمیں اللہ ایک نہیں دو ننھے تحفوں سے نوازنے والا ہے تو ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگیا اور آنے والے دنوں میں اس بیش بہا انعام کے لیے اس کی دعاؤں کا خواستگار رہنے لگا۔ پاکستان میں ثمینہ کے گھر والوں کے ساتھ ہمارے گھر والوں نے بھی صدقہ خیرات کے ساتھ اس خوشخبری پر خوشیاں منائیں۔ میرا ارادہ رمضان کی عید گھر پر گزارنے کا تھا جس کے لیے کمپنی کی طرف سے دس دن کی چھٹیاں بھی منظور ہوگئی تھیں، خیال تھا کہ چھٹیاں گزار کر میں واپس آجاؤں گا اور ثمینہ اپنی ڈلیوری تک پاکستان میں ہی رک جائے گی۔

رمضان کی آمد کے بعد پندرہویں روزے کو اچانک ثمینہ نے طبیعت گھبرانے کی شکایت کی۔ شام تک ایسی حالت ہوگئی کہ ہمیں اسپتال کا رخ کرنا پڑ گیا۔ ڈاکٹرز نے کچھ ضروری ٹیسٹ لیے اور رپورٹ آنے پر مزید ٹیسٹ کروانے کے لیے دو ہفتوں کا وقت دیا، رات کو ثمینہ کی حالت سنبھلنے پر ہم گھر واپس آگئے۔ دوسرے دن میں نے چھٹی کرلی اور ہم نے پورا دن سکون سے گھر میں گزارا۔ موقع دیکھ کر میں نے ثمینہ کو ڈاکٹرز کے فیصلے سے آگاہ کیا جس کے مطابق اب ہم شاید عید کے موقع پر چھٹیوں میں پاکستان نہ جاسکیں گے کیوں کہ اس دوران ہونے والے اہم نوعیت کے ٹیسٹ کے لیے ہمیں یہیں رہنا لازمی تھا۔ ثمینہ یہ سن کر پریشان تو ہوئی مگر میں نے اس کی فکرمندی دور کرتے ہوئے اسے بتایا کہ بقول ڈاکٹرز یہ سب کچھ ہمارے ہونے والے جڑواں بچوں کی پیدائش پر ضروری اقدامات کی وجہ سے ہے جن کا براہِ راست تعلق ان بچوں کی قبل از ولادت صحت اور دیکھ بھال سے تھا۔

☆☆☆

رمضان المبارک اپنے اختتام پر تھے۔ عید کی آمد آمد

تھی، مختلف ممالک سے آئے ہوئے مسلمانوں نے عید منانے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ جن لوگوں نے وطن میں عید گزارنی تھی، ان کی رخصت منظور ہوگئی تھی۔ اب وہ اپنی فلائٹ کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے اور یہ سلسلہ چاند رات تک چلتا رہا، جن کو عید پردیس میں گزارنی تھی وہ بس اپنے اہل خانہ کے ساتھ روزانہ فون پر حاضری لگا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہے تھے۔ یہاں پر بھی فیملیز نے اپنے اپنے گھروں میں عید کی تقریبات کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔ فیملی ممبرز ہونے کے ناتے اب ہمیں میس میں لنچ کے سوا اکٹھا ہونے کا موقع نہ ملتا تھا اور ہمارا وہ گروپ جو اپنی شوخیوں اور شرارتوں کی وجہ سے سب کا مرکز نگاہ بنا رہتا تھا اب اس کی وارداتوں میں کچھ کمی سی آگئی تھی۔ چند مہینوں سے ہم نے بھی اپنا ہاتھ ہلکا رکھا ہوا تھا اور خود بخود ہی ہماری تیز دھار زبانوں کی جملہ بازیوں کا سیز فائر سا ہو گیا تھا۔ یا شاید رمضان کے بابرکت مہینے کی بدولت بھی کہ کنجو بیچارے کی ذات جو کہ ہماری خنجر جیسی زبان کی زد پر رہا کرتی تھی اس کے بخیے ادھیڑنے میں بھی واضح کمی آچکی تھی۔ ویسے بھی رمضان کے آخری عشرے میں کام کی زیادتی کی وجہ سے کنجو کا تبادلہ عارضی طور پر جونیئر میس میں کر دیا گیا تھا۔

رمضان کے بابرکت مہینا میں قید کیا گیا نفس کا شیطان رمضان کے ختم ہوتے ہی آزاد ہو گیا اور اس نے آزاد ہوتے ہی عین عید کے دن ایسی کامیابی سے وار کیا کہ بس۔

آج عید کا دن تھا صبح سویرے ہی ثمینہ نے شیر خورمہ اور سویاں وغیرہ بنا لی تھیں، ڈاکٹرز نے اسے کام سے منع نہیں کیا تھا بلکہ خصوصی طرز کی کچھ ورزشیں بتائی تھیں، حتیٰ کہ سونے چلنے اٹھنے اور بیٹھنے کی بھی پوزیشنز کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا۔ میں جانا تو نہیں چاہتا تھا مگر کمپنی نے خصوصی طور پر تاکید کی تھی۔ عید کی نماز کمپنی کی اکوموڈیشن سے ملحقہ مسجد میں ادا کی جائے گی اور میس میں خصوصی ناشتہ ہوگا پھر دوپہر گیارہ بجے خصوصی ظہرانہ ہوگا جس میں سب صاحبان حاضر ہوں گے، مقصد دیارِ غیر میں عید کی خوشیوں کو سب کے ساتھ مل کر شیئر کرنا تھا۔ شام کو آزادی تھی اور تمام فیملی ممبرز نے ایک مقامی پاکستانی ریسٹورنٹ میں عشائیہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔

مسجد میں امام صاحب نے عربی میں خطاب کیا۔ چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے کہ اچانک جماعت کھڑی ہوگئی۔ امام صاحب نے دونوں رکعتوں میں اتنی دفعہ تکبیریں کہیں کہ گنتی ہی بھول گئے۔ شاید بارہ کے قریب تو ہوں گی۔ پاکستان میں دونوں رکعتوں کو ملا کر کل چھ تکبیریں ہوتی ہیں لیکن امارات میں زائد تکبیروں کے ساتھ نماز پڑھنے کا پہلا اتفاق تھا اس لیے بھول چوک میں بار بار رکوع میں چلے جاتے تھے۔ سلام پھیرتے ہی کچھ لوگ بقایا طویل خطبے کو نظر انداز کر کے عید مبارک کی سرگوشیاں اور مبارکباد کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور گلے ملنے کا آغاز ہوا۔ پاکستانیوں نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا اور جن کو اللہ نے اچھی صحت سے نوازا تھا انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کمزوروں کو یوں دبا دبا کر گلے لگایا کہ ان کی ہڈیوں تک کو کڑکڑا دیا اور تو اور ورکرز حضرات نے اپنے افسران کے ہاتھوں کو اپنے سخت ہاتھوں سے دبا دبا کر خوب ادھار چکایا، افسر بیچارے مصنوعی مسکراہٹ سجائے اپنا مورال ہائی کرتے نظر آئے۔ آہستہ آہستہ لوگ چھٹے تو ہمارا مخصوص گروپ میس کی طرف رواں دواں ہوا جہاں خصوصی ناشتے کا اہتمام تھا، چاہے عید کا تہوار ہو یا کوئی اور سرکاری خصوصی دن، سیکیورٹی کا عملہ اور میس کا اسٹاف ہمیشہ چھٹی والے دن بھی اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہوتا ہے۔ طریقہ تو یہ ہے کہ ان بیچاروں کو بھی ان کی ڈیوٹی کی جگہ جا کر عید کی مبارکباد دینی چاہیے تاکہ ان کی بھی حوصلہ افزائی ہو جائے مگر اکثر دانستہ اور غیر دانستہ طور پر انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آفیسر میس کے دو مرکزی داخلی اور خارجی دروازے تھے اور دونوں ہی سے ملا جلا کر کام چلا لیا جاتا تھا، ابھی میس سے کچھ دور ہی تھے کہ داخلی دروازے پر نظر پڑی جہاں کنجو پائیدان کو سلیقے سے جما رہا تھا۔ غالباً وہ ابھی فارغ ہوا تھا اور صفائی کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔

”ارے یار یہ مصلی کہاں مل گیا آج عید کے دن، وہ بھی صبح صبح۔“ پلاننگ انجینئر شاہد نے لقمہ دیا۔

”صبح سویرے کالی بلی راستے میں آگئی ہے۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ایک بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔ کنجو کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے بھی غالباً کچھ سن لیا تھا، ہماری طرف دیکھ کر اس نے ایپرن سے ہاتھ صاف کیے اور اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا ویسے ہی ننھے کے انداز میں۔

”لو جی یہ تو خود ہی کہہ رہا ہے کہ نا بابا میں تو تمہارے لائق نہیں ہوں۔“ سپروائزر قاسم نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا۔

”ارے یار ایسا کرتے ہیں کہ دوسرے دروازے سے داخل ہوتے ہیں ورنہ اس سے گلے ملنا پڑے گا۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ سب نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور اپنے قدم دوسرے راستے کی طرف بڑھا دیے۔

”کیا بدتمیزی ہے یار، وہ بے چارہ ہم سے گلے ملنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔“ سیفٹی آفیسر سرمد کے لہجے میں کچھ شرمندگی سی جھلک رہی تھی۔

”تو جا کر مل و نہ اپنے رشتے دار سے، کس نے روکا ہے۔“ میں نے تڑ سے کہا۔

”ہاں جی اے تے لگدا وی اے اودی ماسی دا پتر“ (ہاں یہ تو لگتا بھی ہے اس کی خالہ کا بیٹا) نذیر صاحب اپنے مخصوص اسٹائل میں بولے، اصل میں سرمد کا رنگ بھی ذرا سانولا تھا۔

”کچھ بھی ہو یار، وہ ہے تو بہرحال مسلمان، کیا ہمارا فرض نہیں بنتا۔“ سرمد نے ہار نہیں مانی۔

”ہاں ہاں ٹھیک ہے، جب میس میں نظر آئے گا تو مل لیں گے۔“ سرمد کے استدلال سے یکدم جیسے سب پر اسلام غالب آگیا۔

ناشتا بہت ہی شاندار اور روایتی تھا، قیمہ پراٹھے، چکن کڑاہی، چھولے دہی بڑے، سویاں اور شیر خرمہ کے ساتھ بھنی ہوئی کلیجی کا اہتمام تھا۔ یہ سب اعجاز تھا پاکستان کی اس مایہ ناز کمپنی میں کام کرنے کا، ورنہ دوسری غیر ملکی کمپنیوں میں تو عید کا پتا تک نہ چلتا۔ آس پاس کی کمپنیوں کے لیبرز کیمپوں میں مقیم کئی مسلم بشمول انڈین ہماری کمپنی کے انتظامات کو رشک سے دیکھتے اور ان مواقع پر ہمارے مہمان بننے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے اور آنے والے کئی دنوں تک اپنی کمپنیوں کی حالت زار پر جلی کٹی سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتے رہتے۔

دوپہر کو کھانے میں خصوصی عید کیک کاٹا گیا، روایتی فیورٹ بریانی کے علاوہ بھنے ہوئے مرغ مسلم اور چاول بھرے روسٹ کیے بکرے کے ساتھ شیر خرمہ اور کھیر شامل تھی۔ کنجو کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ وہ بڑھ چڑھ کر انتظامات میں حصہ لے رہا تھا۔ یہ نچلے اسٹاف کی ذہانت ہوتی کہ وہ افسران کا موڈ سمجھ لیتے ہیں، گو کہ سب نے ہی ارادہ کیا تھا کہ جب کنجو ہماری ٹیبل پر آئے گا تو ہم سب اس سے گلے مل کر عید کی مبارکباد دیں گے۔ مگر اس نے ایک دفعہ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے زوردار آواز میں اجتماعی طور پر ”عید مبارک صاحب“ کا نعرہ لگایا اور اپنا سر ہلاتے ہوئے دوسری جانب چل دیا۔ شاید وہ ہماری اجتماعی مجبوری کو سمجھ گیا تھا لہٰذا اس نے بھی پروفیشنل اپروچ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس واحد گرمجوشی پر ہی اکتفا کیا۔ ہماری ٹیبل کے علاوہ جس کسی کے پاس گیا حیرت انگیز طور پر سب نے اسے دبا دبا کر گلے لگایا، چٹکلے چھوڑے اور عید کی مبارکباد دی۔ اسی دوران جب کمپنی کے جنرل منیجر صاحب نے گلے لگا کر سو درہم کا نوٹ بطور عیدی اسے عنایت کیا تو اس کی خوشی دیدنی تھی اور باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ اس کی نظر میں عقیدت واحترام کا سمندر موجزن تھا۔ کنجو نے نوٹ جیب میں رکھ کر ادب سے انہیں سلام کیا اور جس جذبے سے ان کی اور ان کی اولاد کی خیر وعافیت کی دعا کی اسے سب کی آنکھوں نے محسوس کیا۔

”دیکھ یار اس مصلی کو، صبح سویرے ہی سو درہم ملے ہیں تو کیسے خوش ہوا ہے اور سلام تو ایسے پیش کیا ہے جیسے شیخ خلیفہ کو کورنش بجا لا رہا ہو۔“ کوالٹی کنٹرولر ریحان نے طنز کے تیر چلاتے ہوئے پہلی دفعہ کنجو کے بارے میں اپنا کھاتا کھولا۔

”جناب من یہ درہم چیز ہی ایسی ظالم ہے کہ ہوش اڑا دیتی ہے، چڑھتے سورج کو سلام کرتی ہے، جا بیٹا جا، اب حرے کر، موبائل میں نیا کارڈ لوڈ کرا اور بات کرا اپنی پریوں کی شہزادی، حسن آراء، مس......، میں نے جان بوجھ کر فقرہ بیچ میں ادھورا چھوڑا تو سب نے اپنے اپنے حساب سے اسے مکمل کرتے ہوئے مختلف خطابات سے نوازنا شروع کیا، مس یوگنڈا، مس کانگو، مس صومالیہ، مس تانجیریا، ہنستے مسکراتے یکایک سب کی زبانیں ایک ساتھ چل پڑی تھیں کہ میں نے ٹیبل پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے ایک نئے ٹائٹل کا اضافہ کیا۔ ”مس ساؤتھ افریقا۔“ میرے اس نئے خطاب پر سب نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”مگر وہ کیسے جناب، ساؤتھ افریقا میں تو ملی جلی رنگت کے ساتھ گوری اقوام کے لوگ بھی بستے ہیں‘ اس کی وضاحت کی جائے۔“ سب نے اکٹھے احتجاج کیا۔

”ارے بھئی وہ اس طرح کہ میڈم براہ راست تعلق رکھتی ہیں جنوبی ہند سے یعنی ویسے ہی وہ مس ساؤتھ کی کوئین کا تاج اپنے سر پر رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی رنگت کے تناسب سے براعظم افریقا کی اعزازی رکن بھی ہیں تو

اپنی اس نسبت اور تناسب کے ملاپ کے باعث وہ ساؤتھ افریقن کوئین کا تاج سر پر سجا کر مس ساؤتھ افریقا کے ٹائٹل کی بھی حقدار ہوئی کہ نہیں؟"

زبردست قہقہوں نے میری اس تشریح کا لطف دوبالا کردیا۔

بڑے دنوں کے بعد اور خصوصاً رمضان میں میس کے نہ اٹینڈ کرنے اور اپنی گھریلو پریشانیوں کے سبب طبیعت پر جو بوجھل پن تھا وہ یکبارگی جیسے فضا میں دھواں بن کر اڑ گیا۔ فقرے بازیوں، لطائف اور ہم سب کے فیوریٹ موضوع پر ہلکی پھلکی زبانی چھترول نے ماحول خوشگوار کر ڈالا تھا۔

"جناب کیا بات ہے ابھی تک آپ کی جانب سے کوئی خاصہ کی چیز نہیں آئی۔" اسٹور انچارج جمیل نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

"صبر کرو ابھی کچھ ہی دیر میں پٹاری سے کوئی نہ کوئی چٹکلہ ضرور برآمد ہوگا۔" فتنہ سازوں نے میرے موڈ کو ہوا دینی شروع کردی تو میرے لیے بھی کچھ نیا کرنا ضروری ہو گیا کہ ایسے میں اچانک ایک شاندار آئٹم نے ذہن میں جنم لیا، میں نے اس آئیڈیا پر معمولی سوچ بچار کے بعد ایک چھوٹا سا ایکٹ ترتیب دینے کے ساتھ ہی سب کو مطلع کیا تو سب نے فوراً ہی دبے دبے جوش کے ساتھ دھیمی آواز میں ارشاد ارشاد ہو کی صدائیں دینی شروع کردیں۔

"تو یارو سنو، اب انتظار کی گھڑیاں ہوئیں ختم۔" میں نے گلا کھنکھار کر کرسی پر ٹیک لگائی اور ہاتھوں کو پھیلا کر کہا۔ "صاحبو، ابھی تک تو ہم نے عالی جناب موصوف حسن کے شہنشاہ اور ان کی موصوفہ ملکہ عالیہ مس یونیورس کی شان میں ہی قصیدے پڑھے ہیں اب یہ رومان پرور داستان آگئی ہے ایک نئے موڑ پر، کہانی کا ٹرننگ پوائنٹ یہ ہے کہ ہیرو جا کر ہیروئن کی ماں سے ملتا ہے جو کہ بیچ میں ظالم سماج کا کردار ادا کر رہی ہیں، ہیرو انکو اپنی خلیج میں جما کی گئی بیش بہا جمع پونجی جو کہ تین سال میں مبلغ پانچ ہزار درہم سے زیادہ نہ ہوگی وہ پیش کر کے انہیں اپنی صاحبزادی سے بیاہ پر آمادہ کر لیتا ہے۔ شادی کے شادیانے بجنے شروع ہوتے ہیں، جنگل کے راجا اور رانی کی سگائی کے لیے افریقا سے خصوصی طور پر جنگلیوں کا ثقافتی طائفہ اپنے رقص و فن کا مظاہرہ کرنے آتا ہے۔ سیاہ آندھی مبارکباد کا پیغام لے حاضر ہوتی ہے اور اُمڈ اُمڈ کر اپنی انسیت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ اس سیاہ رات میں ملن کی تکمیل دو سیاہ دلوں کے ملنے سے ہوجاتی ہے اور خوشی کے اس موقع پر ہفتوں گھروں میں روشنیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ اندھیرے اندھیروں سے گلے ملتے ہیں اور اس پیار بھری داستان کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے کہ چاند کی پہلی تاریخ کو بلیک کوئن کے سر پر مس ڈارک نائٹ کا تاج سجا کر ان کی تاجپوشی کردی جاتی ہے۔" قہقہوں اور واہ واہ کے شور میں داد سمیٹتے ہوئے میں کچھ دیر کے لیے رکا اور ڈرامائی انداز میں گویا ہوا۔

"ابھی کہانی کا انت نہیں ہوا، پکچر ابھی باقی ہے میرے دوست۔"

سب کی ہنسی کو بریک سے لگ گئے۔ وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے باری باری سوالیہ انداز میں سب کی طرف دیکھ کر ایک گہری سانس کھینچی اور سلسلہ پھر سے جوڑا۔ "یہ کہانی کا دوسرا سیکوئل ہے، ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد کی کہانی ہے، دونوں پریمیوں کی پریم کتھا میں ایک نیا اضافی باب لکھا گیا جب اللہ نے اس چاند سے جوڑے کے آنگن میں ایک سیاہ گلاب کھلا دیا، ذرا سوچیں، دو حسین ترین انسانوں کے ملاپ سے وجود میں آنے والا وہ تحفہ کیسا ہوگا، کیا لاجواب ماسٹر پیس تخلیق ہوا ہوگا، اب آپ لوگ بھی اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچیں کہ اس تحفے کو دیکھ کر کتنے لوگ ڈر گئے ہوں گے اور کتنے کمزور دلوں کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہوگا۔ اور یہاں کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اس سیکوئل کا نام ہے "ریٹرن آف دی ڈائنو سار اینڈ فیملی۔"

میں نے بات ختم کی لیکن بات سے بات چل نکلی، پہلے تو ہم صرف بیچارے کنجو اور اس کی گرل فرینڈ کا ہی ریکارڈ بجاتے آرہے تھے مگر اس بار ہم نے اس کی آنے والی نسل تک کو اپنا نشانہ بنا ڈالا تھا جس میں میرے مصالحے دار چٹکلوں کا بڑا حصہ تھا، رمضان ختم ہوتے ہی شیطان مکمل آزاد ہو چکا تھا اور ہماری زبان میں حلول ہو کر اپنے ہی رب کی بنائی ہوئی تخلیق پر تضحیک پر مسلسل آمادہ کر رہا تھا۔ ہم پوری طرح اس کے زیر اثر تھے اور اپنے طنز و مزاح کی تیز دھار تلوار سے بے رحمی کے ساتھ اس پروردگار کے بنائے ہوئے بندے کو قربان کر رہے تھے۔ ہم لوگ کافی عرصے سے اور خصوصاً میں خدا کی بنائی ہوئی تخلیق کا مسلسل مذاق اڑاتا آرہا تھا۔ کبھی کبھی قدرت کی طرف سے ہماری رسّی ڈھیلی اور دراز ہوتی ہے، سنبھلنے کا موقع بھی دیا جاتا ہے مگر عقلوں پر تالے اور نظروں پر پردہ سا پڑ جاتا ہے۔ ہم سب ہی پڑھے

لکھے مناسب تعلیم یافتہ اور باشعور انسان تھے لیکن لمحاتی خوشی اور ہنسی مذاق کے لیے اپنے مقام سے کتنا گرتے جا رہے تھے اس کا ہمیں اندازہ تک نہ تھا لیکن قدرت کچھ کام اپنے انداز میں کر رہی ہوتی ہے اور ڈھیلی کی گئی رسّی جب کھینچ لی جاتی ہے تو بساط ہی الٹ جاتی ہے۔

وہ بیچارہ کنجو بھی صرف ایمانداری سے اپنے حصے کا کام کر رہا تھا مگر اس بیچارے کو معلوم نہ تھا کہ اس کے حصہ میں جو لوگ آئے ہیں وہ کتنے گھٹیا ہیں۔ بہرحال جب دوپہر کے ظہرانے کا اختتام ہوا تو میری اس اسٹوری کو مزید نمک مرچ لگا کر چٹ پٹے انداز میں پورے میس میں یوں ریلیز کر دیا گیا کہ وہ طنز و مزاح کے سانچے میں ڈھل کر کسی شاہکار کی طرح نکھرتی چلی گئی۔

☆☆☆

عیدالفطر کی گہما گہمی کچھ دھیمی پڑی تو میں نے ثمینہ کو ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق مزید ٹیسٹ کروانے کے لیے اسپتال کا رخ کیا، مطلوبہ ٹیسٹ مکمل ہونے کے بعد اگلے ہفتے جب میں رپورٹس کے حصول کے لیے پہنچا تو سینئر ڈاکٹر کے چیمبر میں مجھے طلب کر کے ڈاکٹر نے وہ خبر سنائی جسے سن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ درمیانی عمر کے لبنانی عیسائی ڈاکٹر نے ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، میرے لیے ٹھنڈے پانی کا گلاس منگوایا اور بولا، دیکھو مسٹر ابھی ہمیں پورا یقین نہیں ہے لیکن شام کو سینئر ڈاکٹرز کا ایک بورڈ اس رپورٹ پر اپنی رائے دے گا۔ اس کے بعد ہی ہم آپ کو کچھ حتمی طور پر بتانے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ آنے والی صورت حال کیا ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ بچے نارمل ہی ہوں۔ اس نے آہستگی سے میرا کندھا دبا کر انشاء اللہ کہا تو میرا دل زور سے دھڑکا کیونکہ عرب ممالک میں اگر کسی کام کے لیے انشاء اللہ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کا یہ کام اب شاید ہی پورا ہوسکے۔

شام کو ڈاکٹرز کے بورڈ کا فیصلہ بھی آگیا، میڈیکل ہسٹری کے مطابق دس لاکھ بچوں میں شاید ایک آدھ ہی ایسا کیس ہوتا ہے جس میں پریگننسی کے دوران جڑواں بچوں کی پیدائش میں اس طرح کی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہیں جس سے یا تو بچے آپس میں جڑے ہوئے پیدا ہوں یا پھر ابنارمل ہونے کی چانسز بڑھ جائیں، جوں جوں میڈیکل سائنس ترقی کرتی جا رہی ہے اب اس پیچیدگی پر قابو پانا ناممکن تو نہیں کسی درجہ دشوار ضرور ہے جس کے لیے مریض کو مستقل ڈاکٹرز کی زیر نگرانی رہنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ڈاکٹرز کی ہدایات پر دوسرے ہی دن ثمینہ کو ایڈمٹ کرلیا گیا۔ ثمینہ ابھی تک آنے والی اس افتاد سے بے خبر تھی لیکن روزانہ ہونے والے طویل چیک اپ اور نت نئے ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ سیشنز سے گھبرا سی گئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق جلد ہی کسی مناسب موقع پر اسے بھی اس حقیقت سے باخبر کردیا جانا تھا، اگلے ہفتے اسپتال سے ڈسچارج ہونے پر وہ بھی آنے والی اس ابتلا سے انجان نہ رہی تھی، ڈاکٹرز نے ہمیں خصوصی احتیاط کے ساتھ ثمینہ کو فزیو تھراپی کی مخصوص ایکسر سائز مستقل طور پر کرواتے رہنے کی ہدایت کی تھی۔

پاکستان میں اس خبر کے پہنچتے ہی دونوں خاندانوں میں صدقات اور خیرات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ امی اور ابو روزانہ فون کر کے ہماری خیریت معلوم کرتے اور اپنی دعاؤں میں شامل رکھتے۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ہمارے ہنستے مسکراتے نشیمن کو کسی کی نظر لگ گئی ہو اور ہم کسی نخلستان سے بھٹک کر دوبارہ تپتے صحرا میں آ کھڑے ہوئے ہوں۔

جب سے ڈاکٹرز نے جڑواں بچوں میں ہونے والی پیچیدگی کے بارے مجھے بتایا تھا، میری راتوں کی نیند اور دن کا چین لٹ گیا تھا۔ بقول ڈاکٹرز بچوں کو آپس میں علیحدہ رکھنے کے لیے بہت زیادہ کوشش کی جارہی ہے اگر یہ پیچیدگی دور نہ ہوسکی تو آنے والے بچے دنیا کے لیے ایک عجوبہ ہوں گے اور انہیں الگ کرنے کے دوران کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تو ساری عمر کے لیے ذہنی پسماندگی کے ساتھ جسمانی طور پر بھی نامکمل ہوسکتے ہیں جن کی زندگی کا بھروسا بھی صرف اللہ کی ذات پر ہوگا۔ ثمینہ کی ذہنی حالت مجھ سے بری تھی حالانکہ ڈاکٹروں نے اسے پرسکون رہنے کا مشورہ دیا تھا، حالات کو دیکھتے ہوئے ثمینہ کی والدہ کو فوراً بلانا پڑ گیا تھا۔ ورنہ مجھے تو سمجھ ہی نہ آتی تھی کہ کس طرح اس سچویشن میں ثمینہ کی دلداری کروں۔ اسے تسلی دوں کہ خود کو سمجھاؤں۔ پہلوٹی کے بچوں کی پیدائش پر آنے والا یہ مسئلہ بڑی دشواریوں اور سخت امتحانوں کو جنم دے رہا تھا اور ان کے پریشان کن اثرات کا اب مجھ پر بھی گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ میری شوخی، لہجے کی تیزی طراری اور بے ساختہ نکلنے والے کاٹ دار جملے اور قہقہے سب ختم ہو گئے، آنکھوں کی چمک معدوم اور قینچی کی طرح چلنے والی زبان خاموش تھی۔ میں تو گویا گم صم سا ہو کر رہ گیا تھا۔

کمپنی نے ان حالات میں میرا پورا ساتھ دیا تھا اور میڈیکل کے تمام اخراجات کے ساتھ ساتھ مجھے کسی بھی وقت کسی بھی دن بغیر کسی دشواری کے چھٹی کی سہولت مل جایا کرتی تھی، میں نے باقاعدگی کے ساتھ نماز کی ادائیگی شروع کردی تھی اور فضول گوئی تو دور کی بات کسی سے بات کرنے کا بھی دل نہ چاہتا تھا، چند دن پہلے ہی کی بات تھی کہ میں نے ایک زوردار ہٹ قسم کی اسٹوری دی تھی جس میں کنجو کی ذات کو بے دردی سے نشانہ بناتے ہوئے اس کے دنیا میں آنے والے بچے کو عجوبہ قرار دیا تھا اور اب یوں لگتا تھا کہ یہ اسٹوری مجھ پر الٹ گئی ہے بساط پلٹ گئی ہے۔

دن گزرتے جا رہے تھے کہ ڈاکٹرز نے بتایا کہ اگلے مہینے امریکا میں ہونے والی سالانہ میڈیکل کانفرنس جس میں دنیا بھر کے ڈاکٹرز اپنی ریسرچ اور مختلف نئی و پرانی بیماریوں پر مقالات پیش کرتے ہیں وہاں ہمارے اس کیس کی ہسٹری بھی بھیجی جا رہی ہے بقول ڈاکٹرز کے اس کیس پر ڈسکشن کے دوران وہاں ضرور کوئی اچھی پروگریس اور نتائج حاصل ہوسکیں گے، ویسے ابھی تک کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا رہی تھی اور بتایا جا رہا تھا کہ جڑواں بچوں کے خدوخال واضح ہونے تک عین ممکن تھا کہ مختلف ایکسرسائز اور ٹریٹمنٹ کے ذریعے وہ صحیح پوزیشن میں آجائیں اور نارمل رہیں، حالات میں بہتری اور ڈاکٹرز کی طرف سے کچھ حوصلہ افزا نتائج کی امید بندھی تو میں نے اللہ سے لو لگالی، میرا بیشتر وقت مسجد میں نماز، نوافل اور وظائف کی ادائیگی میں گزرنے لگا۔

کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہا تھا کہ مسجد میں میرے علاوہ ایک اور شخص بھی جماعت کے بعد کافی دیر تک تسبیحات اور وظائف میں مشغول رہتا ہے۔ ایک دن جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں حسب معمول نوافل کی ادائیگی کی اور طویل وظیفے سے جونہی فارغ ہوا تو میں نے مذکورہ شخص کو سجدے میں پڑے ہوئے دیکھا۔ وہ کافی دیر سے سجدے میں تھا، اچھی خاصی دیر ہوگئی تھی اور اب مسجد میں ہم دو ہی اشخاص بچے تھے۔ اس نے کافی دیر تک سجدے سے سر نہ اٹھایا تو مجھے کچھ تشویش ہوئی، میں آہستگی سے اس کے پاس پہنچا کہ مبادا اس کی عبادت میں خلل نہ پڑے، قریب پہنچا تو میں نے دھیمی آواز میں گڑگڑاتے ہوئے اسے اپنے کسی جرم کی معافی مانگتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا ”یااللہ میری سزا ختم فرما، یا اللہ میرا امتحان ختم فرما، مجھے معاف فرما۔“ وہ بار بار یہی الفاظ دہرا رہا تھا، گڑگڑاتے ہوئے ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے۔ وہ شخص یقیناً کسی بڑی خطا کا مرتکب ہوا تھا، اس کا معاملہ مجھے کچھ اپنی طرح کا لگ رہا تھا، مگر اس کی عاجزی بتا رہی تھی کہ وہ مجھ سے بڑی خطا کا سزاوار ہے۔ کچھ دیر بعد اس شخص نے سجدے سے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے اسے تسلی دینی چاہی مگر اسے تو کسی پل قرار نہ آرہا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس سے ایک انتہائی فاش غلطی ہوئی ہے، جس کی سزا بھگتتے ہوئے اسے دس سال کا عرصہ بیت چکا ہے مگر ابھی تک اس کی سزا ختم نہیں ہوئی، اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے میں نے اس سے وجہ پوچھی تو جو کچھ اس نے مختصراً بتایا اسے سن کر میرے ہوش قابو میں نہ رہے۔ اس کا اور میرا مسئلہ تقریباً ملتا جلتا تھا فرق صرف اتنا تھا میرے بچے ابھی اس دنیا میں نہیں آئے تھے اور اس کے آتے ہی فوت ہوجاتے تھے یا پیدائشی معذور ہوتے تھے۔

”وہ پاکپتن کے ایک گاؤں کا رہائشی تھا، بچپن کے دوستوں میں ایک معذور دوست اشفاق تھا، اس کے دائیں پاؤں میں قدرتی لنگ تھا جیسے پولیو کے مرض میں ایک ٹانگ چھوٹی رہ جاتی ہے، ہم کچھ دوست مل کر اکثر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے، کبھی لنگڑا کبھی لولا کے تحقیر آمیز ناموں سے اس کی دل شکنی کیا کرتے تھے، وہ بیچارہ ہم سے لیے دیئے رہتا تھا اور اسکول میں بھی کلاس کی سب سے پیچھے والی بنچوں پر بیٹھتا، ہاف ٹائم میں جب ہم سب پورے اسکول میں بھاگتے دوڑتے، شرارتیں کرتے کھیل کود میں مصروف ہوتے وہ بیچارہ کسی کونے میں کھڑا ہم سب کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوتا، ہم نے کبھی کوشش نہیں کی کہ اس کو کسی کھیل میں شریک کرلیں۔ کم از کم کرکٹ کے کھیل میں وہ کھڑا ہوکر بالنگ تو کرا ہی سکتا تھا اور رنر کے ساتھ بیٹنگ بھی کرلیتا، مگر ہم نے ہمیشہ اس کی زندگی اجیرن بنائے رکھی اور تو اور باسکٹ بال کھیلنے کی کوشش کے دوران میں نے کئی بار اسے جان بوجھ کر دھکا دے کر گرایا اور ہر دفعہ گرنے کے بعد اس کے آنکھوں میں جو گہری بے بسی کے سائے اور رنج والم کی تصویر نظر آتی تھی، اس کی میں نے کبھی پروا ہی نہ کی۔ نجانے یہ ہمارے ملک کا کلچر ہے یا دینی و دنیوی تعلیم کی کمی کہ اس طرح کے بیشمار کیرکٹر ہمارے آس پاس گلی محلوں اور کوچے و بازاروں میں نظر آئیں گے اور لوگ ان کو تنگ کرنے اور برے برے نام رکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے ہیں، ہم لوگ تو پاگلوں کو بھی معاف نہیں کرتے اور گلی محلے کے بچے ان کو پتھر لیے دوڑاتے نظر آئیں گے جن میں بعض دفعہ بڑی عمر سے لے کر باشعور اور پڑھے لکھے لوگ بھی محظوظ ہوتے نظر آتے ہیں۔

”ساون آتا تو گاؤں میں بارشوں کے بعد چھوٹے چھوٹے تالاب سے بن جاتے، ایک دفعہ میں نے اشفاق کو تالاب کے پانی میں ایسی ڈبکی دی کہ سارا پانی اس کے منہ اور ناک میں چلا گیا اور وہ بیچارہ گھبراہٹ میں چیخیں مارتے خود کئی ڈبکیاں کھا بیٹھا، اس دن کے بعد کسی نے اس کو بارش میں گھر سے باہر نہیں نکلتے دیکھا، اسکول میں ہم مینڈک پکڑ کر اس کی قمیص میں ڈال کر بھاگ جایا کرتے تھے اور وہ بیچارہ سٹ پٹا کر رہ جاتا مگر نہ ہی کوئی احتجاج کرتا اور نہ شکایت کیونکہ ایسی صورت میں اسے مزید انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننا پڑتا۔ اسکول میں پیچھے کی بنچوں پر بیٹھنے والے بچے کبھی تعلیمی میدان میں آگے نہیں آتے ہیں۔ مگر اشفاق نے نویں جماعت کا امتحان پاس کرلیا اور ہمارے ساتھ میٹرک میں آگیا۔ دسویں جماعت کے امتحانات سے چند مہینے پہلے اشفاق کے گھر والوں نے اس کی میتھ کے ٹیچر سے ٹیوشن لگوالی وہ حساب میں بہت کمزور تھا وہ بیچارہ اپنی طرف سے بہت محنت کر رہا تھا کہ کم از کم میٹرک تو پاس کر ہی لے۔ حساب کے ٹیچر کا گھر زیادہ دور تو نہ تھا کوئی دس منٹ کا راستہ ہوگا اور یہ راستہ گاؤں کے قبرستان کے نزدیک سے گزرتا تھا۔ مجھے شرارت سوجھی اور چند دوستوں کے ساتھ مل کر اسے ڈرانے کا پروگرام بنالیا۔ ٹیوشن سے واپسی پر عموماً مغرب کی اذان کا وقت ہو رہا ہوتا تھا اور اگر سفید چادر میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ کر کے ملگجے اندھیرے میں اچانک قبرستان سے نکل کر کوئی سامنے آجائے تو کیا حالت ہوگی، ہم سب سوچ سوچ کر بے قابو ہو رہے تھے مگر عین منصوبے والے دن تقریباً سب نے منع کر دیا۔ کسی کو کوئی کام پڑ گیا اور کسی کو اخلاقیات یاد آگئیں....

بظاہر پلان تو چوپٹ ہوگیا تھا مگر میں نے اسی وقت اکیلے ہی اپنے پروگرام پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مغرب کے بعد جونہی اندھیرا پھیلنا شروع ہوا تو قبرستان میں پھیلے سناٹے میں ہُو کا سا عالم طاری ہوگیا، تبھی کچھ فاصلے پر لنگڑاتے ہوئے اشفاق کو آتا دیکھ کر پھر سے شیطان نے بہکایا، ـــ واہ کیسا مزہ آئے گا جب اشفاق بھوت سمجھ کر بھاگ نکلے گا۔ میں نے خیالوں میں اسے حواس باختہ ہوکر بھاگتے ہوئے دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ میں اپنا ڈر بھول کر قبرستان کے داخلی دروازے کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے کی آڑ میں کھڑا ہوگیا اور سفید چادر اوڑھ لی، جیسے ہی اشفاق نزدیک آیا میں ڈراؤنی آوازیں نکالتا ہوا اس کے سامنے آگیا۔ اشفاق نے قبرستان کے خاموش پُراسرار ماحول میں اندھیرے سے نکل کر ایک سفید ہیولے کو جب اپنی جانب آتے دیکھا تو ایک فلک شگاف چیخ مار کر وہاں سے چلّاتا ہوا بھاگا۔ کچے پکے راستوں پر اس کے اونچے نیچے قدم اس طرح پڑ رہے تھے جیسے کوئی فٹ بال پتھروں سے ٹکرائی اچھلتی کودتی جا رہی ہو، ہنستے ہنستے میرا برا حال تھا کہ اچانک اشفاق نے ایک زور کی چیخ ماری۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا تو پتا چلا کہ وہ جھاڑیوں سے الجھ کر راستے کے کنارے چھوٹے سے گڑھے میں گر گیا تھا۔ غالباً اس کا سر پتھروں سے ٹکرانے کے باعث زخمی ہوا تھا۔ وہ گرنے کے بعد بے حس وحرکت پڑا تھا۔ چند لمحوں میں میری اس شرارت نے اسے کیسے انجام سے دوچار کردیا تھا مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ مجھے اب حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ میں نے جلدی سے چادر اتار کر تہ کی اور چپ چاپ وہاں سے کھسک لیا اور سیدھے گھر جا کر ہی دم لیا۔

دوسرے دن اشفاق اسکول سے غیر حاضر تھا۔ پتا چلا جب کافی دیر تک وہ گھر نہ پہنچا تو گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ وہ اسے ڈھونڈنے نکلے، کئی جگہ ڈھونڈنے کے بعد ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف جانے والے راستے میں قبرستان سے کچھ فاصلے پر وہ زخمی حالت میں بیہوش پڑا ملا، گو کہ زخم کچھ ایسے خاص نہ تھے مگر وہ بہت ڈرا ہوا تھا اور تھوڑی دیر بعد چیخ مار کر گر جاتا تھا۔ مولوی صاحب کو بلوا کر دم وغیرہ کروایا تو کچھ سکون آیا لیکن حالت سنبھل نہ پائی، پورا ہفتہ گزر گیا۔ اشفاق اسکول نہ آسکا، دسویں دن جب وہ اسکول آیا تو پیلا زرد ہو رہا تھا۔ مزید یہ کہ اس نے اس دن کے بعد ٹیوشن بھی چھوڑ دی تھی جس کا اس کی امتحان کی تیاری پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ جن دوستوں کو اس مذاق کے تانے بانے کا علم تھا وہ پریشان اور نادم تھے مگر میں نے انہیں جھوٹی قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ میرا اس واقعہ میں کوئی کردار نہیں۔ وہ مطمئن تو نہ ہوئے مگر خاموش رہنے میں عافیت سمجھی کیوں کہ اس پروگرام کے بنانے میں ان کا بھی ہاتھ تھا اگر شامل نہ ہوئے تو کیا ہوا۔ ویسے اس دن کے بعد گاؤں والوں نے اپنے بچوں کو شام کے وقت قبرستان کے نزدیک کھیلنے سے منع کردیا تھا۔

میٹرک کے امتحان ہو گئے اور رزلٹ بھی آ گیا، ہم سب پاس ہو گئے سوائے چند ایک کے جو فیل ہو گئے تھے، ان میں اشفاق کا نام بھی شامل تھا۔ ازراہِ ہمدردی اسے تسلی دینے کی بات ہوئی تو میں نے ہنستے ہوئے ڈھٹائی سے کہا کہ اس لنگڑ دین کو پاس ہونے کی صورت میں کون سی ڈپٹی کلکٹر کی نوکری مل جانی تھی جو اسے تسلی دی جائے۔ سب ہنس دیئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ اشفاق کو میٹرک میں پاس نہ ہونے کا ایسا صدمہ ہوا کہ اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔

میٹرک کے بعد سب نے شہر کے مختلف کالجوں میں اپنی اپنی پسند سے مختلف فیلڈز میں داخلہ لے لیا۔ میں نے سرگودھا کے پولی ٹیکنیک کالج میں اپلائی کیا جہاں مجھے میکینکل ٹیکنالوجی کے ڈپلوما میں بآسانی داخلہ مل گیا اور ساتھ ہی بورڈنگ میں رہائش بھی۔ پہلے سمسٹر کے اینڈ پر دس دن کی چھٹیاں ملیں اور گاؤں آیا تو پتا چلا کہ اشفاق کا ذہنی توازن کچھ درست نہیں ہے اور کسی نے اسے نشہ کی عادت بھی ڈال دی ہے۔ پیسے نہ ملنے پر اس نے گھر کی اشیا چوری کر کے بیچنا شروع کر دی تھیں اور سارا سارا دن نشے کی حالت میں بے حال گاؤں میں رُلتا پھرتا، دوسرے سمسٹر کے اختتام پر جب گاؤں واپس آیا تو پتا چلا کہ اب تو اس کی حالت اور بھی بری ہو گئی ہے۔ اب تو یہ حال ہو گیا تھا کہ پورے گاؤں میں اس کا نام مستانہ پڑ گیا تھا۔ آخری سمسٹر کے اختتام سے پہلے خبر ملی کہ ایک دن مستانہ غائب ہو گیا، ہر جگہ تلاش کرنے کے بعد اس کی جوتیاں نہر کے کنارے ملیں تو فرض کر لیا گیا کہ وہ نہر میں ڈوب گیا ہے اور گھر والوں نے رو دھو کر صبر کر لیا۔ وہ شخص اپنی کہانی سناتے سناتے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا، اچھی تعلیم سب کا بنیادی حق ہے۔ اشفاق اپنی معذوری اور دشواریوں کے بعد بھی پڑھائی جاری رکھے ہوئے تھا، میں اگر بھوت بن کر اس کے راستے میں نہ آیا ہوتا تو شاید وہ تعلیمی میدان میں اپنی محنت جاری رکھتے ہوئے مستقبل میں کامیابیاں سمیٹتا، میرے مذاق نے ایک شخص کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ اس کی آنکھوں سے حسین خواب چھین کر اسے تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا اور مجھے اپنی اس حرکت پر کوئی پچھتاوا تک نہ تھا، میرا ڈپلوما مکمل ہوا تو مجھے لاہور کی ایک انجینئرنگ کمپنی میں نوکری مل گئی، چند سال گزرے سالانہ عرس کے موقع پر دوستوں کے ساتھ جانا ہوا تو وہاں ایک لنگڑے فقیر کو دیکھ کر چونک گیا، اس نے کالے رنگ کا ایک لمبا چولا سا پہن رکھا تھا جو کہ اس کے ٹخنوں تک آ رہا تھا، اس کی نظریں مجھ سے چار ہوئیں تو میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ سرخ گھورتی ہوئی شعلہ بار آنکھیں تھیں جو میرے وجود کے آر پار اتر گئی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں سے نظریں چرانی چاہیں مگر ان آنکھوں نے جیسے مجھے جکڑ کر رکھ لیا، وہ آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان میں کچھ سوالات تھے اور کچھ جوابات بھی۔ مشکل سے چند لمحے گزرے ہوں گے مگر مجھے لگا کہ جیسے صدیاں سی گزر گئی ہوں اور بچپن سے جوانی تک کا سارا سفر ان لمحات میں طے ہو گیا ہو۔ اس کی ایکسرے کرتی ہوئی آنکھوں نے چند ہی سیکنڈز میں میرے دماغ کی چھپی ہوئی ساری ان کہی باتیں پڑھ لیں اور سارے راز جان لیے۔ میں بے خودی کے عالم میں ساکت کھڑا تھا کہ اچانک اس فقیر نے اللہ ہو کا ایک فلک شگاف نعرہ لگایا اور لوگوں کی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سحر سے واپس آیا تو انکشاف ہوا وہ سو فیصد اشفاق تھا جسے اس کے گھر والوں نے مردہ سمجھ کر صبر کر لیا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ اُف خدایا اس کی آنکھیں، اس کی آنکھیں گویا میرے دماغ سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ میں نے سر کو جھٹک کر ان آنکھوں سے جیسے چھٹکارا پانا چاہا مگر کامیابی نہ ملی۔ جاگتے سوتے مجھے انہی آنکھوں کا خیال آتا رہتا، خواب میں وہ آنکھیں مجھ سے باتیں کرتی محسوس ہوتیں۔ وہ کہا کرتیں بہت مزے کر لیے بہت آزاد پھر لیے اب تمہاری باری ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ جاتا اور سب کچھ بھول کر سونے کی کوشش کرتا۔ مگر پھر بڑی مشکلوں سے کروٹیں بدلنے کے بعد نیند آتی۔ میں نے اس بات کا تذکرہ ابھی تک کسی سے نہ کیا تھا کہ جس اشفاق کو اس کے گھر والے مردہ سمجھ بیٹھے ہیں وہ مجھے داتا دربار پر نظر آیا ہے۔ میں اسے اپنا واہمہ سمجھ کر بھول جانا چاہتا تھا۔ یہ میری مجرمانہ غفلت ہی تھی کہ میں سچ کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے ایک دو بار داتا دربار جا کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ نظر نہ آیا اور میں نے اسے بھول جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ رفتہ رفتہ ان مقناطیسی آنکھوں کی کشش مدھم ہوتی چلی گئی اور وہ مجھے نظر آنا بند ہو گئیں۔ اگلے سال میری شادی ہو گئی اور مجھے دبئی کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری مل گئی۔ دبئی آیا تو اگلے مہینے خوشخبری ملی کہ میں باپ بننے والا ہوں۔

میرا پہلا بچہ پیدا ہوا تو پورا گاؤں اسے دیکھنے کے

لیے اُمڈ آیا، اس بچے کے چار ہاتھ چار ٹانگیں تھیں، پیدائش کے چند گھنٹوں کے بعد وہ چل بسا۔ مجھ پر قیامت سی ٹوٹ پڑی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ دو سال کے وقفے کے بعد پھر خوشخبری ملی کہ میں باپ بننے والا ہوں، اس دفعہ جو بچہ پیدا ہوا وہ پیدائشی کبا (کبڑا) تھا۔ اس کے بعد ایک بیٹی جو کہ اسپیشل چائلڈ ہے۔ متواتر چوتھی اور پانچویں دفعہ مردہ بچے پیدا ہوئے، بہت علاج کروایا، نذر و نیاز کا سلسلہ کیا، مزاروں پر جا جا کر منتیں مانگیں اور اس دفعہ میری بیوی پھر امید سے ہے۔ جعلی عاملوں نے بہت پیسا بٹورا، عملیات کا سہارا لیا، بزرگوں سے دعائیں کروائیں اور یتیم خانوں و مدرسوں میں بچوں کو کھانا کھلوایا، اس بار ڈاکٹرز نے ہمیں الٹراساؤنڈ کی رپورٹ ہی نہیں دکھائی اور بس یہی کہا ہے کہ اللہ سے دعا کریں۔ کسی نے ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ کا پتا بتایا جو نماز کی تاکید کے ساتھ وظائف پڑھنے کو دیتے ہیں۔ ان کے آستانے پر نذر و نیاز کا کوئی سلسلہ نہیں ہے اور وہ غیر اسلامی شعائر کے سخت خلاف ہیں۔ سنا تھا کہ وہاں کئی لوگوں کو شفا ملی ہے، ان کے سامنے حاضری دی تو کچھ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھنے کے بعد کہا کہ بیٹا تمہارا معاملہ تو بالکل بگڑا ہوا ہے اور بات بالکل سیدھی سادی ہے۔ تم نے ضرور اللہ کے کسی نیک بندے کا دل دکھایا ہے، کسی کی زندگی برباد کی ہے۔ تمہارا معاملہ بدنظر کا نہیں بددعا کا ہے، بزرگ نے مجھ سے پورے حالات پوچھنے کے بعد صلاح دی کہ پہلی فرصت میں اسے جا کر ڈھونڈو... اور اس کے پیر پکڑ کر معافی مانگ کر اسے منا لو تو پھر اللہ یقیناً تمہارے حال پر رحم فرمائے گا۔

میں نے اگلے دن گاؤں میں سب کو بتا دیا کہ میں نے اشفاق کو داتا دربار پر دیکھا تھا۔ کسی نے یقین کیا کسی نے واہمہ سمجھا، ایک مہینے کی پوری چھٹی کے دوران اشفاق کے گھر والوں کے ساتھ سندھ اور پنجاب کے سارے مزاروں کی خاک چھان لی۔ ہر جگہ تلاش کر لیا مگر وہ کہیں نہ ملا، اتنا ضرور تھا کہ اس کے نئے حلیہ اور پرانی تصویر دکھانے پر کچھ لوگوں نے مختلف جگہوں پر اس کی موجودگی کی نشان دہی ضرور کی تھی۔ میں نے ایک ماہ کی مزید چھٹی کی درخواست کی اور وہ بھی ختم ہو گئی مگر میرا امتحان ختم نہ ہوا۔ میں نے اشفاق کے گھر والوں کی مالی مدد بھی کی اور اس کی تلاش میں ہونے والے اخراجات بھی برداشت کیے۔ وہ بیچارے میرے اس تعاون کو میری رحمدلی سمجھتے ہوئے میرے شکر گزار تھے۔ اشفاق کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا ہے دعا کریں کہ مل جائے۔

وہ شخص خاموش ہوا تو میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس شخص کے ماتھے پر کثرت نماز اور سجدوں کی زیادتی کے باعث محراب کا نشان بنا تھا، اس کی نمناک آنکھوں کے گوشوں سے آنسو تواتر کے ساتھ بہہ کر اس کی داڑھی کو بھگو رہے تھے، بظاہر اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ اللہ کا کوئی نافرمان بندہ ہے لیکن اب پتا چل رہا تھا کہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کے معاملات کتنے اہم ہوتے ہیں، بے شک اسے اپنی نمازوں کا ثواب تو شاید مل ہی رہا ہو گا مگر خدا کے معصوم بندے کو پہنچائی گئی تکلیف پر سزا کم نہ ہو رہی تھی، میرے ذہن میں بھی جھماکے ہو رہے تھے۔ اس شخص کے اعترافِ گناہ سے میرے بھی چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ میرا اور اس کا معاملہ تقریباً یکساں تھا۔ فرق یہ تھا کہ وہ معافی کے لیے جس کا دامن پکڑنا چاہ رہا تھا وہ اس کی دسترس سے دور تھا اور میرے پاس ابھی آخری موقع تھا۔ ابھی شاید مہلت باقی تھی۔ اس شخص نے اپنی دردانگیز کہانی ختم کی تو میں نے اسے تسلی اور دلاسا دیا کہ اللہ پاک اس پر ضرور اپنا رحم فرمائیں گے اور اس کا یہ امتحان اور سزا ضرور ختم ہو گی۔ یہ دعا کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا منافق تصور کر رہا تھا۔

وہ شخص اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے رخصت ہوا تو میں کچھ دیر تلاوت کلام پاک کے لیے وہیں بیٹھ گیا، کلام پاک کھولتے ہی جو پہلی سورہ میرے سامنے آئی اس کا ترجمہ پڑھ کر مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ یہ ۲۶ پارہ میں سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۱، ۱۲ تھی جس میں ذکر تھا کہ

''اے ایمان والو، کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ ہی عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو، اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو، ایمان لانے کے بعد برے نام رکھنا گناہ ہے اور جو توبہ نہ کریں وہ ظالم ہیں، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تو تم نفرت کرتے ہو۔ اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔''

یہ ترجمہ صاف صاف بتا رہا تھا کہ انسان کتنا ناقص العقل ہے۔ قومیں اور قبیلے تو صرف شناخت کے لیے بنائے

گئے ہیں، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں، اللہ کے نزدیک اور خاص بندوں میں وہی لوگ سرفہرست ہیں جو تقویٰ اور پرہیزگاری میں افضل ہیں، اللہ پاک نے اس دنیا کو بنایا ہے وہ خالقِ کائنات ہے۔ اس نے یہاں کی ہر چیز میں ایک خاص توازن اور عدل قائم کر رکھا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی ہر شے میں حکمت ہے اس کے قائم کیے میزان کا مذاق اڑانا ایسا ہی ہے جیسے اس کی خدائی سے انکار کرنا۔ میں نے خالقِ کائنات کے احکامات کی روشنی میں غور اور فکر کے ساتھ اپنا محاسبہ کیا، ضمیر کی عدالت سجائی تو خود کو مجرم پایا۔ میں بھی نماز کی پابندی کر رہا تھا، کثرت سے وظائف و نوافل کی ادائیگی کر رہا تھا، اس کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہوئے دعا مانگتا اور تسبیحات میں بیشتر وقت گزارتا مگر اصل بات بھولا ہوا تھا۔ میں نے اللہ کے بندوں کا دل دکھایا تھا، مجھ پر بہت بڑے قرض کی ادائیگی واجب تھی۔ خالقِ کائنات کا جلال مجھ پر غالب آچکا تھا، مجھ پر شرمندگی کا دورہ پڑا اور میری نظریں جھک گئیں، مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میرا پورا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا ہے۔ حقیقتِ حال کا ادراک ہوتے ہی ربِ ذوالجلال کے قہر کا سوچ کر میرے تن بدن سے جان سی نکلتی جا رہی تھی، اپنی کی گئی زیادتی کا احساس مجھ پر غالب آگیا تھا، میری ہستی ہی کیا تھی کہ مصورِ کائنات کی بنائی گئی کسی تصویر کا مذاق اڑاؤں۔ میں تو ہر حد پار کر چکا تھا اور مجھے احساس بھی نہ تھا کہ جب مظلوم کے دل سے آہ نکلتی ہے تو عرش کو بھی ہلا ڈالتی ہے۔ عصر کی نماز پڑھ کر میں گھر کی طرف چلا تو میں نے اس امتحان سے کامیاب ہو کر گزرنے کا طریقہ سوچ لیا تھا، مجھے اعترافِ جرم کرنا تھا ابھی شاید ایک راستہ کھلا تھا جو توبہ کے در سے ہو کر گزرتا تھا۔

☆☆☆

جمعہ کے دن کی چھٹی گزار کر ہفتے کو ڈیوٹی پر پہنچا تو لنچ ٹائم میں کنجو کے بارے علم ہوا کہ وہ انڈیا جا رہا ہے۔ پتا یہ چلا کہ اس دفعہ تو اسے جانا ہی پڑے گا کیونکہ اس کے ویزے کی میعاد ختم ہونے والی تھی اور نیا ویزا اپلائی کرنے کی صورت میں اسے لازمی ایک دفعہ دبئی سے آؤٹ ہونا پڑتا چاہے اس کے لیے اسے چند دنوں کے لیے قریب ترین ایرانی جزیرہ کش جانا پڑے یا پھر اپنے وطن، لہٰذا اس صورتِ حال میں کنجو نے انڈیا جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی رخصت منظور ہو چکی تھی۔ اور آج رات ہی ایمرٹس ائرلائن کی پرواز سے وہ انڈیا جا رہا تھا۔ دوپہر بارہ بجے کا وقت تھا میں نے لنچ کا ارادہ موقوف کیا اور جونیئر اکاموڈیشن کی طرف چلا۔ جونیئر ورکرز کی رہائش گاہ میں ایک روم میں چار سے چھ افراد کو اکاموڈیٹ کیا جاتا ہے۔ وہاں کسی سے کنجو کے روم کا پتا کیا تو اتفاق سے وہ اپنے روم میں اکیلا ہی مل گیا۔ کنجو کے زیادہ تر روم میٹ اس وقت اپنی ڈیوٹی پر یا لنچ میں مصروف تھے، دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا تو وہ اپنی پیکنگ کو آخری شکل دے رہا تھا۔ کنجو مجھے اچانک وہاں دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔

”ارے صاحب آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے حکم دیتے نا، میں آجاتا آپ کے پاس۔“ کنجو نے ادب سے سر ہلا کر اپنے مخصوص انداز میں کہا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے میرا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ کتنے ظرف والا عظیم شخص تھا وہ اور میں کتنا گرا ہوا پست انسان کہ وہ ساری ذلت اور ہتک بھول کر بھی جاتے جاتے مجھے عزت دے رہا تھا۔

”صاحب بیٹھیے نا۔“ اس نے جلدی سے کرسی میرے آگے کی۔ ”صاحب آج رات میری انڈیا کی فلائٹ ہے۔ اگر آپ کی خدمت میں کوئی کمی آئی ہو تو مجھے معاف کیجیے گا۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”کنجو کیا تم مجھے معاف کرو گے؟“ میں نے موقع ضائع کیے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے ندامت سے کہا۔

”ارے صاحب کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ۔ کس بات کی معافی، معافی تو ہم کو مانگنی چاہیے شاید ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہو آپ کی خدمت کرتے ہوئے۔“ وہ بیچارہ اپنی طرف سے انکساری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

میں نے کنجو کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا۔ ”نہیں کنجو تم بہت عظیم ہو اور میں بہت گرا ہوا۔ تم مجھ سے معافی نہ مانگو، میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ بہت دل دکھایا ہے تمہارا۔ میں نے تمہاری گرل فرینڈ کے بارے میں بہت بکواس کی ہے۔ اس کی تحقیر کی اور اس کا مذاق اڑایا ہے۔“

ایک سایہ سا کنجو کے سانولے چہرے پر لہرا گیا اور اس کی روشن آنکھوں میں جیسے کئی سورج ڈوب سے گئے۔

”ارے صاحب آپ نے کیا مذاق اڑایا، اس میں آپ کا کیا قصور، مجھے تو اوپر والے نے بنایا ہی اسی طرح ہے۔ بلکہ صرف مجھے ہی کیا میرا پورا خاندان، رشتے دار، برادری، شہر اور پوری نسل... ایسے ہی ہے۔ ہمیں تو اوپر والے کی

طرف سے اسی طرح کا بنا بنایا رنگ وروپ ملا ہے اور صرف ہم ہی کیا دنیا میں ہم سے بھی زیادہ سیاہ رنگت کے لوگ موجود ہیں۔ اس دنیا میں دو ہی رنگ کی اقوام ہیں گوری اور کالی۔ دونوں ہی اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اگر کسی کو یہ رنگ پسند نہیں ہے تو کیا کر سکتے ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو اسے مٹا کر کم زیادہ نہیں کر سکتے، ایک بات بتاؤں صاحب اپنے ملک میں رہتے ہوئے ذہن کبھی بھی اس انتشار کا شکار ہی نہ ہوا تھا کہ اللہ نے ہمیں ایسا کیوں بنایا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں اس طرح کے امتیازی سلوک کرنے والے نہیں ہیں، بلکہ وہاں تو شروع ہی سے نسلی و مذہبی فسادات اور ذات پات، رنگ و نسل پر مبنی تفریق ہے اور غیر مساوی سلوک پر مبنی ناانصافیاں ہیں کہ عادت سی ہو گئی ہے۔ میں جب دبئی آیا اور پاکستانیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو دل بہت ہی خوش ہوا آپ کو معلوم ہے کہ انڈیا کے مسلمانوں کے دل میں پاکستان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ انڈیا کے مسلمانوں کے دل پاکستان کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔“ وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ”مگر نجانے کیوں زندگی میں پہلی دفعہ اپنے کالے رنگ پر غصہ آیا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے جگنو ٹمٹما سے گئے۔

میں شرم سے گڑا جا رہا تھا، میری زبان گنگ تھی اور اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ نہ تھا۔ ”پھر بھی صاحب ہم نے کبھی آپ کو قصوروار نہیں ٹھہرایا، نہ کبھی دل سے بددعا نکلی مگر آپ لوگوں کے اس رویے سے پریشان بہت ہوا اور خاص طور پر جب آپ لوگوں نے میری ہونے والی گھر والی اور اس بچے کے بارے میں جو ابھی دنیا میں آیا ہی نہیں ان کو برا بھلا کہا تو دل کو بہت تکلیف پہنچی اور پھر وہ تکلیف اتنی بڑھی کہ برداشت سے باہر ہونے لگی۔ آپ لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر سامنے اور کبھی پیٹھ پیچھے ہنستے، میں آپ لوگوں کے راستے سے ہٹ جایا کرتا۔ عید پر سب خوش تھے اور میرا دل اندر سے رو رہا تھا، میں اپنے آپ کو اس وقت دنیا کا بدصورت ترین انسان سمجھ رہا تھا جسے اس کے ہم مذہب بھی گلے لگانے کو تیار نہ تھے۔ وہ دن میری زندگی کا اذیت ناک دن تھا، میں اللہ سے رو رو کر فریاد کرتا رہا، اپنا چہرہ چھپا نہیں سکتا تھا مگر جب آپ لوگوں کے طنز بھرے فقروں سے دل زیادہ دکھتا تھا تو کئی کئی روز آئینہ نہ دیکھتا۔“ وہ ہتھیلیوں کے کٹورے میں اپنا چہرہ بھر کر رونے لگا۔ میں نے بھی رونے دیا کہ دل کا غبار نکل جائے۔ کچھ دیر بعد اس نے آنسو پونچھے

اور بھرائے گلے سے بولا۔ ”کتنی بار بھوکا سویا مگر ہر روز صبح اسی چہرے کے ساتھ آنکھ کھلتی۔ اسی مقدر کے ساتھ سورج طلوع ہوتا اور آپ ہر نئے دن میرا اسی طرح مذاق اڑاتے، انڈیا میں مسلمانوں کے ساتھ واضح فرق روا رکھا جاتا ہے اور نچلے طبقے سے اشرافیہ تک ہر جگہ یہ فرق عام ہے۔ چاہے وہ ایک عام آدمی ہو یا پھر شاہ رخ خان۔ انڈیا چاہے لاکھ اپنے سیکیولر ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتا رہے۔ وہاں مسلمان عدم تحفظ کا شکار ہیں مگر دکھ اس بات کا ہے کہ ہم مذہب ہوتے ہوئے آپ نے بدسلوکی کی جس نے مجھے دکھی کیا میری راتوں کی نیند اڑائے رکھی اور میرے دل کو ایسے توڑا کہ مجھے اپنے پیدا ہونے اور انسان ہونے پر شرم آنے لگی، مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ میں اللہ سے شکوے شکایت شروع کر دوں، اللہ مجھے معاف کرے۔ میں بھی شیطان کے دھوکے میں آکر اس کی نعمتوں کا شکر کرنے کی بجائے دنیاوی خواہشات کی پیروی اور خواہ مخواہ کے احساس کمتری کا شکار ہو کر خود کو مظلوم بنا بیٹھا، ان سب باتوں کی ایک ہی وجہ تھی اور وہ آپ سب لوگوں کا رویہ۔ برا نہ مانئے گا صاحب میں تو پھر بھی دوسرے ملک سے تعلق رکھتا ہوں آپ لوگ تو بعض دفعہ اپنے ہی لوگوں کو بھی معاف نہیں کرتے ہو، آپ لوگ ایسا کیوں کرتے ہو صاحب؟“ کنجو نے میری طرف دیکھا اور آہستگی سے اپنے ہاتھ چھڑا لیا۔

”آپ بیٹھئے صاحب میں آپ کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔“ کنجو کو مہمان نوازی کا خیال آیا اور وہ جانے کے اٹھا، میرے پاس صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہ تھا میری آنکھوں سے شرمندگی اور ندامت کے آنسو بند توڑ کر بہہ نکلے۔

کنجو جاتے جاتے رک گیا۔ وہ کچھ حیران سا نظر آرہا تھا، اسے حیران ہونا بھی چاہیے تھا۔ پورا سال ہونے کو آیا تھا اپنی اکڑی ہوئی گردن اور تنے ہوئے سر کے ساتھ آنکھوں میں رعونت لیے میں اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا، فقرے کستا تھا اور وہ زبان جو چن چن کر طنز کے تیر چلایا کرتی تھی، گنگ ہو گئی تھی، جھکے ہوئے سر اور ڈھلکی ہوئی گردن کے ساتھ آنکھوں میں صرف ندامت بھرے آنسو تھے۔

”معاف کرنا صاحب، میں شاید کچھ زیادہ بول گیا۔“ کنجو گھبرا کے میرے سامنے پھر سے بیٹھ گیا۔ وہ بیچارہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے مجھ سے معذرت طلب کرنے لگا۔ مگر مجھے تو اپنے خدا کو راضی کرنا تھا اور اس کے لیے اس سے پہلے اس کے بندے کو منانا تھا۔ اگرچہ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ہمیں کبھی کوئی بددعا نہ دی تھا اور نہ ہماری طرح ہماری آنے والی نسلوں کو برا بھلا کہا تھا مگر اس نے خدا سے انصاف ضرور طلب کیا تھا۔ وہ اپنے رب کے حضور فریاد کناں تھا۔ اس رب نے اس کی آہ وزاری تو ضرور سنی ہوگی اور ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والے اور شہ رگ سے زیادہ قریب مہربان رب کا انصاف حرکت میں آگیا تھا۔ اس کے لیے مجھے اس کے محبوب بندے کو ضرور راضی کرنا تھا، خدا کی طرف سے لیے گئے امتحان اور مجھ پر آنے والی مصیبت سے کنجو لاعلم تھا۔ میں نے مختصراً اپنے حالات اسے بتائے اور یہ بھی بتا دیا کہ میں کیوں فرعون سے فقیر بن کر اس کے در پر پہنچا ہوں اور کیوں میرا پتھر دل اتنا موم ہوا ہے۔

کنجو بہت بڑے دل کا مالک تھا۔ اس نے سچے دل سے مجھے معاف کر دیا۔ میں تو اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کا ارادہ لے کر آیا تھا مگر اس نے گلے سے لگا کر صدقِ دل سے مجھے معاف کر دیا تھا۔ یہ مکافاتِ عمل ہی تھا کہ جس کنجو کو میں نے عین عید جیسے باسعادت تہوار جس میں گلے ملنے کا مطلب ہی بھائی چارے کا اظہار ہوتا ہے اسے نظر انداز کیا تھا، آج اس کے ہی گلے لگ کر ندامت کے آنسو بہا رہا تھا اور جب میں نے اسے اس کی گرل فرینڈ کو بدصورت کہنے پر معافی مانگی تو وہ سادگی سے بولا۔

”صاحب آپ نے اس کی تصویر کو میری طرح دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اور جب دل کی آنکھ ہی میلی ہو تو ہر چیز بدصورت نظر آتی ہے، اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔“

بالآخر فرداً فرداً میں نے اپنا ہر جرم قبول کیا اور اس اللہ کے بندے نے میرے سامنے ہی بیٹھ کر بڑے رقت آمیز انداز میں میرے حق میں دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے اور مجھ پر آنے والی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے اللہ سے دلسوز انداز میں رقت آمیز دعا کی۔

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد میں نے پھر کنجو کو گلے لگا کر اس سے جانے کی اجازت چاہی اور کمرے سے رخصت ہوتے ہوئے پوچھا؟ ”اس دفعہ تو اپنا رشتہ پکا کر کے آؤ گے نا؟“

”نہیں صاحب ہماری ماں نے بولا ہے کہ اس دفعہ چھوٹی بہن کی شادی کرنی ہے، لڑکا بھی مسقط میں ڈرائیور

ہے لہذا شادی پر خرچہ بھی اس کی حیثیت کے حساب سے کرنا پڑے گا، ۱۰ تولے سونے کے ساتھ ڈھیر سارا دہیج (جہیز) اور لڑکے کو سلامی میں نئی موٹر سائیکل الگ دینی ہوگی، میری تو ساری بچت اس شادی میں پوری ہو جائے گی، اپنی شادی میں تو ابھی بہت ٹائم ہے۔'' کنجو عادتاً سر ہلا کر بولا اور میں اس کو خدا حافظ کر کے وہاں سے رخصت ہوا۔

☆☆☆

کنجو انڈیا چلا گیا اور شکر ہے مجھے اپنے دل کا بوجھ اتارنے کا موقع مل گیا۔ میرا دل ہلکا ہو گیا تھا، مجھے حقیقت سے باخبر کرنے میں معاون وہ اجنبی شخص بھی پاکستان چلا گیا تھا، جاتے ہوئے اس نے نہیں بتایا کہ اشفاق کی کوئی اطلاع ملی ہے۔ اس کا اتا پتا چلا ہے، رخصت ہوتے ہوئے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے اپنی کہانی سنا کر سچائی کا راستہ دکھایا۔ میں بھی اس دوران اس کو اپنے معاملات سے آگاہ کر چکا تھا۔

جیسے جیسے دن کٹتے جا رہے تھے ڈاکٹرز کبھی امید دلاتے اور کبھی آس ٹوٹتی محسوس ہوتی کہ اچانک ایک دن خوشخبری ملی کہ امریکا میں ہونے والی میڈیکل کانفرنس میں ہمارے اس کیس کو لے کر وہاں اسپیشلسٹ کی طرف سے اس پر اسٹڈی کے بعد بھرپور ریویو کیا گیا ہے اور جرمنی سے گائناکولوجسٹ کی ایک ٹیم اس کیس میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے جلد یو اے ای میں وزٹ کرے گی اور اپنے ساتھ جدید سرجری اور لیزر ٹیکنیک کے سرجیکل انسٹرومنٹ ساتھ لائے گی۔ ان کے بمطابق اب اس طرح کے پیچیدہ کیسوں کے طریقۂ علاج میں بہت زیادہ ریسرچ ہو چکی ہے اور انہوں نے ہمارے کیس کی رپورٹس بغور دیکھنے کے بعد امید دلائی ہے کہ وہ اس مشکل کو باآسانی ہینڈل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کے لیے براہِ راست بذریعہ انٹرنیٹ امریکا سے ہی انہوں نے یہاں پر ڈاکٹروں کو ہدایات دینی شروع کر دی تھیں جس سے علاج میں ہونے والی پیچیدگیوں پر مثبت پیش رفت ہوئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا مگر یہ سچ تھا، ثمینہ پر بھی اس خبر کا بہت خوشگوار اثر ہوا اور اس کی ذہنی اور جسمانی حالت میں بہتری... آنی شروع ہو گئی۔ مزید دن گزرے کہ ڈاکٹرز نے مختلف ٹیسٹ کے دوران نتائج کو حیران کن قرار دیتے ہوئے ہمیں اس بات کی خوشخبری سنائی کہ حیرت انگیز طور پر جس حساب سے اس کیس میں نئی ڈیولپمنٹ آئی تھی وہ نہ صرف حوصلہ افزا بلکہ ان کے لیے بھی خوشی کا باعث تھی۔ ڈاکٹرز پُرامید تھے کہ جس طرح سے امپروومنٹ ہو رہی ہے تو سب کچھ نارمل طریقے سے ہو جائے گا، اسی دوران جرمنی سے ڈاکٹرز کی ٹیم نے بھی یو اے ای کے ڈاکٹرز پینل کو جوائن کر لیا تھا جنہوں نے پوری تندہی کے ساتھ اپنے اپنے تجربے اور ساتھ لائے ہوئے جدید انسٹرومنٹس کی مدد سے اس کیس میں ہماری مدد کی اور ان کی گائیڈ کی ہوئی انسٹرکشن اور طریقۂ کار کی بدولت کسی آپریشن اور سرجری کے بغیر ہی دورانِ پریگننسی وہ پیچیدگی دور کر لی گئی جو کہ آگے چل کر ہمارے لیے مشکل کھڑی کر سکتی تھی اور الٹرا ساؤنڈ کی مختلف رپورٹس میں بچے بالکل صحیح پوزیشن میں نظر آرہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ علاج اپنی جگہ مگر دعائیں اپنا رنگ لا رہی تھیں۔ یہ سچ تھا کہ کنجو نے دل صاف ہونے کے بعد میرے لیے جو دعا کی تھی اس نے اللہ کی مرضی سے میری تقدیر کو پلٹ دیا تھا۔ شکوک وشبہات کا خاتمہ کرتے ہوئے مایوسی کے چھائے ہوئے بادلوں کو ٹال دیا تھا۔

بالآخر وہ دن بھی آگیا جب میں دو صحت مند جڑواں بچوں کا باپ بن گیا، ایک لڑکا اور ایک لڑکی کی پیدائش پر میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا تھا۔ قدرت کے عطا کردہ اس انعام پر میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

کئی سال گزر چکے ہیں، دونوں بچے ہماری آنکھ کے تارے ہیں، گھر کے بزرگوں کی مرضی سے ان کے نام رکھے گئے ہیں مگر میں پیار سے اپنے لڑکے کو کنجو کہہ کر پکارتا ہوں، آپ کو بتاؤں کہ ساؤتھ انڈین ملیالم زبان میں کنجو کا مطلب ''ڈارلنگ بے بی'' یعنی چھوٹا سا پیارا بچہ ہوتا ہے۔ وہ صاحب جو اشفاق کو تلاش کر رہے تھے پھر کبھی واپس نہ آئے، مجھے یقین ہے کہ ان کی بھی سزا ضرور ختم ہو گی یا ہو چکی ہو گی کیونکہ سچے دل سے کی جانے والی توبہ ضرور قبول ہوتی ہے، اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں مگر اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ خدا کے لیے ان لوگوں کا مذاق مت اڑائیں جن کو اللہ نے اپنی مرضی سے ایسا بنایا ہوتا ہے اور ان میں بلاوجہ نقص نہ نکالیں ان کے برے برے نام اور القابات رکھ کر دل شکنی کرنے کی کوشش نہ کریں اور نہ ہی ان کے دل کا درد جگائیں۔